منتخب از تصانیف

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

منتخب از تصانیف

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

ترتیب

محترم جناب محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہم

پہلی بار عکسی طباعت .... رمضان ۱۴۰۲ھ ہجری

باہتمام .... اشرف برادران سلّمہم الرحمٰن

ناشر .... ادارۂ اسلامیات ۔ لاہور

طباعت .... وفاق پریس ۔ لاہور

کتابت .... مشتاق احمد جلالپوری

قیمت .... گلیز مجلد ڈائی دار:

ادارۂ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ — دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۲۳۱۲، ۷۲۴۲۸۵ ۔ فیکس ۹۲-۴۲-۷۲۴۲۸۵

★ — ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون — ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

★ — الرحمٰن بلڈنگ، موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون ۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۂ اسلامیات ۔ ۱۹۰ ۔ انارکلی لاہور نمبر ۲

ادارۃ المعارف ڈاکخانہ دار العلوم کراچی نمبر ۱۴

دار الاشاعت بالمقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر ۱

مکتبہ دار العلوم ۔ دار العلوم ۔ کراچی نمبر ۱۴

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عرضِ ناشر

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم۔ امّا بعد!

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دو سالہ محنت و کاوش کے بعد یہ مبارک کتاب "سیرتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللّٰھم لک الحمد۔

ہم اس کتاب کے مرتب محترم جناب محمد اقبال قریشی صاحب دام ظلہم کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس اللہ سرہٗ کے مبسوط ذخیرۂ تصانیف سے انتخاب کرتے ہوئے رحمتِ دو عالم سیدنا و مولانا احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی یہ سیرتِ طیبہ ترتیب دی اس مجموعہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مکمل سیرت پاک کے ساتھ ساتھ سیرت کے مختلف پہلوؤں پر بعض ایسے اہم مباحث بھی موجود ہیں جو اس وقت اُردو میں سیرت کی دوسری کتابوں میں موجود نہیں۔ امید ہے کہ یہ مبارک کتاب، سیرتِ طیبہ سے استفادہ کرنے والوں کے لئے عمدہ ذخیرہ ثابت ہوگی۔

اس مجموعہ کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے اصل مضمون کے الفاظ میں بھی کمی بیشی نہ کی جائے۔ اس احتیاط کی وجہ سے کتاب میں کسی کسی جگہ ربط کی کمی محسوس ہوتی ہے مگر اُسے گوارا کر لیا گیا ہے۔

اس مبارک کتاب کو مرتب کرتے وقت اگرچہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی تمام تصانیف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت پر دو مشہور کتابوں "سیرت خاتم الانبیاءؐ" اور "آدابُ النبیؐ" کو اس مجموعہ کی

بنیاد بنایا گیا ہے۔

چنانچہ اس مجموعہ کے حصّہ اوّل میں "سیرت خاتم الانبیاءؐ" مکمل شامل ہے اور سیرت خاتم الانبیاءؐ کے عنوانات کے تحت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دیگر تصانیف سے جس قدر مواد مل سکا اسکا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حصّہ دوم میں "آدابُ النبیؐ" مکمل شامل کی گئی ہے اور اس کے عنوانات کو بنیاد بنا کر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دیگر تصانیف سے مواد لے کر اس میں سمو دیا گیا ہے۔

اس طرح اب یہ مجموعہ سیرتِ طیبہ کے تمام ادوار اور حیاتِ طیبہ کے اہم گوشوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّہ میں آنحضرتؐ کی مکمل سیرتِ طیبہ، تاریخی واقعات اور سنین کے حساب سے ترتیباً بیان کی گئی ہے اور دوسرے حصّہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی صفاتِ جمیلہ و اخلاقِ کریمہ کو جمع کرنے اور آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ مرتب اور ناشر کی اس کوشش کو قبول فرما کر اس مجموعہ کو حضرت مفتی اعظم پاکستان قدس اللہ سرّہٗ کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے اور ہمیں بھی اس کتاب کی روحانی برکات سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

آخر میں قارئین سے گذارش ہے کہ ہماری پوری احتیاط کے باوجود اگر انہیں اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب میں کوئی فروگذاشت نظر آئے یا کوئی مفید مشورہ دینا مناسب خیال ہو تو اس سے ہمیں مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

ربّنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطأنا۔

وتقبّل منا انک السمیع العلیم

وصلّی اللہ وسلّم وبارک علی حبیبنا وسیّدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

اشرف برادران (سلّمہم الرحمٰن)

ادارۂ اسلامیات۔ لاہور

۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ ھجری

سیرت رسولِ اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم

(حصّہ اوّل)

حیاتِ طیّبہ

از صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۲۹۶

فہرست مضامین

سیرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(جلد اوّل)

حیاتِ طیبہ

فہرست مضامین، سیرت رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

(جلد دوم)

اسوۂ حسنہ

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک

وسلّم وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا۔ امابعد

سیرت خاتم الانبیاءؐ کے عنوانات کی عبارت من وعن مزید تفصیلات سے درج کرنے کے بعد اسی عنوان کے تحت "معارف القرآن" یا دیگر تصانیف سیّدی و مُرشدی حضرت مفتئ اعظم قدس سرّہ سے عبارات درج کی گئی ہیں۔ اس طرح کہیں کہیں معمولی سا تکرار ہوسکتا ہے جو قند مکرر ہے۔ مگر انشاء اللہ تعالےٰ بے ربط عبارت کا احساس نہ ہو گا۔ بلکہ ایسا ہی طرز ہے جیسا خلاصۂ تفسیر لکھنے کے بعد مزید مکمل تفسیر لکھی جاتی ہے۔

حق سبحانہٗ وتعالےٰ اس کاوش کو قبول فرمادیں اور زادِ آخرت و وسیلۂ نجات بنادیں۔ آمین ؎

روزِ قیامت ہر کسے وادہ بہ خویش نامہ اے
من نیز حاضر می شوم سیرتِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) در بغل

آخر میں حضرت قدس سرّہٗ کی وہ نثری تقاریر درج ہیں جو برادرِ محترم مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم نے ارسال فرمائیں۔

دُعاؤں کا از حد محتاج

بندہ محمد اقبال قُریشی غفرلہٗ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ ہارون آباد

سیرتِ رسول اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم

حصّہ اوّل
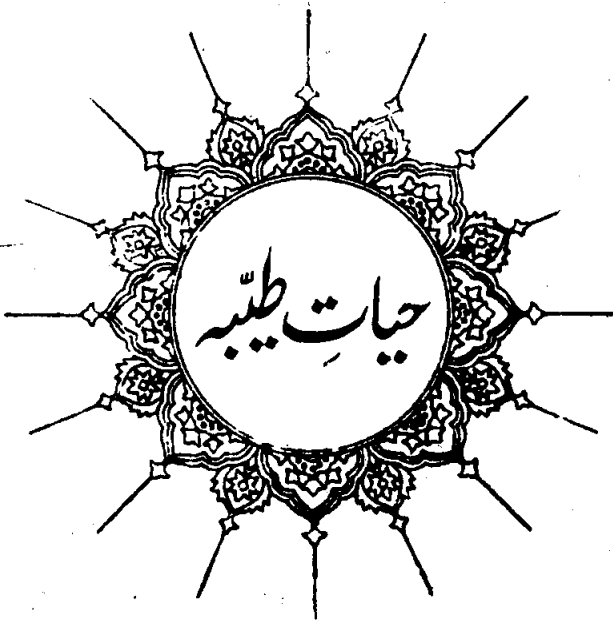
انتساب

مصنفین کا معمول ہے کہ اپنی تصنیفات کسی اپنے صاحبِ اقتدار مربی کی خدمت میں تحصیلِ برکت و اظہارِ عقیدت کے لئے بطورِ نذر پیش کرتے ہیں، یہ ناکارۂ خلائق اس تحفۂ گدائی اور نوائے بے نوائی کو سید الاولین والآخرین فخرِ بنی آدم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ جلالت پناہ میں پیش کر کے عرض کرتا ہے :-

وجئنا ببضاعۃ مزجاۃ فاوف لنا الکیل
وتصدّق علینا انّ اللّٰہ یجزی المتصدقین ؁

؎ بضاعت نیاوردم الا امید

محمد شفیع الدیوبندی غفرلہٗ ولوالدیہ ۱۳۴۳ھ

(ماخوذ از سیرتِ خاتم الانبیاءؐ)

مقدّمہ

اما بعد، سرورِ کائنات فخرِ موجودات ممدوحِ دوعالم رسول اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلّم کی سیرت (سوانح عمری) پڑھنے پڑھانے کی ضرورت محتاجِ بیان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت میں جب سے تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوُا۔ آج تک ہر قرن ہر زمانہ کے علماء نے اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی زبانوں میں آپؐ کی سیرتیں لکھیں اور اس غیر منقطع سلسلہ میں خدا تعالےٰ ہی جانتا ہے کہ کتنی غیر محصور کتابیں زیر تصنیف آچکی ہیں اور کتنی آنے والی ہیں ؎

نہ من برآں گلِ عارض غزل سرایم و بس

کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزاران اند

مسلمانوں سے بڑھ کر سینکڑوں کی تعداد میں کفار نے آپؐ کی سیرتیں لکھی ہیں اور یوروپین مورخین نے اس میں بڑا حصّہ لیا جن میں بیس تیس تو ہمیں معلوم ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے عام طور پر واقعات کے بیان میں شدید تعصب سے کام لیا ہے اس لئے مسلمانوں کو ان کے مطالعہ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ الغرض بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا میں آج تک کسی انسان کی سیرت کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا۔ ایک یوروپین سیرت نگار لکھتا ہے:۔

"محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابلِ فخر چیز ہے"

(از سیرت النبیؐ)

اُردو زبان میں بھی قدیم وجدید بہت سی سیرتیں موجود ہیں جو اہلِ ہند کی طرف سے اس فریضہ کو ادا کرچکی ہیں۔ لیکن میری نگاہ عرصہ سے ایسی مختصر سیرت کو ڈھونڈ رہی تھی جس کو ہر کاروباری مُسلمان مرد وعورت دو تین مجلسوں میں ختم کرکے اپنا ایمان تازہ کر سکے اور اسوۂ نبویہ کو اپنا رہنما بنا سکے اور جو اسلامی انجمنوں اور مدارس کے ابتدائی

نصاب میں درج ہو سکے اور جس میں اختصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا اجمالی نقشہ اپنے اصلی رنگ میں مکمل طور سے روایت میں احتیاط کو مدِ نظر رکھ کر پیش کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسا کوئی رسالہ اردو زبان میں میری نگاہ سے نہ گزرا۔ اسی عرصہ میں بعض احباب شملہ نے اپنی اسلامی انجمن کے لئے ایسے رسالہ کی ضرورت محسوس کر کے احقر سے فرمائش کی تو باوجود اپنی کم علمی اور پھر اس کے ساتھ مشاغل تعلیم و تعلم کے اس خیال سے قلم اٹھایا کہ جس وقت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کے نام پیش ہوں شاید کسی گوشہ میں اس سیہ کار کا نام بھی آجائے

ع بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس ست

اس لئے بنامِ خدا اس رسالہ کو شروع کیا اور امورِ ذیل کا التزام کرتے ہوئے سیرت کی معتبر کتابوں کا لب لباب اس میں پیش کر دیا۔

۱۔ اس کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ رسالہ طویل نہ ہو جائے اور اسی وجہ سے ملک عرب کے جغرافیائی حالات اور عجم و عرب کی حالت قبل از اسلام وغیرہ جو سیرت کا جزو سمجھے جاتے ہیں اور ایک حد تک مفید بھی ہیں اُن سے قطع نظر کر کے صرف اُن حالات پر اکتفا کرنا پڑا جو خاص آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے متعلق ہیں اور اسی اختصار کی وجہ سے اس کا نام "اوجز السیر لخیر البشر" بھی رکھا گیا۔

۲۔ اختصار کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھا گیا کہ جامعیت ہاتھ سے نہ جائے اور بحمد اللہ تقریباً تمام ضروری واقعات اس رسالہ میں لئے گئے ہیں۔

۳۔ مسائل جہاد، تعداد ازدواج وغیرہ پر جو مخالفین کے اوہام ہیں ان کے بھی موٹے موٹے شافی جوابات درج کئے گئے۔

رسالہ کا ماخذ

کل معتبر اور مستند کتابیں ہیں جن کے حوالے بھی ہر موقع پر بقید صفحات لکھ دیئے گئے ہیں جن میں سے بعض نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مشکوٰۃ شریف (۲) صحاح ستہ مع شروح (۳) کنز العمال (۴) خصائص کبریٰ للسیوطی (۵) مواہب لدنیہ (۶) سیرت مغلطائی (۷) سیرت ابن ہشام، شفاء قاضی عیاض مع شرح خفاجی (۹) سیرت حلبیہ (۱۰) زاد المعاد از علامہ ابن قیم (۱۱) تاریخ ابن عساکر (۱۲) سرور المحزون از حضرت شاہ ولی اللہ (۱۳) اوجز السیر از شیخ بن فارس (۱۴) نشر الطیب مصنفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ وغیرہ۔

خدا تعالیٰ کا ہزاروں ہزار شکر ہے کہ اُس نے ناچیز سعی کو قبولیت عطا فرمائی اور سب[1] سے پہلے سیدی و مرشدی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اس کو پسند فرما کر خانقاہِ امدادیہ کے نصابِ درس میں داخل فرمایا اور اپنے رسالہ تتمات وصیت میں اس کا اعلان فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی اس طرف رغبت دلائی۔

چنانچہ صرف تین ماہ میں پنجاب، ہندوستان، بنگال کے سو سے زائد مدارس اور اسلامی انجمنوں کے نصاب میں داخل کر لیا گیا۔ حال میں جناب مہتمم صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور نے اطلاع دی ہے کہ اُن کی مجلسِ شوریٰ نے بھی اس کو ابتدائی نصاب میں داخل کر لیا ہے۔ والحمد للہ اولہ وآخرہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہٗ
۲۸ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

---

[1] یہ آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان پاکستان کے بہت سے مدارس اور سکولوں میں داخلِ نصاب ہو چکی ہے اور مجموعی طور پر لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب مطہر تمام دنیا سے زیادہ شریف اور پاک ہے۔ دلائل ابونعیم میں مرفوعاً روایت ہے، جبرئیل علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں دنیا کے مشرق و مغرب میں پھرا، مگر بنی ہاشم سے افضل کوئی خاندان نہیں دیکھا (مواہب) اور یہ وہ بات ہے کہ تمام کفارِ مکہ اور آپؐ کے دشمن بھی اس سے انکار نہ کہہ سکے۔ ابوسفیان رضؓ نے بحالت کفر شاہِ روم کے سامنے اس کا اقرار کیا، حالانکہ وہ اس وقت چاہتے تھے کہ اگر کوئی گنجائش ملے تو آپؐ پر عیب لگا دیں۔

آپؐ کا نسب شریف والد ماجد کی طرف سے یہ ہے:۔ محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیّ بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن معد بن عدنان۔ یہاں تک سلسلۂ نسب باجماع اُمت ثابت ہے اور یہاں سے حضرت آدم علیہ السلام تک اختلاف ہے اس لئے اس کو ترک کیا جاتا ہے۔

والدہ ماجدہ کی طرف سے آپؐ کا نسب یہ ہے :۔ محمدؐ بن آمنہ بنت وہب عبدالمناف بن زہرۃ بن کلاب۔ اس سے معلوم ہُوا کہ کلاب بن مرہ میں آپؐ کے والدین کا نسب جمع ہو جاتا ہے۔ (سیرت خاتم الانبیاءؐ صـ۲۰، صـ۲۱)

ولادت سے پہلے آپؐ کی برکات کا ظہور

جس طرح آفتاب سے پہلے صبح صادق کی عالمگیر روشنی اور پھر شفق سُرخ دُنیا کو طلوعِ آفتاب کی بشارت دیتے ہیں۔ اسی طرح جب آفتابِ نبوّت کا طلوع قریب ہُوا تو اطرافِ عالم میں بہت سے ایسے واقعات ظاہر کئے گئے جو آپؐ کی تشریف آوری کی خبر دیتے تھے۔ جن کو محدثین کی اصطلاح میں "ارہاصات" کہا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی والدۂ ماجدہ کا بیان ہے کہ جب آپؐ اُن کے بطن میں بصورتِ حمل مستقر ہُوئے تو اُنہیں خواب میں بشارت دی گئی کہ وہ بچّہ جو تمہارے حمل میں ہے اس اُمّت کا سردار ہے، جب وہ پیدا ہوں تو تم یُوں دعا کرنا:

"مَیں ان کو ایک خدا کی پناہ میں دیتی ہوں، ان کا نام محمدؐ رکھنا"۔

(سیرت ابن ہشام)

اور فرماتی ہیں کہ آپؐ کے حمل میں رہنے کے بعد مَیں نے ایک نور دیکھا جس سے شہر بُصریٰ علاقہ شام کے محلات اُن کے سامنے آگئے۔ (سیرت ابن ہشام)

اور فرماتی ہیں کہ مَیں نے کسی عورت کو کوئی حمل نہیں دیکھا جو آپؐ سے زیادہ سہل اور سبک ہو۔ یعنی ایامِ حمل میں جو متلی اور سستی وغیرہ عموماً عورتوں کو رہتی ہے، وہ کچھ مجھے پیش نہیں آئیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے واقعات رونما ہُوئے جن کی اس مختصر رسالہ میں گنجائش نہیں۔

(سیرت خاتم الانبیاء صـ۲۱، صـ۲۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کی خصوصیات

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین اس وقت تھا جبکہ آدم علیہ السلام پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا خمیر ہی تیار ہو رہا تھا اور پھر فرمایا میں آپ لوگوں کو اپنے معاملہ کی ابتدا بتلاتا ہوں کہ میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ ماجدہ کے خواب کا مظہر ہوں (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا سے مراد وہ دُعا ہے جس کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۲۹، آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ میں قرآن نے کیا ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کے بھیجنے کی دُعا[1] فرمائی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بشارت سے مُراد ان کا وہ قول ہے جس کا حوالہ دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے:-

یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ (الصّف آیت ۶)

(اسی طرح اپنی والدہ ماجدہ کے جس خواب کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ کیا ہے، اُس سے مراد وہ خواب ہے جس کے بارے میں روایات میں آیا ہے کہ آپ کی) والدہ ماجدہ نے حالتِ حمل میں یہ خواب دیکھا تھا کہ میرے بطن سے ایک نور نکلا جس سے مُلکِ شام کے محلات جگمگا اُٹھے۔

(تفسیر معارف القرآن ج۱۲ ص۳۳۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا بعد وفات زندہ ہوکر مُسلمان ہونا (ماخوذ از فتاویٰ دارالعلوم)

سوال:- چونکہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کا انتقال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے

[1] اس دُعا کا مفہوم مع تشریح ضروری بعثت کے بیان میں آئیگا، انشاء اللہ۔ احقر قریشی غفرلہٗ

بہت پہلے آپؐ کے ایامِ طفولیت ہی میں ہوگیا تھا جبکہ آپؐ کے والد ماجد آپؐ کی ولادت سے بھی پہلے وفات پاچکے تھے۔ بنا بریں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارے میں اپنی زندگی میں آپؐ کی نبوت پر ایمان لانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ذخیرۂ احادیث میں ایک حدیث ایسی ضرور موجود ہے جس میں وفات کے بعد آپؐ کے والدین کے دوبارہ زندہ ہونے اور آپؐ پر ایمان لانے کا ذکر ملتا ہے)۔

الجواب اس حدیث کی صحت میں (اگرچہ) اختلاف ہے (لیکن) شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس حدیث کی شرح میں تین مستقل رسالے لکھے ہیں اور اس حدیث کی توثیق کی ہے۔ (نیز) شامی نے باب المرتد میں بھی (اس) حدیث کی تصحیح اکابر محدثین سے نقل کی ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

الا ترى ان نبينا صلى الله عليه وسلم اكرمه الله تعالى بحياة ابويه له حتى امنا به كما فى الحديث صححه القرطبى وابن ناصر الدين حافظ الشام وغيرهما فانتفعا بالايمان بعد الموت على خلاف القاعدة اكراما لنبينا صلى الله عليه وسلم۔ شامی مصری ج ۳ ص ۳۱۵ -

(امداد المفتیین ج ۲ ص ۲۶) -

ترجمہ :- کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خاص اکرام کرتے ہوئے اُنکے ماں باپ کو دوبارہ زندگی عطا کی اور وہ دونوں حضورؐ پر ایمان لائے جیسا کی حدیث میں ہے اور اس حدیث کی امام قرطبی اور ابن ناصر الدین حافظِ شام وغیرہ نے تصحیح کی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص اکرام میں آپؐ کے والدین اپنی وفات کے بعد ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔ (شامی طبع مصر ص ۳۱۵ ج ۳)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت

اس بات پر جمہور کا اتفاق ہے کہ آپؐ کی ولادت باسعادت ماہِ ربیع الاوّل میں اس سال ہوئی جس میں اصحابِ فیل نے بیت اللہ پر حملہ کیا اور خداوندِ عالم نے اُن

کو ابابیل یعنی چند حقیر جانوروں کی ٹکڑیوں کے ذریعے شکست دی، جس کا اجمالی واقعہ قرآنِ عزیز میں موجود ہے اور درحقیقت واقعہ فیل بھی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی ولادت باسعادت کی برکات کا مقدمہ تھا۔ (سیرت صہ ۲۲)۔

حضرات محدّثین نے اس واقعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک قسم کا معجزہ قرار دیا ہے۔ مگر چونکہ معجزات کا قانون یہ ہے کہ وہ نبی کے دعوائے نبوت کے ساتھ ان کی تصدیق کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ دعوائے نبوت سے پہلے بلکہ نبی کی ولادت سے بھی پہلے حق تعالےٰ بعض اوقات دنیا میں ایسے واقعات اور نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو خرق عادت ہونے میں مثل معجزہ کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی نشانیوں کو محدّثین کی اصطلاح میں ارہاص کہا جاتا ہے جو تاسیس و تمہید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ رہص سنگِ بنیاد کو کہتے ہیں (قاموس) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور ولادت سے پہلے بھی اس قسم کے ارہاصات متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ اصحابِ فیل کو آسمانی عذاب کے ذریعے بیت اللہ پر حملے سے روک دینا بھی ان ہی ارہاصات میں سے ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ صہ ۸۱۱)

اصحابِ فیل کا واقعہ

امام حدیث و تاریخ ابن کثیرؒ نے اس واقعے کو اس طرح نقل فرمایا ہے کہ "یمن پر ملک حمیر کا قبضہ تھا، یہ لوگ مشرک تھے۔ ان کا آخری بادشاہ ذونواس تھا جس نے اس زمانے کے اہلِ حق یعنی نصاریٰ پر شدید مظالم کئے۔ اسی نے ایک طویل و عریض خندق کھدوا کر اُس کو آگ سے بھرا اور جتنے نصرانی بُت پرستی کے خلاف ایک اللہ کی عبادت کرنے والے تھے سب کو اس آگ کی خندق میں ڈال کر جلا دیا جن کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی (یہی وہ خندق کا واقعہ ہے جس کا ذکر اصحاب الاخدود کے نام سے سورۂ بروج میں گزرا ہے۔ ان میں دو آدمی کسی طرح اُن کی گرفت سے نکل بھاگے اور انہوں نے قیصر ملکِ شام سے جا کر فریاد کی کہ ذونواس ملک حمیر نے نصاریٰ پر ایسا ظلم کیا ہے آپ ان کا انتقام لیں۔ قیصر ملک شام نے بادشاہ

حبشہ کو (کہ وہ بھی) نصرانی تھا اور یمن سے قریب تھا ایک خط لکھا اس خط میں اُس نے بادشاہ حبشہ کو ترغیب دلائی) کہ وہ اس ظالم سے ظلم کا انتقام لے (شاہِ حبشہ نے) اپنا عظیم لشکر دو کمانڈر (امیر) ارباط اور ابرہہ کی قیادت میں یمن کے اُس بادشاہ کے مقابلہ پر بھیج دیا۔ لشکر اس کے مُلک پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو قوم حمیر کے قبضہ سے آزاد کرا دیا۔ ملک حمیر ذوالنواس بھاگ نکلا اور دریا میں غرق ہو کر مر گیا۔ اس طرح ارباط و ابرہہ کے ذریعہ یمن پر بادشاہ حبشہ کا قبضہ ہو گیا۔ پھر ارباط و ابرہہ میں باہمی جنگ ہو کر ارباط مقتول ہو گیا ابرہہ غالب آ گیا اور بعد ازاں یہی (ابرہہ) بادشاہ حبشہ نجاشی کی طرف سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہو گیا۔ اس نے یمن پر قبضہ کرنے کے بعد ارادہ کیا کہ یمن میں ایک ایسا شاندار کلیسا بنائے جس کی نظیر دُنیا میں نہ ہو، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں وہ اس کلیسا کی عظمت و شوکت سے مرعوب ہو کر کعبۃ اللہ کے بجائے اُس کے بنائے ہوئے کلیسا میں جانے لگیں۔ اس خیال پر اُس نے ایک بہت بڑا عالی شان کلیسا اتنا اونچا تعمیر کیا کہ اُس کی بلندی پر نیچے کھڑا ہوا آدمی نظر نہیں ڈال سکتا تھا اور اُس کو سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا اور پوری مملکت میں اعلان کرا دیا کہ اب یمن سے کوئی شخص کعبۃ اللہ کا حج کرنے کی غرض سے نہ جائے بلکہ اس کلیسا میں عبادات کرے۔ عرب میں اگرچہ بُت پرستی غالب آ گئی تھی تاہم دینِ ابراہیم اور کعبہ کی عظمت و محبت اُن کے دلوں میں پیوست تھی۔ اس لئے عدنان، قحطان اور قریش کے قبائل میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ یہاں تک کہ اُن میں سے کسی نے رات کے وقت کنیسہ میں داخل ہو کر اس کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے مسافر قبیلہ نے کنیسہ کے قریب اپنی ضروریات کے لئے آگ جلائی، اس کی آگ کنیسہ میں لگ گئی اور اس کو سخت نقصان پہنچ گیا۔ ابرہہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی اور یہ بتلایا گیا کہ کسی قریشی نے یہ کام کیا ہے تو اُس نے قسم کھائی کہ مَیں اُن کے کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہوں گا۔ ابرہہ نے اس کی تیاری شروع کی اور اپنے بادشاہ نجاشی سے اجازت مانگی۔ اُس نے اپنا خاص ہاتھی کہ جس کا

نام محمود تھا ابرہہ کے لئے بھیج دیا تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر کعبہ پر حملہ کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ سب سے بڑا عظیم الشان ہاتھی تھا جس کی نظیر نہیں پائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ آٹھ ہاتھی دوسرے بھی اس لشکر کے لئے بادشاہ حبشہ نے بھیج دیئے تھے، ہاتھیوں کی یہ تعداد بھیجنے کا منشاء یہ تھا کہ بیت اللہ کے ڈھانے میں ہاتھیوں سے کام لیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ بیت اللہ کے ستونوں میں لوہے کی مضبوط اور طویل زنجیریں باندھ کر ان زنجیروں کو ہاتھیوں کے گلے میں باندھیں اور ان کو ہنکادیں تو سارا بیت اللہ (معاذ اللہ) فوراً ہی زمین پر آگرے گا۔

عرب میں جب اس کے حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ یمن کے عربوں میں ایک شخص ذونفر نامی تھا، اس نے عربوں کی قیادت اختیار کی اور عرب لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ ان لوگوں نے ابرہہ کے خلاف جنگ کی۔ مگر چونکہ اللہ تعالےٰ کو منظور یہ تھا کہ ابرہہ کی شکست اور اس کی رسوائی نمایاں ہو کر دُنیا کے سامنے آئے۔ اس لئے یہ عرب (اس پہلے) مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ابرہہ نے اُن کو شکست دے دی اور ذونفر کو قید کر کے آگے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد جب وہ قبیلہ خثعم کے مقام پر پہنچا تو اس قبیلہ کے سردار نفیل بن حبیب نے پُورے قبیلہ کے ساتھ ابرہہ کا مقابلہ کیا مگر ابرہہ کے لشکر نے ان کو بھی شکست دیدی۔ اور نفیل بن حبیب کو بھی قید کر لیا۔ اس نے اوّل ان کے قتل کا ارادہ کیا۔ مگر پھر یہ سمجھ کر ان کو زندہ رکھا کہ ان سے ہم راستوں کا پتہ معلوم کرتے چلیں گے۔ بہرحال جب یہ لشکر طائف کے قریب پہنچا تو طائف کے باشندے ثقیف پچھلے قبائل کی جنگ اور ابرہہ کی فتح کے واقعات سُن چکے تھے اس لئے انہوں نے ابرہہ سے صُلح کر لینے ہی میں اپنی خیر سمجھی چنانچہ) انہوں نے فیصلہ کیا کہ طائف میں ان لوگوں نے ایک عظیم الشان بُت خانہ لاتؔ کے نام سے بنا رکھا ہے۔ ابرہہ اس کو نہ چھیڑے تو وہ اس کا مقابلہ نہ کریں گے (ابرہہ اس پر راضی ہو گیا) انہوں نے ابرہہ سے مل کر یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اس کی امداد اور راہنمائی کے لئے اپنا ایک سردار ابورغال اس کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ ابرہہ ابورغال کو لے کر

مکہ مکرمہ کے قریب ایک مقام مغمس پر پہنچ گیا جہاں قریش مکہ کے اونٹ چر رہے تھے۔ ابرہہ کے لشکر نے سب سے پہلے حملہ کر کے اونٹ گرفتار کر لیئے جن میں دو سو اونٹ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جدِّ امجد عبد المطلب رئیس قریش کے بھی تھے۔ ابرہہ نے یہاں پہنچ کر اپنا ایک سفیر حناط حمیری کو شہر مکہ میں بھیجا کہ وہ قریش کے سرداروں کے پاس جا کر اطلاع کر دے کہ ہم تم سے جنگ کے لئے نہیں آئے، ہمارا مقصد کعبہ کو ڈھانا ہے، اگر تم نے اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تو تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ حناطہ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو سب نے اُس کو عبد المطلب کا پتہ دیا کہ وہ سب سے بڑے سردار قریش کے ہیں۔ حناطہ نے عبد المطلب سے گفتگو کی اور ابراہہ کا پیغام بھی پہنچا دیا۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق عبد المطلب نے یہ جواب دیا کہ ہم بھی ابرہہ سے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ نہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکیں، البتہ مَیں یہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ اللہ کا گھر اور اس کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہُوا ہے، وہ خود اُس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ اللہ سے جنگ کا ارادہ ہے تو جو چاہے کر دیئے پھر دیکھے کہ اللہ تعالےٰ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ حناطہ نے عبد المطلب سے کہا کہ تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں، آپ کو ابرہہ سے ملاتا ہوں۔ ابرہہ نے جب عبد المطلب سے کہا کہ بڑے وجیہہ آدمی ہیں تو ان کو دیکھ کر اپنے تخت سے نیچے اُتر کر بیٹھ گیا اور عبد المطلب کو اپنے برابر بٹھایا اور اپنے ترجمان سے کہا کہ عبد المطلب سے پوچھے کہ وہ کس غرض سے آئے ہیں؟ عبد المطلب نے کہا کہ میری ضرورت تو اتنی ہے کہ میرے اونٹ جو آپ کے لشکر نے گرفتار کر لئے ہیں ان کو چھوڑ دیں۔ ابرہہ نے ترجمان کے ذریعے عبد المطلب سے کہا کہ جب مَیں نے آپ کو اوّل دیکھا تو میرے دل میں آپ کی بڑی وقعت و عزت ہوئی مگر آپ کی گفتگو نے اس کو بالکل ختم کر دیا کہ آپ مجھ سے صرف اپنے دو سو اونٹوں کی بات کر رہے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ مَیں آپ کا کعبہ جو آپ کا دین ہے اُس کو ڈھانے کے لئے آیا ہوں، اس کے متعلق آپ نے کوئی گفتگو نہیں کی۔ عبد المطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک تو مَیں ہوں، مجھے اُن کی فکر ہوئی اور بیت اللہ کا مَیں مالک نہیں بلکہ

اس کی مالک ایک عظیم ہستی ہے وہ اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ ابرہہ نے کہا تمہارا خدا اس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔

بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ اور بھی قریش کے چند سردار گئے تھے اور انہوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ بیت اللہ پر دست اندازی نہ کریں اور لوٹ جائیں تو ہم پورے تہامہ کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے، مگر ابرہہ نے اس کے ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالمطلب کے اونٹ ابرہہ نے واپس کر دیئے، وہ اپنے اونٹ لے کر واپس آئے تو بیت اللہ کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہوئے اور قریش کی ایک بڑی جماعت ساتھ تھی۔ سب نے اللہ تعالٰے سے دُعائیں کیں کہ ابرہہ کے عظیم لشکر کا مقابلہ ہمارے تو بس میں نہیں، آپ ہی اپنے بیت کی حفاظت کا انتظام فرما دیں۔ الحاح وزاری سے دُعا کرنے کے بعد عبدالمطلب مکہ مکرمہ کے دوسرے لوگوں کو ساتھ لے کر مختلف پہاڑوں پر پھیل گئے ان کو یہ یقین تھا کہ اس کے لشکر پر اللہ تعالٰے کا عذاب آئے گا۔ اسی یقین کی بناء پر انہوں نے ابرہہ سے خود اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ بیت اللہ کے متعلق گفتگو کرنا اس لئے پسند نہ کیا کہ خود تو ابرہہ کے مقابلے کی طاقت نہ تھی اور دوسری طرف بھی یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالٰے اُن کی بے بسی پر رحم فرما کر دشمن کی قوت اور اُس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ صبح ہوئی تو ابرہہ نے بیت اللہ پر چڑھائی کی تیاری کی اور اپنے ہاتھی محمود نامی کو آگے چلنے کے لئے تیار کیا۔ فضیل بن حبیب جن کو راستے سے ابرہہ نے گرفتار کیا تھا اس وقت وہ آگے بڑھے اور ہاتھی کا کان پکڑ کر کہنے لگے تو جہاں سے آیا ہے وہیں سالم لوٹ جا، کیونکہ تو اللہ کے بلد امین (محفوظ شہر) میں ہے۔ یہ کہہ کر اُس کا کان چھوڑ دیا۔ ہاتھی یہ سُنتے ہی بیٹھ گیا۔ ہاتھی بانوں نے اُس کو اُٹھانا چلانا چاہا، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس کو بڑے بڑے آہنی تبروں سے مارا گیا اُس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔ اس کی ناک میں آنکڑا لوہے کا ڈال دیا گیا، پھر بھی وہ کھڑا نہ ہوا۔

اس وقت ان لوگوں نے اس کو یمن کی طرف لوٹانا چاہا تو چلنے لگا۔ پھر مشرق کی طرف چلایا تو چلنے لگا۔ ان سب اطراف میں چلانے کے بعد پھر اس کو مکّہ مکرمہ کی طرف چلانے لگے تو پھر بیٹھ گیا۔ قدرتِ حق جلّ شانہٗ کا یہ کرشمہ تو یہاں ظاہر ہُوا۔

دوسری طرف دریا کی طرف سے کچھ پرندوں کی قطاریں آتی دکھائی دیں جن میں سے ہر ایک کے ساتھ تین کنکریاں، چنے یا مسُور کے برابر تھیں، ایک چونچ میں اور دو پنجوں میں۔ واقدی کی روایت میں ہے کہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ جُثّہ میں کبوتر سے چھوٹے تھے، اُن کے پنجے سرخ تھے اور ہر پنجے میں ایک کنکر اور ایک چونچ میں آتے دکھائی دیئے اور فوراً ہی ابرہہ کے لشکر کے اُوپر چھا گئے۔ یہ کنکریں جو ہر ایک کے ساتھ تھیں ان کو ابرہہ کے لشکر پر گرایا۔ ایک ایک کنکر نے وہ کام کیا جو ریوالور کی گولی بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جس پر پڑتی اس کے بدن کو چھیدتی ہوئی زمین میں گھُس جاتی تھی۔ یہ عذاب دیکھ کر ہاتھی سب بھاگ کھڑے ہُوئے۔ صرف ایک ہاتھی رہ گیا تھا جو اس کنکری سے ہلاک ہُوا اور لشکر کے سب آدمی اسی موقع پر ہلاک نہیں ہُوئے، بلکہ مختلف اطراف میں بھاگے۔ ان سب کا یہ حال ہُوا کہ راستہ میں مر مر کر گر گئے، ابرہہ کو چونکہ سخت سزا دینا تھی، یہ فوراً ہلاک نہیں ہُوا، مگر اس کے جسم میں زہر ایسا سرایت کر گیا کہ اُس کا ایک ایک جوڑ گل سڑ کر گرنے لگا۔ اسی حال میں واپس اُس کو یمن لایا گیا۔ دارالحکومت صنعا پہنچ کر اُس کا سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا اور مر گیا۔ ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان یہیں مکّہ مکرمہ رہ گئے تھے، مگر اس طرح کہ دونوں اپاہج اور اندھے ہو گئے تھے۔ محمد بن اسحاق نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ مَیں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے اور اپاہج تھے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی بہن حضرت اسماءؓ نے فرمایا کہ مَیں نے دونوں اپاہج اندھوں کو بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ ۸۱۴ تا صـ ۸۲۰)

(اس مفصل واقعہ کو حق سبحانہٗ وتعالےٰ نے سورت الفیل میں نہایت مختصر مگر جامع انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کا نظیر لہ)

(اسعد قریشی غفرلہٗ)

بعض مورخین[1] نے لکھا ہے کہ واقعہ فیل ۲۰ اپریل ۵۷۱ئہ میں ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیدائش حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش سے پانچ سو اکہتر سال بعد میں ہوئی۔

امام حدیث ابن عساکر[2] نے دُنیا کی مجمل تاریخ اس طرح لکھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السّلام اور حضرت نوح علیہ السّلام کے درمیان ایک ہزار دو سو برس کا فاصلہ ہُوا اور حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام تک ایک ہزار ایک سو بیالیس سال کا اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام سے حضرت موسےٰ علیہ السّلام تک پانچ سو پینسٹھ برس کا اور موسیٰ علیہ السّلام سے حضرت داوٗد علیہ السّلام تک پانچ سو بہتّر اور حضرت داوٗد علیہ السّلام سے حضرت عیسےٰ علیہ السّلام تک ایک ہزار تین سو چھپّن ۱۳۵۶۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان چھ سو برس کا فاصلہ گزرا ہے۔ اس حساب سے حضرت آدم علیہ السّلام سے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلّم تک پانچ ہزار بیس ۵۰۲۰ سال ہو گئے۔ اور حضرت آدم علیہ السّلام کی عمر مشہور قول کے مطابق چالیس کم ایک ہزار سال ہُوئی اس لئے حضرت آدم علیہ السّلام کے دُنیا میں تشریف لانے سے تقریباً چھ ہزار سال بعد یعنی ساتویں ہزار سال میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم رونق افروز ہُوئے[3]

---

[1] دروس التاریخ اسلامی ص۱۴ للخیاط

[2] ابن عساکر نے اس کو صحیح فرمایا ہے۔ (ج ۱ ص۲۱) [3] اس تفصیل کے متعلق اور بھی مختلف اقوال ہیں، لیکن ابن عساکر نے اس کو صحیح فرمایا ہے (ج ۱ ص ۲۱)

جائے ولادت

وہ مکان ہے جو بعد میں حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کے ہاتھ آیا تھا۔[1]

(سیرت خاتم الانبیاءؐ صـ۲۲)

یومِ ولادت

الغرض جس سال اصحابِ فیل کا حملہ ہوا اس کے ماہِ ربیع الاول کی بارہویں تاریخ روز دوشنبہ دنیا کی عمر میں ایک نرالا دن ہے کہ آج پیدائشِ عالم کا مقصد، لیل ونہار کے انقلاب کی اصلی غرض، آدمؑ اور اولادِ آدم کا فخر، کشتیٔ نوحؑ کی حفاظت کا راز، ابراہیمؑ کی دعا اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی پیشین گوئیوں کا مصداق یعنی ہمارے آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونق افروزِ عالم ہوتے ہیں۔ ادھر دُنیا کے بُت کدہ میں آفتابِ نبوت کا ظہور ہوتا ہے۔ ادھر ملکِ فارس کے کسریٰ کے محل میں زلزلہ آتا ہے جس سے اُس کے چودہ کنگرے گر جاتے ہیں۔ بحیرۂ ساوہ (ملکِ فارس کا ایک دریا) دفعتاً خشک ہو جاتا ہے۔ فارس کے آتش کدہ کی وہ آگ جو ایک ہزار سال سے کبھی نہ بجھی تھی خود بخود سرد ہو جاتی ہے۔[2]

یہ درحقیقت آتش پرستی اور ہر گمراہی کے خاتمہ کا اعلان اور فارس و روم کی سلطنتوں کے زوال کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح احادیث میں ہے کہ ولادت کے وقت آپ کی والدہ ماجدہ کے بطن سے ایک ایسا نور ظاہر ہوا کہ جس سے مشرق و مغرب روشن ہو گئے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپؐ زمین پر جلوہ افروز ہوئے تو دونوں ہاتھوں پر سہارا دیئے ہوئے تھے۔ پھر آپؐ نے خاک کی مُٹھی بھری اور آسمان کی طرف دیکھا۔[3]

---

[1] سیرتِ مغلطائی صـ۱۲۵ [2] سیرتِ مغلطائی صـ۵ [3] خوابِ مدینہ ∴

تاریخِ ولادت

اس پر اتفاق ہے کہ ولادت باسعادت ماہِ ربیع اوّل میں دوشنبہ کے دن ہوئی. لیکن تاریخ کی تعیین میں چار اقوال مشہور ہیں۔ دوسری، آٹھویں، دسویں، بارہویں۔ حافظ مغلطائیؒ نے دوسری تاریخ کو اختیار فرماکر دوسرے اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے۔ مگر مشہور قول بارہویں تاریخ کا ہے۔ یہاں تک کہ ابن البزارؒ نے اس پر اجماع نقل کر دیا اور اسی کو کامل ابنِ اثیر میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ جمہور کے خلاف بے سند قول ہے اور حسابات پر بوجہ اختلاف مطالع ایسا اعتماد نہیں ہو سکتا کہ جمہور کی مخالفت اس کی بناء پر کی جائے۔ (حاشیہ سیرت خاتم الانبیاء صـ۲۴)

آپؐ کے والد ماجد کی وفات

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے کہ آپؐ کے والد ماجد عبد اللہ کو ان کے والد عبد المطلب نے حکم دیا کہ وہ مدینہ طیبہ سے کھجوریں لائیں۔ عبد اللہ آپؐ کو بصورتِ حمل[1] چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ اتفاقاً وہیں ان کی وفات ہو گئی اور اس طرح والد کا سایہ پیدائش سے پہلے ہی سر سے اُٹھ گیا ہے[2]

(سیرت خاتم الانبیاءؐ صـ۲۵)

---

[1] ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپؐ کے والد ماجد کا انتقال آپؐ کی ولادت کے بعد ہوا ہے۔ جبکہ آپؐ کی عمر سات مہینے کی تھی لیکن زاد المعاد میں ابن قیمؒ نے اس قول کو مرجوح قرار دیا ہے۔ (زاد المعاد ج ا صـ)

[2] سیرتِ مغلطائی صـ ..

زمانۂ رضاعت اور زمانۂ طفولیت

سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو آپؐ کی والدہ ماجدہ نے اور چند روز کے بعد ابو لہب کی کنیز ثوبیہ نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد یہ دولت خداداد حلیمہ سعدیہ کو نصیب[1] ہوئی۔

شرفائے عرب کی عام عادت تھی کہ بچوں کو دودھ پلانے کے لئے گرد و نواح کے دیہات میں بھیج دیتے تھے جس سے بچوں کی جسمانی صحت بھی اچھی ہو جاتی تھی اور وہ خالص عربی زبان بھی سیکھ جاتے تھے اور اسی لئے گاؤں کی عورتیں اکثر شہروں میں شیر خوار بچے لینے کے لئے جایا کرتی تھیں۔ حضرت حلیمہ سعدیہ کا بیان ہے کہ میں (طائف) سے بنی سعد کی عورتوں کے ہمراہ دودھ پینے والے بچوں کی تلاش میں مکّہ کو چلی۔ اس سال قحط تھا، میری گود میں ایک بچّہ تھا مگر (فقر و فاقہ کی وجہ سے) اتنا دودھ نہ تھا جو اُس کو کافی ہو سکے۔ رات بھر وہ بھوک سے تڑپتا تھا اور ہم اس کی وجہ سے بیٹھ کر رات گزارتے تھے۔

ایک اونٹنی بھی ہمارے پاس تھی مگر اس کے بھی دودھ نہ تھا۔ مکّہ کے سفر میں جس دراز گوش پر سوار تھی وہ بھی اس قدر لاغر تھا کہ سب کے ساتھ نہ چل سکتا تھا۔ ہمراہی بھی اس سے تنگ آرہے تھے۔ بالآخر مشکل سے یہ سفر طے ہُوا۔ مکّہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو عورت دیکھتی تھی اور یہ سُنتی کہ آپؐ یتیم ہیں تو کوئی قبول نہ کرتی (کیونکہ زیادہ انعام و اکرام کی توقع نہ تھی) ادھر حلیمہ کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا، اُن کے دُودھ کی کمی اُن کے لئے رحمت بن گئی۔ کیونکہ دودھ کم دیکھ کر کسی نے اُن کو اپنا بچّہ دینا گوارا نہ کیا۔ حلیمہ فرماتی ہیں کہ میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ خالی ہاتھ واپس ہوں۔ خالی سے یہی بہتر ہے کہ اس یتیم کو لے چلوں

---

[1] مغلطائی۔

شوہر نے منظور کر لیا اور یہ اُس دُرِّ یتیم کو لے آئیں جس سے آمنہ اور حلیمہ کے گھر میں نہیں بلکہ مشرق و مغرب میں اُجالا ہونے والا تھا۔

خدا کا فضل تھا کہ حلیمہ کی قسمت جاگی اور سردارِ کائنات اُن کی گود میں آگئے۔ فرودگاہ پہ لا کر دُودھ پلانے بیٹھی تو برکات کا ظہور شروع ہو گیا۔ اس قدر دُودھ اُترا کہ آپؐ نے بھی اور آپؐ کے رضاعی بھائی نے بھی خوب سیر ہو کر پیا اور آرام سے سو گئے۔ ادھر اونٹنی کو دیکھا تو اُس کے تھن دُودھ سے لبریز تھے (حلیمہ فرماتی ہیں کہ) میرے شوہر نے اُس کا دودھ نکالا اور ہم سب نے سیر ہو کر پیا اور رات بھر آرام سے گزاری۔ مدتوں بعد یہ پہلی رات تھی کہ ہم اطمینان کے ساتھ نیند بھر کر سوئے۔ اب تو میرا شوہر بھی کہنے لگا کہ حلیمہ تم تو بڑا ہی مبارک بچہ لائی ہو۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی یہی توقع ہے کہ یہ نہایت مبارک لڑکا ہے۔ اس کے بعد ہم مکّہ سے روانہ ہوئے۔ میں آپؐ کو گود میں لے کر اسی دراز گوش پر سوار ہوئی۔ مگر اس مرتبہ خدا کی قدرت کا یہ تماشہ دیکھتی ہوں کہ اب وہ اتنا تیز چلتا ہے کہ کسی کی سواری اس کی گرد کو نہیں پہنچتی۔ میری ہمراہی عورتیں تعجب سے کہنے لگیں کہ یہ وہی ہے جس پر تم آئی تھیں۔

الغرض راستہ قطع ہُوا، ہم گھر پہنچے وہاں سخت قحط پڑا ہُوا تھا۔ تمام دودھ کے جانور دودھ سے خالی تھے۔ لیکن میرا گھر میں داخل ہونا تھا اور میری بکریوں کا دودھ سے بھرنا۔ اب روز میری بکریاں دودھ سے بھری آتی ہیں اور کسی کو اپنے جانوروں میں ایک قطرہ دُودھ نہیں ملتا۔ میری قوم کے لوگوں نے اپنے چرواہوں سے کہا کہ تم بھی اپنے جانور اسی جگہ چراؤ جہاں حلیمہ کی بکریاں چرتی ہیں، مگر وہاں تو چراگاہ اور جنگل کی خصوصیت نہ تھی بلکہ کسی اور ہی لعل کی خاطر منظور تھی، اس کو وہ لوگ کہاں سے لاتے؟ چنانچہ ایک ہی جگہ چرنے کے بعد بھی اُن کے جانور دودھ سے خالی اور میری بکریاں بھری ہوئی آتی تھیں۔ اسی طرح ہم برابر آپؐ کی برکات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دو سال پورے ہو گئے اور میں نے آپؐ کا دودھ چھڑا دیا۔[1]

(سیرت ص۲۵ تا ص۲۸)

---

[1] الصالحات

آپؐ کا سب سے پہلا کلام

حلیمہؓ کا بیان ہے کہ جس وقت آپؐ کا دودھ چھڑایا تو یہ کلماتِ مبارک آپؐ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوئے :- اللہ اکبر کبیرا والحمد للہ حمداً کثیراً وسبحان اللہ بکرۃً وّ اصیلاً- اور یہ آپؐ کا سب سے پہلا کلام تھا-

(اخرجہ البیہقی عن عباس کذا فی الخصائص ج۱ ص۵۵)

حلیمہ آپؐ کے بچپن کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ آپؐ کا نشوونما اور سب بچوں سے اچھا تھا کہ دو سال ہی میں اچھے بڑے معلوم ہونے لگے- اب ہم حسبِ قاعدہ آپؐ کی والدہ کے پاس لائے- مگر آپؐ کی برکات کی وجہ سے آپؐ کو چھوڑنے کو جی نہ چاہتا تھا- اتفاقاً اس سال مکہ میں طاعون پھیل رہا تھا- ہم وباء کا بہانہ کر کے پھر آپؐ کو ساتھ واپس لے آئے- آپؐ ہمارے پاس رہے، باہر نکلتے اور لڑکوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتے تھے، مگر خود علیحدہ رہتے تھے- ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ میرے دوسرے بھائی دن بھر نظر نہیں آتے- وہ کہاں رہتے ہیں؟ میں نے کہا بکریاں چرانے جاتے ہیں- آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اُن کے ساتھ بھیجا کرو[1] اور اس کے بعد اپنے رضاعی بھائی (عبداللہ) کے ساتھ جایا کرتے تھے[2] (سیرت ص۲۹)

ایک مرتبہ دونوں مواشی میں پھر رہے تھے کہ عبداللہ دوڑتے اور ہانپتے ہوئے گھر پہنچے اور اپنے باپ سے کہا کہ میرے قریشی بھائی کو دو سپید کپڑے والے آدمیوں نے پکڑ کر لٹایا اور شکم چاک کر دیا- میں اُن کو اسی حال میں چھوڑ کر آیا ہوں- ہم دونوں گھبرائے ہوئے جنگل کو دوڑے- دیکھا کہ آپؐ بیٹھے ہیں مگر رنگ (خوف سے) متغیّر ہے- میں نے پوچھا کہ بیٹا کیا بات ہے؟ فرمایا دو شخص سفید کپڑے پہنے ہوئے

---

[1] بچپن کے زمانہ میں داعیہ مساوات قابلِ دید ہے کہ جب میرا بھائی کام کرتا ہے تو میں کیوں نہ کروں- [2] خصائص جلد ۱ ص ۱۵ ؎

آئے اور پیٹ[1] چاک کر کے اس میں سے کچھ ڈھونڈ کر نکالا معلوم نہیں کیا تھا۔ ہم آپؐ کو گھر لے آئے[2]۔ اس کے بعد میں آپ کو ایک کاہن[3] کے پاس لے گئی۔ وہ آپؐ کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھا اور آپؐ کو اپنے سینہ پر اٹھا لیا اور چلانا شروع کر دیا کہ اے آلِ عرب دوڑو! جو بلاتم پر عنقریب پہنچنے والی تھی اس کو دفع کرو جس کی صورت یہ ہے کہ اس لڑکے کو قتل کر دو اور اگر تم نے اسے چھوڑ دیا تو یاد رکھو کہ یہ تمہارے دین کو مٹا دے گا اور ایسے مذہب کی طرف تمہیں دعوت دے گا جو تم نے اب تک کبھی نہیں سنا۔ حلیمہ یہ سن کر جھنجھلا اٹھی اور آپؐ کو اس بدبخت کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ اور کہا کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے۔ تجھے خود اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیئے۔ حلیمہ آپؐ کو لے کر گھر آئیں۔ لیکن اس دوسرے واقعہ نے ان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ آپؐ کو آپؐ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کر دیں۔ کیونکہ حلیمہ کما حقہ تحفظ نہ کر سکتی تھیں۔

(ماخوذ از شواھد النبوت لمولانا الجامی وخصائص کبریٰ ص ۵۵ ج ۱)

---

[1] جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ربی ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الانشراح آیت ۱) "کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ" شرح کے لفظی معنی کھولنے کے ہیں اور سینہ کو کھول دینا اس کے علوم و معارف اور اخلاقِ حسنہ کے لئے وسیع کر دینے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو حق تعالےٰ نے علوم و معارف اور اخلاقِ کریمہ کے لئے ایسا وسیع بنا دیا تھا کہ آپؐ کے علم و حکمت کو بڑے بڑے عقلاء بھی نہ پا سکے اور اسی شرح صدر کا نتیجہ تھا کہ آپؐ کو مخلوق کی طرف توجہ کرنا حق تعالےٰ کی طرف توجہ میں مخل نہ ہوتا تھا اور بعض احادیث صحیحہ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے بحکم الٰہی آپؐ کا سینہ مبارک ظاہری طور پر بھی چاک کر کے صاف کیا۔ بعض حضرات مفسرین نے شرح صدر سے اس جگہ وہی شق صدر کا معجزہ مراد لیا ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۷۷۱)

[2] سیرت ابن ہشام بحاشیہ زاد المعاد ج ۱ ص ۴۰ لغایت ص ۸۹ [3] اسلام سے پہلے کچھ لوگ جنات و شیاطین کے ذریعے آسمانی خبریں اور چھپی خبریں معلوم کر کے غیب دانی کے مدعی ہوتے تھے انکو کاہن کہا جاتا ہے۔ (سیرت ص ۴۹)

جب مکہ پہنچ کر آپؐ کو آپؐ کی والدہ شریفہ کے سپرد کیا تو انھوں نے حلیمہ سے پُوچھا کہ باوجود خواہش کرکے واپس لے جانے کے اس قدر جلد واپس لے آنے کی کیا وجہ ہے؟ اصرار کے بعد حلیمہ کو تمام واقعہ عرض کر دینا پڑا۔ اُنھوں نے سُن کر فرمایا کہ بیشک میرے بیٹے کی ایک خاص شان ہے اور پھر ایامِ حمل اور وقتِ ولادت کے تمام حیرت انگیز واقعات سُنائے [1]۔ (سیرت ص۲۹، ص۳۰)

آپؐ کی والدۂ ماجدہ کی وفات

جب آپؐ کی عمر شریف چار یا چھ برس ہُوئی تو مدینہ سے واپس ہوتے ہُوئے بمقام ابواء آپؐ کی والدہ ماجدہ نے بھی دنیا سے رحلت فرمائی [2]۔ بچپن کا زمانہ، چھ سال کی عمر ہے، والد کا سایہ تو پہلے ہی اُٹھ چکا ہے۔ والدہ کی آغوشِ شفقت کا بھی خاتمہ ہُوا لیکن یہ یتیم جس آغوشِ رحمت میں پرورش پانے والا ہے وہ ان اسباب سے بے نیاز ہے۔ (سیرت ص۳۱)

عبدالمطلب کی وفات

والدین کے بعد آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کے پاس رہے۔ لیکن خدائے قدوس کو دکھلانا تھا کہ یہ نونہال محض آغوشِ رحمت میں پرورش پانے والا ہے مسبب الاسباب اس کی تربیت کا خود کفیل ہو چکا ہے۔ جب آپؐ کی عمر آٹھ برس دو مہینہ دس دن کی ہوئی تو عبدالمطلب بھی دُنیا سے رحلت فرما گئے۔ (سیرت ص۳۱)
اس کے بعد آپؐ کے حقیقی چچا ابوطالب آپؐ کے ولی ہُوئے۔

---

[1] ابن ہشام ص۹۔ [2] مغلطائی ص۱۰۔

نبی اُمّی اور معجزۂ قرآن

اب اس ذاتِ مقدس کا حال سُنیئے جس پر قرآن اُترا ہے۔ ولادت سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گئے۔ ابھی سات سال کی عمر بھی نہ تھی کہ والدہ کی بھی وفات ہو گئی۔ آغوشِ مادر کا گہوارہ بھی نصیب نہ رہا۔ شریف آباء و اجداد کی فیاضی اور بے مثل سخاوت نے اپنے گھر میں کوئی اندوختہ نہ چھوڑا تھا جس سے یتیم کی پرورش اور آئندہ زندگی کا سامان ہو سکے۔ نہایت عسرت کی زندگی پھر ماں باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ ان حالات میں آپؐ نے پرورش پائی اور عمر کا ابتدائی حصّہ گزارا۔ اور جو تعلیم و تعلّم کا اصلی وقت ہے۔ اس وقت اگر مکّہ میں کوئی دار العلوم یا اسکول و کالج بھی ہوتا تو بھی آپؐ کے لئے اس سے استفادہ مشکل تھا۔ مگر معلوم ہو چکا کہ وہاں سرے سے یہ علمی مشغلہ اور اس سے دلچسپی ہی کسی کو نہ تھی۔ اسی لئے یہ پوری عرب قوم اُمیین کہلاتے تھے۔ قرآن کریم نے بھی ان کے متعلق یہ الفاظ استعمال کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ آپؐ ہر قسم کے تعلیم و تعلّم سے بے خبر رہے۔ وہاں کوئی بڑا عالم بھی ایسا نہ تھا جس کی صُحبت میں رہ کر یہ علوم حاصل کئے جا سکیں، جن کا قرآن حامل ہے۔ پھر قدرت کو تو ایک فوق العادت معجزہ دکھلانا تھا۔ آپؐ کے لئے خصوصی طور پر ایسے سامان ہوئے کہ معمولی نوشت و خواند ہر جگہ کے لوگ کسی نہ کسی طرح سیکھ ہی لیتے ہیں، آپؐ نے وہ بھی نہ سیکھی بالکل اُمّی محض رہے کہ اپنا نام تک بھی نہ لکھ سکتے تھے۔

عرب کا مخصوص فن شعر و سخن تھا جس کے لئے خاص اجتماعات کئے جاتے اور مشاعرے منعقد ہوتے اور اس میں ہر شخص مسابقت کی کوشش کرتا تھا۔ آپؐ کو حق تعالےٰ نے ایسی فطرت عطا فرمائی تھی کہ ان چیزوں سے بھی دلچسپی نہ لی کبھی کوئی شعر یا قصیدہ نہ لکھا، نہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہوئے۔

ہاں اُمّی محض ہونے کے ساتھ بچپن ہی سے آپؐ کی شرافت نفس، اخلاقِ فاضلہ

فہم و فراست کے غیر معمولی آثار، دیانت و امانت کے اعلیٰ ترین شاہکار، آپؐ کی ذاتِ مقدس میں ہر وقت مشاہدہ کئے جاسکتے تھے، جس کا نتیجہ تھا کہ عرب کے بڑے بڑے مغرور و متکبر سردار آپؐ کی تعظیم کرتے تھے اور سارے مکہ میں آپؐ کو امین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

یہ اُمّی محض چالیس سال تک مکہ میں اپنی برادری کے سامنے رہتے ہیں کسی دوسرے مُلک کا سفر بھی نہیں کرتے جس سے یہ خیال پیدا ہوسکے کہ وہاں جاکر علوم حاصل کئے ہوں گے۔ صرف مُلکِ شام کے دو تجارتی سفر ہوئے وہ بھی گِنے چُنے چند دن کے لئے جس میں اُس کا کوئی امکان نہیں۔ اس امّی محض کی ذاتِ مقدس کی زندگی کے چالیس سال مکہ میں اپنی برادری میں اس طرح گزرے کہ نہ کبھی کسی کتاب یا قلم کو ہاتھ لگایا، نہ کسی مکتب میں گئے، نہ کسی مجلس میں کوئی نظم و قصیدہ ہی پڑھا۔ ٹھیک چالیس سال کے بعد اُن کی زبان مبارک پر وہ کلام آنے لگا جس کا نام قرآن ہے جو اپنی لفظی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور معنوی علوم و فنون کے لحاظ سے محیر العقول کلام ہے۔ اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو بھی اس کے معجزہ ہونے میں کسی انصاف پسند کو کیا شبہ رہ سکتا ہے؟ مگر یہاں ہی نہیں بلکہ اُس نے ساری دُنیا کو تحدّی کی، چیلنج دیا کہ کسی کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شُبہ ہو تو اس کا مثل بنالائے۔

اب ایک طرف قرآن کی یہ تحدّی اور چیلنج اور دوسری طرف ساری دُنیا کی مخالف طاقتیں جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو شکست دینے کے لئے اپنی مال، جان، اولاد، آبرو سب گنوانے کو تیار ہیں۔ مگر اتنا کام کرنے کے لئے کوئی جرأت نہیں کرتا کہ قرآن کی ایک چھوٹی سی سُورت بنالائے۔ فرض کر لیجئے کہ یہ کتاب بے مثل و بے نظیر بھی نہ ہوتی، جب بھی ایک محض اُمّی کی زبان سے اس کا ظہور اعجازِ قرآن اور وجوہِ اعجاز کی تفصیل میں جائے بغیر قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے لئے کم نہیں جس کو ہر عالم و جاہل سمجھ سکتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۱ ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۷)

نبی کریمؐ کا اُمّی ہونا آپؐ کی بڑی فضیلت اور بڑا معجزہ ہے

حق تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر جس طرح بہت سے واضح اور کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرمائے ان ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؐ کو پہلے سے اُمّی رکھا، نہ کچھ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے نہ خود لکھ سکتے تھے اور عمر کے چالیس سال اسی حال میں تمام اہلِ مکّہ کے سامنے گزرے۔ آپؐ کا اختلاط اہلِ کتاب سے بھی کبھی نہیں ہوا کہ اُن سے کچھ سُن لیتے۔ کیونکہ مکّہ میں اہلِ کتاب تھے ہی نہیں۔ چالیس سال ہونے پر یکایک آپؐ کی زبانِ مبارک سے ایسا کلام جاری ہونے لگا جو اپنے مضامین اور معانی کے اعتبار سے بھی معجزہ تھا اور لفظی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی۔

بعض علماء نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آپؐ کا اُمّی ہونا ابتداء میں تھا پھر اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو پڑھنا لکھنا سکھا دیا تھا اور اس کی دلیل میں واقعہ حدیبیہ کی ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ جس میں یہ ہے کہ جب معاہدۂ صُلح لکھا گیا تو اس میں من محمد بن عبد اللہ و رسولہ اوّل لکھا تھا۔ اس پر مشرکینِ مکّہ نے اعتراض کیا کہ ہم آپؐ کو رسول مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا۔ اس لئے آپ کے نام کے ساتھ "رسول اللہ" کا لفظ ہم قبول نہیں کریں گے۔ لکھنے والے حضرت علی المرتضیٰؓ تھے۔ آپؐ نے ان کو فرمایا کہ یہ لفظ مٹا دو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے ادب سے مجبور ہو کر ایسا کرنے سے انکار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ لفظ مٹا کر یہ لکھ دیا من محمد بن عبد اللہ۔ اس روایت میں لکھنے کی نسبت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے جس سے کچھ حضرات نے استدلال کیا ہے کہ آپؐ لکھنا جانتے تھے۔ مگر صحیح بات یہی ہے کہ کسی دوسرے سے لکھوانے کو بھی عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ "اس نے لکھا" جیسا کہ محاورات میں عام ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس واقعہ میں بطورِ معجزہ آپؐ سے نام مبارک بھی اللہ نے لکھوایا۔ اس کے علاوہ صرف اپنے نام کے چند حروف لکھ دینے سے کوئی آدمی لکھا پڑھا نہیں کہلا سکتا اس

کو ان پڑھ اور اُمّی ہی کہا جائے گا۔ جب لکھنے کی عادت نہ ہو اور بلا دلیل کتابت کا آپؐ کی طرف منسوب کرنا آپؐ کی فضیلت کا اثبات نہیں۔ غور کریں تو آپؐ کی بڑی فضیلت اُمّی ہونے میں ہے۔ (معارف القرآن ج ۶ ص ۷۱۲، ص ۷۱۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتابت کی تعلیم نہ دینے کا راز

حق تعالےٰ جلّ شانہٗ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو لوگوں کے فکر و قیاس سے بالاتر بنانے کے لئے آپؐ کی جائے پیدائش سے لے کر آپؐ کے ذاتی حالات تک سب ایسے بنائے تھے کہ جن میں کوئی انسان اپنی ذاتی کوشش و محنت سے کوئی کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ جائے پیدائش کے لئے عرب کا صحرا تجویز ہُوا جو متمدّن دُنیا اور علم و حکمت کے گہواروں سے بالکل کٹا ہُوا تھا اور راستے اور مواصلات اتنے دشوار گزار تھے کہ شام و عراق اور مصر وغیرہ کے متمدّن شہروں سے یہاں کے لوگوں کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ اسی لئے عرب سب کے سب ہی اُمیّین کہلاتے ہیں۔ ایسے ملک اور ایسے قبائل میں آپؐ پیدا ہُوئے اور پھر حق تعالےٰ نے ایسے سامان کئے کہ عرب کے لوگوں میں جو خال خال کوئی علم و حکمت اور خط و کتابت سیکھ لیتا تھا۔ آپؐ کو اس کے سیکھنے کا بھی موقع نہ دیا گیا۔ ان حالات میں پیدا ہونے والے انسان سے علم و حکمت اور اخلاق فاضلہ عالیہ کا کس کو تصوّر ہو سکتا ہے۔ اچانک حق تعالےٰ نے خلعتِ نبوّت سے نوازا اور علم و حکمت کا غیر منقطع سلسلہ آپؐ کی زبان مبارک پر جاری فرما دیا۔ فصاحت و بلاغت میں عرب کے بڑے بڑے شعراء و بلغاء آپؐ کے سامنے عاجز ہو گئے۔

یہ ایک ایسا کھلا ہُوا معجزہ تھا کہ ہر آنکھوں والا اس کو دیکھ کر یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپؐ کے کمالاتِ انسانی سعی و عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیبی عطیات ہیں خط و کتابت کی تعلیم نہ دینے میں بھی یہی حکمت تھی۔ (ماخوذ از قرطبی)

(معارف القرآن ج ۸ ص ۴۸۶)

آپ کا سفرِ شام

جب آپ کی عمر شریف بارہ برس دو مہینہ کی ہوئی تو ابوطالب نے تجارت کے لئے ملک شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلّم کو ساتھ لے کر شام کی طرف چلے۔ راستہ میں مقامِ تیما میں اقامت فرمائی۔

آپ کے متعلق یہود کے ایک بڑے عالم کی پیشین گوئی

آپ مقامِ تیما میں مقیم تھے کہ اتفاقاً یہود کے ایک بڑے عالم جن کو بحیرا راہب کہا جاتا تھا آپ کے پاس سے گزرے۔ آپ کو دیکھ کر ابوطالب سے خطاب کیا کہ یہ لڑکا جو آپ کے ساتھ ہے کون ہے؟ ابوطالب نے کہا میرا بھتیجا ہے۔ بحیرا نے کہا کیا آپ اس پر مہربان ہیں اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں؟ ابوطالب نے کہا "بے شک" یہ سُن کر بحیرا راہب نے قسم کھائی اور کہا کہ تم اگر اس کو شام لے گئے تو اس کو یہود قتل کر ڈالیں گے۔ کیونکہ یہ خدا کا نبی ہے جو یہود کے دین کو منسوخ کرے گا میں اس کی صفات اپنی آسمانی کتاب میں پاتا ہوں۔

فائدہ بحیرا راہب چونکہ تورات کا عالم تھا اور تورات میں آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلّم کا پورا حلیہ مذکور تھا اس لئے اس نے دیکھ کر آپ کو پہچان لیا کہ وہی خاتم الانبیاء ہیں جو تورات کو منسوخ اور احبار یہود کی حکومت کا خاتمہ کریں گے۔ ابوطالب کو بحیرا کے کہنے سے خطرہ پیدا ہوا اور آنحضرت کو مکہ واپس کر دیا۔

(مغلطائی ص۱۰) ، (سیرت ص۳۱ ، ص۳۲)

دوبارہ سفرِ شام بغرضِ تجارت

مکہ معظمہ میں خدیجہؓ اس وقت ایک مالدار عورت تھیں اور ساتھ ہی نہایت

عقلمند اور تجربہ کار۔ جن لوگوں کو ہوشیار اور معتبر سمجھتیں ان کو اپنا مال سپرد کر دیتیں کہ فلاں جگہ جا کر فروخت کر آؤ، اس قدر تم کو دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اگرچہ اس وقت تک ظہور نہ تھا لیکن آپؐ کی دیانت و امانت کا تمام مکہ والوں میں بڑا شہرہ تھا اور ہر ایک کو آپؐ کے برگزیدہ اور پاک اخلاق کا اعتبار تھا۔ آپؐ امین کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ شہرت اور بزرگی خدیجہؓ پر پوشیدہ نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ اپنی تجارت کو آپؐ کے سپرد کر کے آپؐ کی دیانت داری سے نفع اٹھائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلا بھیجا کہ اگر ہماری تجارت کا مال شام کو لے جائیں تو ہم اپنا ایک غلام آپؐ کی خدمت کے لئے ہمراہ کر دیں اور دوسرے لوگوں کو نفع میں سے جو حصہ دیا جاتا ہے اس سے زیادہ آپؐ کی خدمت کریں۔ آپؐ کی ذات مبارک چونکہ بلند ہمت اور وسیع الخیال ہستی واقع ہوئی تھی فوراً اس بعید سفر کے لئے تیار ہو گئے اور خدیجہؓ کے غلام میسرہ کو ساتھ لے کر ۱۶ ذی الحجہ کو شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں اس مال کو نہایت عقلمندی سے بہت زیادہ نفع کے ساتھ فروخت کر دیا اور شام سے دوسرا مال خرید کر واپس ہوئے۔ مکہ معظمہ میں لا کر دوسرا کو مال سپرد کر دیا۔ اس کو خدیجہؓ نے یہاں بیچا تو دو چند کے قریب نفع ہوا۔

شام کے راستہ میں جب آپؐ ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے، ایک راہب نسطورا نامی نے آپؐ کو دیکھا اور نبی آخر الزمان کی جو علامتیں پہلی کتابوں میں لکھی تھیں آپؐ میں دیکھ کر پہچان گیا۔ راہب میسرہ کو جانتا تھا۔ اس سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ کون شخص ہے؟ اس نے کہا کہ مکہ معظمہ کے رہنے والے ہیں۔ قریش کے ایک شریف جوان ہیں۔ اس نے کہا۔ یہ نبی ہوں گے۔

(از مغلطائی ص ۱۲ و الصالحات) سیرت ص ۲۳، ص ۳۹۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا ایک عقلمند فہمیدہ عورت تھی۔ آپ کی شرافت اور محیر العقول اخلاق کو دیکھ کر اُن کو ایک سچا اعتقاد اور خاص اُنس ہو گیا جس سے خدیجہؓ نے خود ارادہ کیا کہ اگر آپؐ منظور فرمادیں تو آپؐ ہی سے نکاح کرلیں۔ جب آنحضرتؐ کی عمر اکیس[1] سال کی ہوئی تو حضرت خدیجہؓ سے نکاح مقرر ہوا۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر اس وقت چالیس سال اور بعض روایات کی رُو سے پینتالیس سال تھی (مغلطائی)۔ نکاح میں ابو طالب اور بنو ہاشم اور روسائے مضر سب جمع ہوئے۔ ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ اس خُطبہ میں ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے متعلق جو الفاظ کہے ہیں وہ سُننے کے قابل ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ محمدؐ بن عبد اللہ ہیں جو اگرچہ مال میں کم ہیں لیکن شریفانہ اخلاق و کمالات کی وجہ سے جس شخص کو آپؐ کے مقابلہ میں رکھا جائے۔ آپؐ اس سے زیادہ عالی مرتبت نکلیں گے۔ کیونکہ مال ایک زائل ہوجانے والا سایہ اور لوٹنے والی چیز ہے اور یہ محمدؐ جن کی قرابت کو تم سب جانتے ہو، خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کرنا چاہتے ہیں اور اُن کا کل مہر معجل اور مؤجل میرے مال سے ہے اور خدا کی قسم اس کے بعد اُن کی بڑی عزت اور عظمت ہونے والی ہے"۔

ابو طالب کے یہ الفاظ آپؐ کی شان میں اُس وقت ہیں جب کہ آپؐ کی عمر اکیسویں سال میں ہے اور ابھی ظاہری طور سے نبوت بھی عطا نہیں ہوئی۔ پھر اس پر یہ طرّہ کہ ابو طالب اپنے اسی قدیمی مذہب پر ہیں جس کو مٹانے کیلئے آنحضرتؐ کی تمام

---

[1] اس وقت عمر شریف کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ۲۱ یا ۲۹ یا ۳۰ یا ۲۷۔ (سیرت مغلطائی صد ۱۲) ؛

زندگی وقف ہے مگر بات یہ ہے کہ حق بات چھپائی نہیں جاسکتی۔

الغرض حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کا نکاح ہوگیا۔ وہ آپؐ کی خدمت میں چوبیس سال رہیں۔ کچھ مدت نزولِ وحی سے پہلے اور کچھ مدت نزولِ وحی کے بعد۔

(سیرت ص۳۴، ص۳۵)

آپؐ کی اولاد حضرت خدیجہؓ سے

حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی چار صاحبزادیاں اور دو فرزند پیدا ہوئے۔ فرزندِ ارجمند قاسمؓ اور طاہرؓ تھے۔ قاسمؓ کے نام ہی سے آپؐ کی کنیت "ابوالقاسم" مشہور ہے اور طاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کا نام عبداللہ[1] تھا۔ چار صاحبزادیوں حضرت فاطمہؓ، زینبؓ، رقیہؓ اور اُمِ کلثومؓ تھیں۔ حضرت زینبؓ[2] آپؐ کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ رضی اللہ عنہن وعنا اجمعین۔

یہ سب اولاد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے تھی۔ البتہ آپؐ کے تیسرے صاحبزادے جن کا نام ابراہیمؓ تھا، صرف وہ ماریہ قبطیہ سے تھے۔ آپؐ کے یہ تینوں فرزند بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ البتہ حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ سواری پر سوار ہو جائیں۔

(سیرت ص۳۶)

---

[1] زادالمعاد میں ہے کہ آپؐ کا اصلی نام عبداللہ تھا اور طیّب و طاہر دونوں آپ کے لقب تھے۔

[2] حافظ ابن قیم نے اس میں مختلف اقوال لکھے ہیں۔ بعض حضرات زینبؓ کو اور بعض رقیہؓ کو اور بعض اُمِ کلثوم کو سب سے بڑی کہتے ہیں اور حضرت ابن عباسؓ سے یہ مروی ہے کہ رقیہ سب سے بڑی تھیں اور ام کلثوم سب سے چھوٹی۔ (زادالمعاد ج۱ ص۲۵)

آپؐ کی چاروں صاحبزادیاں

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا باجماعِ اُمت تمام صاحبزادیوں سے افضل تھیں، نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔ ان کا نکاح پندرہ برس ساڑھے پانچ ماہ کی عمر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہُوا۔ چار سو اسّی درہم مہر مقرر کیا گیا۔

اس سیدۃ النساء کا جہیز کیا تھا ایک چادر، ایک تکیہ جس میں کھجور کے درخت کا گُودا بھرا ہُوا تھا۔ ایک چمڑے کا گدا، ایک بان کی چارپائی، ایک چھاگل، دو مٹی کے گھڑے، دو مشکیزے اور ایک چکی (طبقات ابن سعد وغیرہ)

چکی پیسنا اور گھر کے سب کاروبار خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ دونوں جہان کے سردار کی سب سے لاڈلی صاحبزادی کا نکاح جہیز اور مہر یہ ہے اور اُن کی فقیرانہ زندگی کا نقشہ یہ ہے۔ کیا اس کو دیکھ کر بھی وہ عورتیں نہ شرمائیں گی جو بیاہ شادی کی رسموں میں دین و دنیا کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔

اس میں خداوند تعالےٰ کی کوئی بڑی حکمت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسری اولاد زندہ نہ رہی۔ صرف دختری اولاد سے آپؐ کی نسل دُنیا میں پھیلی۔ لیکن بیٹیوں میں بھی صرف حضرت فاطمہؓ کی اولاد باقی رہی ہے۔ دوسری صاحبزادیوں میں بعض کے اولاد ہی نہیں ہوئی بعض کی زندہ نہ رہی۔

حضرت زینبؓ کا نکاح ابوالعاص ابن الربیع سے ہُوا۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہُوا جو تھوڑی عمر میں انتقال کر گیا اور ایک لڑکی امامہ پیدا ہُوئیں۔ ان سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہؓ کے بعد نکاح کیا لیکن ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت رقیہؓ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے نکاح میں آئیں اور حضرت حبشہ میں آپ کے ساتھ رہیں۔ ۲ھ میں غزوۂ بدر سے واپسی کے وقت لاولد دُنیا سے رخصت ہوگئیں۔

ان کے بعد ۳ھ میں ان کی دوسری بہن ام کلثوم رضؓ کا نکاح بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی سے کر دیا اور اسی وجہ سے حضرت عثمان رضؓ کا لقب ذی النورین ہوا۔ ۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میرے پاس کوئی تیسری لڑکی اور ہوتی تو اس کو بھی اُن کے نکاح میں دے دیتا۔

(سیرت مغلطائی صـ۱۶، صـ۱۷)

عورتیں یاد رکھیں! سیرت کی معتبر روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رقیہ رضی اللہ تعالے عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرنے آئیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے پسند نہیں کہ عورت اپنے خاوند کی شکایت کیا کرے، جاؤ اپنے گھر بیٹھو۔"

یہ ہے لڑکیوں کی وہ تعلیم جس سے اُن کی حیات دُنیا و آخرت دونوں درست ہو سکتی ہیں۔ (اوجز السیر لابن الفارس) سیرت صـ۳۷، صـ۳۸۔

باقی ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالے عنہن

حضور انور صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالے عنہا کی حیات میں کسی عورت سے نکاح نہیں کیا۔ ہجرت سے تین سال پہلے جب اُن کی وفات ہو گئی اور آپؐ کی عمر ۴۹ برس میں پہنچی تو اور خواتین بھی اُن کے نکاح میں آئیں۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

(۱) سودہ رضؓ بنت زمعہ، (۲) عائشہ رضؓ (۳) حفصہ رضؓ (۴) زینب بنت خزیمہ (۵) اُمِ سلمہ رضؓ (۶) زینب رضؓ بنت جحش (۷) جویریہ رضؓ (۸) ام حبیبہ رضؓ (۹) صفیہ رضؓ (۱۰) میمونہ رضؓ یہ گیارہ[1] ہیں جن میں دو سامنے وفات پا گئیں اور نو آپؐ کی وفات کے وقت

---

[1] حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالے عنہا کو شامل کر کے۔ احقر قریشی غفرلہٗ

زندہ تھیں اور یہ بہ اجماعِ اُمت صرف آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی۔ اُمت کے لئے چار سے زائد عورتیں ایک وقت میں بصورت نکاح جمع کرنا جائز نہیں اور اس خصوصیت کی بعض وجوہ آگے آتی ہیں۔

حضرت سودہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ پہلے سکران بن عمرو کے نکاح میں تھیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، چھ سال کی عمر میں تھیں جب آپؐ سے اُن کا نکاح ہوا اور ہجرت کے سال نو برس کی عمر میں رخصتی ہوئی اور جب آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تو آپؓ کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نو سالہ مصاحبت سے آپؓ پر کیا رنگ چڑھا اور کیا حاصل ہوا۔ اس کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں جب کسی مسئلہ میں شک ہوتا تھا تو عائشہ صدیقہؓ کے پاس اس کا علم پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اجلّہ صحابہؓ آپؓ کے شاگرد ہیں۔

قصّہ افک و بہتان

۶ھ میں بعض منافقین نے اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر ایسی تہمت گھڑی تھی اور تقلیداً بعض مسلمان بھی اس کا تذکرہ کرنے لگے تھے۔ یہ معاملہ عام مسلمان پاک دامن عورتوں کے معاملہ سے کہیں اشدّ تھا۔ اس لئے قرآن کریم حضرت صدیقہ عائشہؓ کی برأت اور پاکی کے بیان میں اللہ تعالےٰ نے سورۃ النور (آیت ۱۱ تا ۲۲) کی دس آیتیں نازل فرمائیں۔ جن میں حضرت صدیقہؓ کی برأت و نزاہت کا اعلان اور اُن کے معاملہ میں جن لوگوں نے افتراء و بہتان میں کسی طرح کا حصّہ لیا تھا ان سب کو تنبیہ اور دُنیا و آخرت میں اُن کے وبال کا بیان ہے۔ یہ بہتان بندی کا واقعہ قرآن و حدیث میں واقعہ افک کے نام سے مشہور ہے۔

افک کہتے ہیں بدترین قسم کے جھوٹ و افتراء و بہتان کو۔ صحیحین اور دوسری

کتب حدیث میں یہ واقعہ غیر معمولی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم غزوہ بنی المصطلق میں جس کو غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے ۶ھ میں تشریف لے گئے تو امہات المؤمنین میں سے حضرت صدیقہ عائشہؓ ساتھ تھیں۔ حضرت عائشہؓ کا اونٹ جس پر اُن کا ہودج (پردہ دار شغدف) ہوتا تھا اور چونکہ اس وقت احکام پردہ کے نازل ہو چکے تھے تو معمول یہ تھا کہ صدیقہ عائشہؓ اپنے ہودج میں سوار ہو جائیں پھر لوگ اس ہودج کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ غزوہ سے فراغت اور مدینہ منورہ کی طرف واپسی میں ایک روز یہ قصہ پیش آیا کہ ایک منزل میں قافلہ ٹھہرا۔ آخر شب میں کوچ سے کچھ پہلے اعلان کیا گیا کہ قافلہ روانہ ہونے والا ہے تاکہ لوگ اپنی اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر تیار ہو جائیں۔ حضرت صدیقہ عائشہؓ کو قضاء حاجت کی ضرورت تھی۔ اس سے فراغت کے لئے جنگل کی طرف چلی گئیں وہاں اتفاق سے اُن کا ہار ٹوٹ گیا۔ اس کی تلاش میں اُن کو دیر لگ گئی۔ جب واپس اپنی جگہ پہنچیں تو دیکھا کہ قافلہ روانہ ہو چکا ہے (ادھر) ان کے اونٹ کا قصہ یہ ہوا کہ جب کوچ ہونے لگا تو عادت کے مطابق حضرت صدیقہ عائشہؓ کا ہودج یہ سمجھ کر اونٹ پر سوار کر دیا گیا کہ حضرت صدیقہؓ اس میں موجود ہیں۔ اُٹھاتے وقت بھی کچھ شبہ اس لئے نہ ہوا کہ اس وقت حضرت صدیقہؓ کم عمر اور بدن میں نحیف تھیں، کسی کو یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہودج خالی ہے چنانچہ اونٹ کو ہانک دیا گیا۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالٰی عنہا نے اپنی جگہ واپس آکر قافلہ کو نہ پایا تو بڑی ہی دانشمندی اور وقار و استقلال سے کام لیا کہ قافلے کے پیچھے دوڑنے یا ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بجائے اپنی جگہ چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور خیال کیا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور رفقاء کو یہ معلوم ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو مجھے تلاش کرنے کے لئے یہاں پہنچیں گے۔ اگر میں اِدھر اُدھر کہیں اور گئی تو اُن کو تلاش میں مشکل ہوگی۔ اس لئے اپنی جگہ پر چادر میں لپٹ کر بیٹھ رہیں۔ آخر رات کا وقت تھا، نیند کا غلبہ ہوا وہیں لیٹ کر آنکھ لگ گئی۔

دوسری طرف قدرت نے یہ سامان کیا کہ حضرت صفوان بن معطل صحابیؓ نے جن کو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اسی خدمت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ قافلہ کے پیچھے رہیں اور قافلہ روانہ ہونے کے بعد گری پڑی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اس کو اٹھا کر محفوظ کرلیں۔ وہ صبح کے وقت اس جگہ پہنچے۔ ابھی روشنی پوری نہ تھی، اتنا دیکھا کہ کوئی آدمی پڑا سو رہا ہے۔ قریب آئے تو حضرت صدیقہ عائشہؓ کو پہچان لیا کیونکہ انہوں نے پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے ان کو دیکھا تھا۔ پہچاننے کے بعد انتہائی افسوس کے ساتھ ان کی زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ نکلا۔ یہ کلمہ صدیقہؓ کے کان میں پڑا تو آنکھ کھل گئی اور چہرہ ڈھانپ لیا۔ حضرت صفوانؓ نے اپنا اونٹ قریب لاکر بٹھا دیا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا اس پر سوار ہو گئیں اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلنے لگے۔ یہاں تک کہ قافلہ میں مل گئے۔ عبداللہ ابن اُبی بڑا خبیث منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا۔ اس کو ایک بات ہاتھ لگ گئی اور کم بخت نے واہی تباہی بکنا شروع کیا اور بعض بھولے بھالے مسلمان بھی سُنی سُنائی اس کا تذکرہ کرنے لگے، جیسے حضرت حسان، حضرت مسطح مردوں میں سے اور حضرت حمنہ عورتوں میں سے۔ تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن مردویہ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اعانہ علیہ عبداللہ ابن اُبی حسان ومسطح وحمنہ۔

جب اس منافق کے بہتان کا چرچا ہوا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ صدیقہ عائشہؓ کو تو انتہائی صدمہ پہنچا۔ ظاہر ہے عام مسلمانوں کو بھی اس سے سخت رنج و افسوس ہوا۔ ایک مہینہ تک یہی قصہ چلتا رہا۔ آخر اللہ تعالےٰ نے حضرت صدیقہؓ کی برأت اور بہتان باندھنے یا اس میں شریک ہونے والوں کی مذمت میں مذکورہ بالا آیات نازل فرمادیں جن کی تفسیر آگے آتی ہے۔

قرآنی ضابطہ کے مطابق جس کا ذکر ابھی حدِ قذف میں آچکا ہے تہمت لگانے والوں سے شہادت کا مطالبہ کیا گیا تو وہ ایک بالکل ہی بے بنیاد خبر تھی، گواہ کہاں سے آتے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تہمت لگانے والوں پر شرعی ضابطہ

کے مطابق حدِ قذف جاری کی، ہر ایک کو اسّی کوڑے لگائے۔

بزار اور ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تین مسلمانوں پر حدِ قذف جاری فرمائی۔ مسطح، حمنہ، حسّان اور طبرانی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس موقع پر عبداللہ بن ابی منافق جس نے اصل تہمت گھڑی تھی اس پر دوہری حد جاری فرمائی۔ پھر مومنین نے توبہ کر لی اور منافقین اپنے حال پر قائم رہے۔

(بیان القرآن) تفسیر معارف القرآن ج ۶ ص ۳۶۴ تا ص ۳۱۶)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خصوصی فضائل اور کمالات اور قصّۂ افک کا بقیہ حصّہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دشمنوں نے آپؐ کے خلاف اپنی ساری ہی تدبیریں صرف کر ڈالیں اور آپؐ کو ایذا پہنچانے کے لئے جو جو صورتیں کسی کے ذہن میں آسکتی تھیں وہ سب جمع کی گئیں۔ کفّار کی طرف سے جو ایذائیں آپؐ کو پہنچی ہیں ان میں سے شاید یہ آخری سخت اور روحانی ایذا تھی کہ ازواج مطہراتؓ میں سب سے زیادہ عالم و فاضل اور مقدّس ترین اُمّ المؤمنین صدیقہ عائشہؓ پر اور ان کے ساتھ حضرت صفوان بن معطل جیسے مقدّس صحابی پر عبداللہ بن ابی منافق نے تہمت گھڑی۔ منافقین نے اس کو رنگ دیئے اور پھیلایا اس میں سب سے زیادہ رنج دہ یہ بات ہوئی کہ چند سیدھے سادے مسلمان بھی ان کی سازش سے متأثر ہو کر تہمت کے تذکرے کرنے لگے۔ اس بے اصل و بے دلیل ہوائی تہمت کی چند روز میں خود ہی حقیقت کھل جاتی۔ مگر اُمّ المؤمنین کو اور خود رسول اللہ صلعم کو جو اس تُہمت سے روحانی ایذا پہنچی تھی، حق تعالےٰ نے اُس کے ازالہ اور صدیقہؓ کی برأت کے لئے وحی الٰہی کے کسی اشارہ پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قرآن کے تقریباً دو رکوع ان کی برأت میں نازل فرمائے اور جن لوگوں نے یہ تہمت گھڑی یا جن لوگوں نے اُس کے تذکرے میں حصّہ لیا ان سب پر عذابِ دُنیا و آخرت کی ایسی وعیدیں بیان فرمائیں کہ شاید اور کسی موقع پر ایسی وعیدیں آئیں نہ ہوں۔ درحقیقت اس واقعہ افک نے

حضرت صدیقہ عائشہؓ کی عفت و تقدیس کے ساتھ اُن کے اعلیٰ عقل و فہم کے کمالات کو بھی روشن کر دیا۔ اسی لئے اس واقعہ میں جو آیات اُوپر مذکور ہوئیں ان میں سے پہلی آیت میں حق تعالے نے فرمایا ہے کہ اس حادثہ کو اپنے لئے شر نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے خیر ہے۔ اس سے بڑی خیر کیا ہو گی کہ اللہ تعالے نے دس آیات میں اُن کی پاکی اور نزاہت کی شہادت دی جو قیامت تک تلاوت کی جائے گی۔ خود صدیقہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے اپنی جگہ تو یہ یقین تھا کہ اللہ تعالے بذریعہ وحی رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم پر میری صفائی اور برأت ظاہر فرما دیں گے۔ مگر میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے معاملہ میں قرآن کی آیات نازل ہو جائیں گی جو ہمیشہ پڑھی جائیں گی۔ اس جگہ واقعہ کی کچھ مزید تفصیل جان لینا بھی آیات کے سمجھنے میں معین ہو گا اس لئے اس کو مختصراً لکھا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد حضرت صدیقہؓ اپنے گھریلو کاموں میں مشغول ہو گئیں۔ ان کو کچھ خبر نہ تھی کہ منافقین نے اُن کے بارے میں کیا خبریں اڑائی ہیں۔ صحیح بخاری کی روایت میں خود حضرت صدیقہؓ کا بیان یہ ہے کہ سفر سے واپسی کے بعد کچھ میری طبیعت خراب ہو گئی اور سب سے بڑی وجہ طبیعت خراب ہونے کی یہ ہو گئی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم اپنے ساتھ نہ دیکھتی تھی جو ہمیشہ سے معمول تھا، بلکہ اس عرصہ میں آپؐ کا معاملہ یہ رہا کہ گھر میں تشریف لاتے اور سلام کرتے پھر پوچھ لیتے کیا حال ہے؟ اور واپس تشریف لے جاتے تھے۔ مجھے چونکہ اس کی کچھ خبر نہ تھی کہ میرے بارے میں کیا خبر مشہور کی جا رہی ہے، اس لئے رسول اللہ ص کے اس طرزِ عمل کا راز مجھ پر نہ کھلتا تھا۔ میں اسی غم میں گھلنے لگی۔

ایک روز اپنی کمزوری کی وجہ سے اُم مسطح کو ساتھ لے کر میں نے قضاء حاجت کے لئے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ اس وقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا۔ جب میں قضاء حاجت سے فارغ ہو کر گھر کی طرف آنے لگی تو اُم مسطح کا پاؤں ان کی بڑی چادر میں اُلجھا اور یہ گر پڑیں۔ اس وقت اُن کی زبان سے یہ کلمہ

تَعِسَ مسطح - یہ ایسا کلمہ ہے جو عرب میں بددعا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ماں کی زبان سے اپنے بیٹے مسطح کے لئے بددعا کا کلمہ سن کر صدیقہ عائشہؓ کو تعجب ہوا۔ ان سے فرمایا کہ یہ بہت بُری بات ہے، تم ایک نیک آدمی کو بُرا کہتی ہو جو غزوۂ بدر کا شریک تھا یعنی اُن کا بیٹا مسطح۔ اس پر امِ مسطح نے تعجب سے کہا کہ بیٹی تم کو خبر نہیں کہ مسطح میرا بیٹا کیا کہتا پھرتا ہے؟ میں نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ تب ان کی والدہ نے مجھے یہ سارا واقعہ اصل اُنکی چلائی ہوئی تہمت کا اور مسطح کا اس میں شریک ہونا بیان کیا۔

صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سُن کر میرا مرض دوگنا ہوگیا۔ جب میں گھر میں واپس آئی اور حسبِ معمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ سلام کیا اور مزاج پرسی فرمائی تو صدیقہؓ نے آنحضرتؐ سے اجازت طلب کی کہ اپنے والدین کے گھر چلی جاؤں۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔ منشاء یہ تھا کہ والدین سے ان معاملہ کی تحقیق کروں۔ میں نے جا کر والدہ سے پوچھا۔ انہوں نے تسلی دی کہ تم جیسی عورتوں کے دشمن ہوا کرتے ہیں اور ایسی چیزیں مشہور کیا کرتے ہیں، تم اس کے غم میں نہ پڑو، خود بخود معاملہ صاف ہوجائے گا۔ میں نے کہا سبحان اللہ! لوگوں میں اس کا چرچا ہوچکا۔ میں اس پر کیسے صبر کروں۔ میں ساری رات روتی رہی، نہ میرے آنسو تھمے نہ آنکھ لگی۔

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس خبر کے پھیلنے سے سخت غمگین تھے اور اس عرصہ میں اس معاملے کے متعلق کوئی وحی بھی آپؐ پر نہ آئی تھی۔ اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اسامہ بن زید جو دونوں گھر کے ہی آدمی تھے ان سے مشورہ لیا کہ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے تو کھل کر عرض کیا کہ جہاں تک ہمارا علم ہے ہمیں حضرت عائشہؓ کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں، ان کی کوئی بات ایسی نہیں جس سے بدگمانی کی راہ پیدا ہو۔ آپؐ ان افواہوں کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے (آپؐ کو غم و اضطراب سے بچانے کے لئے) یہ مشورہ دیا کہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ پر کچھ تنگی نہیں فرمائی۔ اگر افواہوں کی بناء پر عائشہؓ کی طرف سے

کچھ تکدرِ طبعی ہوگیا ہے تو عورتیں اور بہت ہیں اور آپؐ کا یہ تکدر اس طرح بھی رفع ہو سکتا ہے کہ بریرہؓ سے جو صدیقہ عائشہؓ کی کنیز ہیں ان سے اُن کے حالات میں تحقیق فرمالیجئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے پوچھ گچھ فرمائی۔

بریرہؓ نے عرض کیا اور تو کوئی بات عیب کی مجھے اُن میں نظر نہیں آتی بجز اس کے کہ نو عمر لڑکی ہیں۔ بعض اوقات آٹا گوندھ کر رکھ دیتی ہیں، خود سو جاتی ہیں بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے۔ (اس کے بعد حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا خطبہ دینا اور افواہ پھیلانے والوں کی شکایت کا ذکر فرمانا اور طویل قصہ مذکور ہے، آگے کا مختصر قصہ یہ ہے)۔

صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ سارا دن اور پھر دوسری رات بھی مسلسل روتے ہُوئے گزری۔ میرے والدین بھی میرے پاس آگئے تھے۔ وہ ڈر رہے تھے کہ رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہُوئے تھے کہ رسول اللہ صلعم تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھ گئے اور جب سے یہ قصہ چلا تھا اس سے پہلے آپؐ میرے پاس آکر نہ بیٹھے تھے۔ پھر آپؐ نے ایک مختصر خطبۂ شہادت پڑھا اور فرمایا "اے عائشہ! مجھے تمہارے بارے میں یہ باتیں پہنچی ہیں۔ اگر تم بری ہو تو ضرور اللہ تعالیٰ تمہیں بری کردیں گے (یعنی برأت کا اظہار بذریعہ وحی فرمادیں گے) اور اگر تم سے کوئی لغزش ہوگئی ہے تو اللہ تعالےٰ سے توبہ و استغفار کرو کیونکہ بندہ جب اپنے گُناہ کا اعتراف کر کے توبہ کرلیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتے ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کلام پورا فرمالیا تو میرے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ میری آنکھوں میں ایک قطرہ نہ رہا۔ میں نے اپنے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ ابوبکرؓ نے عذر کیا کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ جواب دیجئے۔ انہوں نے بھی عذر کردیا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ اب مجبور ہو کر مجھے ہی بولنا پڑا۔ میں ایک کم عمر لڑکی تھی، اب تک قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھ سکی تھی۔ اس وقت اس رنج و غم اور انتہائی

صدمہ کی حالت میں جب کہ اچھے اچھے عقلاء کو بھی کوئی معقول کلام کرنا آسان نہیں ہوتا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو کچھ فرمایا وہ ایک عجیب و غریب عاقلانہ فاضلانہ کلام ہے۔ اس کے الفاظ بعینہ لکھے جاتے ہیں :۔

"واللہ لقد عرفت لقد سمعتم ھٰذا الحدیث حتی استقر فی انفسکم و صدقتم بہ ولئن قلت لکم انی بریئۃ لا تصدقونی ولئن اعترفت لکم بامر۔ واللہ یعلم انی منہ بریئۃ لتصدقونی، واللہ لا اجد لی ولکم مثلا الا کما قال ابو یوسف فصبر جمیل۔ واللہ المستعان علی ما تصفون"

" بخدا مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ نے اس بات کو سنا اور سنتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے اس کی عملاً تصدیق کر دی۔ اب اگر میں یہ کہتی ہوں کہ میں اس سے بری ہوں جیسا کہ اللہ جانتا ہے کہ واقع میں بری ہوں تو آپ میری تصدیق نہ کریں گے اور اگر میں ایسے کام کا اعتراف کر لوں جس سے میرا بری ہونا اللہ تعالےٰ جانتا ہے تو آپ میری بات مان لیں گے۔ واللہ! اب میں اپنے اور آپ کے معاملہ کی کوئی مثال بجز اس کے نہیں پاتی جو یوسف علیہ السّلام کے والد یعقوب علیہ السّلام نے اپنے بیٹوں کی غلط بات سن کر فرمائی تھی کہ میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے اس معاملے میں مدد کرتا ہوں جو تم بیان کر رہے ہو"

صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اتنی بات کر کے میں الگ بستر پر جا کر لیٹ گئی اور فرمایا کہ مجھے یقین تھا کہ جیسا میں فی الواقع بری ہوں، اللہ تعالےٰ میری برأت کا اظہار بذریعہ وحی ضرور فرمائیں گے۔ لیکن یہ وہم و خیال بھی نہ تھا کہ میرے معاملے میں قرآن کی آیات نازل ہوں گی۔ جو ہمیشہ تلاوت کی جائیں گی۔ کیونکہ میں اپنا مقام اس سے بہت کم محسوس کرتی تھی۔ ہاں یہ خیال تھا کہ غالباً آپ کو خواب میں میری برأت ظاہر کر دی جائے گی۔

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس مجلس سے ابھی نہیں اٹھے تھے اور گھر والوں میں بھی کوئی نہیں اٹھا تھا کہ آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو نزولِ وحی

کے وقت ہُوا کرتی تھی جس سے سخت سردی کے زمانہ میں آپؐ کی پیشانیٔ مبارک سے پسینہ پھوٹنے لگتا تھا۔ جب یہ کیفیت رفع ہُوئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہنستے ہوتے اُٹھے اور سب سے پہلا کلمہ جو فرمایا وہ یہ تھا: البشری عائشہ اما اللہ فقد ابرأ لث یعنی اے عائشہ! خوشخبری سُنو۔ اللہ تعالےٰ نے تو تمہیں بری کر دیا۔ میری والدہ نے کہا کہ کھڑی ہو جاؤ اور آنحضرتؐ کے پاس حاضر ہو۔ مَیں نے کہا کہ نہ مَیں اس معاملہ میں اللہ کے سوا کسی کا احسان مانتی ہو نہ کھڑی ہوں گی، مَیں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ اُسی نے مجھے بری فرمایا۔ (تفسیر معارف القرآن ج ۶ ص ۳۷۳ تا ص ۳۷۷)

حضرت صدیقہؓ کی چند خصوصیات

امام بغوی نے انہی آیات کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ کی چند خصوصیات ایسی ہیں جو اُن کے علاوہ کسی دوسری عورت کو نصیب نہیں ہُوئیں۔ اور صدیقہ عائشہؓ بھی (بطور تحدیث بالنعمت) ان چیزوں کو فخر کے ساتھ بیان فرمایا کرتی تھیں ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نکاح میں آنے سے پہلے جبرائیل امین ایک ریشمی کپڑے میں میری تصویر لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ تمہاری زوجہ ہے (رواہ الترمذی عن عائشہؓ) اور بعض روایات میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام اپنی ہتھیلی میں یہ صُورت لے کر تشریف لائے تھے۔

دوسری یہ کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کے سوا کسی کنواری لڑکی سے نکاح نہیں کیا۔ تیسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات اُن کی گود میں ہوئی تھی۔ چوتھی یہ کہ بیتِ عائشہؓ ہی میں آپ مدفون ہُوتے۔ پانچویں یہ کہ آپؐ پر اس وقت بھی وحی نازل ہوتی تھی جب کہ آپؐ حضرت صدیقہؓ کے ساتھ ایک لحاف میں ہوتے تھے۔ دوسری کسی بی بی کو یہ خصوصیت حاصل نہ تھی۔ چھٹی یہ کہ آسمان سے اُن کی برأت نازل ہُوئی۔ ساتویں یہ کہ وہ خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیٹی ہیں اور صدیقہ ہیں اور ان میں سے ہیں جن سے دُنیا ہی میں مغفرت کا اور رزقِ کریم کا اللہ تعالےٰ نے وعدہ فرمالیا ہے (مظہری)

حضرت صدیقہؓ کی فقیہانہ اور فاضلانہ تقریر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ بن طلحہؓ نے فرمایا۔
میں نے صدیقہ عائشہؓ سے زیادہ کوئی فصیح و بلیغ نہیں دیکھا (رواہ الترمذی) تفسیر قرطبی میں نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی گئی تو اُن کے فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شہادت سے اُن کو بری کیا اور حضرت صدیقہ عائشہؓ پر تہمت لگائی گئی تو اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی دس آیات نازل کر کے ان کی برأت کا اعلان کیا جس نے ان کے فضل و عزت کو اور بڑھا دیا۔
(تفسیر معارف القرآن ج ۶ ص ۳۷۴، ص ۳۷۵)

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ پہلے انیس بن حذافہ کے نکاح میں تھیں۔ ان کے بعد ہجرت سے دوسرے یا تیسرے سال آپؐ سے نکاح ہوا۔ (مغلطائی ص ۴۹)

حضرت زینبؓ بنت خزیمہ ہلالیہ

اُمّ المساکین کے نام سے معروف ہیں۔ پہلے طفیل بن حارث کے نکاح میں تھیں۔ اس نے طلاق دے دی۔ پھر اُن کے بھائی عبیدہؓ سے نکاح ہو گیا۔ جب یہ بھی غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تو ۳ھ میں غزوۂ اُحد سے ایک ماہ پہلے آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔ (سیرت مغلطائی) اور صرف دو ماہ تک نکاح میں رہ کر وفات پا گئیں۔ (نشر الطیب)

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

ابو سفیان کی بیٹی ہیں۔ پہلے عبد اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں اُن سے اولاد بھی ہوئی۔ یہ دونوں مسلمان ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں پہنچ کر عبد اللہ بن جحش نصرانی ہو گیا اور حبیبہ اپنے ایمان پر قائم رہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی شاہ حبشہ کو خط لکھا کہ اُمّ حبیبہ کو آنحضرتؐ کی طرف سے پیغام نکاح دیں۔ چنانچہ نجاشی نے پیغام دیا اور خود ہی نکاح کا کفیل ہوا اور چار سو دینار مہر بھی خود ہی ادا کر دیئے۔

حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

ان کا نام ہندہ ہے۔ پہلے ابو سلمہ کے نکاح میں تھیں جن سے اولاد بھی ہوئی۔ ۴ھ میں اور بعض روایات کے مطابق ۳ھ میں آپ کے نکاح میں آئیں۔ (سیرت مغلطائی صد ۵۵)۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت اُمِ سلمہ نے تمام ازواج مطہرات کے بعد انتقال فرمایا۔

حضرت زینبؓ بنت جحش

آنحضرتؐ کی پھوپھی کی بیٹی ہیں۔ آپؐ نے اُن کا نکاح زید بن حارثہ سے کرنا چاہا تھا جن کو آپؐ نے آزاد کر کے متبنیٰ بنا رکھا تھا۔ مگر چونکہ حضرت زیدؓ پر غلامی کا نام آچکا تھا اس لئے زینب اس عقد کو پسند نہ کرتی تھیں۔ مگر بالآخر حضورؐ کے تعمیلِ ارشاد کے لئے راضی ہوگئیں۔ ایک سال کے قریب زید کے نکاح میں رہیں، مگر چونکہ طبعی موافقت نہ تھی ہمیشہ شکر رنجی رہا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ زیدؓ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے اُن کو سمجھا کر طلاق سے روکا۔ لیکن پھر جب کسی طرح موافقت نہ ہوئی تو جب وہ آزاد ہوگئیں تو آپؐ نے ان کی تسلی اور دل جوئی کے لئے اُن سے نکاح کرنا چاہا لیکن اس وقت عرب کے خیال میں متبنیٰ کو اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپؐ اس نکاح سے رکتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ لیکن چونکہ یہ جاہلیت[1] کی رسم تھی جس کا مٹانا اسلام کا فرض تھا اس لئے آیت نازل ہوئی کہ آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں حالانکہ ڈرنا اللہ تعالےٰ سے چاہیئے (سورہ احزاب

---

[1] اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیالِ باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے۔ کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہے جبکہ اس کا عملی مظاہرہ ہو۔ حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینبؓ کے نکاح سے متعلق ہوا تھا۔ (تفسیر معارف القرآن ج ۷ صد ۱۵۶)

غرض ۴ھ میں اور بعض روایات کے مطابق ۳ھ یا ۵ھ میں خداوندِ عالم کے حکم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اُن سے نکاح کر لیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ لے پالک یعنی متبنیٰ اصلی بیٹے کا حکم نہیں رکھتا۔ اس کی بیوی بعد قطع تعلق کے حرام نہیں ہوتی۔ اور جن لوگوں نے خدا تعالےٰ کے اس حلال کو عقیدۃً یا عملاً حرام کر رکھا ہے وہ آئندہ اس غلطی سے نکل جائیں اور جاہلیت کی یہ رسم ٹوٹ جائے۔ لیکن اس دیرینہ رسم کا ٹوٹنا جب ہی ممکن تھا کہ آنحضرتؐ خود عملاً اس کا نفاذ کریں۔ حضرت زینبؓ کے اس نکاح کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا ہے نہایت صحیح روایاتِ حدیث سے لکھا ہے جن کو صحیح بخاری کی شرح میں حافظِ حدیث علامہ ابن حجر نے نقل کیا ہے۔ (دیکھو فتح الباری تفسیر سورہ احزاب)

اس کے علاوہ جو لغو روایات مشہور کی گئی ہیں وہ سب منافقین اور کفار کی گھڑی ہوئی ہیں۔ جن کو بعض مؤرخین نے بھی بلا تنقید نقل کر دیا ہے۔ وہ محض جھوٹ اور افتراء ہیں۔ (سیرت ص۴۱۹، ص۴۲۰)

حضرت صفیہؓ بنت یحییٰ

حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ یہ صرف اُن کی خصوصیت تھی کہ ایک نبی کی صاحبزادی اور ایک نبی کی زوجہ تھیں۔ پہلے کنانہ ابن ابی الحقیق کے نکاح میں تھیں ان کے قتل کے بعد آپؐ کے عقد میں آئیں۔

حضرت جویریہؓ بنت حارث خزاعیہ

یہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی ہیں جنگ میں گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ پھر آپؐ کے نکاح میں آئیں اور ان کی بدولت تمام قبیلہ آزاد ہو گیا اور ان کے باپ مسلمان ہو گئے۔

حضرت میمونہؓ بنت حارث ہلالیہ

اوّل مسعود بن عمر کے نکاح میں تھیں، اُس نے طلاق دے دی تو ابورھم سے

نکاح ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔ (مغلطائی ص۶۶)
یہ آپؐ کی آخری ازدواج میں سے ہیں۔ ان کے بعد آپؐ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض خواتین سے نکاح ہوا۔ مگر ان کو شرف مصاحبت حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ قبل از رخصت ہی بعض وجوہ سے علیحدگی ہو گی جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں ہے۔ (سیرت ص۴۲، ص۴۳)۔

تعدد ازدواج کے متعلق ضروری تنبیہ

ایک مرد کے لئے متعدد بیویاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا عرب، ہندوستان، ایران، مصر، یونان، بابل، آسٹریلیا وغیرہ کی ہر قوم میں کثرتِ ازدواج کی رسم جاری تھی اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعداد ازدواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی لیکن نبھ نہ سکی۔ بالآخر فطری قانون غالب آیا اور اب اس کے رواج دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے تعدادِ ازدواج کی حمایت میں انجیل[1] کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے۔ ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعداد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔ (دیکھو لائف[2] مؤلفہ جان ڈیون پورٹ ص۱۵۸)
البتہ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اسلام سے پہلے تعداد ازدواج کی کوئی حد نہ تھی

---

[1] موجودہ بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں اور تین سو حرم تھیں۔ اوّل سلاطین داؤد علیہ السلام کی ننانوے بیویاں تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں اور حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰؑ کی چار چار بیویاں تھیں۔ (بائبل پیدائش باب ۲۹، ۳۰)
[2] اسی طرح پادری فکس اور جان ملٹن اور ایزک ٹیلر وغیرہ نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے۔

ایک ایک شخص کے تحت میں ہزار ہزار تک عورتیں رہتی تھیں۔ عیسائیوں کے پادری برابر کثرت ازدواج کے عادی تھے۔ سولھویں صدی عیسوی تک جرمنی میں اس کا عام رواج تھا۔ شاہِ فلسطین اور اُس کے جانشینوں نے بہت سی بیویاں کیں۔ اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعداد ازدواج کو جائز رکھتی ہے اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ منوجی جو ہندوؤں اور آریوں میں مسلّم بزرگ اور پیشوا مانے جاتے ہیں۔ دھرم شاستر میں لکھتے ہیں:

"اگر ایک آدمی کی چار پانچ عورتیں ہوں اور ایک اُن میں سے صاحبِ اولاد ہو تو باقی بھی صاحبِ اولاد ہی کہلاتی ہیں۔"

(منوادھیائے ۹، اشوک ص۱۸۱ از رسالہ ازدواج امرتسر)

شری کرشن جی جو ہندوؤں میں بڑے واجب التعظیم اوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیویاں تھیں۔

غرض اسلام سے پہلے کثرتِ ازدواج ایک غیر محدود صورت سے رائج تھی۔ جہاں تک مذاہب و ممالک کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی۔ نہ یہود نے، نہ نصاریٰ نے، نہ ہندوؤں نے، نہ آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم اسی طرح بغیر تحدید جاری رہی۔ بعض صحابہؓ کے نکاح میں چار سے زائد عورتیں تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں بھی خاص خاص اسلامی ضرورتوں کی بنا پر دس ازواج تک جمع ہوگئیں۔ پھر جب اس کثرتِ ازدواج سے عورتوں کی حق تلفی ہونے لگی۔ لوگ اوّل تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے۔ مگر پھر ان سب کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، قرآنِ عزیز کا ابدی قانون جو دُنیا سے ظلم و جور کو مٹانے کے لئے ہی نازل ہُوا ہے اُس نے فطری ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تعدادِ ازدواج کو بالکل منع تو نہ کیا۔ لیکن اس کی خرابیوں کو اصلاح ایک تحدید کے ذریعہ سے کر دی اور یہ ارشادِ خداوندی نازل ہُوا کہ اب صرف چار عورتوں تک نکاح کر سکتے ہو اور وہ بھی اس شرط پر کہ تم چاروں کے

حقوق برابر ادا کر سکو اور اگر اتنی ہمت نہ ہو تو پھر ایک سے زیادہ رکھنا ظلم ہے۔ اس ارشادِ خداوندی کے بعد باجماع اُمّت چار سے زائد بیویوں کا نکاح میں جمع رکھنا حرام ہو گیا۔ جن صحابہؓ کے نکاح میں چار سے زائد عورتیں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم فرمایا تو اُنہوں نے چار کو رکھ کر باقی کو طلاق دے دی۔

حدیث میں ہے کہ حضرت غیلان مسلمان ہوئے تو اُن کے نکاح میں دس عورتیں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو حکم فرمایا کہ چار کو رکھ کر باقی کو طلاق دے دیں۔ اسی طرح نوفل بن معاویہؓ اسلام لائے تو اُن کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں۔

(تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات بھی اس عام قانون کی رُو سے چار سے زائد نہ رہنی چاہیئے تھیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اُمہات المؤمنین دوسری عورتوں کی طرح نہیں۔ خود قرآنِ عزیز کا ارشاد ہے:۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ۔

"اے نبی کی عورتو! تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی عورت"

وہ تمام اُمّت کی مائیں ہیں۔ آنحضرتؐ کے بعد وہ کسی کے نکاح میں نہیں آسکتیں۔ اب اگر عام قانون کے ماتحت چار کے سوا باقی ازواجِ مطہراتؓ کو طلاق دے کر علیحدہ کر دیا جاتا تو اُن پر کتنا ظلم ہوتا کہ اب وہ عمر بھر کے لئے معطل ہو جاویں اور حضرت رحمت اللعالمین کی چند روزہ صحبت اُن کے لئے عذاب بن جاتی کہ ادھر تو فخرِ عالمؐ کی صحبت چھوٹتی ہے اور ادھر ان کے لئے اس کی بھی اجازت نہیں ملتی کہ کسی اور جگہ اپنا غم غلط کر سکیں۔ اس لئے کسی طرح یہ مناسب نہیں تھا کہ ازواجِ مطہراتؓ اس عام قانون کے ماتحت آئیں خصوصاً وہ خواتین[۱] جن کا نکاح اس لئے عمل میں آیا تھا کہ اُن

---

[۱] حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے شوہر حضرت ابو سلمہؓ کی وفات کے بعد آپؐ نے اُن سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپؐ کے گھر تشریف لائیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے خاوند جہاد میں شہید ہو گئے اور وہ بے سروسامان رہ گئیں ۔ آپؐ نے ان کی دلداری کے لئے اُن سے نکاح کر لیا ۔ اب اگر اُن کو طلاق دی جاتی تو اُن پر کیا گزرتی ؟ یہ اچھی

(بقیہ حاشیہ صلا سے آگے) اُن کے بچوں کی آپؐ نے پرورش کی اور اپنے عمل سے بتلا دیا کہ کس پیار و محبّت سے سوتیلی اولاد کی پرورش کرنی چاہیئے ۔ آپؐ کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں ۔ اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پرورش کا خانہ خالی رہ جاتا اور اُمّت کو اس سلسلہ میں کوئی ہدایت نہ ملتی ۔ ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ مَیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی گود میں پرورش پاتا تھا ۔ ایک بار آپؐ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا ۔ آپؐ نے فرمایا : سَمِّ اللہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِكَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْكَ ۔ اللہ کا نام لے کر کھا ، داہنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۳۶۳) ۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہو کر آئی تھیں ۔ دوسرے قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم ہو گئیں اور ثابت بن قیس اور ان کے چچا زاد بھائی کے حصّے میں ان کو لگا دیا لیکن انہوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کر لیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دے دوں گی ۔ مجھے آزاد کر دو ۔ یہ معاملہ کر کے حضورؐ کے پاس آئیں اور مالی امداد چاہی ۔ آپؐ نے فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتا دوں ؟ وہ یہ کہ مَیں تمہاری طرف سے مال ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں انہوں نے بخوشی منظور کر لیا ۔ تب آپؐ نے اُن کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرما لیا ۔ اُن کی قوم کے سینکڑوں افراد حضرات صحابہؓ کی ملکیت میں آچکے تھے ۔ کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہو کر آئے تھے ۔ جب صحابہؓ کو پتہ چلا کہ جویریہؓ آپؐ کے نکاح میں آگئی ہیں تو آنحضرتؐ کے احترام کے پیشِ نظر سب نے اپنے غلام باندی آزاد کر دیئے ۔ سبحان اللہ ! حضراتِ صحابہؓ کے ادب کی کیا شان تھی ۔ اس جذبہ کے پیشِ نظر کہ یہ لوگ سرکارِ دو عالمؐ کے سسرال والے ہو گئے ۔ ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں ، سب کو آزاد کر دیا ۔ حضرت عائشہؓ اس واقعہ کے متعلق فرماتی ہیں : فلقد اعتق بتزویجہ ایّاھا مائۃ اھل بیت من بنی المصطلق

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دلداری ہوتی کہ وہ اب تمام عمر نکاح سے محروم ہو جائیں۔ اس لئے بحکم خداوندی چار سے زائد بیویوں کا رکھنا صرف آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خصوصیت ٹھہری۔ نیز آپؐ

فما اعلم امرأۃ اعظم برکۃ علی قومہا منہا۔ آنحضرتؐ کے جویریہؓ سے نکاح کر لینے سے بنو المصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے۔ میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہو۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتداء اسلام میں ہی مکہ میں اسلام قبول کیا تھا اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے قافلہ کے دوسرے افراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ وہاں ان کا شوہر نصرانی ہو گیا اور چند دن کے بعد مر گیا۔ آنحضرتؐ نے نجاشی کے واسطہ سے اُن کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا جسے اُنہوں نے قبول کر لیا اور وہیں حبشہ میں نجاشی ہی نے آنحضرتؐ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ ابو سفیانؓ کی صاحبزادی ہیں اور ابو سفیان اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے جس نے اسلام دشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا اور وہ مسلمانوں اور پیغمبر اسلامؐ کو اذیت دینے اور انہیں فنا کے گھاٹ اتار دینے کا کوئی موقع اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ جب ان کو اس نکاح کی اطلاع ہوئی تو بلا اختیار ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ھُوَ الْفَحْلُ وَلَا یُجْدَعُ اَنْفُہٗ۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوانمرد ہیں ان کی ناک نہیں کاٹی جا سکتی۔ مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز ہیں ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں۔ ادھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور ادھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی۔ غرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا اور اسلام کے مقابلے میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے مدبر اور حکیم رسول اللہؐ نے ضرور اس فائدہ کو پیشِ نظر رکھا ہو گا۔ (یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلائے ہوئے پُر فریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے۔ کیونکہ انکے اس دام تیز و تیر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرتِ نبویؐ اور تاریخِ اسلام سے بے خبر ہیں اور اسلامیات کا علم مستشرقین کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۳ صہ ۲۹۲ تا صہ ۲۹۳) ؛؛

کی خانگی زندگی کے حالات جو اُمّت کے لئے تمام دین و دُنیا کے معاملات میں دستور العمل ہیں۔ ہم تک صرف ازواجِ مطہرات ہی کے ذریعہ سے پہنچ سکتے ہیں اور یہ ایک ایسا مقصد ہے کہ اس کے لئے نو خواتین بھی کم ہیں۔ اِن حالات پر نظر کرتے ہوئے کیا کوئی انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ خصوصیت معاذ اللہ کسی نفسانی خواہش پر مبنی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ جس وقت سارا عرب و عجم مخالفت کے لئے کھڑا ہوا۔ قتل کے منصوبے گانٹھے، طرح طرح کے عیب لگائے۔ بہتان باندھے (پناہِ خدا) مجنون کہا، کذّاب بتلایا۔ غرض اس آفتاب عالم تاب پر خاک ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاکر خود خاک آلود ہوئے۔ یہ سب کچھ کیا لیکن کسی کافر نے خواہشات نفسانی اور عورتوں کے معاملہ میں بھی کسی وقت آپؐ پر کوئی الزام لگایا؟ نہیں اور ہرگز نہیں! یہاں افتراء کے بھی پاؤں نہ ہوئے۔ ورنہ کسی نیک نام عورت کو بدنام کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی حربہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ذرا انگلی رکھنے کی جگہ تھی تو کفارِ عرب جو گھر کے بھیدی تھے سب سے بڑھا چڑھا کر اس کو عیوب میں شمار کرتے۔ لیکن وہ اتنے بے وقوف نہ تھے کہ مشاہدات کا انکار کر کے اپنی بات کا اعتبار کھو دیتے۔ کیونکہ تقویٰ مجسّم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ لوگوں کے سامنے تھی جس میں وہ دیکھ رہے تھے کہ آپؐ کے زمانہ شباب کا بڑا حصّہ تو محض تجرد اور خلوت گزینی میں گزرا۔ پھر جب عمر شریف پچیس سال میں پہنچی تو حضرت خدیجہؓ کی طرف سے نکاح کی درخواست ہوئی جو بیوہ اور صاحبِ اولاد ہونے کے ساتھ اس وقت چالیس سال کی عمر میں بڑھاپے کا زمانہ گزار رہی تھیں اور آپؐ سے پہلے دو شوہروں کے نکاح میں رہ چکی تھیں اور دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کی ماں تھیں۔

بارگاہِ نبوّت میں اُن کی درخواست رد نہ کی گئی اور پھر اکثر عمر اسی ایک نکاح پر گزار دی گئی اور وہ بھی اس طرح کہ اُن کو چھوڑ کر حرا کے لق و دق غار میں ایک ایک مہینہ تک محض عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور عمر کا بڑا حصّہ اسی نکاح پر گزارا۔ اسی لئے آپؐ کی جتنی اولاد ہوئی وہ سب حضرت خدیجہؓ سے ہوئی ہے۔ البتہ

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد جبکہ عمر شریف پچاس سال[1] سے تجاوز کر جاتی ہے تو یہ سارے نکاح ظہور میں آتے ہیں اور خاص ضرورتوں کے ماتحت دس خواتین تک آپؐ کے نکاح میں داخل ہوتی ہیں جو سب کی سب (حضرت عائشہؓ کے سوا) بیوہ ہیں

[1] پچیس سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر شریف ہونے تک تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپؐ کی زوجہ رہیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نکاح ہوا۔ مگر حضرت سودہؓ تو آپؐ کے گھر تشریف لے آئیں اور حضرت عائشہؓ صغر سنی کی وجہ سے اپنے والد کے گھر ہی رہیں۔ پھر چند سال کے بعد ۲ھ میں مدینہ منورہ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی عمل میں آئی۔ اس وقت آپؐ کی عمر چون سال ہو چکی ہے اور دو بیویاں اس عمر میں آکر جمع ہوئی ہیں۔ یہاں سے تعدد ازدواج کا معاملہ شروع ہوا۔ اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے نکاح ہوا۔ پھر کچھ ماہ بعد حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے نکاح ہوا اور صرف اٹھارہ ماہ آپؐ کے نکاح میں رہ کر وفات پائی۔ ایک قول کے مطابق تین ماہ آپؐ کے نکاح میں زندہ رہیں۔ پھر ۴ھ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا جو ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ اس وقت آپؐ کی عمر اٹھاون سال ہو چکی تھی اور اتنی بڑی عمر میں آکر چار بیویاں جمع ہوئیں حالانکہ اُمت کو جس وقت چار بیویوں کی اجازت ملی تھی اس وقت ہی آپؐ کم از کم چار نکاح کر سکتے تھے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ اس طرح ۶ھ میں جویریہؓ سے اور ۷ھ میں حضرت ام حبیبہؓ سے اور پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

خلاصہ: یہ کہ چون سال کی عمر تک آپؐ نے صرف ایک ہی بیوی کے ساتھ گزارا کیا یعنی پچیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گزارے پھر اٹھاون سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں اور باقی ازواج مطہراتؓ دو تین سال کے اندر حرمِ نبوت میں آئیں۔

(تفسیر معارف القرآن ج ۲ ص ۲۹۰، ص ۲۹۱)

اور بعض صاحبِ اولاد بھی۔ ان حالات پہ نظر کرتے ہُوئے گمان نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی سلیم الحواس انسان آپؐ کے اس تعدّد ازدواج کو معاذ اللہ کسی نفسانی خواہش کا نتیجہ بتلا سکے گا۔ اگر کوئی شپرہ چشم آفتابِ نبوت کے عظمت و جلال کو بھی نہ دیکھ سکے اور آپؐ کے اخلاق، اعمال، تقویٰ، طہارت، زہد و ریاضت اور مقدس زندگی کے تمام گرد و پیش کے حالات سے بھی آنکھ چُرا لے تو خود ان متعدد نکاحوں کے واقعات و حالات ہی بھی آنکھ چرا لے تو خود ان متعدد کہ تعدّد ازدواج یقیناً کوئی نفسانی خواہش پر مبنی نہ تھا۔ ورنہ ساری عمر ایک سن رسیدہ عورت کے ساتھ گزار دینا، پچپن سالہ کو اس کام کے لئے تجویز کرنا کسی انسان کی عقل تسلیم نہیں کر سکتی خصوصاً جب کہ کفارِ عرب اور روسائے قریش آپؐ کے ایک اشارے پہ اپنا منتخب حسن و جمال آپؐ کے قدموں پر نثار کر دینے کے لئے بھی تیار تھے جیسا کہ سیر و تاریخ کی معتبر کتابیں اس کی شاہد ہیں اور اس سے بھی قطع نظر کی جائے تو خود مسلمانوں کی جمعیت بھی اس عرصہ میں لاکھوں کی تعداد تک پہنچ چکی تھی۔ جن کی ہر عورت آپؐ کے عقد میں داخل ہونے کو بجا طور پر فلاحِ دارین سمجھتی تھی۔ مگر آپؐ کے عقد میں پچاس سال تک صرف ایک خدیجہؓ تھیں جن کی عمر بوقتِ نکاح بھی چالیس سال تھی۔ پھر اس کے بعد بھی جن خواتین کا نکاح کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے وہ ایک کے سوا سب کی سب بیوہ اور صاحبِ اولاد ہیں۔ اُمت کی بے شمار کنواری لڑکیاں اس وقت بھی انتخاب میں نہیں آئیں۔

اس مختصر رسالہ میں تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ یہ دکھلا دیا جاتا کہ آپؐ کے یہ متعدد نکاح کس قدر اسلامی اور شرعی ضرورتوں پر مبنی تھے۔ نیز اگر یہ نہ ہوتے تو بہت سے احکام جو عورتوں ہی کے ذریعے سے اُمت کو پہنچ سکتے تھے وہ سب مخفی رہ جاتے[1]

---

[1] الحمد للہ کہ حضرت سیدی و سندی حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اس ضرورت کو اس طرح پُورا فرمایا کہ ایک رسالہ میں ان تمام احادیث کو جمع فرمایا جو ازواجِ مطہراتؓ کے ذریعے سے خانگی زندگی کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اس رسالے کا نام "تعدد ازواج صاحب المعراج" رکھا گیا ہے ؎

کس قدر بے حیائی اور حق کشی ہے کہ حضرتِ رسالت کے اس تعدد ازدواج کو نفسانی خواہش پر محمول کیا جائے۔ اگر باطل پرستوں نے عقل و حواس کو اندھا کر دیا ہو تو کوئی کافر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نو ازواجِ مطہراتؓ چھوڑ کر انتقال فرمایا۔ آپؐ کے بعد سب سے پہلے ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت زینب بنت حجشؓ کی وفات ہوئی اور سب سے آخر میں حضرت اُمِّ سلمہؓ نے وفات پائی۔ (سیرت ص۲۱۳ تا ص۲۵۰)

حضور اقدس صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات سراپا رحمت و برکت ہے۔ تبلیغ احکام اور تزکیۂ نفوس اور ابلاغِ قرآن آپؐ کا سب سے بڑا مقصدِ بعثت تھا۔ آپؐ نے اسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دُنیا میں پھیلا دیا۔ یعنی آپؐ بتاتے تھے اور کرتے بھی تھے۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی کی رہبری کی ضرورت نہ ہو، نماز با جماعت سے لے کر بیویوں سے تعلقات، آل اولاد کی پرورش اور پیشاب پاخانہ اور طہارت تک کے بارے میں آپؐ کی قولی اور فعلی ہدایات سے کُتبِ حدیث بھرپور ہیں۔ اندرونِ خانہ کیا کیا کام کیا، بیویوں سے کیسے میل جول رکھا اور گھر میں آکر مسائل پُوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا؟ اس طرح کے ہی سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ازواجِ مطہراتؓ کے ذریعے ہی اُمّت کو رہنمائی ملی۔ تعلیم و تبلیغ کی دینی ضرورت کے پیشِ نظر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کثرتِ ازدواج ایک ضروری امر تھا۔ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے احکام و مسائل، اخلاق و آداب اور سیرتِ نبویؐ سے متعلق دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں جو کُتبِ حدیث میں پائی جاتی ہیں۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد تین سو اٹھ سٹھ تک پہنچی ہوئی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین ج ۱ ص ۹ میں لکھا ہے کہ اگر حضرت اُمِّ سلمہؓ کے فتاویٰ جمع کئے جائیں جو انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیئے ہیں تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا

کا روایت و درایت اور فقہ و فتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلسل اڑتالیس سال تک علمِ دین پھیلایا۔ بطورِ مثال دو مقدس بیویوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے۔ دیگر ازواجِ مطہراتؓ کی روایات بھی مجموعی حقیقت سے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تبلیغ کا نفع صرف ازواجِ مطہراتؓ سے پہنچا۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۲۸۹)

ازواجِ مطہراتؓ کی ایک خصوصیت

اور اس کی وجہ سے اُن پر ایک کڑی پابندی

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرًا ۝ وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ (الآیہ سورۂ احزاب)

ان دو آیتوں میں ازواجِ[1] مطہراتؓ کی یہ خصوصیت بیان فرمائی ہے کہ اگر وہ کوئی گناہ کا کام کریں گی تو اُن کو دوسری عورتوں کی نسبت سے دوگنا عذاب دیا جائے گا۔ یعنی اُن کا ایک گناہ دو کے قائم مقام قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر وہ نیک عمل کریں گی تو دوسری عورتوں کی نسبت ان کو ثواب بھی دوہرا دیا جائے گا۔ ان کا ایک عمل دو کے قائم مقام ہوگا۔

ازواجِ مطہراتؓ پر حق تعالیٰ کے انعامات بڑے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] آیتِ مبارکہ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ سے بھی یہی خصوصیت مراد ہے کہ یہ اعمال و احکام (اگرچہ) سب مسلمان عورتوں کے لئے لازم و واجب ہیں آپ کو ان کا اہتمام دوسروں سے زیادہ کرنا چاہیئے۔ (اسی لئے یہاں ازواجِ مطہراتؓ کو خصوصی خطاب فرمایا گیا ہے)۔ (معارف القرآن ج ۷ ص ۱۳۱)

اپنے رسولؐ کی زوجیت کے لئے منتخب فرمایا۔ ان کے گھروں میں وحی نازل ہوتی رہی۔ تو اُن کی ادنیٰ غلطی کوتاہی بھی بڑی ہوگی۔ اگر دوسروں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچے تو اس سے کہیں زیادہ اشد ہوگا کہ ان سے کوئی بات ایذا و تکلیف کی سرزد ہو۔ قرآن کریم کے ان الفاظ میں خود اس سبب کی طرف اشارہ ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ (معارف القرآن ج۷، ص۱۲۹) ﴿

اسبابِ نزولِ آیتِ تخییر اور اس کے بعد ازواجِ مطہراتؓ کا مؤقف

ان واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت جابرؓ کی روایت سے مفصل آیا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ نے جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطالبہ کیا کہ ان کا نان نفقہ بڑھایا جائے۔ تفسیر بحرِ محیط میں ابوحیان نے اس کی تشریح یہ بیان کی ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد بنونضیر پھر بنوقریظہ کی فتوحات اور اموالِ غنیمت کی تقسیم نے عام مسلمانوں میں ایک گونہ خوش حالی پیدا کر دی تھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ ان اموالِ غنیمت میں سے آنحضرتؐ نے بھی اپنا حصہ رکھا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے جمع ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کسریٰ و قیصر کی بیبیاں طرح طرح کے زیورات اور قیمتی لباسوں میں ملبوس ہیں اور ان کی خدمت کے لئے کنیزیں ہیں اور ہمارا حال فقر و فاقہ کا آپؐ دیکھتے ہیں اس لئے اب کچھ توقع سے کام لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں اور دُنیاداروں میں ہوتا ہے۔ تو آپؐ کو اس سے بہت رنج ہوا کہ انہوں نے بیتِ نبوت کی قدر نہ پہچانی۔ ازواجِ مطہراتؓ کو خیال نہ تھا کہ اس سے آپؐ کو ایذا پہنچے گی۔ عام مسلمانوں میں مالی وسعت دیکھ کر اپنے لئے بھی وسعت کا خیال دل میں آگیا تھا۔

ابوحیانؒ نے فرمایا اس واقعہ کو غزوۂ احزاب کے بعد بیان کرنے سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے کہ ازواج کا یہ مطالبہ ہی تخییر آیت کا سبب بنا۔ بعض روایاتِ حدیث

میں حضرت زینب رضؓ کے گھر میں شہد پینے کا واقعہ جو سورۂ تحریم میں مذکور ہے۔ جس میں ازواج کی باہمی غیرت کے سبب جو صورت پیش آئی وہ اس تخییر طلاق کی سبب بنی۔ اگر یہ دونوں ہی چیزیں قریبی زمانے میں پیش آئی ہوں تو یہ بھی بعید نہیں کہ دونوں ہی سبب ہوں۔ لیکن آیت تخییر کے الفاظ سے تصدیق اسی کی ہوتی ہے کہ ازواج مطہراتؓ کی طرف سے کوئی مالی مطالبہ اس کا سبب بنا ہے کیونکہ اس آیت میں فرمایا ہے: اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا (الاٰیۃ)۔ اس آیت نے سب ازواج مطہراتؓ کو اختیار دے دیا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ حالت یعنی معاشی عسرت و تنگی کے ساتھ آپؐ کی زوجیت میں رہنا قبول کریں یا پھر آپؐ سے طلاق کے ساتھ آزاد ہو جائیں۔

پہلی صورت میں اُن کو عام عورتوں کی نسبت سے بہت زیادہ اجرِ عظیم اور آخرت کے خاص درجات عطا ہوں گے۔ اور دوسری صورت یعنی طلاق لینے میں بھی ان کو دُنیا کے لوگوں کی طرح کسی تلخی و تکلیف کی نوبت نہیں آئے گی۔ بلکہ سُنّت کے مطابق کپڑوں کا جوڑہ وغیرہ دے کر عزت کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔

ترمذی نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اظہار و اعلان کی ابتدا مجھ سے فرمائی اور آیت سنانے سے پہلے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہنے والا ہوں مگر تم اس کے جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ یہ مجھ پر خاص عنایت تھی کہ مجھے والدین سے مشورہ کے بغیر اظہار رائے سے آپؐ نے منع فرمایا کیونکہ آپؐ کو یقین تھا کہ میرے والدین مجھے کبھی یہ رائے نہ دیں گے کہ میں رسول اللہؐ سے مفارقت اختیار کروں۔ میں نے جب یہ آیت سُنی تو فوراً عرض کیا کہ کیا میں اس

ل يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (الاحزاب آیت ۲۸، ۲۹)

معاملے میں والدین سے مشورہ لینے جاؤں؟ میں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دارِ آخرت کو اختیار کرتی ہوں"۔ پھر میرے بعد سب ازواجِ مطہراتؓ کو قرآن کا یہ حکم سنایا گیا۔ سب نے وہی کہا جو میں نے اول کہا تھا کسی نے بھی دنیا کی فراخی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقابلہ میں قبول نہ کیا (قال الترمذی ھٰذا حدیث حسن صحیح)۔

(معارف القرآن ج۷، ص۱۲۷، ص۱۲۸)

آیاتِ تحریم اور اس کا واقعۂ نزول

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت عائشہؓ وغیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شریف تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے سب بیبیوں کے پاس تشریف لاتے تھے۔ ایک روز حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا کہ میں نے حفصہؓ سے مشورہ کیا کہ آپؐ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں وہ یوں کہے کہ آپؐ نے مغافیر نوش فرمایا ہے۔ مغافیر ایک خاص قسم کا گوند ہے جس میں کچھ بدبو ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تو شہد پیا ہے۔ ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی ہو اور ان کا رس چوسا ہو (اسی وجہ سے شہد میں بھی بدبو آنے لگی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدبو کی چیزوں سے بہت پرہیز فرماتے تھے اس لئے آپؐ نے قسم کھائی کہ پھر میں شہد نہ پیوں گا۔ اور اس خیال سے کہ حضرت زینبؓ کا جی برا نہ ہو، اس کے اخفاء کی تاکید فرمائی۔ مگر ان بی بی نے دوسری سے کہہ دیا اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہؓ شہد پلانے والی ہیں اور حضرت عائشہؓ و سودہؓ و صفیہؓ صلاح مشورہ کرنے والی۔ بعض روایات میں یہ قصہ دوسری طرح بھی آیا ہے۔ ممکن ہے کہ کئی واقعے ہوئے ہوں اور ان سب کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں۔ (بیان القرآن)

خلاصہ ان آیات کا یہ ہے کہ اس واقعہ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حلال چیز یعنی شہد کو بذریعہ قسم اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یہ فعل جبکہ کسی ضرورت کے

اور مصلحت سے ہو تو جائز ہے گناہ نہیں۔ مگر اس واقعہ میں ضرورت ایسی نہ تھی کہ اس کی وجہ سے آپؐ خود کوئی تکلیف اٹھائیں اور ایک حلال چیز کو چھوڑ دیں۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے یہ کام ازواج مطہراتؓ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا اور ایسے معاملہ میں ان کا راضی کرنا کے لئے کیا تھا اور ایسے معاملہ میں ان کا راضی کرنا آپؐ کے ذمے لازم نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے از روئے شفقت و عنایت فرمایا یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ اس آیت میں بھی قرآن کریم کے عام اسلوب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کا نام لے کر خطاب نہیں کیا بلکہ یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ کے لقب سے خطاب فرمایا جو آپؐ کا خصوصی اعزاز و اکرام ہے اور پھر فرمایا کہ اپنی ازواج کی رضا جوئی کے لئے آپؐ اپنے اوپر ایک حلال چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں۔ یہ کلام اگرچہ از رُوئے شفقت ہُوا۔ مگر صورت جواب طلبی کی تھی جس سے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید آپؐ سے کوئی بڑی غلطی ہو گئی۔ اس لئے ساتھ ہی فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ یعنی گُناہ بھی ہوتا تب بھی اللہ تعالیٰ مغفرت اور معاف کرنے والے ہیں۔ (معارف القرآن جلد ۸ صفحہ ۴۹۹)

ازواجِ مطہراتؓ کے لئے ایک خصوصی حُکم

ازواجِ مطہراتؓ کا آنحضرتؐ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح جائز نہیں وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بنصِ قرآنی اُمّہات المؤمنین ہیں (کما قال اللہ تبارک و تعالیٰ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ) اور اگرچہ اُن کے اُمّہات ہونے کا اثر اُن کی اولادِ روحانی پر نہیں پڑتا کہ وہ سب بہن بھائی ہو کر باہم نکاح نہ کر سکیں۔ مگر اُن کی اپنی ذات کی حد تک (امتناع نکاح کا حکم دیا گیا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلّم اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ آپؐ

کی وفات کا درجہ ایسا ہے جیسے کوئی زندہ شوہر گھر سے غائب ہو، اسی لئے آپؐ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی۔ اسی بناء پر آپؐ کی ازواج کا وہ حال نہیں جو عام شوہروں کی وفات پر اُن کی ازواج کا ہوتا ہے۔ یہ حکمت بھی ہے کہ شرعی قاعدہ سے جنت میں ہر عورت اپنے آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔

حضرت حذیفہؓ نے اپنی زوجہ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تم جنت میں میری بیوی ہو تو میرے بعد کوئی دُوسرا نکاح نہ کرنا۔ کیونکہ جنت میں عورت اپنے آخری شوہر کو ملے گی۔ (قرطبی) اس لئے ازواجِ مطہراتؓ کو جو شرف حق تعالےٰ نے دُنیا میں آپؐ کی زوجیت کا عطا فرمایا ہے اُس کو آخرت اور جنت میں بھی باقی رکھنے کے لئے ان کا نکاح کسی دوسرے سے حرام کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ طبعی طور پر کوئی شوہر اس کو پسند نہیں کرتا کہ اُس کی بیوی دوسرے کے نکاح میں جائے۔ مگر اس طبعی خواہش کا پُورا کرنا عام لوگوں کے لئے شرعاً ضروری نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طبعی خواہش کا بھی حق تعالےٰ نے احترام فرمایا۔ یہ آپؐ کا خصوصی اعزاز ہے۔ (معارف القرآن ج ۷، صـ۲۰۲، صـ۲۰۳)

ازواجِ مطہراتؓ کے قلوب میں آپؐ کی عظمت اور عقیدت

صحیح بخاری غزوۃ الطائف میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پانی کے برتن میں کُلّی کر کے حضرت ابو مُوسیٰؓ اور حضرت بلالؓ کو عطا فرمایا کہ اس کو پی لیں اور اپنے چہرے پر مَل لیں۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ پردے کے پیچھے یہ واقعہ دیکھ رہی تھیں۔ اُنھوں نے اندر سے آواز دے کر ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ اس تبرک میں سے کچھ اپنی ماں یعنی ام سلمہؓ کے لئے چھوڑ دینا۔" یہ حدیث بھی شاہد ہے کہ نزول حجاب کے بعد ازواجِ مطہراتؓ گھروں اور پردوں کے اندر رہتی تھیں۔

فائدہ:۔ اس روایت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات کی ایسی ہی شائق تھیں جیسے دوسرے مُسلمان۔ یہ بھی

آپؐ کی ذاتِ اقدس ہی کی خصوصیت تھی، ورنہ بیوی سے بے تکلف تعلق جو شوہر کا ہوتا ہے اس کے ساتھ اس کے تقدیس و تعظیم کا یہ درجہ قائم رہنا عادۃً ناممکن ہے۔ (معارف القرآن ج ۷، صـ ۲۱۵)

کیا ازواجِ مطہراتؓ سارے عالم کی عورتوں سے افضل ہیں؟

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ: آیت کے ان الفاظ سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ تمام دُنیا کی عورتوں سے افضل ہیں۔ مگر قرآن کریم کی آیت حضرت مریم علیہا السّلام کے بارے میں یہ ہے: اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ٥ اس سے حضرت مریم علیہا السّلام کا سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے اور ترمذی میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ کافی ہیں تم کو ساری عورتوں میں سے مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد (امّ المؤمنین) اور فاطمہ بنت محمدؐ اور آسیہ زوجہ فرعون۔

اس حدیث میں حضرت مریم علیہا السّلام کے ساتھ اور تین عورتوں کو نساءِ عالمین سے افضل فرمایا۔ اس لئے اس آیت میں جو ازواجِ مطہرات کی افضیلت اور فوقیت بیان کی گئی ہے وہ ایک خاص حیثیت یعنی ازواج النبیؐ اور نساء النبیؐ ہونے کی ہے جس میں وہ تمام عالم کی عورتوں سے بلا شُبہ افضل ہیں۔ اس سے عام فضیلت مطلقہ ثابت نہیں ہوتی جو دوسری نصوص کے خلاف ہو (مظہری)

(معارف القرآن ج ۷، صـ ۱۳۱)

نبی کریمؐ کا ازواجِ مطہراتؓ میں برابری کی رعایت کا التزام واہتمام

حق تعالےٰ نے نبی کریمؐ کو یہ اعزاز بخشا کہ ازواجِ مطہراتؓ برابری کرنے کے حکم سے مستثنیٰ فرمایا۔ لیکن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس استثناء واجازت کے باوجود

اپنے عمل میں ہمیشہ برابری کرنے کا التزام ہی فرمایا۔ امام ابوبکر جصاص نے فرمایا کہ حدیث کی روایت یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت (تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْھُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ) کے نزول کے بعد بھی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں برابری کی رعایت ہمیشہ رکھتے تھے۔ پھر اپنی اسناد کے ساتھ حضرت صدیقہ عائشہ رض سے یہ حدیث نقل کی جو مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد وغیرہ میں موجود ہے۔ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقْسِمُ فَیَعْدِلُ فَیَقُوْلُ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا قِسْمِیْ فِیْمَآ اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا لَآ اَمْلِکُ - قال ابوداؤد یعنی القلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب ازواج میں برابری فرماتے تھے اور یہ دُعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! جس چیز میں میرا اختیار رہے ہے اس میں تو میں نے برابری کر لی (یعنی نفقہ اور شب باشی وغیرہ میں) مگر جس میں میرا اختیار نہیں ہے اس معاملے میں مجھے ملامت نہ فرمائیے، مراد دل کی محبت ہے کسی سے زیادہ کسی سے کم۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رض کی روایت ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بی بی کی نوبت میں اُن کے یہاں جانے سے کوئی عذر ہوتا تو آپ اس سے اجازت لیتے تھے۔ جب کہ یہ آیت (تُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ) بھی نازل ہو چکی تھی جس میں بیویوں میں برابری کرنے کا فرض آپ سے معاف کر دیا گیا۔

یہ حدیث بھی سب کتبِ حدیث میں معروف ہے کہ مرضِ وفات میں جب آپ کو ازواجِ مطہرات رض کے گھروں میں روزانہ منتقل ہونا مشکل ہو گیا تو آپ نے سب سے اجازت لے کر حضرت صدیقہ عائشہ رض کے بیت میں بیماری کے دن گزارنا اختیار فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جن کاموں میں آپ کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی رخصت آپ کی آسانی کے لئے کی جاتی تھی تو اُس کی شکر گزاری کے طور پر آپ عموماً عزیمت پر عمل کرتے اور رخصت کو صرف ضرورت کے وقت استعمال فرماتے تھے۔

(معارف القرآن ج ۷، ص ۱۹۱، ص ۱۹۲)

آیتِ تطہیر میں اہلِ بیت سے مُراد ازواجِ مطہرات رضؓ ہی ہیں

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ہ

(الاحزاب آیت (۳۳) -

صحیح یہی ہے کہ لفظِ اہلِ بیت میں ازواجِ مطہراتؓ بھی داخل ہیں۔ کیونکہ شانِ نزول اس آیت کا وہی ہیں اور شانِ نزول کا مصداق آیت میں داخل ہونا کسی شبہ کا متحمل نہیں اور حضرت فاطمہؓ و علیؓ و حسنؓ و حسینؓ بھی ارشادِ نبوئ کے مطابق اہلِ بیت میں شامل ہیں جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپؐ ایک سیاہ رومی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ حسن بن علیؓ آئے تو اُن کو اس چادر میں لے لیا پھر حسینؓ آگئے اُن کو بھی اسی طرح چادر کے اندر داخل فرمالیا۔ پھر یہ آیت (مذکورہ بالا) تلاوت فرمائی اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا: اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَآءِ اَهْلُ بَيْتِيْ (رواہ ابن جریر) - (معارف القرآن ج ۷ ص ۱۴۱) -

غرض آیتِ تطہیر میں ازواجِ مطہراتؓ کے داخل و شامل ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ چنانچہ حضرت عکرمہؒ تو بازار میں منادی کرتے تھے کہ آیت میں اہلِ بیت سے مراد ازواجِ مطہراتؓ ہیں۔ کیونکہ یہ آیت ان ہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اور فرماتے تھے کہ میں اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں اور سعید بن جبیر رضؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے آیت میں اہلِ بیت سے مراد ازواجِ مطہراتؓ کو قرار دیا اور استدلال میں اگلی آیت پیش فرمائی وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ - رواہ ابن حاتم و ابن جریر) -

حجراتِ اُمّہات المؤمنین

ابن سعد نے بروایت عطاء خراسانی لکھا ہے کہ یہ حجرات کھجور کی شاخوں کے

بنے ہوئے تھے اور اُن کے دروازوں پر موٹے سیاہ اُون کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ امام بخاریؒ نے ادب المفرد میں، بیہقی نے داؤد بن قیس سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان حجرات کی زیارت کی ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ حجرے کے دروازہ سے مسقف بیت تک چھ سات ہاتھ ہوگا اور بیت (کمرہ) دس ہاتھ اور چھت کی اونچائی سات آٹھ ہاتھ ہوگی۔ یہ حجرات اُمہات المؤمنین، ولید بن عبدالملک کی حکومت میں اُن کے حکم سے مسجدِ نبویؐ میں شامل کر دیئے گئے۔ مدینہ میں اس روز لوگوں پر گریہ و بکا طاری تھی۔ (معارف القرآن ج ۸ صـ ۱۰۲)

آپؐ کے چچا اور پھوپھیاں

عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے۔ حارث، زبیر، حجل، ضرار، مقوم، ابولہب، عباس حمزہ، ابوطالب، عبداللہ۔ جن میں سے عبداللہ آپؐ کے والد ماجد ہیں۔ باقی نو آپؐ کے چچا ہیں۔ حضرت عباسؓ اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے ہیں۔

آپؐ کی پھوپھیاں چھ ہیں۔ امیمہ، امّ حکیم، برّہ، عاتکہ، صفیہ اور اروی۔

(سیرت صـ ۵۰)

آپؐ کی پہرہ داری کرنے والے

سعد بن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ جنہوں نے غزوۂ بدر میں آپؐ کی نگہبانی کی اور زکوان بن عبد قیس اور محمد بن سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ انصاری نے غزوۂ احد میں اور زبیرؓ نے غزوۂ خندق میں اور عباد بن بشیر و سعد بن ابی وقاص نے اور ابوایوب و بلالؓ نے وادیٔ قریٰ میں۔ اور جب یہ آیت نازل ہوئی: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔ اللہ تعالےٰ خود آپؐ کی حفاظت کریں گے تو پہرہ داری اُٹھا دی گئی۔

(سیرت صـ ۵)

بناءِ کعبہ

اور قریش کا آپؐ کو باتفاق رائے امین تسلیم کرنا

جب آپؐ کی عمر پینتیس سال کی ہوئی تو اس وقت قریش[1] نے بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ بیت اللہ کی تعمیر کو ہر شخص اپنی سعادت سمجھتا تھا اور قبائل قریش نے اپنی قسمتوں کا فیصلہ اس پر کر رکھا تھا کہ اس کی تعمیر میں زیادہ حصہ لیا جائے۔ چنانچہ اس تعمیر کو قبائل نے تقسیم کرنے کی نوبت آئی تاکہ کوئی جھگڑا پیش نہ آئے (سیرت صدا)

بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدمؑ و حوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالےٰ نے جبرائیل امین کے ذریعے اُن کو یہ حکم بھیجا کہ اب وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں۔ ان حضرات نے حکم کی تعمیل کر لی تو اُن کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں اور اُن سے کہا گیا کہ آپؑ اوّل النّاس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں اور یہ گھر اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ــــ یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے (ابن کثیر)۔

بعض روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی۔ طوفانِ نوحؑ میں منہدم ہوئی اور اس کے نشانات مٹ گئے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ پھر ایک مرتبہ کسی حادثہ میں اس کی تعمیر منہدم ہوئی تو قبیلہ جرہم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی۔ پھر ایک مرتبہ منہدم ہوئی تو عمالقہ نے تعمیر کی اور پھر منہدم ہوئی تو قریش نے رسول اللہ ص کے ابتدائی زمانہ میں تعمیر کی جس میں آنحضرتؐ بھی شریک ہوئے اور حجرِ اسود کو اپنے دستِ مبارک سے قائم فرمایا۔ (معارف القرآن ج ۲ ص ۱۱۲)

---

[1] اس سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر اوّل حضرت شیثؑ نے اور پھر حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ (منہ)

اسی تقسیمِ عمل کے ساتھ بناء کعبہ حجرِ اسود کی حد تک پہنچ گئی۔ لیکن اب حجرِ اسود کو اُٹھا کر تعمیر میں نصب کرنے کے متعلق سخت اختلاف ہُوا۔ ہر قبیلہ اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرے۔ یہاں تک کہ قتل و قتال پر عہد و پیمان ہونے لگے۔ قوم کے بعض سنجیدہ لوگوں نے وعدہ کیا کہ مشورہ کر کے کوئی صُلح کی صُورت نکالیں اور اس غرض کے لئے مسجد میں گئے۔ مشورہ میں یہ طے ہُوا کہ جو شخص سب سے پہلے مسجد کے اس دروازے میں داخل ہو وہ تمہارے معاملے کا فیصلہ کرے اور اُس کے حکم کو ہر شخص دستِ قدرت کا فیصلہ سمجھ کر تسلیم کرے۔

خدا کی قدرت کہ سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اس دروازے سے داخل ہُوئے۔ آپؐ کو دیکھ کر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ امین ہیں، ہم ان کے حکم پر راضی ہیں۔ آپؐ تشریف لائے اور وہ حکیمانہ فیصلہ کیا کہ سب خوش ہو گئے یعنی ایک چادر پھیلادی اور اس میں حجرِ اسود کو اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے رکھ دیا اور پھر حکم دیا کہ ہر قبیلہ کا منتخب آدمی چادر کا ایک ایک کنارہ پکڑ لے۔ اسی طرح کیا گیا جب بنیاد تک پہنچ گیا تو خود اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر رکھ دیا۔ ابن ہشام اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ نبوّت سے پہلے تمام قریش بالاتفاق آپؐ کو امین کہتے تھے۔ (سیرت صد ۵۱ و ۵۲) (سیرت ابن ہشام ج ۱۱۲ صد ۱۰۵)۔

عطائے نبوّت

جب آپؐ کی عمر شریف چالیس برس ایک دن کی ہوئی تو ظاہری طور پر بھی باضابطہ آپؐ کو خلعتِ نبوّت کے ساتھ ممتاز و مشرف فرمایا جس کی تاریخ ولادت کی طرح ماہ ربیع الاوّل روز دوشنبہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ (سیرت مغلطائی صد ۱۴، سیرت صد ۵۲)۔

صحیحین کی ایک طویل حدیث میں نبوّت اور وحی کی ابتدا کا واقعہ اس طرح بیان ہُوا ہے کہ امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ رویائے صالحہ یعنی سچّے خوابوں سے شروع ہُوا جس کی کیفیّت یہ تھی کہ جو کچھ خواب میں دیکھتے بالکل اُس کے مطابق واقعہ پیش آتا اور اس میں کسی تعبیر کی بھی ضرورت نہ تھی۔ صُبح کی روشنی کی طرح واضح طور پر خواب میں دیکھا ہُوا واقعہ سامنے آ جاتا تھا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو مخلوق سے یک سوئی اور خلوت میں عبادت کرنے کا داعیۂ قوی پیش آیا جس کے لئے آپؐ نے غارِ حرا کو منتخب فرمایا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتی ہیں کہ آپؐ اس غار میں جا کر راتوں کو رہتے اور عبادت کرتے تھے۔ جب اہل وعیال کی خبر گیری کی ضرورت پیش نہ آتی وہیں مقیم رہتے تھے اور اس وقت کے لئے آپؐ ضروری توشہ لے جاتے تھے۔ اور پھر توشہ ختم ہونے کے بعد آپؐ اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور مزید کچھ دنوں کے لئے توشہ لے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ اسی غارِ حرا میں تشریف فرما تھے کہ اچانک آپؐ کے پاس حق یعنی وحی پہنچی۔

(معارف القرآن ج ۸ صد ۷۸۲)

دُنیا میں اشاعتِ اسلام

تبلیغ کا پہلا قدم

ابتداءً جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپؐ اعلاناً تبلیغ کے لئے مامور نہ تھے بلکہ اس میں صرف آپؐ کی ذات کے لئے احکام تھے۔ پھر کچھ دنوں سلسلۂ وحی منقطع رہنے کے بعد آپؐ پر دوبارہ وحی شروع ہوئی تو اس میں آپؐ کو تبلیغِ اسلام کے لئے حکم ہُوا۔ مگر دنیا میں جہالت وضلالت کی حکومت تھی بالخصوص عرب کا تکبّر اور غرور اور تقلیدِ آبائی اُنہیں حق پر کان لگانے کی ہرگز ہی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس لئے ابتداء میں حکمتِ الٰہیہ کا اقتضاء یہ ہُوا کہ آپؐ کو اعلاناً تبلیغ واشاعتِ اسلام کا امر نہ کیا جائے تاکہ اوّل ہی سے لوگ متنفر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ابتداءً دعوتِ اسلام اپنی جان پہچان کے لوگوں میں اور ان شخصوں میں شروع کی جن پر آپؐ کو اعتماد تھا یا آپؐ فراست کے ذریعے ان میں خیر وصلاح کے آثار دیکھتے تھے۔

اس طریق پر سب سے پہلے زوجۂ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور آپؐ کے چچازاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپؐ کے متبنّٰے زید بن حارثہ مشرف باسلام ہُوئے اور حضرت ابوبکرؓ نبوّت سے پہلے آنحضرتؐ کے دوست تھے اور آپؐ کے صدق ودیانت واخلاق سے خوب واقف تھے۔ جب آپؐ نے اُن کو رسالتِ الٰہیہ کی خبر دی تو فوراً آپؐ نے تصدیق کی اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ اپنی قوم کے مسلّم بزرگ تھے۔ تمام معاملات میں لوگ اُن پر اعتماد کرتے تھے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد آپؐ نے بھی ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دینی شروع کی جن میں کچھ صلاح وخیر کے آثار دیکھے۔ چنانچہ حضرت عثمان غنیؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ اور زبیر بن العوامؓ اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہم نے اُن کی دعوت قبول کی اور آپؐ ان

سب کو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

ان کے بعد ابو عبیدہ بن جراح اور عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب اور سعید بن زید عدوی اور ابو سلمہ مخزومی اور خالد بن سعید بن العاص اور عثمان بن مظعون اور اُن کے دونوں بھائی قدامہ اور عبداللہ اور ارقم بن ارقم رضی اللہ عنہم اجمعین مشرف باسلام ہوئے۔ یہ سب کے سب قریش میں سے تھے اور غیر قریش میں صہیبؓ رومی عمار بن یاسرؓ، ابوذر غفاریؓ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک یہ دعوتِ اسلام محض خفیہ تھی۔ عبادات اور اعمالِ شرعیہ بھی چھپ چھپ کر ادا کئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے چھپ کر نماز پڑھتا تھا۔ جب مسلمانوں کی تعداد تیس سے بڑھ گئی تو آنحضرتؐ نے اُن کے لئے ایک وسیع گھر منتخب کر دیا جس میں وہ سب جمع ہو جایا کرتے تھے اور آپؐ ان کو تعلیم فرماتے تھے۔

اس طریقہ سے دعوتِ اسلام تین سال تک جاری رہی۔ اس دوران میں قریش کی ایک خاصی جماعت اسلام میں داخل ہو گئی اور پھر اور لوگ بھی داخل ہونے شروع ہو گئے اور یہ خبر مکہ میں پھوٹ نکلی اور لوگوں میں جا بجا اس کا چرچا ہونے لگا اور اب اعلاناً دعوتِ حق کا وقت آپہنچا۔ (سیرت صہ۵۳ تا صہ۵۴)

اعلاناً دعوتِ اسلام

تین سال کے بعد جبکہ کثرت سے مرد و عورت اسلام میں داخل ہونے لگے اور لوگوں میں اس کا چرچا ہوا تو خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو فرمایا کہ علی الاعلان لوگوں کو کلمۂ حق پہنچائیں۔ آپؐ نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی اور مکہ کی پہاڑی صفا پر چڑھ کر اور قبائلِ قریش کا نام لے کر آواز دی۔ جب تمام قبائل جمع ہو گئے تو آپؐ نے اوّلاً سب سے دریافت کیا کہ اگر میں آپ کو یہ خبر دوں کہ غنیم کا لشکر تم پر

چڑھا چلا آ رہا ہے اور قریب ہے کہ تم پر لوٹ ڈال دے، تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب یہ سُن کر یک زبان ہو کر بولے کہ بے شک ہم آپؐ کی خبر بالکل حق سمجھیں گے، کیونکہ ہم نے آج تک آپؐ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ مَیں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم نے اپنے باطل عقائد کو نہ چھوڑا تو خدا تعالےٰ کا سخت عذاب تم پر آنے والا ہے۔ اور فرمایا:

"جہاں تک مجھے معلوم ہے دنیا میں کوئی انسان اپنی قوم کے لئے اس تحفہ سے بہتر تحفہ لے کر نہیں آیا جو مَیں تمہارے لئے لایا ہوں۔ مَیں تمہارے لئے دین و دُنیا کی فلاح و بہبود لے کر آیا ہوں اور خداوند نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ مَیں تمہیں اُس کی طرف دعوت دوں۔ خدا کی قسم! اگر مَیں تمام دُنیا کے انسانوں سے جھوٹ بولتا تب بھی تمہارے سامنے جھوٹ نہ بولتا اور اگر ساری دُنیا کو دھوکہ دیتا تب بھی تمہیں دھوکہ نہ دیتا۔ اس ذاتِ قدوس کی قسم ہے کہ جو ایک ہے اور جس کا کوئی سہیم و شریک نہیں کہ مَیں تمہاری طرف خصوصاً اور تمام عالم کی طرف عموماً خدا تعالےٰ کا رسول پیغمبر ہوں۔"

(از دروس السیرت صنا، سیرت ص ۵۵، ص ۵۶)

تمام عرب کی مخالفت و عداوت اور آپؐ کی استقامت

یہ دعوت و تبلیغ کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ عرب کو جب یہ معلوم ہُوا کہ آپؐ کی وحی میں اُن کے بُتوں کی حقیقت کھولی گئی ہے۔ اُن کی پرستش کرنے والوں کی بیوقوفی ظاہر کی گئی ہے تو آپؐ کی عداوت کے لئے کھڑے ہو گئے اور اُن کی ایک جماعت آپؐ کے چچا ابو طالب کے پاس آئی کہ وہ آپؐ کو اس قسم کی باتوں سے روک دیں اور یا آپؐ اُن کی حمایت چھوڑ دیں۔ ابو طالب نے ایک عمدہ پیرائے میں جواب دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اسی طرح کلمۂ حق کی نشر و اشاعت میں سرگرم اور بُتوں

کی عبادت سے لوگوں کو منع کرتے رہے۔ جب عرب کو اس پر صبر نہ ہو سکا تو پھر ابو طالب کے پاس آئے اور سختی سے اُن سے مطالبہ کیا کہ یا آپؐ اپنے بھتیجے کو باز رکھیں ورنہ ہم سب تمہارے خلاف جنگ کریں گے۔ یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک فنا ہو جائے۔ (سیرت ص۵۶)

تمام قبائل عرب کے مقابلہ میں آپؐ کا جواب

اب تو ابو طالب کو بھی فکر ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں گفتگو کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اے عمِ بزرگوار!

"خدا کی قسم! اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب لاکر رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں خدا کا کلمہ اس کی مخلوق کو نہ پہنچاؤں تو میں ہرگز اس کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ خدا تعالےٰ کا سچا دین لوگوں میں پھیل جائے اور یا کم از کم اسی جد و جہد میں اپنی جان دے دوں"

ابو طالب نے جب یہ رنگ دیکھا تو کہا اچھا جاؤ، تم اپنا کام کرتے رہو میں بھی تمہاری حمایت و نصرت سے کبھی ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ (سیرت ص۵۷)

لوگوں میں نفرت پھیلانا اور اس کا اُلٹا نتیجہ

جب قریش نے دیکھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب آپؐ کے ساتھ ہیں اور ادھر موسم حج قریب ہے۔ اس موقع پر آپؐ تبلیغ میں سرگرم کوشش کریں گے اور آپؐ کے کلامِ حق کی مقناطیسی کشش سے سب واقف تھے اس لئے اندیشہ ہے کہ اب ان کا مذہب تمام دُنیا کے اطراف میں پھیل جائے گا تو سب نے جمع ہو کر یہ طے کیا کہ مکہ کے تمام راستوں پر اپنے آدمی بٹھا دیئے جائیں تاکہ اطرافِ عالم سے جو لوگ حج کے لئے آئیں انہیں دُور ہی سے کہہ دیا جائے کہ یہاں ایک ساحر ہے جو

اپنے کلام سے باپ بیٹے اور خاوند بیوی میں اور تمام رشتہ داروں میں تفریق ڈال دیتا ہے، تم اس کے پاس نہ جاؤ ؀

چراغ را کہ ایزد بر فروزد ۔۔۔ کسے کئی تف زند ریشش بوزد

(جس چراغ کو حق تعالےٰ روشن فرمائیں۔ جو شخص (بجھانے کے لئے) اس پر پھونک مارتا ہے اس کی ہی ڈاڑھی جل جاتی ہے)۔

خدا کی قدرت! ان کا یہ طرزِ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا کام کر گیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو بہت ممکن تھا کہ بہت سے لوگ آپؐ کا ذکر بھی نہ سنتے۔ لیکن ان کی اس جدوجہد نے سب کو آپؐ کا مشتاق بنا دیا۔ (سیرت ص۵۸)

قریش کی ایذا رسانی اور آپؐ کی استقامت

جب قریش اپنی تدبیروں میں ناکام رہے اور دیکھا کہ روز آپؐ کی دعوت عام ہوتی جاتی ہے اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو رہے ہیں تو اب ہر قسم کی ایذا رسانی شروع کی۔ مکہ کے چند اوباش لوگوں کو جمع کر کے اس پر آمادہ کیا کہ وہ آپؐ کا ہر مجلس میں استہزاء کریں اور جس صورت سے ممکن ہو سکیں آپؐ کو تکلیف پہنچائیں۔ (سیرت ص۵۸)۔

آپؐ کے قتل کا ارادہ اور آپؐ کا بیّن معجزہ

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کعبہ شریف کے پاس نماز پڑھ رہے تھے تو ابو جہل نے موقع کو غنیمت سمجھ کر ارادہ کیا کہ آپؐ کا سر مبارک کچل ڈالے مگر ؏

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

(اگر دشمن قوی ہے تو نگہبان اس سے زیادہ قوی ہے)۔

جب پتھر لے کر آپؐ کے قریب پہنچتا ہے تو ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ پتھر لے کر

آپؐ کے قریب پہنچتا ہے تو ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ پتھر ہاتھ سے گر جاتا ہے۔ رنگ فق ہو جاتا ہے اور بھاگ کر اپنی جماعت کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ جب مَیں نے آپؐ کے سر کی جانب ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو ایک عجیب وضع کا اونٹ منہ کھولے ہوئے میری طرف جھپٹا اور قریب تھا کہ مجھے کھا جائے۔ مَیں نے ایسا اونٹ آج تک کبھی نہیں دیکھا۔

یہ وہ واقعہ ہے جو کفّار کے مجمع میں سب کے سامنے پیش آیا اور خود کفّار کے سردار ابوجہل نے اس کا اقرار کیا۔ ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط، ابولہب، عاص بن وائل، اسود بن یغوث، اسود بن عبدالمطلب، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث۔ یہ لوگ ہر وقت آنحضرتؐ کے درپے آزار رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کو اسلام کی توفیق نہیں ہوئی۔ بلکہ سب کے سب نہایت ذلیل ہو کر ہلاک ہوئے۔ کچھ غزوۂ بدر میں تلوار کے گھاٹ اُتر گئے اور کچھ نہایت گندے اور سخت امراض میں گل سڑ کر مر گئے۔

(سیرت ص۵۹، ص۵۸)

قریش کا آپؐ کو ہر قسم کی طمع دینا اور آپؐ کا جواب

جب قریش نے دیکھ لیا کہ یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوتی تو سب نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ چالاک سردار عتبہ بن ربیعہ کو آپؐ کے پاس بھیجیں تاکہ وہ آپؐ کو ہر قسم کی دنیاوی طمع دلائے۔ شاید اس تدبیر سے آپؐ اپنے دعوے سے خاموش ہو بیٹھیں۔ عتبہ بن ربیعہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پاس جا کر کہا بھتیجے! تم حسب و نسب کے اعتبار سے ہم سب میں بہتر ہو اور اس کے باوجود تم نے اپنی جماعت میں ایک تفریق ڈال دی اور ان کے معبودوں کو اور ان کو بُرا بھلا کہا۔ ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو جاہل ٹھہرایا۔ تم آج اپنے دل کی بات کہہ دو۔ اگر ان سارے قصّوں سے تمہاری غرض یہ ہے کہ بڑی دولت جمع کر لو تو سنو! ہم تمہارے واسطے اتنا مال جمع کر دینے کے لئے تیار ہیں

کہ تم اہلِ مکہ میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ اور اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہیں سرداری حاصل ہو جائے تو اس پر راضی ہیں کہ تمام قریش کا سردار بنا دیں اور آپؐ کے حکم کے بغیر کوئی ذرّہ نہ ہلائیں اور اگر آپؐ کی غرض بادشاہت ہے تو ہم آپؐ کو اپنا سب کا بادشاہ بھی بنا سکتے ہیں! اور اگر تم پر معاذ اللہ کسی جن کا اثر ہے اور یہ اسی کا کلام (وحی) تم لوگوں کو سناتے ہو اور تم اُس کے دفع کرنے سے عاجز ہو تو ہم آپؐ کے لئے کوئی طبیب تلاش کریں جو آپؐ کا علاج کرے (سیرت مغلطائی صنہ ۲۰)

جب عتبہ اپنے کلام سے فارغ ہُوا تو نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اس کی ساری داستان کے جواب میں صرف ایک سُورت قرآن سُنا دی جس کو سُن کر عتبہ ہکا بکا رہ گیا اور اپنی قوم میں واپس آکر کہنے لگا کہ خدا کی قسم! آج میں نے ایسا کلام سُنا ہے۔ واللہ! اس کی شانِ عظیم ظاہر ہونے والی ہے۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تم میری بات مانو اور زیادہ نہیں تو کچھ دنوں انتظار کرو۔ اگر عرب ان پر غالب آگئے تو تم مفت میں اس تکلیف سے نجات پاؤ گے اور اگر وہ عرب پر غالب آ گئے تو تم مفت ہماری ہی عزت ہے کیونکہ وہ ہمارے ہی قبیلہ سے ہیں۔ قریش اپنے سب سے زیادہ ہوشیار سردار کی یہ باتیں سُن کر حیرت میں رہ گئے اور یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ اس پر محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے جادو کر دیا ہے۔ (دروس السیرت صہ ۱۴) ۔

جب قریش کا کوئی حیلہ کارگر نہ ہُوا تو اب نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ آپؐ کے صحابہ کرام اور متعلقین واقرباء کو بھی ستانا اور طرح طرح کی ایذائیں دینا شروع کیا۔ حضرت بلال وغیرہؓ صحابہ کو سخت ایذائیں دی گئیں۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کی والدہ ماجدہ اسی بناء پر نہایت دردناک طریقہ سے شہید کی گئیں اور یہ سب سے پہلا واقعہ شہادت ہے جو اسلام میں پیش آیا۔ (سیرت صہ ۶۰، صہ ۶۱ ماخوذ دروس السیرۃ صہ ۲۱) ۔

صحابہ کرامؓ کے لئے ہجرتِ حبشہ کا حکم

آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اپنی ذات پہ ہر قسم کے مظالم اور تکالیف برداشت کرتے رہے۔ مگر جب صحابہ کرامؓ اور دیگر اقارب تک اس کی نوبت پہنچی اور دیکھا کہ وہ نہایت صبر کے ساتھ تمام مظالم سہنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر اس کلمۂ حق اور نورِ الٰہی سے مُنہ موڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو اُن کو آپؐ کے ذریعہ سے وصول ہوا ہے، تو ان حضرات کو اجازت دی کہ ملکِ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جائیں۔ عطائے نبوت سے پانچویں سال رجب میں بارہ[1] مرد اور عورتوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی جن میں حضرت عثمانؓ اور آپؐ کی زوجۂ مطہرہ حضرت رقیہ بھی تھیں۔ (دروس السیرت ص۹۵)

نجاشی بادشاہ حبشہ نے ان مہاجرین کا اکرام کیا۔ یہ سب امن وعافیت کے ساتھ وہاں رہنے لگے۔ جب قریش کو اس کی خبر ہوئی تو عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ یہ لوگ مفسد ہیں۔ ان کو اپنی قلمرو میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دو بلکہ ان کو ہمارے سپرد کر دو۔ نجاشی[2] ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ اس نے اُن کے جواب میں کہا کہ میں یہ کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اُن کے مذہب وخیالات کی تحقیق نہ کر لوں۔ ان حضرات سے جب نجاشی نے یہ دریافت کیا کہ اپنا مذہب اور اس کے صحیح واقعات بتلائیں۔ تو جعفر بن ابی طالب آگے بڑھے اور فرمایا[3] "شاہا! ہم پہلے جاہلیت والے تھے۔ بُتوں کی پُوجا کرتے تھے اور مردار جانور کھاتے تھے فحش کاری

---

[1] از سیرت مغلطائی، مہاجرین کی تعداد میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ منہ رح

[2] ملکِ حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کہتے ہیں۔

[3] یورپ کے بعض سیاسی لوگوں نے (غالباً لارڈ کرو مرنے) کہا ہے کہ اگر مشرق ومغرب کے علماء جمع ہو کر دینِ اسلام کی حقیقت بیان کرنا چاہیں تو اس سے اچھا نہیں کر سکتے جو مہاجرینِ حبشہ نے بیان کیا (منہ رح)

قطع رحمی اور بد خلقی میں مبتلا تھے۔ ہمارا قوی ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا جو ہمارے ہی کنبہ سے ہے۔ ہم اُن کے نسب اور سچائی امانت اور عفت کو خوب جانتے ہیں اور انہوں نے ہمیں اس کی دعوت دی کہ اللہ تعالیٰ کو ایک سمجھیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ جانیں اور بُت پرستی چھوڑ دیں، سچ بولیں، عزیز و اقارب کے ساتھ صلۂ رحمی کریں، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ اور محرمات سے منع فرمایا اور خون بہانے اور جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے روکا اور ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کا حکم فرمایا۔ ہم نے جب یہ سُنا تو اس پر ایمان لائے"۔

نجاشی[1] یہ سُن کر بہت متاثر ہُوا۔ قریش کے دونوں قاصدوں کو واپس کر دیا اور خود بھی مُسلمان ہو گیا۔ مہاجرین تقریبًا تین مہینے وہاں امن و عافیت کے ساتھ قیام کر کے واپس آ گئے۔ اس وقت حضرت فاروق اعظمؓ بھی آنحضرتؐ کی دُعا کی برکت سے مشرف باسلام ہو گئے۔ اس وقت مسلمانوں کی مردم شماری چالیس مرد اور گیارہ عورتوں سے زائد نہ تھی۔ فاروق اعظمؓ یعنی حضرت عمرؓ کے داخل اسلام ہونے سے مسلمانوں کو ایک قسم کی شوکت حاصل ہوئی لہذا وہ لوگ جو دلائل واضحہ کے ذریعہ سے اسلام کی حقانیت کا یقین کر چکے تھے۔ مگر قریش کی ایذا کے خوف سے اسلام ظاہر نہ کرتے تھے۔ اب اعلانیہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اسی طرح قبائلِ عرب میں اسلام پھیلتا اور ترقی کرتا رہا۔ جب قریش نے دیکھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کی عزت روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور بادشاہ حبشہ نے بھی مسلمانوں کا احترام کیا ہے تو انہیں اپنا انجام نظر آنے لگا۔

تمام قریش نے یہ طے کیا کہ بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم سے مطالبہ کیا جائے کہ

---

[1] یہ نجاشی کوئی اور شخص ہے جو نبوت سے پانچویں سال مسلمان ہُوا جس کا ذکر سنہ ۶ھ میں اسلام لانے کا آگے آتا ہے وہ اور ہے۔ (منہ)

وہ اپنے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) کو ہمارے سپرد کر دیں ورنہ ہم اُن سے بالکل قطع تعلق کر دیں گے۔ مگر بنی عبدالمطلب نے اس کو منظور نہ کیا تو باتفاق رائے یہ عہدنامہ[۱] لکھا گیا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے بالکل مقاطعہ کیا جائے۔ رشتے ناطے، نکاح، بیاہ اور خرید دفروخت سب بند کر دیئے جائیں اور یہ عہد نامہ بیت اللہ کے اندر معلق کر دیا گیا۔

ایک پہاڑ کی گھاٹی میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے تمام رفقاء و اقرباء کو مقید کر دیا گیا۔ اس وقت ابولہب کے سوا تمام بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے تمام افراد بلا امتیاز مسلم و کافر سب کے سب ابوطالب کے ساتھ رہے اور اس گھاٹی میں مقید و محصور ہو گئے۔ سب طرف سے آمد و رفت کے راستے بند تھے۔ خورد و نوش کا جو سامان تھا ختم ہو گیا تھا تو سخت اضطراب پیش آیا۔ شدّت بھوک سے درختوں کے پتّے تک کھانے کی نوبت آئی۔ یہ حالت دیکھ کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دوبارہ صحابہ کرامؓ کو حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے فرمایا۔ اس مرتبہ ایک بڑے قافلے نے ہجرت کی جس کی تعداد تراسی مرد اور بارہ عورتیں[۲] بیان کی جاتی ہیں۔ پھر ان کے ساتھ یمن کے مسلمان بھی گئے جن میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کی قوم بھی تھی۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی آل و اصحاب نے تقریباً تین[۳] سال انہی مظالم اور مصائب کے ساتھ بسر کئے۔ اس کے بعد چند آدمی اس عہد کو توڑنے اور آپؐ پر سے یہ محاصرہ اُٹھا دینے پر آمادہ ہوئے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتلایا گیا کہ اس عہد نامہ کو دیمک نے کھالیا ہے اور بجز خدا کے نام کے اس میں کوئی حرف نہیں چھوڑا۔ آپؐ نے لوگوں سے بیان کیا، دیکھا تو ٹھیک اسی طرح نکلا جیسا کہ آپؐ نے بیان فرمایا تھا۔ الغرض آپؐ سے محاصرہ اُٹھالیا گیا۔ (سیرت صہ ۶۲ تا صہ ۶۳)

---

[۱] یہ عہد نامہ منصور بن عکرمہ نے لکھا تھا اور اسی کی شامت میں اس کا ہاتھ شل ہو گیا (سیرت مغلطائی صہ ۱۲)

[۲] سیرت مغلطائی صہ ۱۳ ۔ [۳] بعض روایات میں دو سال اور بعض میں چند سال بیان کئے جاتے ہیں۔ (سیرت مغلطائی صہ ۱۳) منہ ؒ

طفیل بن عمرو دوسیؓ کا مشرف بہ اسلام ہونا

اسی عرصہ میں حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ جو نہایت شریف اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی بدیہی حقانیت اور آپؐ کے اخلاق کو دیکھ کر برضا و رغبت مسلمان ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے۔ میں جا کر ان کو بھی اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ مگر آپؐ اللہ تعالےٰ سے دعا کیجئے کہ میرے ساتھ کوئی ایسی کھلی ہوئی علامت ظاہر کر دی جائے جس کے ذریعے سے میں اُن کو اپنی بات کا یقین دلا سکوں۔ آپؐ نے دُعا فرمائی تو اللہ تعالےٰ نے اُن کی پیشانی پر ایک ایسا نور چمکا دیا کہ جو اندھیرے میں ایک نہایت روشن چراغ کی طرح چمکتا تھا۔ جب طفیل بن عمروؓ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو خیال ہُوا کہ کہیں میری قوم اس نور کو کوئی مصیبت اور بیماری نہ سمجھے اور یہ نہ کہے کہ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مُجھ پر یہ مرض مسلط ہو گیا ہے اس لئے یہ دُعا کی کہ یہ نور ان کے تازیانہ میں آ جائے۔ اللہ تعالےٰ نے دُعا قبول فرمائی اور اس نُور کو اُن کے کوڑے کے ساتھ قندیل معلق کی طرح لگا دیا۔ اپنے قبیلے میں پہنچ کر تبلیغ کی۔ کچھ آدمی آپ کی سعی سے مسلمان ہو گئے۔ مگر چونکہ اُن کے گمان کے مطابق زیادہ نہ ہُوئے، اس لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ آپؐ دُعا فرمایئے تاکہ میری سعی کامیاب ہو۔ آپؐ نے دُعا فرمائی اور ارشاد فرمایا:

"جاؤ اب تبلیغ کرو اور نرمی سے کام لو۔"

طفیل بن عمرو لوٹے اور پھر لوگوں کو اسلام کی طرف بُلایا اور اللہ تعالےٰ کے فضل سے ایسے کامیاب ہُوئے کہ غزوۂ خندق کے بعد ستر اسّی گھرانے مُسلمان کر کے غزوۂ خیبر میں اپنے ساتھ لائے جو سب کے سب شریکِ جہاد ہوئے۔

(سیرت مغلطائی صہ ۲۷ للحافظ علاء الدین)

(سیرت صہ ۶۶، صہ ۶۷)

❖

ابوطالب کی وفات

اسی عرصہ میں آپؐ کے چچا ابوطالب[۱] کی وفات ہوگئی۔ یہ سانحہ نبوّت سے دسویں سال ماہِ شوال کے نصف پر پیش آیا اور اس کے تین دن بعد حضرت خدیجہ[۲] رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی اور اسی لئے آنحضرتؐ نے اس[۳] سال کو غم کا سال فرمایا ہے۔ (سیرت مغلطائی صنہ ۳۰)(سیرت صہ ۶۸)۔

ہجرتِ طائف

ابوطالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا۔ آپؐ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ جب آپؐ کو اہلِ مکّہ کے قبولِ اسلام سے مایوسی کی صورت پیدا ہونے لگی تو اسی سال یعنی سنہ ۱۰ھ میں آخر ماہِ شوال میں زید بن حارثہ کو ساتھ لے کر طائف تشریف لے گئے اور اہلِ طائف کو کلمۂ حق کی دعوت دی اور ایک ماہ تک متواتر اُن کی تبلیغ و ہدایت میں مصروف رہے۔ مگر ایک شخص کو بھی قبولِ حق کی توفیق نہ ہوئی بلکہ ظالموں نے اپنے شہر کے چند اوباش لوگوں کو سنکا دیا کہ آپؐ کو تکلیف پہنچائیں۔ یہ سنگدل بدنصیب اس سرورِ کائناتؐ کے دَرپے ہوگئے کہ شانِ رحمت للعالمین مانع نہ ہو تو اس کی ایک جنبشِ لب میں ان کی ساری بدمستیوں کا خاتمہ ہوسکتا تھا اور طائف اور طائف کے بسنے والوں کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹایا جاسکتا تھا۔ ان بدبخت لوگوں نے آپؐ پر

---

[۱] سیرت مغلطائی صہ ۲۵ [۲] تاریخ وفات میں اور بھی مختلف روایات ہیں۔ مثلاً ماہِ رمضان ہجرت سے ۵ سال پہلے یا ۴ سال پہلے، بعد معراج کذا فی سیرت مغلطائی صہ ۲۶۔
[۳] اور اسی سال حضرت سودہؓ سے آپؐ کا نکاح ہوا اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے بعد اُن سے نکاح ہوا ہے (سیرت مغلطائی صہ ۲۶) ؎

پتھر برسانے شروع کیے جن سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک زخمی ہو جاتے تھے۔ زید بن حارثہ جس طرف سے پتھر آتا ہوا دیکھتے اس طرف خود کھڑے ہو کر آنحضرتؐ کو بچاتے اور پتھر کو اپنے سر پر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت زیدؓ کا سر زخمی ہو گیا۔ بالآخر رحمتِ عالم ایک ماہ بعد طائف سے اس طرح واپس ہوئے کہ آپؐ کے ٹخنے شریف لہولہان تھے، مگر زبانِ مبارک پر حرفِ بد دُعا اس وقت بھی نہ آتا تھا۔ (سیرت صـ۶۸)

اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ ابو طالب کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں بے یار و مددگار رہ گئے تو آپؐ نے تن تنہا طائف کا سفر کیا کہ وہاں کے قبیلہ بنی ثقیف سے کچھ مدد اور معاونت حاصل کر سکیں۔

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف پہنچے تو قبیلہ ثقیف کے تین بھائیوں کے پاس گئے جو قبیلہ کے سردار اور شریف سمجھے جاتے تھے۔ یہ تین بھائی عمیر کے بیٹے عبد یا لیل اور مسعود اور حبیب تھے اور اُن کے گھر میں ایک عورت قریش کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور اپنی قوم کے مظالم کا ذکر کر کے ان سے معاونت کے لئے فرمایا، مگر ان تینوں نے بڑا سخت جواب دیا اور آپؐ سے اور کچھ کلام نہیں کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ قبیلہ بنو ثقیف کے یہی تین آدمی ایسے شریف سمجھے جاتے تھے جن سے کسی معقول جواب کی امید تھی، اُن سے بھی مایوسی ہو گئی تو آپؐ نے اُن سے فرمایا:

"اچھا اگر آپ لوگ میری مدد نہیں کرتے تو کم از کم میرے آنے کو میری قوم پر ظاہر نہ کرنا"۔

مقصد یہ تھا کہ اگر ان کو میری خبر ملے گی تو اور زیادہ ستائیں گے، مگر ان ظالموں نے یہ بات بھی نہ مانی بلکہ اپنے قبیلے کے بے وقوف لوگوں اور غلاموں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا کہ آپؐ کو گالیاں دیں اور شور مچائیں۔ ان کے شور و شغب سے بہت سے اور شریر لوگ بھی جمع ہو گئے۔ آپؐ نے اُن کے شر سے بچنے کے لئے

ایک باغ میں جو عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا تھا، اس میں پناہ لی اور یہ دونوں بھی اس باغ میں موجود تھے۔ اس وقت یہ شریر لوگ آپؐ کو چھوڑ کر واپس ہوئے اور آپؐ انگوروں کے باغ کے سائے میں بیٹھ گئے۔

یہ دونوں بھائی آپؐ کو دیکھ رہے تھے اور یہ بھی دیکھا کہ ان کی قوم کے بیوقوفوں کے ہاتھوں آپؐ کو کیا تکلیف اور اذیت پیش آئی۔ اسی درمیان میں وہ قریشی عورت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے ملی جو اُن ظالموں کے گھر میں بیاہی تھی آپؐ نے اس سے شکایت کی کہ تمہاری سسرال کے لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔

جب باغ میں رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کو کچھ اطمینان حاصل ہُوا تو آپؐ نے اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں دُعا مانگنی شروع کی۔ اس دُعا کے الفاظ بھی عجیب وغریب ہیں اور کسی موقع پر آپؐ سے ایسے الفاظِ دُعا منقول نہیں۔ وہ دُعا یہ ہے :۔

اللّٰھم انی اشکوا الیک ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس وانت ارحم الرٰحمین وانت رب المستضعفین فانت ربی الیٰ من تکلنی الیٰ بعید یتھجمنی او الیٰ عدو ملکتہ امری ان تکن ساخطا علیّ فلا ابالی ولکن عافیتک ھی اوسع لی۔ اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت لہ الظلمات وصلح علیہ امر الدنیا والاخرۃ من ان ینزل لی غضبک لک العتبیٰ حتیٰ ترضیٰ ولا حول ولا قوۃ الا بک۔

(مظہری باختصار)

"یا اللہ! مَیں آپ سے شکایت کرتا ہوں اپنی قوت کے ضعف اور کمی کی اور اپنی تدبیر کی ناکامی کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی خفت و بے توقیری کی

اور آپ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں اور آپ کمزوروں کی پرورش فرمانے والے ہیں۔ آپؐ ہی میرے رب ہیں۔ آپؐ مجھے کس کے سپرد کرتے ہیں۔ کیا (ایک غیر آدمی کے جو مجھ پر حملہ کرے یا کسی دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے کہ جو چاہے کرے) اگر آپ مجھ پر ناراض نہ ہوں تو مجھے ان سب چیزوں کی بھی پرواہ نہیں، لیکن آپؐ کی عافیت میرے لئے زیادہ بہتر ہے (میں اس کو طلب کرتا ہوں) میں آپ کی ذاتِ مبارک کے نور کی پناہ لیتا ہوں جس سے تمام اندھیریاں روشن ہو جاتی ہیں اور اس کی بناء پر دُنیا اور آخرت کے سب کام درست ہو جاتے ہیں، اس بات سے کہ مجھ پر اپنا غضب نازل فرمائیں، ہمارا کام ہی یہ ہے کہ آپ کو راضی کرنے اور منانے میں لگے رہیں، جب تک کہ آپ راضی نہ ہو جائیں اور ہم تو کسی برائی سے بچ سکتے نہیں، نہ کسی بھلائی کو حاصل کر سکتے ہیں بجز آپ کی مدد کے۔"

جب ربیعہ کے دونوں بیٹوں عتبہ اور شیبہ نے یہ حال دیکھا تو اُن کے دل میں رحم آگیا اور اپنے ایک نصرانی غلام عداس، عداس نامی کو بُلا کر کہا کہ انگور کا ایک خوشہ لو اور ایک طبق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جاؤ اور اُن سے کہو یہ کھائیں۔

عداس نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے جا کر انگور کا یہ طبق آپؐ کے سامنے رکھ دیا۔ آپؐ نے بسم اللہ پڑھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عداس یہ دیکھ رہا تھا وہ کہنے لگا۔ واللہ! یہ کلام یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُس سے پوچھا۔

"عداس! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا کیا مذہب ہے؟"

اُس نے کہا "میں نصرانی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے نیک بندے یونس بن متی علیہ السلام کی بستی کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا کہ آپؐ کو یونس بن متی علیہ السلام کی کیا خبر؟ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ و آلہ وسلم

نے فرمایا کہ وہ میرے بھائی ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اللہ تعالےٰ کے نبی تھے میں بھی نبی ہوں یہ سُن کر عدّاس آپؐ کے قدموں پر گر پڑا اور آپؐ کے سر مبارک اور ہاتھوں پاؤں کو بوسہ دیا۔ عتبہ اور شیبہ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دُوسرے سے کہا کہ اُس نے ہمارے غلام کو تو خراب کر دیا۔

جب عدّاس لوٹ کر اُن کے پاس گیا تو انہوں نے کہا عدّاس تجھے کیا ہوا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگا۔ اس نے کہا میرے سردارو! اس وقت زمین پر اس سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس نے مجھے ایسی بات بتلائی جو نبی کے سوا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ انہوں نے کہا۔ کم بخت! ایسا نہ ہو کہ یہ آدمی تجھے تیرے مذاہب سے پھیر دے۔ کیونکہ تیرا دین بہرحال اُس کے دین سے بہتر ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم طائف سے مکّہ مکرّمہ کی طرف لوٹ گئے جبکہ ثقیف کی ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ۷۵ تا صـ۷۷)۔

اسراء اور معراج

نبوت کا پانچواں سال اسلام کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے جس میں فخر الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایک اعزازی جلوس کے ساتھ نوازا گیا جو انبیاءؑ کی جماعت میں سے بھی صرف آنحضرتؐ کی امتیازی خصوصیت ہے، جس کا مختصر واقعہ یہ ہے :-

ایک رات آپؐ حطیم کعبہ میں لیٹے ہوئے تھے کہ جبرائیل اور میکائیل علیہم السلام آئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلیئے۔ آپؐ کو براق پر سوار کیا گیا جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ جس جگہ اُس کی نظر پڑتی تھی وہیں قدم پڑتا تھا۔ اسی سرعت رفتاری کے ساتھ اول آپؐ کو ملکِ شام میں مسجدِ اقصیٰ تک لے گئے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاءؑ سابقین کو آنحضرتؐ کے اکرام کے لئے (بطور معجزہ) جمع فرمایا تھا۔ جبرائیل علیہ السلام نے یہاں پہنچ کر اذان دی۔ انبیاء و رسل کی صفیں تیار ہو کر کھڑی ہوئیں لیکن سب اس کا انتظار کر رہے تھے کہ نماز کون پڑھائے؟ جبرائیل امین نے آپؐ کا ہی دستِ مبارک پکڑ کر آگے کر دیا۔ آپؐ نے تمام انبیاء و مرسلین اور ملائکہ کو نماز پڑھائی۔ یہاں تک عالمِ دُنیا کی سَیر تھی جو براق پر ہوئی۔ اس کے بعد بہ ترتیب آپؐ کو آسمانوں کی سَیر کرائی گئی۔ پہلے آسمان پر آدم علیہ السلام سے مُلاقات ہوئی اور دُوسرے پر عیسیٰ و یحییٰ علیہ السلام سے اور تیسرے پر یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے پر ادریس علیہ السلام سے، پانچویں پر ہارون علیہ السلام سے، چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کی۔

(صحیح بخاری مع فتح الباری مصری صفحہ ۱۸۵ پ ۱۵)

اس کے بعد آپؐ سدرۃ المنتہیٰ کی طرف تشریف لے چلے۔ راستہ میں حوضِ کوثر پر گزر ہُوا پھر جنت میں داخل ہوئے۔ وہاں دستِ قدرت کے وہ عجائب و غرائب دیکھے جو نہ کسی آنکھ نے آج تک دیکھے اور نہ کسی کان نے سُنے اور نہ کسی انسان کے وہم و گمان کی وہاں تک رسائی ہوئی۔ پھر دوزخ آپؐ کے سامنے پیش کی گئی جو ہر قسم کے عذاب اور سخت شدید آگ سے بھری ہوئی تھی جس کے سامنے لوہے اور پتھر جیسی سخت چیزوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس میں آپؐ نے ایک جماعت کو دیکھا کہ مُردار کھا رہے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں؟ جبرائیل علیہ السّلام نے عرض کیا کہ یہ وہ ہیں جو لوگوں کے گوشت کھاتے ہیں۔ (یعنی ان کی غیبت کرتے تھے) پھر دوزخ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ پھر آنحضرتؐ آگے بڑھے اور جبرائیل امین یہیں ٹھہر گئے کیونکہ ان کو اس سے آگے درجہ کا حُکم نہیں تھا اور اس وقت آپؐ کو خداوند تعالیٰ کی زیارت ہُوئی۔

صحیح یہ ہے کہ زیارت فقط قلب سے نہیں بلکہ آنکھوں سے ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور تمام محققین صحابہؓ و آئمہ کی یہی تحقیق ہے۔ آنحضرتؐ سجدہ میں گر پڑے اور خداوند عالم سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہُوا۔ اسی وقت نمازیں فرض کی گئیں۔ اس کے بعد آپؐ واپس ہوئے۔ وہاں سے براق پر سوار ہو کر مکّہ معظمہ کی طرف تشریف لے چلے۔ راستہ میں مختلف مقامات میں قریش کے تین تجارتی قافلوں پر سے گزرے جن میں سے بعض کو آپؐ نے سلام کیا اور انہوں نے آپؐ کی آواز پہچانی اور مکہ واپس ہونے کے بعد اس کی شہادت دی۔ صبح سے پہلے ہی یہ سفر مبارک تمام ہو گیا۔

اسراءِ نبویؐ پر علمی شہادتیں

جب صُبح ہوئی اور یہ خبر قریش میں پھیلی تو اُن کا ایک عجیب عالم تھا، کوئی تالیاں بجاتا تھا اور کوئی تعجب سے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا اور کوئی تمسخر سے ہنس رہا تھا۔ پھر سب نے بغرض امتحان آپؐ سے سوالات شروع کئے اور دریافت

کیا کہ اچھا بتلائیے کہ بیت المقدس کی تعمیر اور ہیئت کیسی ہے اور پہاڑ سے کتنے فاصلہ پر ہے۔ آپؐ نے اس کا پورا نقشہ بتلا دیا۔ اسی طرح وہ مختلف چیزیں دریافت کرتے رہے۔ اور آپؐ بتلاتے رہے۔ یہاں تک کہ اب انھوں نے ایسے سوالات شروع کر دیئے جو باوجود ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بھی کوئی شخص نہ بتلا سکے۔ مثلاً یہ کہ مسجد کے کتنے دروازے ہیں، کتنے طاق ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں کون شمار کرتا ہے۔ اس لئے آپؐ کو سخت اضطراب ہوا۔ مگر بطور معجزہ مسجد اقصیٰ آپؐ کے سامنے کر دی گئی۔ آپؐ شمار کرتے اور بتاتے جاتے تھے۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَشْھَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ۔ اور قریش بھی اب تو سب کے سب چپ ہوئے اور کہنے لگے، حالات و صفات تو بالکل درست بیان کئے ہیں اور پھر حضرت صدیقؓ سے خطاب کر کے کہنے لگے کہ کیا تم اس کی تصدیق کرتے ہو کہ آپؐ ایک رات میں مسجد اقصیٰ تک پہنچ بھی گئے اور لوٹ بھی آئے؟ حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ میں اس سے بھی زیادہ بعید چیزوں میں آپؐ کی تصدیق کرتا ہوں میں ایمان لاتا ہوں کہ صبح شام ذرا سی دیر میں آپؐ کو آسمانی خبریں پہنچ جاتی ہیں تو پھر اس میں کیا تردد ہو سکتا ہے۔ اس لئے بھی آپ کا نام صدیق رکھا گیا ہے۔ (سیرت ص۶۹ تا ص۲)

خود کفارِ قریش کی چشم دید شہادتیں

اس کے بعد قریش نے پھر بغرض امتحان دریافت کیا۔ اچھا بتلاؤ ہمارا قافلہ جو ملکِ شام کی طرف گیا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا فلاں قبیلہ کے ایک تجارتی قافلہ پر مقام روحاء میں میرا گزر ہو رہا تھا، ان کا اونٹ گم ہو گیا تھا وہ سب اسی کی تلاش میں گئے ہوئے تھے۔ میں ان کے کجاووں کے پاس گیا تو وہاں کوئی نہ تھا اور ایک کوزہ میں پانی رکھا ہوا تھا، وہ میں نے پی لیا۔ اس کے بعد فلاں قبیلہ کے تجارتی قافلے پر فلاں مقام پر ہمارا گزر ہوا۔ جب براق اس کے قریب ہوا تو اونٹ دہشت سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور ان میں سے ایک سرخ اونٹ تھا جس پر دو خردار (گون) سیاہ

اور سپید تھے وہ تو بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے بعد فلاں قبیلہ کے تجارتی قافلہ پر فلاں مقام میں ہمارا گزر ہوا جس میں سب سے آگے ایک خاکی رنگ کا اونٹ تھا اور اس پر سیاہ ٹاٹ اور دو سیاہ خردار (گون) تھے۔ اور یہ قافلہ عنقریب تمہارے پاس آنے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کب تک؟ آپؐ نے فرمایا کہ بدھ کے روز تک آجائے گا۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح ہوا جیسا کہ آپؐ نے فرمایا تھا اور ان قافلوں نے بھی آپؐ کے بیانات کی تصدیق کی۔ جب قریش پر خدا تعالےٰ کی حجت تمام ہوگئی اور اس محیر العقول سفر کی خود ان کی قوم نے شہادت دی تھی تو اب معاندین کے لئے بھی اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ آپؐ کے اس سفر کو سحر اور آپؐ کو (معاذ اللہ) جادوگر کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ (سیرت صہ ۲، صہ ۴۳)۔

معراج کے جسمانی ہونے پر قرآن و سنّت کے دلائل

قرآن مجید کے ارشادات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے کہ اسراء و معراج کا تمام سفر روحانی نہیں تھا بلکہ جسمانی تھا جیسے عام انسان سفر کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے پہلے ہی لفظ سبحان[۱] میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔ کیونکہ یہ لفظ تعجب اور کسی بھی عظیم الشان امر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر معراج صرف روحانی بطور خواب کے ہوتی تو اس میں کون سی عجیب بات ہے۔ خواب تو ہر مسلمان بلکہ ہر انسان دیکھ سکتا ہے کہ میں آسمان پر گیا فلاں فلاں کام کئے۔

دوسرا اشارہ لفظ عبد سے اپنی طرف ہے کیونکہ عبد صرف روح نہیں بلکہ جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ۔

واقعہ معراج آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت ام ہانیؓ کو بتلایا تو انہوں

---

[۱] سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۔ (بنی اسرائیل آیت ۱)

نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اس کا کسی سے ذکر نہ کریں، ورنہ لوگ اور زیادہ تکذیب کریں گے۔ اگر معاملہ تکذیب کا ہوتا تو اس میں تکذیب کی کیا بات تھی۔

پھر جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے لوگوں پر اس کا اظہار کیا تو کفارِ مکہ نے اس کی تکذیب کی اور مذاق اڑایا۔ یہاں تک کہ بعض نومسلم اس خبر کو سُن کر مرتد ہو گئے۔ اگر معاملہ خواب کا ہوتا تو ان معاملات کا کیا امکان تھا۔ اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ آپ کو اس سے پہلے اور بعد میں کوئی معراج روحانی بصورت خواب بھی ہوئی ہو جو جمہور اُمت کے نزدیک آیت قرآن وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ میں رُؤیا سے مراد رویت ہے۔ مگر اس کو بلفظ رؤیا (جو اکثر خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) تعبیر کرنے کی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس معاملہ کو تشبیہ کے طور پر رُویا کہا گیا ہو کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خواب دیکھ لے اور اگر رویا کے معنی خواب ہی کے لئے جائیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ واقعہ معراج جسمانی کے علاوہ اس سے پہلے یا پیچھے یہ معراج روحانی بطور خواب بھی ہوئی ہو۔ اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عائشہ امّ المؤمنین سے جو اس کا واقعہ خواب ہونا منقول ہے وہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معراج جسمانی نہ ہوئی ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ احادیث اسراء کی متواتر ہیں اور نقاش نے بیس صحابہ کرامؓ کی روایات اس باب میں نقل کی ہیں اور قاضی عیاض نے شفاء میں اور زیادہ تفصیل کر دی ہے (قرطبی) اور امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ان تمام روایات کو پوری جرح و تعدیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ پھر پچیس صحابہ کرامؓ کے اسماء نقل کئے ہیں جن سے یہ روایات منقول ہیں۔ حضرت عمر ابن خطاب علی مرتضیٰ، ابن مسعود، ابوذر غفاری، مالک بن صعصعہ، ابوہریرہ، ابوسعید، ابن عباس، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبدالرحمٰن بن قرظ، ابوحیہ، ابولیلےٰ، عبداللہ بن عمر، جابر بن عبداللہ، حذیفہ بن یمان، بریدہ، ابوایوب انصاری، ابوامامہ، سمرہ بن جندب، ابوالحمراء، صہیب الرومی، امِّ ہانی،

عائشہ، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین۔

اس کے بعد ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے فرمایا: فحدیث الاسراء اجمع علیہ المسلمون واعرض عنہ الزنادقۃ والملحدون (ابن کثیر) ”واقعہ اسراء کی حدیث پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے صرف ملحد اور زندیق لوگوں نے اسے نہیں مانا“

مختصر واقعۂ معراج ابن کثیرؒ کی روایت سے

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور احادیث متعلقہ کی تفصیل کے بعد فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سفر اسراء بیداری میں پیش آیا۔ خواب میں نہیں۔ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا۔ جب آپؐ دروازۂ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا جس میں نیچے سے اوپر جانے کے درجے بنے ہوئے تھے۔ اسی زینہ کے ذریعے پہلے آپؐ پہلے آسمان پر تشریف لے گئے اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے (اس زینہ کی حقیقت تو اللہ تعالےٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیا اور کیسا تھا۔ آج کل بھی زینہ کی بہت سی قسمیں دنیا میں رائج ہیں جو خود حرکت میں لفٹ کی صورت کے زینے بھی ہیں اس سے اس معجزانہ زینہ کے متعلق کسی شک و شبہ میں پڑنے کا کوئی مقام نہیں) ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپؐ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے۔ مثلاً چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساتویں آسمان میں حضرت خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ پھر آپؐ ان تمام انبیاء علیہم السلام کے مقامات سے بھی آگے تشریف لے گئے اور ایک ایسے میدان میں پہنچے جہاں قلم تقدیر کے لکھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور آپؐ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا جس پر اللہ تعالےٰ جل شانہٗ کے حکم سے سونے کے

پروانے اور مختلف رنگ کے پروانے گر رہے تھے اور جس کو اللہ تعالےٰ کے فرشتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ اسی جگہ جبرئیل امین کو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ان کی اصل شکل میں دیکھا جس نے اُفق کو گھیرا ہوا تھا، رفرف مسند سبز، ہرے رنگ کی پالکی۔ اور آپؐ نے بیت المعمور کو بھی دیکھا جس کے پاس بانی کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دیوار پر کمر لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس بیت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جن کی باری داخل ہونے کی قیامت تک نہیں آتی اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جنت اور دوزخ کا بچشم خود معائنہ فرمایا۔ اس وقت آپؐ کی اُمت پر اوّل پچاس نمازیں فرض ہونے کا حکم ملا۔ پھر تخفیف کر کے پانچ کر دی گئیں۔ اس سے تمام عبادات کے اندر نماز کی خاص اہمیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپؐ واپس بیت المقدس میں اُترے اور جن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مختلف آسمانوں میں ملاقات ہوئی تھی وہ بھی آپؐ کے ساتھ اُترے (گویا) آپؐ کو رُخصت کرنے کے لئے بیت المقدس تک آپؐ کے ساتھ آئے۔ اس وقت آپؐ نے نماز کا وقت ہو جانے پر سب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اسی دن صبح کی نماز ہو۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ امامت انبیاء کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک آسمان پر جانے سے پہلے پیش آیا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ واپسی کے بعد ہوا ہے کیونکہ آسمانوں پر انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کے واقعہ میں یہ منقول ہے کہ سب انبیاء سے جبرائیل امین نے آپؐ کا تعارف کرایا۔ اگر واقعہ امامت پہلے ہو چکا ہوتا تو یہاں تعارف کی ضرورت نہ ہوتی اور یوں بھی ظاہر یہی ہے کہ اس سفر کا اصل مقصد ملاء اعلیٰ میں جانے کا تھا پہلے اسی کو پُورا کرنا اقرب معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب اصل کام سے فراغت ہوئی تو تمام انبیاء علیہم السلام آپؐ کے ساتھ مشایعت (رخصت) کے لئے بیت المقدس تک آئے اور آپؐ کو جبرائیل امین کے اشارہ سے سب کا امام بنا کر آپؐ کی سیادت پر اور سب پر فضیلت کا عملی ثبوت دیا گیا۔ اس کے بعد آپؐ بیت المقدس سے رخصت ہوئے اور براق پر سوار ہو کر اندھیرے

وقت میں مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

(تفسیر معارف القرآن ج ۵ ص ۴۲۸، ص ۴۲۹)

واقعۂ معراج کے متعلق ایک غیر مُسلم کی شہادت

تفسیر ابن کثیرؒ میں ہے کہ حافظ ابو نعیم اصبہانی نے اپنی کتاب "دلائل النبوۃ" میں محمد بن عمر واقدی کی سند سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے شاہ روم قیصر کے پاس اپنا نامۂ مبارک دے کر حضرت دحیہ ابن خلیفہ کو بھیجا۔ اس کے بعد حضرت دحیہ کے خط پہنچانے اور شاہِ روم تک پہنچنے اور اُس کے صاحبِ عقل و فراست ہونے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا (جو صحیح بخاری اور حدیث کی سب معتبر کُتب میں موجود ہے) جس کے آخر میں ہے کہ شاہ روم ہرقل نے نامہ مبارک پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیق کرنے کے لئے عرب کے ان لوگوں کو جمع کیا جو اس وقت اُن کے ملک میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے۔ شاہی حکم کے مطابق ابوسفیان ابن حرب اور اُن کے رفقاء جو اس وقت مشہور تجارتی قافلہ لے کر شام میں آئے ہوئے تھے وہ حاضر کئے گئے۔ شاہ ہرقل نے ان سے وہ سوالات کئے جن کی تفصیل صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ ابوسفیان کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق کچھ ایسی باتیں بیان کریں جن سے آپؐ کی حقارت اور بے حیثیت ہونا ظاہر ہو، مگر ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اپنے اس ارادے سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس کا جھوٹ ہونا کھل جائے اور مَیں بادشاہ کی نظر سے گر جاؤں اور میرے ساتھی بھی ہمیشہ مجھے جھوٹا ہونے کا طعنہ

---

[1] واقدی کو روایت حدیث میں محدثین نے ضعیف کہا ہے لیکن امام ابن کثیرؒ جیسے محتاط محدث نے ان کی روایت کو نقل کیا ہے اس لئے کہ اس معاملہ کا تعلق عقائد یا حلال وحرام سے نہیں ایسے تاریخی معاملات میں ان کی روایت معتبر ہے (منہ)

دیا کریں۔ البتہ مجھے اس وقت خیال آیا کہ اس کے سامنے واقعہ معراج بیان کروں جس کا جھوٹ ہونا بادشاہ خود سمجھ لے گا تو میں نے کہا کہ میں ان کا معاملہ آپ سے بیان کرتا ہوں جس کے متعلق آپ خود معلوم کر لیں گے کہ وہ جھوٹ ہے۔ ہرقل نے پوچھا وہ کیا واقعہ ہے؟ ابوسفیانؓ نے کہا کہ یہ مدعی نبوت یہ کہتے ہیں کہ وہ ایک رات میں مکہ مکرمہ سے نکلے اور آپؐ کی اس مسجد میں بیت المقدس پہنچے اور پھر اسی رات میں صبح سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہمارے پاس پہنچ گئے۔

ایلیا (بیت المقدس) کا سب سے بڑا عالم اس وقت شاہ روم ہرقل کے سرہانے پر قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے بیان کیا میں اس رات سے واقف ہوں۔ شاہ روم اس کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ آپ کو اس کا علم کیسے ہوا اور کیونکر ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ میری عادت تھی کہ رات کو میں اس وقت تک سوتا نہیں تھا جب تک بیت المقدس کے تمام دروازے بند نہ کر دوں۔ اس رات میں نے حسب عادت تمام دروازے بند کر دیئے۔ مگر ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا۔ دروازے کے کواڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی پہاڑ کو ہلا رہے ہیں۔ میں نے عاجز ہو کر کاریگروں اور نجاروں کو بلایا۔ انہوں نے دیکھ کر کہا کہ ان کواڑوں کے اوپر دروازے کی عمارت کا بوجھ پڑ گیا ہے۔ اب صبح سے پہلے اس کے بند ہونے کی کوئی تدبیر نہیں۔ صبح کو ہم دیکھیں گے کہ کس طرح کیا جائے؟

میں مجبور ہو کر لوٹ آیا اور دونوں کواڑ اس دروازے کے کھلے رہے۔ صبح ہوتے ہی پھر اس دروازے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دروازہ مسجد کے پاس ایک پتھر کی چٹان میں روزن کیا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی جانور باندھا گیا ہے۔ اس وقت میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج اس دروازہ کو اللہ تعالٰے نے شاید اس لئے بند ہونے سے روکا ہے کہ کوئی نبی یہاں آنے والے تھے اور پھر بیان کیا کہ اس رات آپؐ نے ہماری مسجد میں نماز بھی پڑھی ہے۔ اس کے بعد اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴، معارف القرآن ج ۵ ص ۴۲۹، ص ۴۳۰)۔

اسراء و معراج کی تاریخ

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ معراج کی تاریخ میں روایات بہت مختلف ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کی روایات یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت مدینہ سے چھ ماہ قبل پیش آیا اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ام المؤمنینؓ کی وفات نمازوں کی فرضیت نازل ہونے سے پہلے ہو چکی تھی۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کا واقعہ بعثت نبویؐ کے سات سال بعد ہوا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ واقعہ معراج بعثتِ نبویؐ سے پانچ سال بعد میں ہوا ہے۔ ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ واقعۂ معراج اس وقت پیش آیا جبکہ اسلام عام قبائل عرب میں پھیل چکا تھا۔ ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ واقعہ معراج ہجرتِ مدینہ سے کئی سال پہلے کا ہے۔

حربی کہتے ہیں کہ واقعہ اسراء و معراج ربیع الثانی کی ستائیسویں شب میں ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا ہے۔ ابن قاسم ذہبی کہتے ہیں کہ بعثت سے اٹھارہ مہینے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ حضرات محدثین نے روایات مختلفہ ذکر کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کن چیز نہیں لکھی اور مشہور عام طور پر یہ ہے کہ ماہِ رجب کی ستائیسویں شب، شبِ معراج ہے۔ واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن ج ۵ ص ۴۳۰، ص ۴۳۱)

مسجدِ حرام اور مسجدِ اقصیٰ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا "مسجدِ حرام" پھر میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد کون سی؟ تو آپؐ نے فرمایا "مسجد اقصیٰ" میں نے دریافت کیا کہ ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فیصلہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا "چالیس سال" پھر فرمایا کہ مسجدوں کی ترتیب تو یہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے ساری زمین کو مسجد بنا دیا ہے۔ جس جگہ نماز کا وقت آئے وہیں نماز ادا کرلو۔ (رواہ مسلم)

امام تفسیر مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کی جگہ کو پوری زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا ہے اور اس کی بنیادیں ساتویں زمین کے اندر تک پہنچی ہوئی ہیں اور مسجد اقصیٰ کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے (رواہ النسائی باسناد صحیح عن عبداللہ بن عمر رضؓ تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۱۳۷)۔

مسجد حرام اس مسجد کا نام ہے جو بیت اللہ کے گرد بنی ہوئی ہے اور بعض پورے حرم کو بھی مسجد حرام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے دو روایتوں کا یہ تعارض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ بعض روایات میں آپؐ کا اسراء کے لئے تشریف لے جانا اور بعض میں حطیم بیت اللہ سے، اگر مسجد حرام کے عام معنی لئے جائیں تو یہ کچھ مستبعد نہیں کہ آپؐ ام ہانی رضؓ کے مکان میں ہوں وہاں سے چل کر حطیم کعبہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے سفر اسراء کی ابتداء ہوئی۔ (معارف القرآن ج ۵ ص ۴۳۱)۔

مسجد اقصیٰ اور ملکِ شام کی برکات

آیت (اسراء) میں بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ میں حول سے مراد پوری زمین شام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش سے دریائے فرات تک مبارک زمین بنائی ہے اور اس میں سے فلسطین کی زمین کو تقدّس خاص عطا فرمایا ہے (روح المعانی) اس کی برکات دینی بھی ہیں اور دُنیاوی بھی۔ دینی برکات تو یہ ہیں کہ وہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اور تمام انبیاء کا مسکن و مدفن ہے اور دنیوی برکات اس کی زمین کا سرسبز ہونا اور اس میں عمدہ چشمے، نہریں اور باغات وغیرہ ہیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اے ملکِ شام تُو تمام شہروں میں سے میرا منتخب خطّہ ہے اور میں تیری طرف اپنے منتخب بندوں کو پہنچاؤں گا (قرطبی) اور مسند احمد میں حدیث ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ) دجال ساری دُنیا میں پھرے گا، مگر چار مسجدوں تک اُس کی رسائی نہ ہوگی۔ مسجد مدینہ، مسجد مکہ مکرمہ، مسجد اقصیٰ اور مسجد طور۔

(معارف القرآن ج ۵ ص ۴۳۱، ص ۴۳۲)

شبِ معراج میں رویت جبرئیل علیہ السلام

سورۃ النجم کی تقریباً ابتدائی اٹھارہ آیات میں واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے جن میں :

وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی ۝ عِنْدَہَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی ۝

(النجم آیت ۱۳ تا ۱۵)

صحیح بخاری میں شیبانی سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت زر سے اس آیت کا مطلب پوچھا وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی ۝ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی ۝ انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حدیث بیان کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو اس حالت میں دیکھا کہ اُن کے چھ سو بازو تھے۔ اور ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے آیت فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جبرائیل امین کو دیکھا اس حالت میں کہ وہ رفرف کے لباس میں تھے اور زمین و آسمان کی درمیانی فضا کو بھر رکھا تھا۔ (غرض) سورۂ نجم کی آیات مذکورہ میں روایت ہے قرب سے مراد جبرائیل علیہ السلام کی رویت اور قرب ہے۔ یہ قول صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابوذر غفاریؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے۔ اسی لئے ابنِ کثیرؒ نے آیاتِ مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا " ان آیات میں جس رویت اور قرب کا ذکر ہے وہ رویت و قرب جبرائیل امین کی مراد ہے جبکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ اُن کی اصلی صورت میں دیکھا تھا۔ پھر دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا اور یہ پہلی رویت نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے میں ہوئی۔ جبکہ جبرائیل علیہ السلام پہلی مرتبہ سورہ اقراء کی آیتوں کی وحی لے کر آئے۔ اس کے بعد وحی میں فترت یعنی وقفہ پیش آیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غم اور تکلیف تھی۔ بارہا یہ خیالات دل میں آئے کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دیں۔ مگر جب کبھی ایسی صورت ہوئی تو جبرائیل امینؑ غائبانہ ہوا سے آواز دیتے کہ اے محمدؐ! آپ اللہ تعالےٰ کے رسول برحق ہیں اور میں

جبرائیلؑ ہوں۔ ان کی آواز سے آپؐ کا دل ٹھہر جاتا اور سکون ہو جاتا تھا۔ جب کبھی ایسا وقت آیا اسی وقت جبرائیل نے اس آواز کے ذریعے تسلّی دی۔ مگر یہ تسلّیاں غائبانہ تھیں۔ یہاں تک کہ ایک روز جبرائیل امین بطحا کے کھلے میدان میں اپنی اصلی صورت میں اس طرح ظاہر ہوئے کہ اُن کے چھ سو بازو تھے اور پورے افق کو گھیر رکھا تھا۔ پھر جبرائیل امین آپؐ کے قریب آئے اور آپؐ کو وحیٔ الٰہی پہنچائی۔ اس وقت رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر جبرائیل امین کی عظمت اور اللہ تعالےٰ کے نزدیک جلالتِ قدر کی حقیقت روشن ہوئی۔ (ابن کثیر)

(معارف القرآن ج ۸ ص ۱۹۶، ص ۱۹۷)

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی میں رویت باری تعالیٰ بھی شامل ہونیکا احتمال ہے

استاذِ محترم حجۃ الاسلام حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب قدس سرّہٗ العزیز نے سُورۃ النجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے :-

(الف) قرآن کریم نے اپنے عام اسلوب کے مطابق سورہ نجم کی ابتدائی آیات میں دو واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک واقعہ جبرائیل امین کو اُن کی اصلی صورت میں اس وقت دیکھنے کا ہے جب کہ آپ فترت وحی کے زمانے میں مکّہ مکرّمہ سے کہیں جا رہے تھے اور یہ واقعہ اسراء معراج سے پہلے کا ہے۔

(ب) دُوسرا واقعہ شبِ معراج کا ہے جس میں جبرائیل امین کو اُن کی اصلی صورت میں دوبارہ دیکھنے سے کہیں زیادہ دوسرے عجائب اور اللہ تعالےٰ کی آیات کبریٰ کا دیکھنا مقصود ہے۔ ان آیاتِ کبریٰ میں خود حق تعالےٰ سبحانہٗ کی زیارت و رویت کا شامل ہونا بھی محتمل ہے۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۲۰۳، معارف انور مرتبہ احقر قریشی)

مدینہ طیبہ میں اسلام

دس سال تک برابر آنحضرت صلّی اللہ وسلّم قبائل عرب کو اعلان کے ساتھ دعوتِ اسلام دیتے رہے اور کوئی مجمع نہیں چھوڑا جس میں جا کر آپؐ نے اُن کو تبلیغ حق نہ کی ہو۔ موسم حج میں بازار عکاظ اور ذی المجاز وغیرہ میں گھر گھر جا کر لوگوں کو حق کی طرف بُلاتے رہے۔ مگر وہ اس کے جواب میں آپؐ کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچاتے اور مذاق اُڑاتے تھے کہ پہلے اپنی قوم کو مسلمان بنائیے پھر ہماری ہدایت کے لئے آئیے۔ اسی پر ایک مُدت گزر گئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اسلام کی اشاعت اور ترقی ہو تو قبیلہ اوس کے چند آدمی مدینہ سے آپؐ کی خدمت میں بھیج دیئے جن میں سے اس سال دو شخص اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس مشرف باسلام ہوئے اور پھر آئندہ سال ان میں سے کچھ اور آئے جن میں سے چھ یا آٹھ آدمی مسلمان ہوئے۔ نبی کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے ان سے فرمایا کہ کیا تم پیغام خداوندی کی تبلیغ میں میری مدد کرو گے؟ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ابھی ہمارے آپس کے اوس و خزرج کی خانہ جنگیاں ہو رہی ہیں۔ اگر اس وقت جناب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ کی بیعت پر سب کا اجتماع نہ ہو سکے گا۔ ابھی ایک سال اس ارادہ کو ملتوی فرمائیں۔ ممکن ہے کہ ہماری آپس میں صلح ہو جائے اور پھر اوس و خزرج مل کر اسلام قبول کر لیں۔ آئندہ سال ہم پھر حاضر خدمت ہونگے۔[۱] اس وقت اس کا

---

[۱] اس وقت مدینہ کی آبادی دو قسم کے لوگوں پر مشتمل تھی، مشرکین اور اہلِ کتاب۔ مشرکین دو بڑے قبیلوں پر منقسم تھے، اوس اور خزرج۔ اور یہ دونوں آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور تقریباً ایک سو بیس سال سے اُن کے درمیان آپس میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا (سیرتِ طیبہ ج ۱ صفحہ ۹) اسی طرح یہود بھی دو صفوں میں منقسم ہو گئے تھے، بنو قریظہ اور بنو نضیر۔ یہ دونوں بھی آپس میں قدیم عداوتیں رکھتے تھے (بیضاوی مع حاشیہ)۔

فیصلہ ہوسکے گا۔ یہ حضرات واپس مدینہ آئے اور مدینہ میں سب سے پہلے مسجد بنی زریق میں قرآن پڑھا گیا۔ خداوند عالم کو منظور تھا کہ مدینہ میں اسلام کی اشاعت ہو۔ اسی سال بھر کے عرصہ میں اوس و خزرج کے اکثر جھگڑے مٹ گئے اور سال آئندہ حج کے موقع پر حسب وعدہ بارہ آدمی آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں سے دس قبیلہ خزرج کے اور دو اوس کے تھے۔ ان میں سے جو لوگ سالِ گزشتہ مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ اب مسلمان ہوگئے اور سب کے سب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ یہ بیعت چونکہ سب سے پہلے عقبہ[1] کے پاس ہوئی تھی اس لئے اس کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا گیا (سیرت حلبیہ ج ۲ اص ۲۲) یہ لوگ مسلمان ہوکر مدینہ طیبہ واپس آئے تو مدینہ کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا تھا اور ہر مجلس میں یہی ایک بات رہ گئی۔ (سیرت ص ۴۴، ص ۴۵)

قبیلہ بنو نضیر کی تاریخ اور ان کی جلاوطنی

بنو نضیر یہود کا ایک قبیلہ ہے (جو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت وہاں آباد تھا) جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے، ان کے آباء و اجداد تورات کے عالم تھے جس میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خبر اور آپؐ کا حلیہ اور علامات مذکور تھے اور یہ کہ اُن کی ہجرت یثرب (مدینہ) ہوگی۔ یہ خاندان اس طمع میں کہ خاتم الانبیاءؐ کے ساتھ رہیں، شام سے مدینہ طیبہ منتقل ہوا تھا، اُن کے موجودہ لوگوں میں بھی کچھ تورات کے عالم تھے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد علامات دیکھ کر پہچان بھی لیا تھا کہ یہ وہی خاتم الانبیاء ہیں لیکن ان کا خیال تھا کہ وہ آخری نبی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں اُن کے خاندان میں ہوں گے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں مبعوث ہوئے تو اس حسد نے ان لوگوں کو ایمان لانے سے روک دیا۔ مگر دل میں ان کے اکثر

---

[1] یعنی جمرۂ عقبہ جو مدینہ کے ابتدائی حصے میں واقع ہے اور حج کرنے والے اس پر کنکریاں مارتے ہیں۔ بعد میں اس جگہ ایک مسجد بھی تعمیر کردی گئی تھی جو مسجد بیعت کے نام سے موسوم ہے۔ (منہ)

لوگ آپؐ کے آخرالانبیاء ہونے کو جانتے پہچانتے تھے اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی حیرت انگیز فتح اور مشرکین کی شکست دیکھ کر اُن کا یہ یقین کچھ اور بڑھا تھا، اس کا اقرار اُن کی زبانوں سے سنا بھی گیا، مگر اس ظاہری فتح و شکست کو حق و باطل پہچاننے کا معیار بنا لینا ہی ایک بودی اور کمزور بنیاد تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غزوۂ اُحد میں جب ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی کچھ حضرات صحابہؓ شہید ہوئے تو اُن کا یقین متزلزل ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے مشرکین مکہ سے ساز باز شروع کر دی۔

اس سے پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ پہنچ کر حکیمانہ سیاست کے مقتضیٰ پر سب سے پہلا یہ کام کیا تھا کہ مدینہ طیبہ میں اور شہر کے آس پاس کچھ یہود کے قبائل آباد تھے، ان سے معاہدۂ صلح اس پر کر لیا تھا کہ یہ لوگ نہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے اور نہ کسی جنگ کرنے والے کی امداد کریں گے۔ اگر کوئی ان پر حملہ آور ہوا تو مسلمان ان کی امداد کریں گے۔ صلحنامہ میں اور بھی بہت سی دفعات تھیں جن کی تفصیل سیرت ہشام وغیرہ میں مذکور ہے۔ اسی طرح یہود کے تمام قبائل جن میں بنونضیر بھی داخل تھے، مدینہ طیبہ میں دو میل کے فاصلہ پر ان کی بستی اور مضبوط قلعے اور باغات تھے۔ غزوۂ اُحد تک یہ لوگ بظاہر اس صلح نامہ کے پابند نظر آئے۔ مگر اُحد کے بعد انھوں نے غداری کی اور خفیہ خیانت شروع کر دی۔ اس غدر و خیانت کی ابتداء اس سے ہوئی کہ بنونضیر کا ایک سردار کعب بن اشرف غزوہ اُحد کے بعد اپنے یہودیوں کے چالیس آدمیوں کے ایک قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچا اور یہاں کے کفار قریش جو غزوۂ بدر کی شکست کا بدلہ لینے کی نیت سے غزوۂ اُحد پر گئے تھے اور اس میں بالآخر شکست کھا کر واپس ہو چکے تھے، ان سے ملاقات کی اور ان دونوں میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا ایک معاہدہ ہونا قرار پایا جس کی تکمیل اس طرح کی گئی کہ کعب بن اشرف اپنے چالیس یہودیوں کے ساتھ اور اُن کے بالمقابل ابوسفیان اپنے چالیس قریشیوں کے ساتھ حرم بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر یہ معاہدہ کیا کہ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں گے۔ کعب بن اشرف

اس معاہدہ کے بعد مدینہ طیبہ واپس آیا تو جبرائیل امین نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ اور معاہدے کی تفصیل بتادی۔ آنحضرتؐ نے کعب بن اشرف کے قتل کا حکم جاری فرمادیا۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ صحابیؓ نے اُس کو قتل کردیا۔

اس کے بعد بنو نضیر کی مختلف خیانتیں اور سازشیں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو معلوم ہوتی رہیں جن میں ایک واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کی سازش کی اور اگر فوری طور پر آنحضرتؐ بذریعہ وحی اس سازش پر مطلع نہ ہوتے تو یہ لوگ اپنی سازش قتل میں کامیاب ہوجاتے۔ کیونکہ جس مکان کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو انہوں نے بٹھایا تھا، اس کی چھت پر چڑھ کر ایک بڑا بھاری پتھر چھوڑ دینے کا منصوبہ تقریباً مکمل ہوچکا تھا جو شخص اس منصوبہ کو عملی صورت دینے والا تھا اس کا نام عمر بن حجاش تھا۔ حق تعالےٰ جل شانہٗ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی اور یہ منصوبہ فیل ہوگیا۔

ایک عبرت

یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ بعد کے واقعہ میں سارے ہی بنو نضیر جلاوطن ہوکر مدینہ سے نکل گئے مگر ان میں سے صرف دو مسلمان ہوکر محفوظ و مامون رہے۔ ان دو میں ایک یہی عمر بن حجاش تھے اور دوسرے اُن کے چچا یامین بن عمرو بن کعب تھے۔ (ابن کثیر)

عمرو بن امیہ ضمری کا واقعہ

عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہوگئے تھے۔ ان کا خون بہا جمع کرنے کی کوشش رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم فرما رہے تھے۔ اسی خون بہا کے سلسلے میں بنو نضیر کا چندہ حاصل کرنے کے لئے آپؐ اُن کی بستی میں تشریف لے گئے تھے۔ اس کا واقعہ ابن کثیر نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کی سازشیں اور مظالم کی داستان تو بہت طویل ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ بیر معونہ کا تاریخ اسلام میں معروف و مشہور ہے کہ بعض منافقین دکفار نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے اپنی بستی میں تبلیغ اسلام کے لئے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت

بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ نے ستّر صحابہ کرامؓ اُن کے ساتھ کئے۔ بعد میں حقیقت یہ کھلی کہ ان لوگوں نے یہ محض سازش کی تھی، ان سب کو گھیر کر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے صرف عمرو بن امیہ ضمری کسی طرح نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جو بزرگ ابھی کفار کی یہ غداری اور خیانت اور اپنے انہتر بھائیوں کا بے دردی سے قتل دیکھ کر آرہے تھے، ان کا جذبہ کفار کے مقابلے میں کیا ہوگا؟ ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ مدینہ طیبہ واپس آنے کے وقت راستہ میں ان کو دو کافروں سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں آدمی قبیلہ بنی عامر کے تھے، جن سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح تھا۔ مسلمانوں کے معاہدات آج کل کے سیاسی لوگوں کے معاہدات تو ہوتے نہیں کہ پہلے ہی خلاف ورزی اور عہد شکنی کی راہیں تلاش کر لی جاتی ہیں۔ یہاں تو جو کچھ زبان یا قلم سے نکلتا تھا۔ دین و مذہب اور خدا تعالیٰ کے حکم کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی پابندی لازمی تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپؐ نے اصولِ شریعت کے مطابق ان دونوں مقتولوں کی دیت (خوں بہا) ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا اور اس کے لئے مسلمانوں سے چندہ کیا۔ اس میں بنو نضیر کے پاس بھی چندہ کے سلسلے میں جانا ہوا۔ (ابن کثیر)

بنو نضیر کی جلاوطنی اور موجودہ اہلِ سیاست کے لئے سبق آموز معاملہ

آج کے بڑے حکمران اور بڑی حکومتیں جو انسانی حقوق کے تحفظ پر بڑے لیکچر دیتے ہیں اور اس کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں اور دُنیا میں تحفظ حقوق انسانیت کے چودھری کہلاتے ہیں۔ ذرا اس واقعہ پر نظر ڈالیں کہ بنو نضیر کی مسلسل سازشیں، خیانتیں، قتلِ رسولؐ کے منصوبے، جو آپؐ کے سامنے آتے رہے۔ اگر آج کل کے کسی حکمران اور کسی سربراہِ مملکت کے سامنے آئے ہوتے تو ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیئے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا؟ آج کل تو زندہ لوگوں پر پیٹرول چھڑک کر میدان صاف کر دینا کسی بڑے اقتدار و حکومت کا بھی محتاج نہیں۔ کچھ غنڈے شریر جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ شاہانہ غیظ و غضب

کے کرشمے اس سے آگے ہوتے ہیں۔ مگر یہ حکومت خدا اور اس کے رسولؐ کی ہے۔ جب خیانتیں اور غداریاں انتہا کو پہنچ گئیں تو اس وقت بھی ان کے قتلِ عام کا ارادہ نہیں فرمایا۔ ان کے مال و اسباب چھین لینے کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ :

(۱) اپنا سب سامان لے کر شہر خالی کر دینے کا فیصلہ کیا۔

(۲) اس کے لئے بھی دس روز کی مہلت دی تاکہ آسانی سے اپنا سامان ساتھ لے کر اطمینان سے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جائیں۔ جب اس کی بھی خلاف ورزی کی تو قومی اقدام کی ضرورت پیش آئی۔

(۳) اس لئے کچھ درخت تو جلائے گئے اور کچھ کاٹے گئے تاکہ اُن پر اثر پڑے۔ مگر قلعے کو آگ لگا دینے کا یا ان کے قتلِ عام کا حکم اُس وقت بھی نہیں دیا گیا۔

(۴) پھر جب مجبور ہو کر ان لوگوں نے شہر خالی کر دینے کا فیصلہ منظور کر لیا تو اس فوجی اقدام کے باوجود ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ ایک اُونٹ پر جس قدر سامان ایک آدمی لے جا سکتا ہے، لے جائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے مکانوں کی کڑیاں، تختے، دروازے اور کواڑ تک اتار کر لاد لئے۔

(۵) اس ساز و سامان کے ساتھ منتقل ہونے والے ان لوگوں کو کسی مسلمان نے ترچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ امن و عافیت اور پورے اطمینان کے ساتھ وہ یہ سامان لے کر رُخصت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے یہ معاملات اس وقت کے ہیں، جبکہ آپؐ کو اپنے دشمن سے پورا پورا انتقام لینے کی مکمل قدرت اور طاقت حاصل تھی۔ ان غدّار، خائن، اور سازشی دشمنوں کے ساتھ آپؐ کا یہ معاملہ اسی کی نظیر ہے جو فتح مکّہ کے بعد دشمنوں کے ساتھ آپؐ نے فرمایا۔

(معارف القرآن ج ۱ صـ ۳۵۸ تا صـ ۳۶۱)

❖

سب سے پہلا مدرسہ مدینہ طیبہ میں

مدینہ پہنچ کر اوس و خزرج کے ذمہ دار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خط لکھا کہ یہاں بحمد اللہ اسلام کی اشاعت ہو چکی ہے۔ اب کسی صاحب کو ہمارے یہاں بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن شریف پڑھائے اور لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت اور ہمیں احکام شرعیہ کی تعلیم دے اور نمازیں ہمارے لئے امام بنے۔ آپؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو تعلیم قرآن کے لئے بھیج دیا اور اسلام میں سب سے پہلے مدرسہ کی بنیاد مدینہ طیبہ میں پڑ گئی۔

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۳۰۲)

آئندہ سال حج کے ایام میں مدینہ طیبہ سے ایک بڑا قافلہ مکہ معظمہ پہنچا جن میں ستر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا اور ان سے عقبہ کے پاس رات کو ملنے کا وعدہ فرمایا۔ حسب وعدہ نصف رات کے وقت سب لوگ جمع ہو گئے۔ آنحضرتؐ کے ساتھ آپؐ کے چچا عباسؓ بھی تشریف لائے۔ اگرچہ حضرت عباسؓ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، جب سب جمع ہو گئے تو حضرت عباسؓ نے ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ "یہ میرا بھتیجہ (نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہمیشہ اپنی قوم میں عزت و حفاظت کے ساتھ رہا ہے، تم جو اس کو مدینہ لے جانا چاہتے ہو تو دیکھ لو کہ اگر تم ان کے عہد کو پورا کر سکو اور مخالفین سے اس کی پوری حفاظت کر سکو تو اس کا ذمہ لو، ورنہ ان کو اپنے قبیلہ میں ہی رہنے دو۔ مدنی قبیلہ کے سردار نے کہا بے شک ہم اس کا ذمہ لیتے ہیں اور ہمارا یہی قصد ہے کہ آپؐ کی بیعت کو پورا کریں۔ یہ سن کر (عہدِ بیعت کو پختہ کرنے کے لئے) حضرت اسعد بن زرارہ بول اٹھے: اے اہلِ مدینہ ذرا ٹھہرو! تم سمجھتے ہو کہ آج تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ سمجھ لو کہ یہ بیعت تمام عرب و عجم کے مقابلہ میں اور مخالفت کا عہد ہے۔ اگر تم اس کو نباہ سکتے ہو تو عہد کرو ورنہ عذر کر دو۔ اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم کسی حال میں اس بیعت سے ہٹنے والے نہیں۔ پھر عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہم نے اس عہد کو پورا کیا تو ہمیں اس کی کیا جزا ملے گی؟ آپؐ نے

فرمایا۔ اللہ تعالےٰ کا راضی ہونا اور جنّت۔ یہ سُن کر سب نے کہا کہ ہم اس پر راضی ہیں۔ آپؐ اپنا دستِ مبارک دیجئے کہ ہم بیعت کریں۔ آپؐ نے ہاتھ بڑھایا اور یہ سب بیعت سے مشرّف ہوئے۔

خدا جانے اس رسول امینؐ کی نظر فیض اثر اور چند کلمات نے ان لوگوں پر کیا اثر کیا تھا کہ ایک ہی صحبت میں تمام دنیوی علائق اور جاہ و مال اور عزّت و آبرو اُس کے مقابلے پر قربان کر سکنے کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور پھر یہ رنگ ان کی اولاد تک قائم رہا۔ حضرت امِ عمارہؓ جو شریکِ بیعت تھیں، اُن کے صاحبزادے حضرت حبیبؓ کا واقعہ ہے کہ ان کو مسیلمہ کذّاب مدّعیٔ نبوّت نے گرفتار کیا اور طرح طرح کے عذاب میں مُبتلا رکھ کر نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ لیکن اس عہد کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالا۔ یہ ظالم ان سے دریافت کیا کرتا تھا کہ محمّد اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں؟ تو وہ فرماتے، بے شک! پھر پوچھتا کہ اس کی بھی گواہی دیتے ہو کہ میں بھی اللہ تعالےٰ کا رسول ہوں، تو فرماتے ہرگز نہیں۔ اس پر وہ ان کا ایک عضو کاٹ لیتا تھا۔ پھر دوبارہ اسی طرح دریافت کرتا تھا اور جب وہ اس کی نبوّت ماننے سے انکار کرتے تو کم بخت ایک اور عضو کاٹ ڈالتا۔ اسی طرح ایک ایک عضو کر کے تمام بدن کے ٹکڑے کر دیئے۔ (سیرت حلبیہ ص۲۰۹)

الغرض شہید ہو گئے کہ باوجود جائز ہونے کے اس کو گوارا نہ کیا کہ عہدِ اسلام کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالیں ؎

اگرچہ خرمن عمرم غمِ تو داد بباد
بخاکِ پائے عزیزت کہ عہد نشکستم

(تیرے غم نے اگرچہ میرے خرمنِ عمر کو برباد کر دیا لیکن تیرے قدم کی قسم کہ میں نے تیرا عہد نہیں توڑا)۔

اس کے بعد سب نے بیعت کی۔ اس وقت مبایعین کی تعداد تہتّر مرد اور دو عورتیں تھیں اور اس بیعت کا نام بیعتِ عقبہ ثانیہ ہے۔ اس کے بعد سب نے اُن میں سے بارہ آدمیوں کو تمام قافلہ کا ذمّہ دار امیر بنا دیا۔ (سیرت حلبیہ ج ۲ ص۱۱)۔

ہجرتِ مدینہ کی ابتداء

قریش کو جب اس بیعت کی خبر ہوئی تو ان کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور مسلمانوں کو ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا۔ صحابہ نے آہستہ آہستہ قریش سے خفیہ ایک، ایک، دو، دو کرکے مکہ معظمہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مکہ میں آنحضرتؐ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علیؓ اور تھوڑے سے غیر مستطیع لوگوں کے علاوہ کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔ صدیق اکبرؓ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا تھا۔ مگر آپؐ نے ان کو فرمایا کہ ابھی ٹھہرو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ مجھے بھی ہجرت کی اجازت دے دے۔ صدیق اکبرؓ اس کے انتظار میں رہے اور دو اونٹنیاں اس سفر کے لئے مہیا کیں۔ ایک اپنے لئے اور دوسری آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے۔ (سیرت مصطفائی صد ۱۳۱ و سیرت صد ۷۶ تا صد ۷۷)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ

کفارِ قریش کو جب حالات معلوم ہوئے تو دار الندوہ میں مشورہ کرنے کے لئے جمع ہوئے کہ اب آپؐ کے معاملے میں کیا کیا جائے؟ کسی نے قید کرنے کی رائے دی، اور کسی نے جلاوطن کرنے کی۔ مگر ان کے چالاک لوگوں نے کہا کہ یہ مناسب نہیں۔ کیونکہ قید کرنے کی صورت میں ان کے اعوان و انصار ہم پر چڑھ آئیں گے اور ہم سے چھڑا لیں گے اور جلاوطن کرنے کی صورت میں تو سراسر ہمارے لئے مضر ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اطراف مکہ کے تمام عرب آپؐ کے کریمانہ اخلاق اور شیریں کلام اور کلام پاک کے گرویدہ ہوجائیں گے اور وہ ان سب کو لے کر ہم پر چڑھائی کریں گے (سیرت مغلطائی) اس لئے بدبخت ابوجہل نے یہ رائے دی کہ آپؐ کو قتل کیا جائے اور قتل میں ہر قبیلہ کا

ایک ایک آدمی شریک ہو تاکہ بنی عبد مناف (آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا قبیلہ) بدلہ لینے سے عاجز ہو جائے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا اور ہر قبیلہ کا ایک ایک جوان اس کام کے لئے مقرر کر دیا کہ فلاں رات میں یہ کام کیا جائے۔ ادھر خداوند عالم نے آپؐ کو ان کے مشورہ کی اطلاع دے دی اور جس رات میں کفارِ قریش نے اپنے خیالِ خام کو پورا کرنے کا ارادہ کیا اور مختلف قبائل کے بہت سے جوان آپؐ کے مکان کا محاصرہ کر کے بیٹھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اسی وقت ہجرت کا ارادہ فرمایا اور حضرت علی رضؓ کو ارشاد کیا کہ وہ آپؐ کی چارپائی پر (آپؐ کی چادر اوڑھ کر سو جائیں) تاکہ کفار کو آپؐ کے گھر میں نہ ہونے کا علم نہ ہو۔ اس کے بعد آپؐ گھر سے باہر تشریف لائے تو دروازے پر قریش کا ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ آپؐ سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے باہر نکلے اور جب آپؐ آیت وَاَغْشَیْنٰھُمْ فَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ پر پہنچے تو اس کو کئی مرتبہ دہرایا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور وہ آپؐ کو نہ دیکھ سکے اور آپؐ حضرت صدیق اکبرؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ پہلے ہی سے تیار تھے اور ایک راستہ بتلانے والے کو بھی اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ صدیق اکبرؓ آپؐ کے ساتھ ہو لئے اور مکان کی پشت کی جانب سے ایک کھڑکی کے راستے سے دونوں باہر نکلے اور ثور کی طرف تشریف لے گئے۔ (ثور مکہ کے قریب ایک پہاڑ ہے) ۔ (سیرت ص۷۹ تا ص۸۱)

تفسیر ابن کثیر اور مظہری میں بروایت محمد بن اسحاق و امام احمد و ابن جریر وغیرہ یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب مدینہ طیبہ سے آنے والے انصار کا مسلمان ہو جانا مکہ میں مشہور ہوا تو قریش مکہ کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اب تک تو ان کا معاملہ صرف مکہ میں دائر تھا، جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے ہاتھ میں ہے اور اب جبکہ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا اور بہت سے صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچ گئے تو اب ان کا ایک مرکز مدینہ طیبہ قائم ہو گیا جہاں ہر طرح کی قوت ہمارے خلاف جمع کر سکتے ہیں اور پھر ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اور ان کو یہ بھی احساس ہو گیا کہ اب تک تو کچھ صحابہ کرام ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے ہیں اب یہ بھی قوی امکان ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں چلے

جائیں اس لئے رؤساءِ مکّہ نے مشورہ کر کے دارالندوہ میں ایک خاص مجلس طلب کی۔ یہ دارالندوہ مسجد حرام کے متصل قصی بن کلاب کا مکان تھا جس کو ان لوگوں نے قومی مسائل میں مشورہ اور مجلس کرنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا اور زمانہ اسلام میں اس کو مسجد حرام میں داخل کر لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ باب الزیادات ہی وہ جگہ تھی جس کو دارالندوہ کہا جاتا تھا۔ حسبِ عادت اس اہم مشورہ کے لئے قریشی سرداروں کا اجتماع دارالندوہ میں ہُوا جس میں ابوجہل، نضر بن حارث، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف اور ابوسفیان وغیرہ قریش کے تمام نمایاں اشخاص شامل ہُوئے اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے مقابلہ میں تدبیریں زیرِ غور آئیں۔

ابھی مشورہ کی مجلس شروع ہوئی تھی کہ ابلیس لعین ایک سن رسیدہ عربی شیخ کی صورت میں دارالندوہ کے دروازے پر آ کھڑا ہُوا۔ لوگوں نے پُوچھا کہ تم کون ہو؟ کیوں آئے ہو؟ بتلایا کہ مَیں نجد کا باشندہ ہوں، مجھے معلوم ہُوا کہ آپ لوگ ایک اہم مشورہ کر رہے ہیں تو قومی ہمدردی کے پیشِ نظر مَیں بھی حاضر ہو گیا کہ ممکن ہے کہ مَیں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔ یہ سُن کر اُس کو اندر بُلا لیا گیا اور مشورہ شروع ہُوا تو سہیلی کی روایت کے مطابق ابوالبختری ابن ہشام نے یہ مشورہ پیش کیا کہ ان کو یعنی آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو آہنی زنجیروں میں قید کر کے مکان کا دروازہ بند کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ معاذاللہ وہ آپ اپنی موت مر جائیں۔ یہ سُن کر شیخ نجدی ابلیس لعین نے کہا کہ یہ رائے صحیح نہیں کیونکہ اگر تم نے ایسا کیا تو معاملہ چُھپے گا نہیں بلکہ اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ جائے گی اور اُن کے صحابہؓ اور رفقاء کے فدائیانہ کارنامے تمہارے سامنے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ لوگ جمع ہو کر تم پر حملہ کر دیں اور اپنے قیدی کو تم سے چُھڑا لیں۔ سب طرف سے آوازیں اُٹھیں کہ شیخ نجدی کی بات صحیح ہے۔ اس کے بعد ابوالاسود نے یہ رائے پیش کی کہ ان کو مکّہ سے نکال دیا جائے۔ یہ باہر جا کر جو چاہیں کرتے رہیں ہمارا شہر ان کے فساد سے مامون ہو جائے گا اور ہمیں کچھ جنگ و جدال بھی نہ کرنا پڑے گا۔ شیخ نجدی (ابلیس لعین) یہ سُن کر پھر بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ

وہ کیسے شیریں کلام آدمی ہیں۔ لوگ ان کا کلام سُن کر مفتون اور مسحور ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو اسی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے تو بہت جلد اپنی طاقت و رجماعت بنالیں گے اور تم پر حملہ کر کے شکست دے دیں گے۔ اب ابوجہل بولا کہ جو کرنے کا کام ہے تم میں سے کسی نے نہیں سمجھا۔ میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے وہ یہ کہ ہم عرب کے سب قبیلوں میں سے ہر قبیلہ کا ایک نوجوان لے لیں اور ہر ایک کو عمدہ کام کرنے والی تلوار دے دیں۔ یہ سب لوگ یکبارگی اُن پر حملہ کر کے قتل کر دیں۔ ہم اُن کے فساد سے تو اس طرح نجات حاصل کر لیں۔ اب رہا اُن کے قبیلہ بنو عبد مناف کا مطالبہ جواُن کے قتل کے سبب ہم پر عائد ہوگا۔ سو ایسی صورت میں جبکہ قتل ایک نے نہیں بلکہ ہر قبیلہ کے ایک ایک شخص نے کیا ہے تو قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا مطالبہ تو باقی نہیں رہ سکتا۔ صرف خون بہا یا دیت کے مال کا مطالبہ رہ جائے گا۔ وہ ہم سب قبیلوں سے جمع کر کے ان کو دے دیں گے۔ اور بے فکر ہو جائیں گے۔ شیخ نجدی ابلیس لعین نے یہ سُن کر کہا کہ بس رائے یہی ہے اور اس کے سوا کوئی چیز کارگر نہیں۔ پوری مجلس نے اسی کے حق میں رائے دیدی اور آج ہی رات میں اپنا یہ ناپاک عزم پُورا کر لینے کا تہیّہ کر لیا گیا۔

مگر انبیاء علیہم السّلام کی غیبی طاقت کو یہ جاہل کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس طرف جبرائیل امین نے ان کے دارالمشورہ کی ساری کیفیت سے رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو باخبر کر کے یہ تدبیر بتلائی کہ آج رات میں آپؐ اپنے بستر پر آرام نہ فرمائیں اور بتلایا کہ اب اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو مکّہ سے مدینہ ہجرت کر لے کی اجازت دے دی ہے۔

ادھر مشورہ کے مطابق شام ہی سے قریشی نوجوانوں نے سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یہ دیکھا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ آج کی رات وہ آنحضرتؐ کے بستر پہ آرام کریں اور یہ خوشخبری سُنادی کہ اگرچہ بظاہر اس میں آپ کی جان کا خطرہ ہے مگر دشمن آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور آپؐ کے بستر پر لیٹ گئے۔ مگر اب مشکل یہ درپیش تھی کہ آنحضرتؐ اس محاصرے سے کیسے نکلیں؟ اس مشکل کو اللہ تعالیٰ

نے ایک معجزہ کے ذریعے حل کیا۔ وہ یہ کہ بامر الٰہی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ایک مٹھی میں مٹی لے کر باہر تشریف لائے اور محاصرہ کرنے والے جو کچھ آپؐ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، اس کا جواب دیا۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ان کی نظروں اور فکروں کو آپؐ کی طرف سے پھیر دیا کہ کسی نے آپؐ کو نہ دیکھا، حالانکہ آپؐ ان میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے نکلے چلے گئے۔ آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد کسی آنے والے نے ان لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ تو انہوں نے بتلایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتظار میں۔ اس نے کہا کہ تم کس خام خیالی میں ہو وہ تو یہاں سے نکل کر جا بھی چکے ہیں اور تم میں سے ہر ایک کے سر پر خاک ڈالتے ہوئے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے سروں پر ہاتھ رکھا تو اس کی تصدیق ہوئی کہ ہر ایک کے سر پر مٹی پڑی ہوئی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپؐ کے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ مگر محاصرہ کرنے والوں نے ان کے کروٹیں بدلنے سے پہچان لیا کہ یہ محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نہیں۔ اس لئے قتل کا اقدام نہیں کیا۔ صبح تک محاصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ خائب و خاسر ہو کر واپس ہو گئے۔ یہ رات اور اس میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے خاص فضائل میں سے ہے۔

قریشی سرداروں کے مشورے میں جو تین رائیں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے متعلق پیش کی گئی تھیں، ان تینوں کو قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ۔ یعنی وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جبکہ کفار آپؐ کے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپؐ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا شہر بدر کر دیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ان کی سب تدبیریں خاک میں ملا دیں۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ یعنی اللہ تعالےٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں جو ساری تدبیروں پر غالب آجاتی ہے، جیسا کہ اس واقعہ میں مشاہدہ ہوا ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۲۱۹ تا ص ۲۲۲)

غارِ ثور کا قیام

آپؐ اس پہاڑ کے ایک غار میں جا کر ٹھہر گئے۔ ادھر یہ قریشی جوان صبح تک آپؐ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرتے رہے اور بالآخر یہ معلوم ہوا کہ وہاں آپؐ کی جگہ علیؓ ہیں تو سخت پریشان ہوئے اور چاروں طرف اپنے قاصد آپؐ کی تلاش میں بھیجے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے گرفتار کرنے پر سو اونٹ کا انعام مقرر کیا۔ بہت سے آدمی آپؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور بعض قیافہ شناس لوگ آپؐ کے نشانِ قدم پر تلاش کرتے ہوئے ٹھیک اس غار کے کنارے بھی پہنچ گئے کہ اگر ذرا جھک کر دیکھتے تو صاف آپؐ کے سامنے تھے۔ اس وقت صدیق اکبرؓ[1] غمگین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھبراؤ نہیں، اللہ تعالےٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

---

[1] رفیقِ غار ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو اپنی جان کا تو غم نہ تھا مگر اس لئے سہم رہے تھے کہ یہ دشمن سرورِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو جائیں گے (کیونکہ دشمنوں کے پیادے اور سوار سب تعاقب کر رہے تھے اور آپؐ کی جائے پناہ بھی کوئی مستحکم قلعہ نہ تھی بلکہ ایک غار تھا جس کے کنارے تک تلاش کرنے والے دشمن پہنچ چکے تھے) مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کوہ ثبات بنے ہوئے نہ صرف خود مطمئن تھے بلکہ اپنے رفیق صدیقؓ کو فرما رہے تھے لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا "تم غمگین نہ ہو کیونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے"۔

یہ بات کہنے کو دو لفظ ہیں، مگر سننے والے حالات کا پورا نقشہ سامنے رکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ محض مادیات پر نظر رکھنے والے سے یہ اطمینان ممکن نہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا کوئی نہ تھا جس کو قرآن پاک نے اگلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے قلب مبارک پر تسلی نازل فرما دی اور ایسے لشکروں سے آپؐ کی امداد کی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا" یہ لشکر فرشتوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور پورے عالم کی قوتیں خود بھی خدائی لشکر ہیں وہ بھی ہو سکتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر کفر کا کلمہ پست ہو کر رہا اور اللہ تعالےٰ ہی کا بول بالا ہوا۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۳۸۰)

غارِ ثور سے مدینہ کی طرف روانگی

غارِ ثور کے تیسرے دن ربیع الاول سلہ بروز پیر صدیق اکبرؓ کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ دونوں اونٹنیاں لے کر پہنچے جو اسی سفر کے لئے حضرت صدیقؓ نے مہیا کی تھیں اور اُن کے ساتھ عبداللہ بن اریقط بھی پہنچے جن کو راستہ بتلانے کے لئے اُجرت دے کر ساتھ لے لیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ایک ناقہ پر سوار ہو گئے اور صدیق اکبرؓ دوسری پر۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے ساتھ عامر بن فہیرہ کو بھی خدمت کے لئے بٹھا لیا اور عبداللہ بن اریقط کے آگے راستہ دکھانے کے لئے چلے۔ (سیرت صہ ۸۲)

سراقہ بن مالک کا راستے میں پہنچنا اور اس کے گھوڑے کا زمین میں دھنسنا

آگے بڑھے تو قریش کے قاصدوں میں سے سراقہ بن مالک جو آپؐ کی تلاش میں پھر رہا تھا، یہاں تک پہنچ گیا۔ جب آپؐ کے قریب آیا تو اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سراقہ گر پڑا۔ مگر پھر سوار ہو کر آپؐ کے پیچھے چلا۔ یہاں تک کہ آپؐ کی تلاوتِ قرآن کی آواز سُنی۔ اس وقت صدیق اکبرؓ بار بار مڑ کر اس کو دیکھتے جاتے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس کی طرف التفات ہی نہ کیا۔ جب زیادہ قریب آگیا تو اُس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں زمین کے خشک اور سخت ہونے کے باوجود گھٹنوں تک اندر اُتر گئے۔ اب ہر چند گھوڑے کو نکالتا ہے مگر وہ نہیں نکلتا ہے۔ مجبور ہو کر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے پناہ مانگی تو آپؐ ٹھہر گئے اور آپؐ کی برکت سے گھوڑا وہاں سے نکل آیا۔ (سیرت مغلطائی م)

جب گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکلے تو پاؤں کی جگہ سے ایک دھواں اُٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر سراقہ اور بھی زیادہ ششدر رہ گیا اور نہایت عاجزی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے توشہ اور موجودہ سامان اُونٹ وغیرہ پیش کرنے لگا۔ آپؐ نے اس کو قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جب تم اسلام قبول نہیں

کرتے۔ بس اتنا کافی ہے کہ تم ہمارے حال کو کسی سے بیان نہ کرو۔ سراقہ ادھر سے واپس ہوا۔ اور جب تک آپؐ کے متعلق خطرہ ہو سکتا تھا، اس وقت تک کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ (حلبیہ ج ۱۰ ص۴۳۶، سیرت ص۸۳)۔

سراقہ کی زبان سے آپؐ کی نبوت کا اعتراف

کچھ دنوں کے بعد سراقہ نے ابوجہل[1] سے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد چند اشعار[2] پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے "اے ابوحکم! (ابوجہل!) لات کی قسم (لات ایک بُت کا نام ہے جس کی قریش پُوجا کیا کرتے تھے) اگر تم اس گھوڑے کے زمین میں دھنس جانے کا مشاہدہ کرتے تو تمہیں اس بات میں شک کی گنجائش نہ رہتی کہ محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں۔ میری رائے میں تمہیں لازم ہے کہ ان کی مخالفت سے خود بھی اجتناب کرو اور لوگوں کو بھی منع کرو۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی کامیابی کے نشانات اس طرح چمک جائیں گے کہ تمام انسان اس کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم ان سے صُلح کر لیتے۔ (سیرت مغلطائی ص۳۵)

ابا حکم واللات لو کنت شاھدا[3]	لامر جوادی اذ تسوخ قوائمه
عجبت ولم تشکک بان محمدا	نبی وبرھان فمن ذا یقاومه
علیک بکف الناس عنه فانني	اریٰ امرہ یوما ستبدو معالمه
بامر یود الناس فیه بأسرھم	لو ان جمیع الناس طرا یسالمه

---

[1] ابوجہل کی کنیت عرب میں ابوحکم تھی، مگر اسلام سے منحرف ہونے سے اس کو ابوجہل کا خطاب دیا۔ اس مضمون کو کسی نے اس شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

الناس کناہ اباحکم   واللّٰہ کناہ ابوجہل

[2] اصل اشعار یہ ہیں۔ [3] یہ اشعار سیرت مغلطائی کے نسخہ میں غلط تھے۔ ان کی تصحیح روض الانف ج۲ ص۶ کی کی گئی ہے۔ (منہ) ::

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ اُمِّ معبد اور اُن کے خاوند کا اسلام

راستہ میں ایک عورت (ام معبد بنت خالد) کے مکان پر گزر ہُوا۔ اُن کی بکری جو کہ بالکل دودھ نہ دیتی تھی۔ آپؐ نے اُس کے تھنوں پر ہاتھ پھیر دیا تو وہ دودھ سے بھر گئے۔ جس کو آپؐ نے بھی پیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا اور یہ برکت اسی طرح برابر جاری رہی، جب آپؐ یہاں سے رُخصت ہُوئے تو اُمِّ معبد کا خاوند آیا اور بکری کے دُودھ دینے کے متعلق یہ عجیب واقعہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سبب پُوچھا تو اُمِّ معبد نے کہا کہ ایک نہایت شریف وکریم جوان آج ہمارے ہاں تھوڑی دیر کے لئے مہمان ہُوئے تھے۔ یہ سب اُن کے ہاتھ کی برکت ہے۔ خاوند یہ سُن کر کہنے لگا بخدا! یہ تو وہی مکّہ والے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد ان دونوں نے بھی ہجرت کی اور مدینہ پہنچ کر مُسلمان ہو گئے۔ (سیرت صہ ۸۴، صہ ۸۵)۔

نزول قباءؔ

یہاں سے روانہ ہو کر آپؐ قبا پہنچے (یہ مدینہ کے قریب ایک مقام ہے) انصار کو جب سے آپؐ کے تشریف لے جانے کی خبر پہنچی تھی، روزانہ استقبال کے لئے بستی سے باہر آتے تھے۔ اس روز بھی حسبِ دستور انتظار کر کے واپس ہو گئے تھے کہ یکایک ایک آواز سُنی گئی کہ جن کا انتظار تھا وہ تشریف لے آئے۔ آپؐ کو تشریف لاتے دیکھ کر سب نے جوشِ مسرّت سے استقبال کیا اور آپؐ کے رفقاء نے چودہ[1] روز تک قبا میں قیام فرمایا۔ اسی عرصہ میں آپؐ نے قبا میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اور یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو اسلام میں بنائی گئی۔ (سیرت صہ ۸۵)

---

[1] قیام قبا کے متعلق اقوال ۳، ۴، ۵ تک اور بعض میں بائیس دن مذکور ہیں۔ (سیرت مغلطائی صہ ۳۶) ∴

حضرت علیؓ کی ہجرت اور قبا میں آپؐ سے مل جانا

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی امانت داری چونکہ کفار کو بھی مسلّم تھی اس لئے آپؐ کے پاس اکثر لوگوں کی امانتیں رہتی تھیں۔ بوقت ہجرت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آپؐ نے اس لئے پیچھے چھوڑا تھا کہ جو امانتیں لوگوں کی آپؐ کے پاس تھیں وہ اُن کو واپس کر کے آپؐ کے پاس خود بھی مدینہ پہنچ جائیں۔ (سیرت صفحہ ۸۵)

اسلامی تاریخ کی ابتداء

اس وقت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے حکم سے اسلامی تاریخ کی ابتداء حضرت عمر[1] رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کی، اور اس کا پہلا مہینہ محرم کو قرار دیا۔ (سیرت صفحہ ۸۶)

مدینہ طیبہ میں داخل ہونا

ماہِ ربیع الاوّل بروز جمعہ قبا سے رخصت ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف روانگی ہوئی۔ انصارِ مدینہ جوشِ مسرت سے آپؐ کی سواری کے ارد گرد چل رہے تھے، کوئی پیدل، کوئی سوار، آپؐ کے ناقہ کی باگ تھامنے میں ہر کوئی پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ ہر شخص کی دلی تمنا تھی کہ آپؐ اُس کے یہاں مقیم ہوں۔ عورتیں، بچے خوشی کے ترانے پڑھ رہے تھے۔ یہ چونکہ جمعہ کا دن تھا۔ بنی سالم بن عوف کے مکانات کے قریب جمعہ کا وقت ہو گیا۔ آپؐ سواری سے اُترے اور جمعہ ادا کرنے کے بعد پھر سوار ہو گئے۔ اب جس انصاری کا مکان راستہ میں پڑتا ہے وہ التجا کرتا ہے کہ میرے غریب خانہ پر قیام فرمائیے۔ مگر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم اونٹنی کو اپنے حال پر چھوڑ دو، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے جس جگہ اس کو ٹھہرنے کا حکم ہے وہاں جا کر خود ٹھہر جائیگی۔ چنانچہ یہ اونٹنی اسی طرح چلتی رہی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھیال بنی عدی بن نجار کے مکانات آگئے تو ابو ایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے جا کر اونٹنی بیٹھ گئی۔ آپؐ ابو ایوب انصاری کے مہمان ہوئے اور ایک مدت تک انہی کے مکان پر مقیم رہے۔ (سیرت صفحہ ۸۶)

---

[1] شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے رسالہ "الشماریخ فی علم التاریخ" میں اس کی تائید کی ہے (منہ)

مسجد نبویؐ کی تعمیر

اس وقت مدینہ طیبہ میں کوئی مسجد موجود نہیں تھی، جس جگہ موقع ملتا نماز ادا کی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ جگہ خریدی گئی جس جگہ ناقہ بیٹھی تھی۔ اس جگہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کی گئی جس کی دیواریں کچی اینٹوں[1] کی اور ستون کھجور کے درخت کی لکڑی کے اور چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی تھی اور قبلہ کا رُخ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا (جو اس وقت مسلمانوں کا قبلہ تھا) مسجد کے ساتھ دو حجرے بھی بنائے گئے۔ ایک حضرت عائشہ رضؓ کے لئے اور دوسرا حضرت سودہؓ کے لئے۔ اس کے بعد نبی کریمؐ نے ایک شخص کو مکہ بھیجا کہ آپؐ کے آل و عترت کو مدینہ طیبہ لے آئے۔ اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی سب اہل و عیال کو مدینہ بلوالیا۔ چنانچہ ام المؤمنین سودہؓ اور دو صاحبزادیاں فاطمہؓ اور ام کلثومؓ مدینہ آگئیں۔ تیسری صاحبزادی زینبؓ کو اُن کے خاوند ابو العاص نے (جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) نہ آنے دیا اور ادھر صدیق اکبرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ اپنی مادر اور دونوں بہنوں عائشہؓ اور اسماءؓ کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے اور اب مکہ میں صرف چند مسلمان رہ گئے جن کو سفر کی طاقت نہیں تھی بلکہ بعض ایسے لوگ بھی وہاں سے چل نکلے کہ راستہ ہی میں اُن کی وفات ہوگئی۔ (سیرت ص۸۷، ص۸۸)

---

[1] پھر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس میں اور جگہ بڑھائی، مگر تعمیر اسی وضع کی باقی رکھی۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں اس میں بہت بڑا اضافہ اور تغیر کیا، جگہ بھی بہت بڑھا دی اور دیواریں منقش پتھروں اور چاندی کے نقش و نگار سے آراستہ اور ستون منقش پتھروں کے اور چھت سال کی لکڑی کی بنائی تھی۔ پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں اس کے حکم سے مسجد کی اور توسیع کی اور ازواج مطہراتؓ کے حجرات بھی اس میں شامل کر دیئے۔ اس کے بعد ۱۶۰ھ میں خلیفہ مہدی نے اور اس کے بعد ۲۰۲ھ میں مامون نے اس میں توسیع و تغیرات کئے اور اس کی بنیاد کو خوب مضبوط کر دیا (سیرت مغلطائی ص۳۴) اسکے بعد سلاطینِ آل عثمان نے نہایت عمدہ تعمیر کی جو اب تک موجود ہے اور اب موجودہ شاہ سعود نے توسیع کی ہے (منہ)

سنہ ۲ھ

مشروعیّت جہاد

سریہ حمزہ رضؓ و سریہ عبیدہ رضؓ

نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی ترپن سالہ زندگی کا اجمالی نقشہ ناظرین کے سامنے آچکا ہے جس میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ دُنیا میں اسلام کی اشاعت کس طرح ہوئی اور وہ ہر طبقہ اور ہر قبیلہ کے ہزار ہا انسان جو ہجرت تک اسلام کے حلقہ بگوش بن کر کچھ ایسے مست ہوئے تھے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو اپنے مال و جائداد، آباء و اجداد، بیویوں اور بچّوں سے بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ اُن کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب کیا تھا؟ حکومت کا جبر و اکراہ تھا یا کوئی لالچ اور جاہ کی طمع تھی یا کوئی پُرشوکت جمعیت تھی جس کی تلوار نے ان کو مجبور کیا تھا یا کچھ اور۔

لیکن جب اس نبی اُمّی (ان پر میرے ماں باپ فدا ہوں) صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے حالات طیبات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بلا وہم اختلاف ان سب کا جواب نفی میں ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ یتیم جس کے والد کا سایہ دُنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے سر سے اُٹھ چُکا ہو اور جس کو بچپن کے چھٹے سال میں والدہ کی آغوشِ شفقت سے جواب مل گیا ہو، جس کے گھر میں مہینوں آگ جلنے کی بھی نوبت نہ آتی ہو جس کے گھر والوں نے کبھی پیٹ بھر روٹی نہ کھائی ہو جس کے رہے سہے عزیز و قریب بھی ایک کلمۂ حق کہنے کی وجہ سے نہ صرف یکسو بلکہ سخت دشمن ہو گئے ہوں، وہ کیا کسی پر حکومت کر سکتا یا مال کے لالچ سے یا تلوار کے زور سے کسی کو اپنا ہم خیال بنا سکتا تھا؟ اس کے علاوہ تاریخ کے دفتر سامنے ہیں جن میں بلا اختلاف موجود ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی عمر شریف کے یہ ترپن سال اس طرح گزرے ہیں کہ ابتدائی بے سروسامانی و بے کسی کے بعد جب اسلام کو ایک ظاہری قوّت بھی حاصل

ہوئی اور بڑے بڑے شجاع و بہادر اور متموّل صحابہ داخلِ اسلام بھی ہو گئے۔ اس وقت بھی اسلام نے کسی کافر پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ بلکہ ظالموں کے ظلم کا جواب تک نہیں دیا حالانکہ کفّار مکّہ کی طرف سے نہ صرف آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس بلکہ آپؐ کے تمام متعلقین آل و اتباع پر بھی وہ ظلم ڈھائے گئے کہ بیان و تحریر میں نہیں آسکتے۔

کفّارِ قریش نے جو ہر قسم کی قوّت وشوکت رکھتے تھے، آپؐ کی ایذا رسانی بلکہ قتل کرنے میں کوئی امکانی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جیسا کہ تین سال تک آپؐ کا مع اپنے متعلقین کے محصور رہنا، آپؐ کے ساتھ قریش کا مکمّل مقاطعہ، آپؐ کے قتل کے لئے سازشیں اور صحابہ کرامؓ کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچانا وغیرہ۔ آپ معلوم کر چکے ہیں یہ سب کچھ تھا مگر قرآن اپنے پیروؤں کو صبر و استقلال کے سوا کسی حربہ کے استعمال کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ہاں اس وقت بھی جہاد کا حکم تھا، وہ یہ کہ کفّار کو حکمت کی اور نصیحت کی باتوں سے اپنے رب کی طرف بلاؤ اور اگر باہمی مکالمے کی نوبت آئے تو حسن تدبیر اور نرم کلام سے اُن کا مقابلہ کریں اور قرآن حکیم کے دلائل واضح سے اُن کے ساتھ پُورا جہاد کرو تاکہ وہ حق کو سمجھ لیں۔

اس وقت تک جو ہزار ہا انسان اسلام کے حلقہ بگوش بن کر ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بننے پر راضی ہُوئے، ظاہر ہے کہ وہ دنیوی طمع یا حکومت کے جبر یا تلوار کے ذریعہ سے مجبور نہیں ہو سکتے۔ اس کھلی ہوئی ہدایت کو دیکھتے ہُوئے بھی کیا وہ لوگ خدا سے نہ شرمائیں گے جو اسلام کی حقانیت پر پردہ ڈالنے کے لئے کیا کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا۔ کیا وہ اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی تھی جو نہ صرف مسلمان بنے بلکہ اسلام کی حمایت میں تلوار اُٹھانے اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالنے پر راضی ہو گئے۔ کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ پر کس نے تلوار چلا کر ان کو مسلمان بنایا تھا اور ابوذرؓ وانیسؓ اور ان کے قبیلہ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ ضماد ازدی کو کس نے مجبور کیا تھا اور طفیل بن عمرو دوسی اور ان کے قبیلہ پر کس نے تلوار

چلائی تھی اور قبیلہ بنی عبدالاشہل کو کس نے دبایا تھا اور تمام انصارِ مدینہ پر کس کا زور تھا، جنہوں نے نہ فقط اسلام قبول کیا بلکہ آپؐ کو اپنے یہاں بُلا کر تمام ذمّہ داری اپنے سر لی اور اپنی جان و مال آپؐ پر قربان کئے۔ بریدہ اسلمیؓ کو کس نے مجبور کیا تھا کہ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر مدینہ کے راستے میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برضا و رغبت مُسلمان ہوگئے۔ نجاشی بادشاہ حبشہ پر کون سی تلوار چلی تھی کہ باوجود اپنی سلطنت وشوکت کے قبل از ہجرت مسلمان ہوگئے۔ ابو ہند اور تمیم اور نعیم وغیرہ وغیرہ پر کس نے زور دیا تھا کہ ملکِ شام سے سفر کر کے آپؐ کی خدمت میں پہنچیں اور آپؐ کی غلامی اختیار کریں اور اسی قسم کے صدہا واقعات[1] جس سے کُتبِ تاریخ بھری ہوئی ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار مشاہدات ہیں جن کو دیکھ کر ہر انسان یہ یقین رکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ: "اسلام اپنی اشاعت میں تلوار کا محتاج نہیں"۔

اور نہ فرضیت جہاد کا یہ مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے گلے پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ مُسلمان ہو جاؤ یا اُن کو کسی جبر و اکراہ سے اسلام میں داخل کیا جائے۔ جہاد کے ساتھ ہی جزیہ کے احکام اور کفار کو اہلِ ذمّہ بنا کر اُن کے جان و مال کی حفاظت بالکل مسلمانوں کی طرح کرنے کے متعلق اسلامی قواعد خود اس کی شہادت ہیں کہ اسلام نے کبھی کفار کو اسلام قبول کرنے پر بعد فرضیت جہاد بھی مجبور نہیں کیا۔ اس لئے ایک منصف مزاج انسان کا فرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرے کہ اسلام میں فرضیت جہاد کس غرض اور کن فوائد کے لئے ہوئی ہے؟ اور اسے اس وقت یہ یقین کرنا پڑے گا کہ جس طرح وہ مذہب کامل نہیں سمجھا جاتا جس نے لوگوں کا گلا گھونٹ کر یہ جبر و اکراہ ان کو اپنے سلسلہ میں داخل کیا ہو۔ (سیرت صفحہ ۸۹ تا ۹۳)

دُنیا میں اسلام کیونکر پھیل رہا ہے؟

بعد الحمد والصّلوٰۃ، ناواقف یا معاند مخالفینِ اسلام یورپین اور ہندو مورخین سادہ لوح

---

[1] یہ سب واقعات مختصر رسالہ "حمیدیہ" سے لئے گئے ہیں۔

عوام کو بہکایا کرتے تھے کہ اسلام جو دُنیا کا اتنا پھیلا۔ اس کی وجہ اسلام کی کوئی خوبی نہیں بلکہ مسلمانوں کا جبر و اکراہ ہے۔ تلوار کے زور سے لوگوں کو مُسلمان بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بیہودہ بے سر و پا راگ ہے جو دریدہ دہن مخالفین الاپتے چلے آتے ہیں۔ اگرچہ خود انہی میں سے بہت سے سنجیدہ طبیعت اہلِ علم نے اس کی خود ہی کافی تردید بھی کی ہے لیکن اس مسئلہ کو پوری طرح تاریخی روشنی میں واضح کرنے کے لئے علامہ زمان، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ایک طویل الذیل مضمون القاسم دیوبند کے قدیم دَور میں شائع ہُوا تھا جو مقبول خلائق ہونے کی وجہ سے پھر مستقل بھی بنام اشاعتِ اسلام شائع ہُوا ہے۔

اس مسئلہ کا دُوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام نے تو اپنے قبول کرنے کے لئے کبھی جبر و تشدد سے کام نہیں لیا مگر متعصب وہوا پرست غیر مسلموں نے ہمیشہ اسلام کے خلاف جبر و تشدد ہی کا حربہ استعمال کیا ہے۔ غیر مسلموں کو اسلام چھوڑنے کے لئے کیا کیا وحشت ناک اور شرمناک ذرائع استعمال کئے ہیں، وہ اب بھی تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔ مسئلہ کے اس دُوسرے رُخ کو واضح کرنے کے لئے میرے استاد محترم شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحؒ مدرس دارالعلوم دیوبند کا ایک شاندار مضمون رسالہ "الفرقان" بریلی میں آج کل شائع ہو رہا ہے وہ ہر مسلمان کے دیکھنے کے قابل ہے۔ لیکن یہ دونوں رُخ قدیم اسلامی تاریخ کے ہیں۔

احقر کا قصد عنوان مذکور کے ماتحت یہ ہے کہ اس مسئلہ کو قصۂ زمین برسرِ زمین کر کے پیش کرے اور یہ دکھلائے کہ آج جبکہ اسلام اور مسلمان ہر قسم کی ظاہری طاقت و شوکت سے خالی، چار طرف اغیار کے پنجوں میں مقہور و مغلوب ہیں۔ اب وہ کون سی تلوار ہے جو غیر مسلموں پر چل رہی ہے اور جوق در جوق انہیں اسلام میں داخل کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ مسئلہ کا دُوسرا رُخ بھی موجودہ تاریخ سے پیش کرنا ہے کہ غیر مسلم کس کس طرح اسلام کے خلاف جبر و تشدد کے ناپاک آلات استعمال کر رہے ہیں (اس سلسلہ میں ڈاکٹر خالد شیلڈرک کی تقریر پیش ہے)۔

"مَیں نے اسلام کیوں قبول فرمایا"

قاہرہ میں ڈاکٹر خالد شیلڈرک کا خطبہ مشہور نومسلم انگریز علامہ ڈاکٹر خالد شیلڈرک نے مصری نوجوانوں کی انجمن (جمعیت الشبان المسلمین قاہرہ) کے ایوان میں ایک اجتماع عظیم کے سامنے مقالہ ذیل پیش کیا ہے۔ اس مقالہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یورپ میں اشاعتِ اسلام قادیانی مبلغوں کی نام نہاد مساعی کی رہینِ منّت نہیں ہے، بلکہ تعلیم یافتہ یورپین اپنے ذاتی مطالعہ کی بناء پر فوج در فوج اسلام میں داخل ہیں۔

"مَیں اپنے خطبہ کا افتتاح کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے کرنا چاہتا ہوں کہ میرے جذباتِ مسرت کا تقاضا یہی ہے۔ مَیں نے دینِ اسلام کافی غور و فکر کے بعد قبول کیا ہے اور آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ مَیں نے اس دین کی تعلیمات اوّلاً اس کے موافقین کی کتابوں سے نہیں بلکہ مخالفین کی کتابوں سے حاصل کی ہیں۔ مَیں برطانوی ماں باپ کے گھر پیدا ہوا جو پروٹسٹنٹ چرچ سے وابستہ تھے اور میرے والد کی یہ آرزو تھی کہ وہ مجھے اس چرچ کا ایک پادری دیکھے، اس لئے مجھے دینی کُتب کے مطالعہ اور مذہبی موضوعات پر مباحثہ میں مصروف دیکھ کر اُسے مسرت ہوتی تھی۔ مجھے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان اگرچہ بظاہر عیسائیت کا پیرو ہے۔ لیکن نوّے فیصد انگریز عیسائیت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور مَیں بلند آہنگی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مَیں خود اپنی زندگی میں ایک دن بھی عیسائیت کے مزعومہ اصول کا قائل نہ ہو سکا۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسائیت کی بنیاد اس عقیدہ پر قائم ہے کہ خدا تعالےٰ کی ذاتِ واحد تین شخصیتوں کا مجموعہ ہے اور یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ اور بیٹا ہر زمانے میں ساتھ ساتھ موجود ہوں جبکہ کسی زمانے میں باپ کا وجود فرض کیا جائے بیٹے کا وجود بھی اس کے ساتھ لازم ہو، یہ ایک ناقابلِ فہم عقیدہ ہے جسے کوئی

ذی ہوش تسلیم نہیں کر سکتا۔ بایں ہمہ عیسائی عقیدۂ تثلیث پر اڑے ہوئے ہیں خواہ اُسے سمجھتے نہ ہوں۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ عیسائی ۲۵ر دسمبر کو مسیح علیہ السلام کا یومِ ولادت مانتے ہیں حالانکہ اس خیال کی تائید میں وہ کسی مسیح کی ہم عصر یا قریب العصر شخصیت کی سند پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ ایک یورپ کی دماغی اختراع ہے جس کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں بلکہ اصول حساب کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ ۲۵ر دسمبر قدیم بُت پرستوں کا ایک مقدس دن تھا، یہ لوگ سورج دیوتا کے پجاری تھے۔ چنانچہ جب ان کا دیوتا سورج جسے یہ مصدر وجود اور چشمۂ حیات سمجھتے تھے، زمانۂ انقلاب سرمائی کو ختم کر لیتا تھا، تو اس سے اگلے دن یہ عید مناتے تھے اور اُسے اپنے دیوتا کا یومِ ولادت مانتے تھے۔ اسی عقیدۂ ولادتِ شمس کو عیسائیوں نے عقیدۂ ولادتِ مسیح میں تبدیل کر لیا اور بُت پرستوں کے قدیم دستور کے مطابق ۲۵ر دسمبر کو عید قرار دیا، حالانکہ ان کے پاس کوئی علمی یا تاریخی سند نہیں جس سے وہ اس تاریخ کو یومِ ولادت مسیح ثابت کر سکیں۔ اسی طرح قدیم پرست اعتدال ربیعی سے اگلے دن عید مناتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ آج اُن کے خدا سورج دیوتا نے اس تاریکی پر فتح پائی ہے جو اُس کے راستے میں حائل ہو گئی تھی اور اب اس کی طاقت اور روشنی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ پرانے بت پرستوں کے پیروی میں جس طرح عیسائیوں نے یومِ ولادت مسیح میں تبدیل کر کے عید مانا تھا، اس طرح انہوں نے یومِ اعتدال ربیعی کو جو دراصل سورج دیوتا کے طاقت پانے کا دن تھا مسیح کے طاقت پانے کا دن قرار دے کر اسے عید القیامہ (ایسٹر) بنا لیا۔ باپ بیٹے کا مسیحی عقیدہ بھی قطعی پرانے بُت پرستوں کے عقائد سے ماخوذ ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بُدھ مت کے ماننے والے بُدھ کے بچپن کے زمانے کی تصویر اس کی ماں جایا کے ساتھ جس انداز سے بناتے

ہیں، بعینہٖ اسی انداز کی تصویر مسیح کے زمانۂ طفولیت کی، اُن کی ماں مریم کے ساتھ ہم گرجا میں منقوش پاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی وہ شخصیت جس کے دعوے دار ہیں کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ناقد علمی طور سے اس موضوع پر بحث کرے تو اسے اس بحث سے خالی ہاتھ آنا پڑے گا۔ اس کا اندازہ آپ مسیح کی ان تصویروں ہی سے کیجئے جو مختلف ممالک میں آپ پاتے ہیں۔ آسٹریلیا کے گرجوں میں آپ مسیح کی صورت کچھ پائیں گے اور اٹلی کے گرجوں میں کچھ، آپ غور و فکر کے بعد مسیح کی ان فرضی تصویروں سے ان کی اصلی صورت کا اندازہ کر سکیں گے۔

اسلام کے خلاف عیسائیت کا غلط پروپگنڈہ

واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے مختلف طبقوں میں اصولِ عیسائیت اور ذات کے متعلق بنیادی اختلافات ہیں۔ عیسائیت کی انہی اُلجھنوں نے دوسرے مذاہب کو مطالعہ پر آمادہ کیا چنانچہ مذاہب عالم کے متعلق انگلستان کی لائبریریوں میں مجھے جتنی کتابیں ملیں مَیں نے اُن کا مطالعہ شروع کیا۔ یہاں مَیں نے دُنیا کے ہر مذہب کے متعلق علمی کتابیں پائیں جن سے اس مذہب کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، مگر جو کتابیں اسلام کے متعلق دیکھیں ان میں بجز طعن و تشنیع کے کچھ نہ تھا۔ ان کتابوں کا نچوڑ یہی تھا کہ "اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں بلکہ محض عیسائی لٹریچر سے ماخوذ چند اقوال کا مجموعہ ہے"۔

قدرتاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہُوا، اگر واقعی اسلام ایسا بے حقیقت مذہب ہے جیسا کہ یہ ظاہر کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قدر اعتراضات، اس قدر طعن و تشنیع اور اس کے مقابلہ و مدافعت کے لئے اتنی طاقت آزمائی کی کیا ضرورت؟ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر دینِ اسلام سے انہیں خوف نہ ہوتا اور اُس کی قوت و زندگی سے مرعوب نہ ہوتے تو اس سے مقابلہ و مجادلہ اور اس کی توہین و تذلیل کے لئے اتنی محنت برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ اب مَیں نے طے کر لیا کہ دینِ اسلام کی جتنی کتابیں مجھے مل سکتی ہیں اُنہیں

ایک ایک کر کے دیکھوں گا۔

معترضین کے اعتراضات سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں، یہ لوگ اگرچہ معاندانہ نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہیں مگر اس سے اسلام کی طاقت و قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسلام کے لئے دعوت و تبلیغ کا راستہ پیدا ہوتا ہے ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اب جبکہ مجھے ہدایت نصیب ہوگئی اور میں نے دل کے پردوں میں سے یہ آواز آتی سُنی کہ میں مُسلمان ہوں تو میں نے باقاعدہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ کر لیا۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ دارالخلافہ اسلام میں ایک مشہور مسجد ہے جس کا نام ایا صوفیہ ہے (اور وہ اسلام کا سنٹر ہے) تو میں نے اس مسجد کے پتے پر اپنے حالات لکھ بھیجے۔ جب میرا خط قسطنطنیہ پہنچا تو محکمہ ڈاک نے اُسے سلطان عبدالحمید کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ سلطان المعظم کے سیکرٹری نے مجھے جواب دیا کہ آپ مشہور انگریز نومسلم شیخ عبداللہ کوئلم بیرسٹر سے مُلاقات کریں۔ آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے ایسے مسلمان انگریز سے ملاقات کر کے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی جس سے کُھل کر میں اپنے دل کا راز بیان کر سکوں اور یہ عبداللہ کوئلم وہ شخصیت ہے جس کی تنہا کوشش سے انگلستان میں پانچ سو سے زیادہ انگریز مسلمان ہوئے ہیں۔

اس دوران میں میرا ارادہ ہُوا کہ اپنے قبولِ اسلام کی اطلاع والد کو کر دوں، چنانچہ میں نے اطلاع کر دی، میں اس واقعہ کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کو خیرباد کہنے سے تو میرے والد کو قطعاً رنج نہ ہُوا، مگر افسوس کہ میرے قبولِ اسلام سے خبر سے اُن کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اُن کو اور اُن کے ساتھ تمام خاندان کو اس سے بڑا رنج ہُوا۔ ان کے اس رنج کو اگر کوئی چیز کم کر سکتی تھی تو وہ یہ خیال تھا کہ شاید میں اُن کے کہنے سُننے سے پھر معاذاللہ اسلام کو ترک کر کے داخلِ مسیحیت ہو جاؤں۔ لیکن میں نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اسلام کے دامن کو تھامے ہُوئے پینتیس ۳۵ سال گزر گئے اور آج میں اس وقت کی بہ نسبت کہیں زیادہ اصولِ اسلام کا معتقد اور اس کے محاسن و فضائل

کا معترف ہوں۔ جب سے مَیں نے اسلام قبول کیا ہے مَیں اُس کے احکام پر عمل کرتا ہوں، مَیں ولی اللہ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ فرائض اسلامی ادا کرنے میں کسر نہیں چھوڑتا۔

مُسلمانوں کو عملی نمونہ بننا چاہیئے

مُجھے کامل یقین ہے کہ ایک دن آئے گا کہ تمام دُنیا دینِ اسلام کے جھنڈے کے نیچے آجائیں گے۔ مگر اس امر پر موقوف ہے کہ پیروانِ اسلام، اسلام کا نمونہ بنیں اور اصولِ اسلام کو عملی طور پر دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ مختلف ممالکِ اسلامی کے سفر کے دوران میں مَیں نے محسوس کیا ہے کہ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہوں، وہاں ان پر ضعف، پست ہمتی، اور افتراق غالب ہے اور جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں وہ اصولِ دین کی پیروی (جو کہ قوت وترقی کے اسباب ہیں) نسبتاً بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر دُنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان اپنے دین کی پیروی کریں اور اُن کی سیرت پر تمام اسلام کی عظمت کے آثار نمایاں ہوں تو یہ ایک اسلام کی عملی تبلیغ ہوگی جو اقوامِ عالم کو اسلام کے اصولوں کا گرویدہ بنا دے گی۔

یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب غیر مسلم، مسلمانوں کو احکامِ دین کے خلاف عمل کرتے دیکھتے ہیں تو وہ اُن کے اعمال کے آئینہ میں اسلام کی مسخ شُدہ تصویر دیکھ کر اُس سے متنفر ہوجاتے ہیں، بلکہ مَیں کہتا ہوں کہ اُنہیں یہ بتایا بھی جائے کہ جو کچھ مسلمان کر رہے ہیں اسلام کے احکام اس سے مختلف ہیں تب بھی وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر احکام اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو سب سے پہلے متبعینِ اسلام ان پر عمل کرتے اور کسی صورت میں ان کی مخالفت نہ کرتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیئے کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کی کسی تقریب میں شریک ہو اور وہاں اُس کے سامنے شراب پیش کی جائے اور وہ اسے اپنی رواداری اور وسیع النظری کے اظہار کے لئے قبول کرلے تو اس کا یہ عمل غیر مسلموں کے لئے اس امر کا ثبوت ہوگا کہ یہ مسلمان خود اپنے مذہب کی تعلیمات کی ترویج و انتشار کی صلاحیت کا منکر ہے ورنہ سب سے پہلے وہ خود اُن پر عمل کرتا اور اپنے عمل سے دوسروں کے لئے بہترین نمونہ بنتا۔ لہٰذا

ہر مسلمان اپنے مذہب کا مبلغ بن سکتا ہے اگر وہ اس کے آداب و اخلاق اور آئین کی محافظت کرے جس طرح وہ اس کے لئے مانع بن سکتا ہے۔ اگر ان امور میں مداہنت برتے۔

قرآن کریم صرف احکامِ دینی ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی دنیوی زندگی کا بہترین راہنما ہے اور یہ حقیقت میں نے اسی وقت محسوس کرلی تھی جب میں نے اس کا مطالعہ شروع ہی کیا تھا حالانکہ میرا مطالعہ ان تراجم کے واسطے سے تھا جن میں اُس کی پاک تعلیم کو آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں جو ہر قسم کی عبادت کو خداوند جل وعلیٰ کے لئے مخصوص کرتا ہو اور توحید خالص کے عقیدہ کا اعلان کرتا ہو اور عیسائیت تو انسانوں کی پیشانیوں کو اُن کے اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے معبودوں کے سامنے گراتی ہے۔ بھلا اس کے اس شرک ظاہرہ کا اسلام کی توحید باہر سے کیا مقابلہ؟ جس کی دعوت سورۂ اخلاص میں اس طرح دی گئی ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

"کہہ دو کہ اللہ ایک ہے اور وہ بے نیاز ہے اور اُس نے نہ کسی کو جنا اور نہ کسی نے اُس کو جنا اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے۔"

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ قرآن نے جس خدا تعالےٰ کی عبادت کے لئے بندوں کی راہنمائی کی ہے وہ ہر عیب سے بری اور ہر صفت کمال سے متصف ہے، جب انسانیت جہالت اور بچپن کے زمانے سے گزر رہی تھی تو وہ ہاتھ اور قلم کے بنائے ہوئے خداؤں سے کھیلتی تھی۔ افسوس کہ آج ۳۸ء میں بھی یہ حماقت دیکھی جا رہی ہے۔ خدا کے تخیل کے متعلق عقلِ انسانی کی طفلانہ لغزشوں کے تماشے آپ گرجاؤں میں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن انسانیت کے شباب کے مناظر مسجدوں میں نظر آئیں گے، جہاں نہ تصویریں ہوں گی، نہ مجسّمے جو عبادت کرنے والوں کے دل غیر اللہ کی طرف پھیریں۔ حالانکہ خدائے واحد ہی تمام کمالات کا مرکز ہے اور عبادت کا مستحق۔ انسانیت کو اس رفیع مرتبہ پر پہنچانے کا

سہرا ہادیٔ اعظم نبی اکرم محمد رسول اللہ و خاتم النبیین کے سر ہے جنہوں نے بتوں کو توڑا اور جلی و خفی شرک کے آثارِ قدیمہ کو مٹا دیا اور انسانیت کو ذلت کے مقام سے نکال کر عزت کے اس مرتبہ پر فائز کیا جو ہر طرح اس کے لائق تھا۔ اسلامی برادری کی جاذب نظر خصوصیت یہ ہے کہ آپ کرۂ زمین پر کسی ملک میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو چلے جائیں۔ آپ اجنبیت محسوس نہ کریں گے۔ بلکہ آپ کو عزیزوں کی جگہ عزیز اور بھائیوں کی جگہ بھائی ملیں گے۔ لہٰذا اے حلقہ بگوشانِ اسلام! ہمیں نہ تو بالشویزم کی ضرورت ہے اور نہ کمیونزم کی۔

اسلامی اخوت و مساوات

سیاسی مذاہب جن خوبیوں کے دعوے دار ہیں وہ ہمارے دین میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور جن خرابیوں سے یہ آلودہ ہیں، اُن سے ہمارا دین پاک ہے۔ یہ ایک معتدل مذہب ہے اور ایک عملی پروگرام ہے جو ہر زمانے میں اور ہر ملک میں انسانی سوسائٹی کی فوز و فلاح کا ضامن ہے۔ اخوتِ اسلامی کے نام سے سب سے پہلے اسی کے ذریعے واقفیت ہوئی۔ یہ ایک "جمعیت اقوام" ہے جو اغراض و اھوی سے بری ہے اور اُس کے رُکن جنسی و وطنی اختلافات سے ناواقف ہیں۔ یہ سب اخوت کی ایسی مضبوط زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں جس کے حلقوں کو امیری و غریبی اور اسی قسم کے دُوسرے ناپائیدار مظاہر جُدا نہیں کر سکتے۔ جب مجھے دینِ اسلام کے یہ اصول معلوم ہوئے تو مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام اپنی ان خوبیوں کی بناء پر تمام سماوی و ارضی شریعتوں سے ممتاز ہے اور میں پہلے سے زیادہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔

دینِ اسلام کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے اپنی طرف ملتفت کیا اور جس سے اس کی قدر و منزلت میرے دل میں زیادہ ہوئی وہ "تحریم شراب" ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس سے دوسرے مذاہب کی کتابیں ہمیں خالی نظر آتی ہیں بلکہ عیسائیت میں تو ہم اس اُمّ الخبائث کی ترغیب پاتے ہیں۔ مثلاً سینٹ پولس کی اپنے شاگرد کو ہدایت کہ وہ تھوڑی شراب اپنے معدہ کی اصلاح کے لئے پیا کرے۔" یا پانی سے بھرے ہوئے

برتنوں کا شراب میں تبدیل ہو جانے کا واقعہ" مجھے تسلیم ہے کہ اس مذہب کے پیشوا شراب سے احتراز کرنے کی ہدایت کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم کتبِ مقدسہ کی ان نصوص سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے جو صراحتہً شراب پینے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ پھر بتائیے ہم کیا مانیں اور کیا نہ مانیں؟ بعض اشخاص کی تحریر یا کتبِ مقدسہ کی تحریریں؟

ابھی کچھ عرصہ ہوا امریکہ نے شراب کے خلاف جہاد شروع کیا تھا۔ مگر باوجود تمدنِ جدید کے تمام وسائل کے اُسے اس معرکہ میں پسپا ہونا پڑا۔ کیا امریکہ کی اس معرکہ آرائی کا رسول اکرم مصلح اعظم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رہنمائی سے کوئی مقابلہ کیا جا سکتا ہے کہ جوں ہی آپؐ نے شیدایانِ اسلام کو بتایا کہ آپ کے خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے تو بے تامل شراب کے مٹکے اُلٹ دیئے گئے اور برتن توڑ دیئے گئے اور سڑکوں پر شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔ یورپ اور امریکہ کے فہمیدہ انسان جن کی ہدایات و نصائح کی وجہ سے امریکہ میں کچھ عرصہ شراب کی بندش رہی۔ خواہ زبان سے اعتراف نہ کریں مگر اُن کے دل یقیناً انسانی سوسائٹی کی اصلاح میں محمد عربی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے حسنِ تاثیر اور آپؐ کی راہنمائی کی کامیابی کا اقرار کر رہے ہیں۔

ہمیں طب بتاتی ہے کہ خنزیر کا گوشت صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ کیونکہ اس میں ایک خاص قسم کے جراثیم پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ آگ اُن پر کوئی اثر نہیں کر سکتی اور اُن کی مضرت کو دُور نہیں کر سکتی۔ اگرچہ عیسائیوں کی کتبِ مقدسہ خنزیر کے گوشت کی ممانعت کرتی ہیں۔ مگر دُنیا کے ہر حصّہ میں عیسائی اُسے بالعموم استعمال کرتے ہیں اور اس کی طبی مضرت اور اپنے مذہب کی ممانعت کی پرواہ نہیں کرتے، برخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے پاک مذہب کے حکم کے مطابق اس سے قطعاً محترز ہیں اور دُنیا کے کسی حصّہ میں اُس کا استعمال نہیں کرتے۔

بلاشُبہ چونکہ اکثر عیسائی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جو انجیل اُن کے ہاتھوں میں ہے وہ مسیح علیہ السلام سے بعد کی لکھی ہوئی ہے اور چونکہ انہیں ان بنیادی اختلافات کا

علم ہے جو اُن کی دینی کتابوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اس سے علم و وقوف نے اُنہیں اپنے احکامِ دین سے اعراض پر بری کر دیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کو کامل یقین ہے کہ جو قرآن اُن کے ہاتھوں میں ہے وہ وہی قرآن پاک ہے جو صاحبِ وحی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کا فرق نہیں۔

اعتقادی حقائق

حقائقِ مذکورہ کی معرفت کے بعد جب مَیں نے عام معتقداتِ اسلامی کا جائزہ لیا تو مَیں نے تمام اسلامی عقائد عقل کے عین مطابق پائے۔ توحید خالص کا عقیدہ جو اسلام کا طغریٰ امتیاز ہے صحیح ترین عقیدہ ہے جس سے انسان واقف ہو چکا ہے۔ توحید الوہیت توحید ربوبیت اور خالقِ عالم کے لئے تمام صفات کمال کے اثبات میں وہ منفرد و مکمل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام خداوند تعالےٰ کے تمام پیغمبروں کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ علیہم صلوٰۃ اللہ والسّلام۔

مسلمان ایک دوسرے کو جو سلام کرتے ہیں وہ کیا خوب ہے۔ اس کے معنے کیسے دلپذیر ہیں اور وہ طریقہ جس سے سلام کیا جاتا ہے کیسا دل کش ہے؟ خصوصاً سر اور دل کی طرف ہاتھ سے اشارہ۔ کیونکہ جسم انسانی میں یہی دونوں اعضاء بہتر و برتر ہیں۔ بھلا اس سلام کا اٹلی کے فیسٹ سلام یا دنیا کی دوسری قوموں اور جماعتوں کے سلام سے کیا مقابلہ؟ بعض یورپین الزام لگاتے ہیں کہ "اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے"۔ یہ ایک ذلیل جھوٹ ہے اور الزام لگانے والے خود جانتے ہیں کہ یہ غلط اور غیر معقول ہے۔ کیونکہ یہ اگر ایک طرف تاریخ کی تصریحات کے خلاف ہے تو دوسری طرف اصولِ اسلام کے۔ اگر اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہوتا تو کیا ممالک اسلامیہ میں آج ان گرجاؤں، صنم خانوں اور غیر اسلامی اوضاع و اطوار کا جو اسلام کے زمانۂ شباب سے اپنی اصلی حالت میں چلے آتے ہیں وجود بھی باقی رہتا اور پھر قرآن مجید کی آیاتِ بیّنات کے سامنے ان کے ہفوات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ قرآن کہتا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین میں کوئی جبر نہیں) لَسْتَ

عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ (اے نبی! آپ ان (کافروں) پر مسلط نہیں کئے گئے) لَكُمۡ دِينُكُمۡ وَلِيَ دِينِ (تمہیں تمہارا دین مبارک اور مجھے میرا دین)۔

تلوار کی دھار سے مذہب کی تبلیغ تو خود ان کا اپنا طریقہ رہا ہے۔ مذہب کے نام پر جو مظالم اسپین کے مسلمانوں پر روا رکھے گئے، اُن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں رنگین ہیں اور عیسائیوں کی پیشانیاں داغدار، ان کو خود اس کا اقرار ہے کہ جب شارلمان جرمنی میں داخل ہُوا تو اُس نے حکم دیا کہ جو سیکس عیسائیت قبول نہ کرے اُسے تلوار سے اُڑا دیا جائے۔ بہرکیف اگر کوئی مذہب تلوار کے ذریعے پھیلا ہے تو وہ اسلام نہیں ہے بلکہ اور کوئی مذہب ہے۔

برادرانِ اسلام! وقت زیادہ ہوگیا ہے، مَیں اس موضوع پر جو کچھ آپ سے کہنا چاہتا تھا وہ سب نہ کہہ سکا۔ مَیں دوبارہ آپ کے سامنے یہ اعلان کرتا ہوں کہ جس قدر اسلام کے متعلق میری معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، میرے دل میں اس کا احترام و ایقان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ مَیں نے مکمل مذہبی معلومات حاصل کر لی ہیں لیکن بقدرِ ضرورت ان سے ضرور بہرہ مند ہو چکا ہوں۔ مجاہدِ اعظم، سیف اللہ خالد بن ولید نے فتوحاتِ اسلامیہ میں جو شریفانہ، بہادرانہ اور رحیمانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اُس سے دینِ اسلام کی جو دن دُونی رات چوگنی ترقی ہُوئی، چونکہ میرے دل میں اُس کی بڑی قدر ہے اس لئے مَیں نے اس مجاہد کے نام پر اپنا نام رکھنا پسند کیا ہے۔

نوجوانانِ اسلام! قبل اس کے کہ مَیں ممبر سے اُتروں، آپ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ پر اسلام کی طرف سے بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس کو آپ کی جان فروشی اور سخت کوشی کی ضرورت ہے۔ ہم خادمانِ اسلام اب بُوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ لوگ اسلام کی ترقی و تبلیغ کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنی امکانی کوشش میں کسر نہ چھوڑیئے تاکہ اس انجمن کے اغراض کی تکمیل ہو اور اسلام اور مُسلمانوں کی خدمت جو اس کے مقاصد میں ان کی تحصیل ہو، آپ انجمن کے عہدہ داروں کے بھروسہ پر نہ رہیئے، انہیں بہت سے دفتری کام ہیں، اصل اور ٹھوس کام آپ کو کرنا ہے۔ اگر آپ مل جُل کر اسے انجام دینے کے لئے تیار ہوں تاکہ

یہ شاندار ادارہ ترقی کی انتہا کو پہنچ جائے۔

اس وقت مَیں نے آپ سے اس طرح گفتگو کی ہے جس طرح ایک دوست اپنے دوستوں سے کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک اپنے مخصوص حدود میں وہ تقریر کرنی چاہیئے۔ مگر دوستانہ گفتگو اس پابندی سے آزاد ہے۔ بھائی اپنے بھائیوں سے جو چاہے کہہ سکتا ہے مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان باتوں کو توجہ سے سُنا اور مترجم حضرات کا بھی جنہوں نے ترجمانی کی زحمت گوارہ کی۔ کیونکہ مجھے افسوس ہے کہ مَیں عربی زبان میں آپ کو مخاطب کرنے سے معذور تھا۔ (کشکول ص ۱۲۲ تا ص ۱۳۳)

"اسلام تلوار سے نہیں پھیلا" کے مزید دلائل حضرت قدس سرہٗ کی ایک نشری تقریر میں بھی ہیں جو کتاب کے آخر میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ (احقر قریشی عفرلہ)

وہ مذہب بھی کامل نہیں جس میں سیاست نہ ہو وہ سیاست نہیں جس کے ساتھ تلوار نہ ہو

وہ ڈاکٹر اپنے فن کا ماہر نہیں ہوسکتا جو صرف مرہم لگانا جانتا ہے مگر سڑے ہوئے فاسد شدہ اعضاء کا آپریشن کرنا نہیں جانتا۔

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

سمجھو اور خوب سمجھو کہ جب عالم کے جسم میں شرک کے زہریلے جراثیم پیدا ہو گئے اور وہ ایک مریض جسم کی طرح ہو گیا تو رحمتِ خداوندی نے اس لئے ایک مصلح اور مشفق طبیب (آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) کو بھیجا جس نے ترپن سال تک متواتر اس کے ہر عضو اور ہر رگ و ریشہ کی اصلاح کی فکر کی جس سے قابلِ اصلاح اعضاء تندرست ہو گئے مگر بعض اعضاء جو بالکل سڑ چکے تھے اُن کی اصلاح کی کوئی صُورت نہ رہی بلکہ خطرہ ہو گیا کہ ان کی سمیت تمام بدن میں سرایت کر جائے اس لئے حکیمانہ اصول کے موافق عین رحمت و حکمت کا اقتضاء یہی تھا کہ آپریشن کرکے ان اعضاء کو کاٹ دیا جائے یہی جہاد کی حقیقت ہے اور یہی تمام جارحانہ اور مدافعانہ غزوات کا مقصد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عین میدانِ کارزار گرم ہونے کے وقت بھی اسلام نے اپنے مقابل جماعت میں سے صرف انہی لوگوں کے قتل کی اجازت دی ہے جن کا مرض متعدی تھا یعنی جو اسلام کے مٹانے کے منصوبے گانٹھتے اور برسرِ جنگ آتے تھے اور ان کے متعلقین عورتیں، بچے بوڑھے اور مذہبی علماء جو لڑائی میں حصہ نہیں لیتے۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی تلوار سے مامون تھے بلکہ وہ لوگ جو کسی دباؤ سے مجبور ہو کر مقابلے پر آئے ہوں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ تھے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ بنی ہاشم میں سے کوئی شخص تمہارے سامنے آئے تو اُس کو قتل نہ کرنا کیونکہ وہ اپنی رضا سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے بلکہ ان کو جبراً لایا گیا ہے (از کنز ج ۵ صـ۲۷۲) بلکہ مقابلہ پر آنے والوں اور جنگ کرنے والوں میں سے بھی تا بمقدور ان لوگوں کو بچایا جاتا تھا جن کے متعلق آنحضرتؐ کو حسن اخلاق اور حسن معاشرت کی خبریں پہنچی تھیں ذیل کا واقعہ ہمارے اس دعوے کی پوری شہادت ہے۔

"جس وقت آپؐ فتح مکّہ کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو راستے میں ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے ارادۂ جہاد کو بھی اس نے عام عرب جاہلیت عرب کی لڑائیوں پر قیاس کر کے عرض کیا کہ اگر آپؐ خوب صورت عورتیں اور اونٹ چاہتے ہیں تو قبیلہ بنی مدلج پر چڑھائی کیجئے (کیونکہ ان میں اس کی کثرت ہے) یہاں صلح اور جنگ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ ارشاد ہوا کہ مجھے حق تعالےٰ نے بنی مدلج پر چڑھائی کرنے سے منع فرمایا ہے کہ وہ صلۂ رحمی کرتے ہیں" (احیاء العلوم للغزالی)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں سات جنگی قیدی پیش کئے گئے۔ آپؐ نے اُن کے قتل کا حکم فرمایا اور حضرت علیؓ کو اس پر مامور فرمایا۔ اسی وقت جبرائیل علیہ السّلام تشریف لائے اور کہا کہ یا رسول اللہ! ان چھ شخصوں کے لئے تو یہی حکم رکھئے لیکن اس ایک شخص کو آزاد کر دیجئے۔ آپؐ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ یہ کریم الاخلاق اور سخی آدمی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ آپ اپنی طرف

سے کہتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم فرمایا ہے۔

(کنز العمال ص۱۳۵ بحوالہ ابن الجوزی)

اسلامی جہاد تہذیب کے مدعی یورپین اقوام عالم کی عالم سوز جنگ نہ تھی جس میں اپنی ہوس رانی کے لئے بلا امتیاز مرد و عورت اور محرم و غیر محرم شہر کے شہر انتہائی بے رحمی کے ساتھ تباہ و برباد کر دیئے جاتے ہیں۔ اکبر مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ہو رہا ہے نفاذ حکم فنا!	نہ مکیں اس سے بچتے ہیں نہ مکاں
تو پیں خود آ کے اب تو میدان میں	پڑھتی ہیں کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگ دوسرے کی آنکھ کا تنکا تک دیکھتے ہیں مگر اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ پرواہ ہے	غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام	یہ نہ ارشاد ہوا توپ[2] سے کیا پھیلا ہے

---

[1] زمین پر جو کچھ ہے فنا ہونے والا ہے۔ (منہ)

[2] اگر یورپ کی خونی تاریخ کے صرف وہ اوراق سامنے رکھ لئے جائیں جو اندلس کے عروج و نزول سے متعلق ہیں تو اُن کی تہذیب و تمدن کی قلعی کھل جائے۔ کیونکہ خود یورپین مؤرخین کے بیان و اقرار کے مطابق وہاں یہ نظر آتا ہے کہ نویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک توپ و تفنگ، قتل و غارت اور طرح طرح کے مصائب ڈال کر مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف مجبور کیا گیا۔ سینکڑوں بندگانِ خدا کو جلا کر خاک کر دیا گیا، سینکڑوں کو قید کر کے ان کے سامنے ان کے بچوں کو ذبح کیا گیا، لاکھوں مسلمان اپنے دین کی حفاظت کے لئے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ غرناطہ کے میدان میں مسلمانوں کا اسی ہزار قلمی نادر و نایاب کتابوں کا بے نظیر ذخیرہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ سولھویں صدی میں ملک فلیپ نے اپنی قلمرو میں عربی زبان کا ایک جملہ بولنے کو جرم قرار دیا۔ مسلمانوں کے آثار کو ایک ایک کر کے مٹایا گیا۔ قرطبہ کی یکتائے روزگار و بے نظیر جامع مسجد میں متعدد گرجا گھر بنائے گئے۔ قصر حمرا و زہرا جو عالم میں بے نظیر اور بارہ ہزار برجوں پر مشتمل اور اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی آوازوں سے گونجتے تھے ان میں صلیبیں قائم کی گئیں، گرجے بنائے گئے جو اب تک قائم ہیں (یہ سب بیان علامہ محمد کرد علی کا ہے جو اُن کے رسالہ غابر الاندلس و حاضرہا میں مذکور ہے جس میں انہوں نے اندلس کی عہد ماضی و حال کا موازنہ کیا ہے۔)

(منہ اضافہ در طبع پنجم)

الغرض مدافعانہ اور جارحانہ جہاد کا مقصد صرف مکارم اخلاق کی اشاعت اور اسلام کا تحفظ و تبلیغ اسلام کے راستے میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں ان کا ہٹانا تھا۔ ان تمام واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد جس طرح عام یوربین مؤرخین اور مارگولیوس کا یہ خیال بالکل غلط اور افترا رہ جاتا ہے کہ اسلامی جہاد کا مقصد لوگوں کو بجبر مسلمان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنا معاش مہیا کرنا تھا۔ اسی طرح اسلامی روایات اور تعامل صحابہ کو جمع کرنے کے بعد اس میں بھی شک نہیں رہتا کہ اسلام میں جس طرح بغرض تحفظ مدافعانہ جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ اسی طرح حفظ ما تقدم اور موانع تبلیغ کو راستے سے ہٹانے کے لئے جارحانہ جہاد بھی[1] قیامت تک کے لئے ضروری کیا گیا ہے اور جس طرح مدافعانہ جہاد کی غرض لوگوں کو بجبر مسلمان بنانا نہیں اسی طرح جارحانہ جہاد کا مقصد بھی کسی طرح یہ نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جبکہ اسلام کا وسیع دامن عین وقت جہاد میں بھی کفار کو اپنی پناہ میں لینے اور کفر پر قائم رہتے ہوئے ان کی جان و مال، عزت و آبرو کی اسی طرح حفاظت کرنے کے لئے پھیلا ہوا ہے۔ جس طرح ایک مسلمان کی حفاظت کی جاتی ہے جس میں مدافعانہ انداز اور جارحانہ جہاد دونوں برابر ہیں۔ نیز دنیا میں حقیقی امن و امان قائم کرنا، ضعیفوں کو ظلم سے چھڑانا وغیرہ جو جہاد کے مقاصد ہیں۔ ان میں بھی دونوں قسمیں یکساں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلامی روایات کو مسخ کر کے جارحانہ جہاد کا انکار کیا جائے۔ جیسا کہ ہمارے بعض آزاد خیال مؤرخین نے کہا ہے۔

اس مختصر گزارش کے بعد ہم اپنے اصلی مقصد کو شروع کرتے ہیں۔ ہجرت کے بعد جہاد و غزوات کا جو سلسلہ شروع ہوا جن میں سے بعض میں خود آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بنفسِ نفیس تشریف لے گئے اور بعض میں خاص خاص صحابہ کی سرکردگی میں لشکر روانہ ہوئے۔ مؤرخین کی اصطلاح میں پہلی قسم کے جہاد کو غزوہ اور دوسری قسم کو سریہ کہتے ہیں۔ غزوات کی مجموعی تعداد تیئس ۲۳ ہے جن میں سے نو میں جنگ کی نوبت آئی باقی میں نہیں اور

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہی ہے (منہ)

سرایہ تینتالیس ہیں اور یہ عجیب ہے کہ ان تمام غزوات اور سرایا میں باوجود مسلمانوں کی بے سروسامانی اور قلتِ تعداد کے ہمیشہ فتح و نصرت ان ہی کا حصّہ ہوتا تھا۔ البتہ صرف غزوۂ احد میں اوّل فتح پانے کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ بھی اس لئے کہ لشکر کے ایک ٹکڑے نے آنحضرتؐ کے امر کے خلاف کیا تھا۔

ہم ان تمام غزوات و سرایا کو بغرض توضیح ایک نقشہ کی صورت میں سن وار درج کرتے ہیں اور چونکہ غزوات و سرایا کی تعداد میں اختلاف ہے اس لئے ہم نے اس تمام بیان میں حافظ حدیث علامہ مغلطائی کی سیرت پر اعتماد کیا ہے۔ نقشہ یہ ہے :۔

سن ہجری	غزوات و سرایا
سنہ ۱ھ	میں آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے دو سریئے روانہ فرمائے۔ اوّل سریہ حمزہؓ اور دوسرا سریہ عبیدہؓ۔
سنہ ۲ھ	میں پانچ غزوات ہوئے۔ غزوۂ ابواء جس کو غزوہ ودان بھی کہتے ہیں۔ غزوہ بدر کبریٰ، غزوۂ بنی قینقاع غزوۂ سویق۔ اور تین سریئے روانہ ہوئے (۱) سریہ عبداللہ بن جحشؓ (۲) سریہ عمیرؓ (۳) سریہ سالمؓ۔ اس سال کے غزوات میں سب سے اہم غزوۂ بدر ہے۔
سنہ ۳ھ	میں تین غزوات ہوئے (۱) غزوہ غطفان (۲) غزوہ احد اور (۳) غزوہ حمرالاسد۔ اور دو سریئے روانہ ہوئے (۱) سریہ محمد بن مسلمؓ (۲) سریہ زید بن حارثؓ
سنہ ۴ھ	میں دو غزوات پیش آئے۔ (۱) غزوہ بنی النضیر (۲) غزوہ بدر صغریٰ اور چار سریئے بھیجے گئے۔ سریہ ابوسلمہؓ، سریہ عبداللہ بن انیس، سریہ منذر، سریہ مرثد۔
سنہ ۵ھ	میں چار غزوات ہوئے جن میں خود حضرت رسالت پناہ صلّی اللہ علیہ وسلّم بنفس نفیس شریک ہوئے۔ غزوہ ذات الرقاع، غزوۂ دومۃ الجندل،

سن ہجری	غزوات سرایہ
	غزوہ[۳] مریسیع، جس کو غزوہ بنی المصطلق بھی کہا جاتا ہے۔ غزوہ[۴] خندق زیادہ اہم اور مشہور ہے۔
سنہ ۶ھ	میں تین غزوات پیش آئے۔ غزوہ[۱] بنی الحیان، غزوہ[۲] غابہ جس کو ذی قرد بھی کہا جاتا ہے۔ غزوہ[۳] حدیبیہ۔ اور گیارہ سرایا روانہ ہوئے۔ سریہ[۱] محمد بن مسلمہ بجانب قرطاء۔ سریہ[۲] عکاشہ، سریہ[۳] محمد بن مسلمہ بجانب ذی القعد، سریہ[۴] زید بن حارثہ بجانب بنی سلیم، سریہ[۵] عبدالرحمٰن بن عوف، سریہ[۶] علی، سریہ[۷] زید بن حارثہ، بجانب ام قرفہ، سریہ[۸] عبداللہ بن عتیک، سریہ[۹] عبداللہ بن رواحہ، سریہ[۱۰] قرز بن جابر، سریہ[۱۱] عمرو الضمری۔ اس سال کے واقعات میں غزوہ حدیبیہ زیادہ اہم ہے۔
سنہ ۷ھ	میں صرف ایک غزوہ خیبر واقع ہوا جو اہم غزوات میں سے ہے اور پانچ سرایہ روانہ ہوئے۔ سریہ[۱] ابوبکر، سریہ[۲] بشر بن سعد، سریہ[۳] غالب بن عبداللہ، سریہ[۴] بشیر، سریہ[۵] اخزم۔
سنہ ۸ھ	اس سال میں چار غزوات پیش آئے۔ غزوہ[۱] موتہ، فتح[۲] مکہ، غزوہ[۳] حنین، غزوہ[۴] طائف۔ اور دس سرایہ بھیجے گئے۔ سریہ[۱] غالب بجانب ملوح، سریہ[۲] غالب بجانب فدک، سریہ[۳] شجاع سریہ[۴] کعب، سریہ[۵] عمرو بن العاص، سریہ[۶] ابو عبیدہ بن الجراح، سریہ[۷] ابو قتادہ، سریہ[۸] خالد، جس کو غمیصاء بھی کہتے ہیں، سریہ[۹] طفیل بن عمرو دوسیؓ، سریہ[۱۰] قطبہ۔
سنہ ۹ھ	اس سال صرف ایک غزوہ، غزوۂ تبوک واقع ہوا جو اہم غزوات میں سے ہے اور تین سریئے روانہ ہوئے۔ سریہ[۱] علقمہ، سریہ[۲] علی، سریہ[۳] سکاشہ۔
سنہ ۱۰ھ	اس سال صرف دو سریئے روانہ کیے گئے۔ سریہ[۱] خالد بن ولید بجانب

سن ہجری	غزوات و سرایہ
	نجران اور سریہ علیؓ بجانب یمن۔ اور اسی سال حجۃ الوداع ہُوا۔ اس سال آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صرف ایک سریہ کی روانگی بسرکردگی حضرت اسامہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ حکم فرمایا تھا جو آپؐ کے وصال کے بعد روانہ ہو سکا ؂

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین اور مؤرخین اسلام کی اصطلاح میں غزوہ اور سریہ کا اطلاق کچھ ایسا عام ہے کہ ذرا ذرا سے معمولی واقعات کو بھی غزوہ اور سریہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ اگر ایک یا دو آدمی کسی مجرم کی گرفتاری کے لئے گئے ہیں تو مؤرخین اس کو بھی سریہ کہتے ہیں۔ چند آدمی کسی معمولی قبیلہ کی اصلاح یا اُن کے حالات کی خبر لینے کو گئے تو مؤرخین نے اس کو بھی سریہ سے تعبیر کر دیا۔

اسی طرح غزوہ کے مفہوم میں بھی مؤرخین کی اصطلاح میں نہایت توسّع ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ غزوات یا سرایہ کی مجموعی تعداد مذکورۃ القدر بیان کے مطابق چھیاسٹھ ۶۶ (غزوات ۲۳، سرایہ ۴۳) تک پہنچتی ہے۔ ورنہ ہمارے عرف میں جہاد اور غزوہ، جس اہم جنگ کو سمجھا جاتا ہے وہ ان تمام واقعات میں صرف چند ہیں جن کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

اہم غزوات وسرایا اور واقعات متفرقہ

پہلا سریہ امارت حمزہؓ ہجرت کے سات مہینے کے بعد ماہ رمضان المبارک میں نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو تیس مہاجرین پر امیر لشکر بنا کر ایک سفید جھنڈا اعطا فرمایا اور قریش کے ایک قافلہ کی طرف روانہ کیا۔ لیکن جب یہ حضرات دریا کے کنارے

پر پہنچے اور باہمی مقابلہ ہوا تو مجدی بن عمرو جہنی نے درمیان میں پڑ کر اس جنگ کو روک دیا۔

سریہ عبیدہ بن الحارث اور اسلام میں تیر اندازی کا آغاز

پھر شوال سنہ ۱ھ میں حضرت عبیدہ بن الحارث رضؓ کو ساٹھ آدمیوں کا امیر لشکر بنا کر بطن رابغ کی طرف ابوسفیان کے مقابلے کے لئے روانہ فرمایا۔ اسی جہاد میں اوّل تیر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کفار پر پھینکا اور یہ سب سے پہلا تیر ہے جو اسلام میں کفار پر چلایا گیا تھا۔

(سیرت صد ۹۳ تا صد ۱۰۱)

۲ھ

تحویل قبلہ، غزوۂ بدر، سریہ عبداللہ بن جحش

تحویل قبلہ

اس سال سے اسلام کی زندگی میں ایک عظیم الشان تغیر یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قبلہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خواہش کے مطابق بیت المقدس کی بجائے کعبہ قرار دیا جاتا ہے جو دُنیا کا پہلا گھر ہے اور جسے لوگوں کو یک جہتی کے ساتھ خدا تعالےٰ کی عبادت پر مجتمع کرنے کے لئے مرکز توجہہ بنایا گیا ہے۔ (سیرت ص ۱۰۲)

کعبہ کے قبلہ نما ہونے کی ابتداء کب ہوئی

اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے مکّہ مکرّمہ میں جب نماز فرض ہوئی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ اوّل ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا، جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے تک باقی رہا۔ اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا عمل مکّہ مکرّمہ میں یہ رہا کہ آپؐ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا بھی استقبال ہو جائے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا۔ اس سے تحویل قبلہ کا اشتیاق پیدا ہُوا۔ (ابن کثیر) اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہُوئی مکّہ میں تو مُسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جب تک مکّہ میں

مقیم رہے بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ پھر ہجرت کے بعد آپ کا قبلہ بیت المقدس قرار دے دیا گیا اور مدینہ میں سولہ سترہ مہینے آپ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ اس کے بعد پھر آپ کا جو پہلا قبلہ تھا یعنی بیت اللہ، اسی کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آگیا۔

تفسیر قرطبی میں بحوالہ ابو عمرو اسی کو اصح القولین قرار دیا ہے اور حکمت اس کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائل یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت نے ان کو مانوس کرنے کے لئے ان ہی کا قبلہ باذن خداوندی اختیار کر لیا۔ مگر پھر تجربے سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپ کو اپنے اصلی قبلہ یعنی بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم مل گیا جو آپ کو اپنے آباء حضرت ابراہیم و اسماعیل کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

قرطبی نے ابو العالیہ ریاحی سے نقل کیا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کا قبلہ بھی بیت اللہ کی طرف تھا اور پھر ابو العالیہ نے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوگیا۔ یہودی نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ صخرہ بیت المقدس تھا۔ ابو العالیہ نے کہا کہ نہیں، حضرت موسےٰ علیہ السلام صخرہ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے، مگر آپ کا رُخ بیت اللہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔ یہودی نے انکار کیا تو ابو العالیہ نے کہا کہ میرے تمہارے جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح علیہ السلام کی مسجد کرے گی جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر ہے۔ دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔

جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے۔ اُن کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے امتیاز اور ان سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا۔ اس لئے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا۔ پھر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے امتیاز اور ان کی مخالفت کا اظہار مقصود ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔

(معارف القرآن ج ۱ صہ ۳۷۴، صہ ۳۷۵)

بخاری و مسلم اور تمام معتبر کتب حدیث میں متعدد صحابہ کرامؓ کی روایت سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی (اور بعض روایات میں اس جگہ عصر کے بجائے ظہر مذکور ہے۔ ابن کثیر) تو بعض صحابہ کرامؓ یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسب سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ ان لوگوں نے درمیان نماز میں ہی بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔

نویلہ بنت مسلم کی روایت میں ہے کہ اس وقت عورتیں جو پچھلی صفوں میں تھیں، آگے آگئیں اور مرد جو اگلی صفوں میں تھے پیچھے آگئے اور جب رُخ بیت اللہ کی طرف بدلا گیا تو مردوں کی صفیں آگے اور عورتوں کی پیچھے ہو گئیں (ابن کثیر)

بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر یا عصر ہی سے تحویل قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا۔ مگر قبا میں یہ خبر اگلے دن صبح کی نماز میں پہنچی۔ جیسا کہ بخاری و مسلم میں بروایت ابن عمر رضی اللہ عنہ مذکور ہے۔ اہلِ قبا نے بھی نماز ہی کے اندر اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا (ابن کثیر و حصاص)۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۳۷۶)

سریہ عبداللہ بن جحشؓ اور اسلام میں پہلی غنیمت

اسی سال میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بارہ مہاجرین پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو امیر بنا کر ماہِ رجب میں مقام نخلہ میں ایک قریشی قافلہ کے لئے روانہ فرمایا۔ جس روز قافلہ سامنے آیا تو اتفاقاً ماہ رجب کی پہلی تاریخ تھی اور رجب ان مہینوں میں سے ہے جن میں ابتداء اسلام میں قتل و قتال حرام تھا۔ لیکن حضرات صحابہ اس تاریخ کو تو جمادی الثانیہ کی تیسویں تاریخ سمجھ رہے تھے۔ جیسا کہ لباب النقول اور بیضاوی میں ابن جریر اور بیہقی سے نقل کیا ہے۔ اس لئے مشورہ کے بعد یہی قرار پایا کہ مقابلہ کرنا

چاہیئے۔ بالآخر مقابلہ ہُوا تو رئیسِ قافلہ مارا گیا اور دو آدمی گرفتار ہُوئے، باقی بھاگ گئے اور مُسلمانوں کو بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا جو امیر سریہ نے شرکاء جہاد میں تقسیم کر دیا اور پانچواں حصّہ بیت المال کے لئے نکال رکھا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کُل مالِ غنیمت لے کر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ نے فرمایا کہ مَیں نے تمہیں اشہر حرام یعنی رجب میں مقاتلہ کا حکم دیا تھا۔ بالآخر آپؐ نے یہ مالِ غنیمت بدر سے فارغ ہونے کے بعد اس کے مالِ غنیمت کے ساتھ تقسیم کیا۔

اس واقعہ سے عرب میں یہ چرچا ہُوا کہ آپؐ نے اشہر حرام میں قتال کو جائز کر دیا۔ اس وقت آیت کریمہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ان کے جواب میں نازل ہوئی۔ (سیرت صد ۱۰۲، صد ۱۰۳)

غزوۂ بدر

مدینہ منوّرہ سے تقریباً اسّی میل کے فاصلہ پر ایک کنوئیں کا نام بدر[1] ہے اور اسی کے

---

[1] بدر، مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی بیسّی میل کے فاصلے پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے۔ اس وقت اس کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پر پانی کی افراط تھی اور یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی۔ توحید اور شرک کے درمیان یہاں پر سب سے پہلا معرکہ بروز جمعۃ المبارک بمطابق ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۲ھ مطابق ۱۱ مارچ سنہ ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا۔ یہ غزوہ بظاہر تو ایک مقامی جنگ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ اسی لئے قرآن کی زبان میں اسے یوم الفرقان کہا گیا ہے۔ فرنگی مؤرخوں نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے۔ امریکی پروفیسر ہٹی اپنی کتاب "ہسٹری آف دی عربین" میں کہتا ہے "یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی"۔ (معارف القرآن ج ۲ صد ۱۷) ::

نام سے ایک گاؤں کی آبادی بھی ہے۔ یہ عظیم الشان جہاد اسی سرزمین پر واقع ہوا، جس کا واقعہ بالاختصار یہ ہے:۔

"قریش کا مایۂ ناز اوران کی تمام تر قوت وشوکت کا سبب چونکہ ملک شام کی تجارت تھی اس لئے سیاسی اصول کے مطابق ضرورت تھی کہ اُن کی شوکت توڑنے کے لئے اس سلسلہ کو بند کیا جائے۔ ایک مرتبہ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ملک شام سے آرہا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو ۱۲ رمضان المبارک سنہ ۲ھ کو تین سو چودہ صحابہؓ مہاجرین وانصار کو ساتھ لے کر مقابلہ کے لئے خود بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ روحا میں پہنچ کر ڈیرا ڈال دیا۔ (روحاء مدینہ کی جنوبی جانب میں چالیس میل کے فاصلہ پر ایک مقام ہے) ادھر قریشی قافلہ کے سردار کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ اس لئے وہ یہ راستہ چھوڑ کر دریا کے کنارے کنارے قافلہ کو لے چلا اور ساتھ ہی ایک سوار کو مکّہ کی طرف دوڑایا کہ قریش اپنی پوری طاقت کے ساتھ جلد موقع پر پہنچیں اور اپنے تجارتی قافلے کی حفاظت کریں۔ قریش پہلے ہی مسلمانوں کے استیصال کے منصوبے گانٹھ رہے تھے۔ اس خبر کا مکّہ میں پہنچنا تھا کہ فوراً نو سو پچاس نوجوانوں کا ایک بڑا لشکر جس میں سو گھوڑے کے سوار اور سات سو اُونٹ تھے، آپؐ کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس لشکر میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور متموّل سب کے سب شریک تھے۔

صحابہ کی جاں نثاری

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع پہنچی، تو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور صدیق اکبرؓ اور دُوسرے صحابہؓ نے اپنی جان ومال کو پیش کر دیا۔ عمیر ابن وقاصؓ اور وقت کم عمر تھے اس لئے آنحضرتؐ نے ان کو شرکتِ جہاد سے روک دیا تو وہ رونے لگے اس پر آپؐ نے اجازت عطا فرمائی اور وہ بھی شریک جہاد ہُوئے۔

انصار میں سے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ نے اُٹھ کر کہا کہ خدا کی قسم! آپؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں کُود پڑیں (صحیح مسلم) اور بخاری کی روایت میں ہے کہ مقدادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ!

ہم آپؐ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے لڑیں گے۔ یہ سُن کر آپؐ بہت مسرور ہُوئے۔ آگے بڑھنے کا حکم فرمایا۔ بدر کے قریب پہنچے تو معلوم ہُوا کہ ابوسفیان تو اپنے قافلہ تجارت کو لے کر نکل گیا ہے اور قریش کا بڑا لشکر اسی میدان کے دوسرے کنارے پر پڑا ہے۔ اور قافلہ نکل جانے کے بعد بھی ابوجہل نے لوگوں کو یہی مشورہ دیا ہے کہ جنگ کو ملتوی نہ کیا جائے۔

مسلمانوں کا لشکر یہ سُن کر آگے بڑھا لیکن قریش پہلے پہنچ کر ایسی جگہ پر قابض ہو چکے تھے جو جنگی محاذ کے لئے بہتر تھی۔ پانی کے مواقع بھی سب اسی طرف تھے۔ مسلمان پہنچے تو ایسی ریتلی زمین اُن کے حصّے میں آئی کہ اس میں چلنا دشوار ہونے کے علاوہ پانی کا نام بھی نہیں تھا۔

غیبی امداد

لیکن خداوند عالم فتح ونصرت کا وعدہ فرما چکا تھا ایسے ہی اسباب مہیا فرما دیئے کہ اسی وقت بارش ہُوئی جس سے زمین کی ریت جم گئی۔ تمام لشکر نے سیراب ہو کر پانی پیا اور پلایا اور اپنے سب برتن بھر لئے۔ زمین میں باقی ماندہ پانی کو حوض بنا کر روک دیا گیا۔ ادھر اسی بارش نے کفار کی زمین پر اس قدر کیچڑ پیدا کر دیا کہ چلنا مشکل ہو گیا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم صفوف قتال کو درست کرنے کے لئے خود کھڑے ہُوئے۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ لشکر ایک مستحکم دیوار کی صورت بن کر کھڑا ہو گیا۔

مسلمانوں کا ایفائے وعدہ

اس وقت جب کہ تین سو بے سروسامان آدمیوں کا مقابلہ ایک ہزار باشوکت انسانوں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک شخص بھی ان کی امداد کو پہنچ جائے تو وہ کس قدر غنیمت معلوم ہو گا۔ لیکن اسلام میں پابندیٔ عہد ان سب باتوں سے مقدم ہے۔ عین میدانِ کارزار میں حضرت

حذیفہؓ اور ابوحسل صحابیؓ شرکت جہاد کے لئے پہنچتے ہیں۔ مگر آکر اپنے راستے کا حوالہ بیان کرتے ہیں کہ راستے میں کفار نے روکا کہ تم محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی امداد کو جارہے ہو۔ ہم نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کر لیا۔ جب آپؐ کو اس وعدے کا علم ہوگیا تو دونوں کو شرکتِ جہاد سے روک دیا اور فرمایا کہ ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے۔ ہمیں اللہ تعالےٰ کی امداد کافی ہے اور بس (صحیح مسلم)

الغرض صفیں درست ہوگئیں تو پہلے قریش کے تین بہادر نکلے۔ مسلمانوں میں سے حضرت علیؓ اور حمزہؓ بن عبدالمطلب اور عبیدہؓ بن الحارث نے ان کا مقابلہ کیا۔ تینوں کافر قتل ہوگئے۔ مسلمانوں میں صرف عبیدہؓ زخمی ہوئے۔ حضرت علیؓ نے ان کو کندھے پر اُٹھا کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا دیا۔ آپؐ نے اپنے پائے مبارک سے تکیہ لگا کر ان کو لٹایا اور چہرے کا غبار خود دستِ مبارک سے صاف فرمایا ؎

رونے کا کچھ آج ہی مزہ ہے　　دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو

عبیدہؓ نے دم توڑتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں تم شہید ہو اور میں اس پر گواہ ہوں۔ اب تو عبیدہؓ نے مسرت سے کہنے لگے کہ آج ابوطالب زندہ ہوتے تو انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ ان کے اشعار کا پورا مستحق ہوں[1]۔

---

[1] آنحضرتؐ کے چچا ابوطالب جو ہمیشہ آپؐ کی حمایت میں سرگرم رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے جذبۂ حمایت کو ان اشعار میں ادا فرمایا تھا ؎

کذبتم وبیت اللہ یبزی محمدًا　　ولما نطاعن دونہ ونناضل

ونسلمہ حتی نصرع حولہ　　ونذھل عن ابنائنا والحلائل

یعنی "بیت اللہ کی قسم! تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو بغیر سمت نیزہ بازی اور تیر اندازی کے سپرد خاک کر دیں گے یا آپؐ کو دشمنوں کے سپرد کر دیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری لاشیں آپؐ کے گرد پڑی ہوں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں کو بھول جائیں"

(از کنز ج ۵ ص ۲۷۲)، (منہ)

جب عبیدہؓ کی وفات ہوگئی تو خود سرورِ کائنات صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اُن کی قبر میں اُترے اور اپنے دستِ مبارک سے دفن کیا۔ یہ امتیازی فضیلت تمام صحابہؓ میں سے صرف حضرت عبیدہؓ کا حصّہ تھی۔ (کنز) ؎

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیاز مندے
کو بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

صحابہؓ کا حیرت انگیز ایثار و جانبازی

اس وقت جب دونوں لشکر ملے تو دیکھا گیا کہ بہت سے اپنے ہی لختِ جگر تلواروں کی زد میں ہیں، مگر اس حزب اللہ کا عقیدہ تھا ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد!
فدائے یک تن بیگانہ کا شنا باشد[1]

چنانچہ صدیق اکبرؓ کے بیٹے (جو اب تک ایمان نہ لائے تھے) میدان میں آئے تو خود حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تلوار اُن کی طرف بڑھی۔ عتبہ سامنے آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہؓ تلوار کھینچ کر باہر نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا ماموں میدان میں بڑھا تو فاروقی تلوار نے خود اس کا فیصلہ کیا۔ (سیرت ابن ہشام و استیعاب ابن عبد البر)

اس کے بعد گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی۔ ادھر میدانِ کارزار گرم تھا، ادھر سید الرسل صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سجدے میں پڑے ہوئے فتح و نصرت کی دُعا مانگ رہے تھے، بالآخر غیبی شہادت نے آپؐ کو مطمئن فرمایا۔

ابوجہل کی ہلاکت

چونکہ ابوجہل کی شرارت اور اسلام کی دشمنی سب میں مشہور ہے اس لئے انصار میں حضرت

---

[1] یعنی ہزار قریبی رشتہ دار جو خدا وند تعالےٰ سے بیگانہ ہوں، اس ایک شخص پر فدا ہے جو کہ آشنائے حق ہے۔ (منہٗ)

معوذؓ اور معاذؓ دونوں بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ وہ جب ابوجہل کو دیکھیں گے تو اُسے مار دیں گے یا خود مر جائیں گے۔ اس موقع پر دونوں بھائی اپنا عہد پُورا کرنے کے لئے نکلے۔ مگر ابوجہل کو پہچانتے نہ تھے۔ اس لئے عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے پُوچھا کہ ابوجہل کون سا ہے؟ انہوں نے اشارے سے بتلایا۔ بتلانا تھا کہ دونوں بھائی باز کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ ابوجہل اسی وقت خاک وخون میں تھا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے (جو بعد میں مُسلمان ہُوئے) پیچھے سے آکر معاذؓ کے شانہ پر تلوار ماری جس سے شانہ کٹ گیا مگر ایک تسمہ باقی رہا۔ معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا مگر وہ بھاگ گئے۔ پھر معاذؓ اسی حالت میں مصروفِ جہاد ہو گئے۔ لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے ہاتھ کو نیچے دبا کر کھینچا کہ وہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور پھر مصروفِ جہاد ہو گئے۔ (سیرت حلبیہ ج ۱ صـ ۵۵۴)

ایک عظیم الشان معجزہ، ایک مُٹھی کنکروں سے سارے لشکر کو شکست اور ملائکہ کی امداد

آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے بحکم خداوندی ایک مٹھی بھر کنکریاں دشمن کے لشکر کی طرف پھینکیں اور پھر صحابہؓ سے فرمایا کہ دفعتاً ان پر ٹوٹ پڑو۔ ادھر ظاہر اسباب میں صحابہؓ کی تھوڑی سی جماعت ان کی طرف بڑھی اور ادھر خداوند عالم نے ملائکہ کی فوج مسلمانوں کی امداد کے لئے بھیج دی اور اپنا وعدۂ نصرت پُورا فرما دیا۔[1]

---

[1] غزوۂ بدر میں جو اللہ تعالےٰ کے فرشتے امداد کے لئے بھیجے گئے ان کی تعداد اس جگہ (سورۃ الانفال آیت ۹ میں) ایک ہزار منقول ہے اور سورہ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار ذکر کی گئی ہے۔ اس کا سبب دراصل تین مختلف وعدے ہیں جو مختلف حالات میں کئے گئے۔ پہلا وعدہ ایک ہزار فرشتوں کا ہُوا جس کا سبب رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی دُعا اور عام مسلمانوں کی فریاد تھی۔ دُوسرا وعدہ جو تین ہزار فرشتوں کا سورۂ آل عمران میں پہلے مذکور ہے وہ اس وقت کیا گیا جب مُسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ قریشی لشکر کے لئے اور کمک آرہی ہے۔ روح المعانی میں ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر وغیرہ سے بروایت شعبی منقول ہے کہ مسلمانوں کو بدر کے دن یہ خبر پہنچی کہ ابن جابر محاربی مشرکین کی امداد کے لئے کمک لے کر آرہا ہے۔ اس خبر سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور باقی کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ ان میں بعض کو قتل اور بعض کو قید کر لیا گیا جس میں ستر آدمی مقتول اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵ سے آگے) مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوا، اس پر آل عمران کی آیت اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ نازل ہوئی جس میں تین ہزار فرشتے امداد کے لئے آسمان سے نازل کرنے کا وعدہ ذکر کیا گیا۔ اور تیسرا وعدہ پانچ ہزار کا اس شرط کے ساتھ مذکور تھا کہ اگر فریق مخالف نے یکبارگی حملہ کر دیا تو پانچ ہزار فرشتوں کی مدد بھیج دی جائے گی۔ وہ آل عمران کی آیت مذکورہ کی بعد کی آیت میں اس طرح مذکور ہے:

بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ یعنی اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کریگا جو خاص شان یعنی خاص وردی میں ہوں گے"۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وعدہ میں تین شرطیں تھیں۔ ایک ثابت قدمی، دوسرے تقویٰ، تیسرے فریق مخالف کا یکبارگی حملہ۔ پہلی دو شرطیں تو صحابہ کرامؓ میں موجود تھیں اور اس میدان میں اوّل سے آخر تک ان میں کہیں فرق نہیں آیا، مگر تیسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی اس لئے پانچ ہزار ملائکہ کے لشکر کی نوبت نہیں آئی اس لئے معاملہ ایک ہزار اور تین ہزار میں دائر رہا جس میں یہ بھی احتمال ہے کہ تین ہزار سے مراد یہ ہو کہ ایک ہزار جو پہلے بھیجے گئے انکے ساتھ مزید دو ہزار شامل کر کے تین ہزار کر دیئے گئے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ تین ہزار اس پہلے ہزار کے علاوہ ہوں۔ یہاں یہ بھی بات قابل نظر ہے کہ ان تین آیتوں میں ملائکہ کی تین جماعتوں کے بھیجنے کا وعدہ ہے اور ہر جماعت کیساتھ ایک خاص صفت کا ذکر ہے، سورۂ انفال کی آیت جس میں ایک ہزار کا وعدہ ہے اس میں تو ان ملائکہ کی صفت میں مُردِفین فرمایا ہے جس کے معنے پیچھے لگنے والے، اس میں شاید اسطرف پہلے ہی اشارہ کر دیا گیا کہ ان فرشتوں کے پیچھے دوسرے بھی آنیوالے ہیں اور سورۂ آل عمران کی پہلی آیت میں ملائکہ کی صفت میں مُنزلین ارشاد فرمائی یعنی یہ فرشتے آسمان سے اُتارے جائینگے۔ اسمیں اشارہ خاص اہمیت کی طرف ہے کہ زمین میں جو فرشتے پہلے سے موجود ہیں ان سے کام لینے کی بجائے خاص اہتمام کے ساتھ یہ فرشتے آسمان سے اسی کام کیلئے بھیجے جائینگے اور آل عمران کی دوسری آیت جسمیں پانچ ہزار کا ذکر ہے اسمیں ملائکہ کی صفت مسوّمین ارشاد فرمائی ہے کہ وہ ایک خاص لباس اور علامت کیساتھ ہوں گے۔ جیسا کہ روایت حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونیوالے فرشتوں کے عمامے سفید اور غزوۂ حنین میں مدد کیلئے آنیوالے فرشتوں کے عمامے سُرخ تھے۔ آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝ یعنی جو مدد بھی کہیں سے ملتی ہے خواہ ظاہری صورت سے ہو یا مخفی انداز سے سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اس لئے تمہاری نظر صرف اسی ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی طرف رہنی چاہیئے۔ (معارف القرآن ج ۲ صہ ۱۹۱ تا صہ ۱۹۳)

ستر گرفتار ہوئے۔ قریش کے بڑے بڑے سردار عتبہ، شیبہ، ابوجہل، امیہ بن خلف، سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ادھر مسلمانوں میں سے صرف چودہ آدمی شہید ہوئے۔ چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے۔

تنبیہ یہ غزوہ دراصل اول سے آخر تک اسلام کا کھلا معجزہ تھا۔ ورنہ اس میں مسلمانوں کی فتح کوئی معنے نہیں رکھتی۔ کیونکہ ادھر ایک ہزار نوجوانوں کا عظیم الشان لشکر ہے اور ادھر صرف تین سو چودہ آدمی۔ اِدھر بڑے بڑے دولت مند اُمراء جو تنہا سارے لشکر کے لئے رسد وغیرہ کا خرچ خود اُٹھا سکتے ہیں اور اِدھر مسلمانوں کے لشکر میں صرف دو گھوڑے۔ ادھر ہر قسم کے ہتھیار و اسلحہ کی بھرمار اور ادھر صرف متعدد تلواریں۔ یورپین مؤرخین حیرت میں ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا؟ انہیں خبر نہیں کہ فتح و نصرت، کامیابی یا ناکامی، گھوڑوں اور تلواروں یا مال و دولت کے قبضے میں نہیں ہیں، بلکہ اس میں اور کوئی ہاتھ کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن اسباب ظاہری کے دلدادہ، برق و بھاپ کو پوجنے والے کہاں اس حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ اکبر نے کیا خوب کہا ہے ؎

چھوڑ کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

اسیرانِ جنگِ بدر سے مسلمانوں کا سلوک!
تہذیب کے مدعی یورپین کے لئے سبق

اسیرانِ جنگِ بدر جب مدینہ طیبہ پہنچے تو آنحضرتؐ نے دو دو، چار چار کر کے صحابہؓ میں تقسیم کر دیئے اور سب کو حکم فرمایا کہ ان کو آرام کے ساتھ رکھیں جس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیز بھی ان قیدیوں میں تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے جن انصار کے سپرد کیا گیا تھا جب وہ کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے تھے اور خود صرف کھجوروں پر بسر کرتے تھے۔ اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں بعد مشورہ صحابہؓ یہ طے ہوا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ چار چار ہزار فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔

اسلامی مساوات

ان قیدیوں میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے چچا حضرت عباس (جو بعد میں مُسلمان ہوئے) بھی تھے۔ حضرت عباس رات کو قید کی تکلیف سے کراہتے تھے۔ ان کی آواز آپؐ کے گوش مبارک میں پہنچی تو نیند اُڑ گئی۔ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپؐ کو نیند کیوں نہیں آئی؟ ارشاد ہُوا کہ مَیں کیسے سو سکتا ہوں؟ جبکہ میرے عمّ بزرگوار کے کراہنے کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی ہے۔ (کنز ج ۵ ص۲۷۲) یہ سب کچھ تھا، مگر مساواتِ اسلامی اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ اپنے ضعیف العمر عمّ بزرگوار کو قید سے رہا کر دیا جائے۔ جس طرح سب سے فدیہ لیا گیا ان سے بھی اسی طرح وصول کیا گیا بلکہ عام قیدیوں سے کچھ زیادہ۔ کیونکہ عام اسیروں سے چار ہزار اور امراء سے کچھ زیادہ لیا گیا۔ حضرت عباسؓ بھی غنی تھے۔ اس لئے ان کو بھی چار ہزار سے زیادہ دینا پڑا۔

انصار نے بھی کہا کہ حضرت عباسؓ سے فدیہ معاف کر دیا جائے۔ مگر اسلامی مساوات میں عزیز واقارب اور دوست دشمن سب برابر تھے۔ انصار کے کہنے پر بھی یہ قبول نہیں کیا گیا۔ اسی طرح آپؐ کے داماد حضرت ابوالعاصؓ بھی اسیرانِ جنگ میں آئے۔ ان کے پاس فدیہ دینے کے لئے مال نہیں تھا، اس لئے ان کی زوجہ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو جو مکّہ میں مقیم تھیں کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں۔ اُن کے گلے میں ایک ہار تھا جو اُن کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے اُن کو جہیز میں دیا تھا، وہی گلے سے اُتار کر بھیج دیا۔ جب آپؐ نے یہ ہار دیکھا تو بے اختیار آپؐ کی آنکھوں میں آنسوؤں بھر آئے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تم سب راضی ہو تو زینب رضہ کے پاس یہ اُس کی والدہ کی یادگار ہے۔ اس کو واپس کر دو۔ صحابہؓ نے بخوشی قبول کر کے واپس کر دیا اور ابوالعاصؓ سے کہہ دیا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو مدینہ بھیج دیں۔

(مشکوٰۃ ص۳۴۶ بحوالہ ابوداؤد و احمد)

ابوالعاصؓ کا اسلام

ابوالعاصؓ آزاد ہو کر مکہ پہنچے اور شرط کے موافق حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا۔ ابوالعاصؓ ایک بڑے تاجر تھے۔ اتفاقاً دوسری مرتبہ پھر ملک شام سے مال لاتے ہوئے پکڑے گئے اور پھر اس مرتبہ رہا ہو کر مکہ واپس آئے تو تمام شرکاء کا حساب بے باق کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور لوگوں سے کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں اگر مسلمان ہوتا ہوں کہ لوگ یوں نہ کہیں کہ ہمارا مال لے کر تقاضہ کے ڈر سے مسلمان ہو گیا یا بہ جبر و اکراہ مسلمان کر لیا گیا۔ (تاریخ طبری)

بدر کے قیدیوں کے پاس کپڑے نہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سب کو کپڑے ولوا دیئے۔ مگر حضرت عباسؓ[1] کا قد اس قدر لمبا تھا کہ کسی کا کرتہ اُن کے بدن پر راست

---

[1] اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے بارے میں نازل ہوئی (وہ آیت یہ ہے یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّمَنْ فِیْٓ اَیْدِیْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓی اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ (الانفال آیت ۷۰)۔ کیونکہ وہ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے اور ان سے بھی فدیہ لیا گیا تھا۔ ان کی خصوصیت اس معاملے میں یہ تھی کہ جنگ بدر میں یہ مکہ سے سات سو گنی سونا لے کر چلے تھے تاکہ وہ لشکر کفار پر خرچ کیا جائے اور ابھی یہ خرچ ہونے نہیں پایا تھا کہ وہ مع اس سونے کے گرفتار کر لئے گئے۔ جب فدیہ دینے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرتؐ سے عرض کیا کہ میرے ساتھ جو سونا تھا اس کو میرے فدیہ کی رقم میں لگا لیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو مال آپ کفر کی امداد کے لئے لائے تھے وہ تو مسلمانوں کا مال غنیمت بن گیا۔ فدیہ اس کے علاوہ ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی آپ ادا کریں۔ عباسؓ نے عرض کیا کہ اگر اتنا مالی بار مجھ پر ڈالا گیا تو مجھے قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی۔ میں بالکل فقیر ہو جاؤں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ کیوں کیا آپ کے پاس وہ مال موجود نہیں جو مکہ سے روانگی کے وقت آپ نے اپنی زوجہ ام الفضل کے حوالے کیا ہے۔ حضرت عباسؓ نے پوچھا۔ آپؐ کو یہ کیسے معلوم ہوا جبکہ وہ میں نے رات کی تاریکی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا اور کوئی تیسرا آدمی اس سے واقف نہیں۔ آپؐ نے فرمایا

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نہ آیا تو عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) نے اپنا کُرتہ دے دیا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جو اپنا کُرتہ عبداللہ بن ابی کے کفن میں عنایت فرمایا تھا اس میں احسان کا معاوضہ بھی ملحوظ تھا۔ (صحیح بخاری)

اسلامی ریاست اور ترقی تعلیم

اسیرانِ جنگ میں جو لوگ فدیہ نہیں دے سکتے تھے اُن میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اُن سے کہا گیا کہ تم دس بچّوں کو لکھنا سکھا دو تمہارا فدیہ یہی ہے۔ حضرت زید بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

اس سال کے واقعات متفرقہ

اسی سال اتوار کے روز آنحضرتؐ غزوہ بدر سے واپس آئے تو لوگ آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کو دفن کر کے ہاتھ جھاڑ رہے تھے (سیرت مغلطائی صـ۴۵) اسی سال بعد واپسی غزوۂ بدر پہلی مرتبہ عید الفطر پڑھی گئی۔ رمضان کے روزے اور صدقۃ الفطر اسی سال واجب ہوئے۔ عید الاضحیٰ کی نماز اور قربانی اسی سال واجب ہوئیں اور اسی سال حضرت فاطمہؓ کا نکاح ہوا۔ (سیرت صـ۱۰۳ تا صـ۱۱۲)

(بقیہ حاشیہ صـ۱۶۹ سے آگے) کہ مجھے میرے رب نے اسکی پوری تفصیل بتا دی۔ حضرت عباسؓ کے دل میں یہ سُن کر آنحضرتؐ کے سچے رسول ہونے کا یقین ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ آنحضرتؐ کے دل سے معتقد تھے مگر کچھ شبہات تھے جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت رفع فرمائے اور وہ درحقیقت اسی وقت سے مسلمان ہو گئے مگر ان کا بہت سا روپیہ قریش مکّہ کے ذمّہ قرض تھا اگر یہ اسی وقت اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا۔ اس لئے اعلان نہیں کیا فتح مکّہ سے پہلے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آجائیں مگر حضورؐ نے انکو یہی مشورہ دیا کہ ابھی ہجرت نہ کریں۔

حضرت عباسؓ اظہارِ اسلام کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ لیا گیا تھا، اس وقت میرے پاس بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کا کاروبار کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے کم کا نہیں اور اس پر مزید یہ انعام کہ مجھے حجاج کو آبِ زمزم پلانے کی خدمت مل گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا گرانقدر انعام ہے کہ سارے اہلِ مکّہ کے اموال بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہوں۔ (معارف القرآن ج ۴ صـ۲۹۰ جلد ۲۹۱)

غزوۂ بدر کا تفصیلی واقعہ

ابن عقبہ وابن عامر کے بیان کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ میں یہ خبر ملی کہ ابوسفیان ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ ملک شام سے مالِ تجارت لے کر مکہ معظمہ کی طرف جارہے ہیں اور اس تجارت میں مکہ کے تمام قریشی شریک ہیں۔ ابن عقبہ کے بیان کے مطابق مکّہ کا کوئی قریشی مرد یا عورت باقی نہ تھا جس کا اس میں حصہ نہ ہو۔ اگر کسی کے پاس صرف ایک مثقال (یعنی ساڑھے چار ماشہ) سونا بھی تھا تو اس نے اس میں اپنا حصہ ڈال دیا تھا۔ اس قافلہ کے پورے سرمایہ کے مطابق ابن عتبہ کی روایت یہ ہے کہ پچاس ہزار دینار تھے۔ دینار سونے کا سکّہ ہے جو ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے۔ سونے کے موجودہ بھاؤ سے اس کی قیمت باون روپیہ اور پورے سرمائے کی قیمت چھبیس لاکھ روپے بنتی ہے اور یہ بھی آج کے نہیں بلکہ اب سے چودہ سو برس پہلے کے چھبیس لاکھ ہیں جو آج کے چھبیس کروڑ سے بھی زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ اس تجارتی قافلہ کی حفاظت اور کاروبار کے لئے قریش کے ستر جوان اور سردار ساتھ تھے جس سے معلوم ہوا کہ یہ تجارتی قافلہ درحقیقت قریش مکّہ کی ایک تجارتی کمپنی تھی۔

بغوی نے بروایت ابن عباسؓ وغیرہ نقل کیا ہے کہ اس قافلہ میں قریش کے چالیس سوار قریش کے سرداروں میں سے تھے جن میں عمرو ابن العاصؓ، مخرمہ بن نوفل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ قریش کی سب سے بڑی طاقت ان کی یہی تجارت اور تجارتی سرمایہ تھا جس کے بل پر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو تنگ کرکے مکّہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت جب رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سفرِ شام سے اس قافلہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو آپؐ کی رائے ہوئی کہ اس وقت اس قافلہ کا مقابلہ کرکے قریش کی طاقت توڑ دینے کا موقع ہے۔ صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا تو زمانہ رمضان کا تھا۔ پہلے سے کسی جنگ کی تیاری نہ تھی۔ بعض حضرات نے تو چستی اور ہمت کا اظہار کیا مگر بعض نے کچھ پس و پیش کی۔ آپؐ نے بھی سب پر اس جہاد کی شرکت کو لازم نہ قرار دیا، بلکہ یہ

حکم دیا کہ جن لوگوں کے پاس سواریاں موجود ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اس وقت بہت سے آدمی جہاد میں جانے سے رُک گئے اور جو لوگ جانا چاہتے تھے اور اُن کی سواریاں دیہات میں تھیں۔ اُنھوں نے اجازت چاہی کہ ہم اپنی سواریاں لے آئیں تو ساتھ چلیں مگر وقت اتنے انتظار کا نہ تھا۔ اس لئے حکم یہ ہوا کہ جن لوگوں کی سواریاں پاس موجود ہیں اور جہاد میں جانا چاہیں، تو صرف وہی لوگ چلیں۔ باہر سے سواریاں منگانے کا وقت نہیں۔ اس لئے ساتھ جانے والوں کا ارادہ رکھنے والوں میں سے بھی تھوڑے ہی آدمی تیار ہو سکے اور جن حضرات نے اس جہاد میں ساتھ جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اس کا سبب بھی یہ تھا کہ آپؐ نے سب کے ذمّے اس جہاد کی شرکت کو واجب ہی قرار نہ دیا تھا اور ان لوگوں کو یہ اطمینان بھی تھا کہ یہ تجارتی قافلہ ہے کوئی جنگی لشکر نہیں جس کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور آپؐ کے ساتھیوں کو زیادہ لشکر اور مجاہدین کی ضرورت پڑے۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد اس جہاد میں شریک نہ ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے جب بئرِ سقیا پر پہنچ کر قیس بن صعصعہ کو حکم دیا کہ لشکر کو شمار کریں تو انھوں نے شمار کر کے اطلاع دی کہ تین سو تیرہ حضرات ہیں۔ آنحضرتؐ سُن کر خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تعداد اصحاب طالوت کی ہے اس لئے فال نیک، فتح اور کامیابی کی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ کل ستّر اُونٹ تھے۔ ہر تین آدمی کے لئے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ خود رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دو حضرات ایک اُونٹ کے شریک تھے، ابولبابہؓ اور حضرت علیؓ۔ جب آپؐ کی باری پیدل چلنے کی آتی تو یہ حضرات عرض کرتے کہ آپؐ سوار رہیں، ہم آپؐ کے بدلے پیدل چلیں گے۔ رحمۃ للعالمین کی طرف سے یہ جواب ملتا کہ نہ تو تم مجھ سے زیادہ قوی ہو اور نہ میں آخرت کے ثواب سے مستغنی ہوں کہ اپنے ثواب کا موقع تمہیں دے دوں۔ اس لئے اپنی باری میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم بھی پیدل ہی چلتے تھے۔

دوسری طرف کسی شخص نے ملک شام کے مشہور مقام عین زرقاء پر پہنچ کر رئیسِ قافلہ ابوسفیان کو اس کی خبر پہنچا دی کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم ان کے قافلہ کے انتظار میں

ہیں، ان کا تعاقب کریں گے۔ ابوسفیان نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ جب یہ قافلہ حدودِ حجاز میں داخل ہُوا تو ایک ہوشیار، مستعد آدمی ضمضم بن عمر کو بیس مثقال سونا یعنی تقریباً دو ہزار روپیہ دے کر اس پر راضی کیا کہ وہ تیز رفتار سانڈنی پر سوار ہو کر جلد سے جلد مکّہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچا دے کہ ان کے قافلہ کو صحابہ کرامؓ سے خطرہ لاحق ہے۔

ضمضم بن عمر نے اس زمانہ کی خاص رسم کے مطابق خطرے کا اعلان کرنے کے لئے اپنی اونٹنی تک کے ناک کان کاٹ دیئے اور اپنے کپڑے آگے پیچھے سے پھاڑ ڈالے اور کجاوہ کو اُلٹا کر کے اُونٹنی کی پُشت پر رکھا۔ یہ علامات اس زمانے میں خطرے کی گھنٹی سمجھی جاتی تھی جب وہ اس شان سے مکّہ میں داخل ہُوا تو پُورے مکّہ میں ہلچل مچ گئی اور تمام قریش مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔ جو لوگ اس جنگ کے لئے نکل سکتے تھے خود نکلے اور جو کسی وجہ سے معذور تھے انہوں نے کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر جنگ کے لئے تیار کیا اور صرف تین روز میں یہ لشکر پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہو گیا۔

ان میں جو لوگ اس جنگ میں شرکت سے ہچکچاتے اُس کو یہ لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھتے اور مسلمانوں کے ہم خیال سمجھتے۔ اس لئے ایسے لوگوں کو خصوصیت سے جنگ کے واسطے نکلنے پر مجبور کیا جو لوگ اعلانیہ طور پر مسلمان تھے اور ابھی تک بوجہ اپنے اعذار کے ہجرت نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مکّہ میں بس رہے تھے۔ ان کو اور بنو ہاشم کے خاندان میں جس پر بھی یہ گمان تھا کہ یہ مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے ان کو بھی اس جنگ کے لئے نکلنے پر مجبور کیا۔

انہی مجبور لوگوں میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے چچا حضرت عباسؓ اور ابوطالب کے دو بیٹے طالب اور عقیل تھے۔ اس طرح اس لشکر میں ایک ہزار جوان، دو سو گھوڑے اور چھ زرہیں اور ترانے گانے والی لونڈیاں اور ان کے طبلے وغیرہ لے کر بدر کی طرف نکل کھڑے ہُوئے۔ ہر منزل پر دس اُونٹ اُن کے کھانے کے لئے ذبح ہوتے تھے۔

دوسری طرف رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم صرف ایک تجارتی قافلے کے انداز سے مقابلہ کی تیاری کر کے بارہ رمضان المبارک کو شنبہ کے دن مدینہ طیبہ سے نکلے اور کئی منزل طے کرنے کے بعد بدر کے قریب پہنچ کر آپؐ نے دو شخصوں کو آگے بھیجا کہ وہ

ابوسفیان کے قافلہ کی خبر لاویں (مظہری) مخبروں نے یہ خبر پہنچائی کہ ابوسفیان کا قافلہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے تعاقب کی خبر پاکر ساحلِ دریا کے کنارے کنارے گزر گیا اور اُس کی حفاظت اور مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مکّہ مکرمہ سے ایک ہزار جوانوں کا لشکر جنگ کے لئے آرہا ہے۔ (ابن کثیر)

ظاہر ہے کہ اس خبر نے حالات کا نقشہ پلٹ دیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرمایا کہ اس آنے والے لشکر سے جنگ کرنا ہے یا نہیں؟ حضرت ابوایوب انصاریؓ اور بعض دوسرے حضرات نے عرض کیا کہ ہم میں اُن کے مقابلے کی طاقت نہیں اور نہ ہم اس قصد سے آئے ہیں۔ اس پر حضرت صدیق اکبرؓ کھڑے ہوئے اور تعمیل حکم کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ پھر فاروقِ اعظمؓ کھڑے ہوئے اور اسی طرح تعمیلِ حکم اور جہاد کے لئے تیار ہونے کا اظہار کیا۔ پھر حضرت مقداد رضی اللہ تعالےٰ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا:

"جو کچھ آپؐ کو اللہ تعالےٰ کا حکم ملا ہے آپؐ اس کو جاری کریں، ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ بخدا! ہم آپؐ کو وہ جواب نہ دیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا: اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ یعنی جائیے آپ اور آپ کا رب لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپؐ ہمیں مُلکِ حبشہ کے مقام برک انغماد تک بھی لے جائیں گے تو ہم آپؐ کے ساتھ جنگ کے لئے چلیں گے"۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم خوش ہوئے اور اُن کو دُعائیں دیں۔ مگر ابھی تک حضرات انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہ اُٹھی تھی اور یہ احتمال تھا کہ حضرات انصارؓ نے جو معاہدہ نصرت اور امداد کا آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا وہ اندرونِ مدینہ کا تھا، مدینہ سے باہر امداد کرنے کے وہ پابند نہیں۔ اس لئے آپؐ نے پھر مجمع کو خطاب کرکے فرمایا کہ لوگو! مجھے مشورہ دو کہ اس جہاد پر اقدام کریں یا نہیں؟ اس

خطاب کا روئے سخن انصار کی طرف تھا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ تعالے عنہ سمجھ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپؐ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ ہاں سعد بن معاذ رضی اللہ تعالے عنہ نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! ہم آپؐ پر ایمان لائے اور اس کی شہادت دی کہ جو کچھ آپؐ فرماتے ہیں سب حق ہے۔ اور ہم نے آپؐ سے عہد و پیمان کئے ہیں، ہر حال میں آپؐ کی اطاعت کریں گے۔ اس لئے آپؐ کو جو کچھ اللہ تعالے کا حکم ملا ہو اُس کو جاری فرمائیے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپؐ کو دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپؐ ہم کو سمندر میں لے جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ دریا میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی آپؐ کے پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں اس میں کوئی گرانی نہیں کہ آپؐ ہمیں کل ہی دشمن سے بھڑا دیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اللہ تعالے آپؐ کو ہمارے کام سے ایسے حالات کا مشاہدہ کرائے گا جس سے آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ ہمیں اللہ تعالے کے نام پر جہاں چاہیں لے چلیں۔"

رسول اللہ صلّی اللہ تعالے علیہ وسلّم یہ سُن کر بہت مسرور ہوئے اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ اللہ تعالے کے نام پر چلو اور یہ خوشخبری سُنائی کہ مجھ سے اللہ تعالے نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں جماعتوں پر سے ایک جماعت پر ہمارا غلبہ ہوگا۔ ان دونوں جماعتوں سے مراد ایک ابو سفیان کا تجارتی قافلہ اور دوسرا یہ مکہ سے آنے والا لشکر ہے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم! میں گویا اپنی آنکھوں سے مشرکین کی قتل گاہ دیکھ رہا ہوں۔ یہ پورا واقعہ تفسیر ابن کثیر اور مظہری سے لیا گیا ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ صـ ۱۸۴ تا صـ ۱۸۷)

غزوۂ بدر کو "یوم الفرقان" کہنے میں حکمت

(قرآن پاک میں) بدر کے دن کو "یوم الفرقان" فرمایا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ سب سے

پہلے مادی اور ظاہری طور پر مسلمانوں کی واضح فتح اور کفار کی عبرت ناک شکست اس دن میں ہونے کی بناء پر کفر و اسلام کا ظاہری فیصلہ بھی اس دن ہو گیا۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۲۴۳)

غزوہ بدر کے نقشۂ جنگ بیان کرنے کا مقصد

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ط (سورۃ الانفال)

اس آیت میں غزوۂ بدر کے محاذ جنگ کا نقشہ یہ بتلایا گیا ہے کہ مسلمان عدوہ دنیا کے پاس تھے اور کفار عدوی قصویٰ کے پاس۔ مسلمانوں کا مقام اس میدان کے اس کنارہ پر تھا جو مدینہ سے قریب تھا اور کفار میدان کے دوسرے کنارے پر تھے جو مدینہ سے بعید تھا اور ابوسفیان کا تجارتی قافلہ جس کی وجہ سے یہ جہاد کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی مکہ سے آنے والے لشکر کفار سے قریب اور مسلمانوں کی زد سے باہر تین میل کے فاصلے پر سمندر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اس نقشۂ جنگ کے بیان سے مقصد یہ بتلانا ہے کہ جنگی اعتبار سے مسلمان بالکل بے موقع غلط جگہ ٹھہرے تھے جہاں سے دشمن پر قابو پانے کا بلکہ اپنی جان بچانے کا بھی کوئی امکان ظاہری اعتبار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس میدان کی وہ جانب جو مدینہ سے قریب تھی ایک ریتلی زمین تھی جس میں چلنا بھی دوبھر تھا۔ پھر پانی کی کوئی جگہ ان کے پاس نہ تھی اور مدینہ سے بعید والی جانب جس پر کفار نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا وہ صاف زمین تھی اور پانی بھی وہاں سے قریب تھا اور اس میدان کے دونوں کناروں کا پتہ دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ دونوں لشکر بالکل آمنے سامنے تھے کہ کسی کی طاقت یا ضعف دوسرے سے مخفی نہ رہ سکتا تھا۔ نیز یہ بھی بتلا دیا کہ مشرکین مکہ کے لشکر کو یہ بھی اطمینان حاصل تھا کہ ہمارا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی زد سے نکل چکا ہے۔ اب اگر ہمیں ضرورت پڑے تو وہ بھی ہماری امداد کر سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل مسلمان اپنی جگہ کے اعتبار سے بھی تکلیف و پریشانی میں تھے اور کہیں

سے کمک ملنے کا بھی کوئی احتمال نہ تھا اور یہ بات پہلے سے متعین اور ہر پڑھے لکھے آدمی کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے لشکر کی کُل تعداد تین سو تیرہ تھی اور کفار کی تعداد ایک ہزار، مُسلمانوں کے پاس نہ سواریوں کی تعداد کافی تھی اور نہ اسلحہ کی۔ اس کے بالمقابل لشکر کفار ان سب چیزوں سے آراستہ تھا۔

نہ مُسلمان اس جہاد میں کسی مسلح لشکر سے جنگ کی تیاری کر کے نکلے تھے۔ بلکہ ہنگامی طور پر ایک تجارتی قافلہ کا راستہ روکنے اور دشمن کی قوت کو پست کرنے کے خیال سے صرف تین سو تیرہ مُسلمان بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک غیر ارادی طور پر ایک ہزار جوانوں کے مسلح لشکر سے مقابلہ پڑ گیا۔ قرآن کی اس آیت (مذکورہ) نے بتلایا کہ لوگوں کی نظر میں یہ واقعہ اگرچہ ایک اتفاقی حادثہ کی صُورت میں بلا ارادہ پیش آیا۔ لیکن دُنیا میں جتنے اتفاقات غیر اختیاری صُورت سے پیش آیا کرتے ہیں، ان کی سطح اور صُورت اگرچہ محض اتفاقات کی ہوتی ہے، لیکن خالقِ کائنات کی نظر میں وہ سب کے سب ایک مستحکم نظام کی لگی بندھی کڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بے ربط یا بے موقع نہیں ہوتی۔ جب وہ پُورا نظام سامنے آ جائے اس وقت انسان کو پتہ لگ سکتا ہے کہ اس اتفاقی واقعہ میں کیا کیا حکمتیں مستور تھیں۔

غزوۂ بدر ہی کے واقعہ کو لے لیجئے کہ اس کی اتفاقی اور غیر اختیاری صورت سے ظاہر ہونے میں یہ مصلحت تھی کہ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ۔ یعنی اگر عام دُنیا کی جنگوں کی طرح یہ جنگ بھی تمام پہلوؤں پر غور و فکر اور باہمی قرار دادوں کے ذریعے لڑی جاتی تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جنگ ہوتی ہی نہیں بلکہ اس میں اختلاف پڑ جاتا خواہ اس طرح کہ خود مُسلمانوں کی رائے اپنی قلت و کمزوری اور مقابل کی کثرت و قوت کو دیکھ کر مختلف ہو جاتی یا اس طرح کہ دونوں فریق اہلِ کفر و اہلِ اسلام مقررہ وعدہ پر میدان میں نہ پہنچتے۔ مسلمان تو اپنی قلت و کمزوری کو دیکھ کر اقدام کی ہمت نہ کرتے اور کفار پر حق تعالےٰ نے مُسلمانوں کا رُعب جما یا ہُوا تھا وہ کثرت و قوت کے باوجود مقابلے پر آنے سے گھبراتے۔ اس لئے قدرت

کے مستحکم نظام نے دونوں طرف ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ مکہ والوں کو تو ابوسفیان کے قافلہ کی گھبرائی ہوئی فریاد نے ایک ہولناک صورت میں سامنے آکر بے سوچے سمجھے چلنے پر آمادہ کر دیا۔ مسلمانوں کو اس خیال نے کہ ہمارے مقابلے پر کوئی جنگی مسلح نہیں ایک معمولی تجارتی قافلہ ہے۔ مگر علیم و خبیر کو منظور یہ تھا کہ دونوں میں ہی باقاعدہ جنگ ہو جائے تاکہ اس جنگ کے پیچھے جو نتائج فتح اسلام کے ظہور میں آنے والے ہیں وہ سامنے آجائیں۔ اسی لئے فرمایا: وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۔ ان حالات کے باوجود جنگ اس لئے ہو کر رہی کہ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرنا ہے اس کی تکمیل کر دکھائے اور وہ یہ تھا کہ ایک ہزار مسلح بہ سامان لشکر کے مقابلے میں تین سو تیرہ بے سروسامان فاقہ زدہ مسلمانوں کی ایک ٹولی اور وہ بھی محاذِ جنگ کے اعتبار سے بے موقع جب اس پہاڑ سے ٹکراتی ہے تو یہ پہاڑ پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہ چھوٹی سی جماعت فتح مند ہوتی ہے۔ جو کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ ہے کہ اس جماعت کی پیٹھ پر بڑی قدرت اور طاقت کام کر رہی ہے جس سے یہ ایک ہزار کا لشکر محروم تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اُس کی تائید اسلام کی وجہ سے اور اس کی محرومی کفر کی وجہ سے تھی جس سے حق و باطل اور کھرے کھوٹے کا پورا امتیاز ہر سمجھدار انسان کے سامنے آگیا۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۲۴۶، ص ۲۴۷)

غزوۂ بدر میں خاص کرشمۂ قدرت کا ظہور

سورۃ الانفال کی آیت ۴۳ اور ۴۴ میں ایک خاص کرشمۂ قدرت کا ذکر ہے اور وہ کرشمۂ قدرت یہ تھا کہ لشکر کفار اگرچہ واقع میں مسلمانوں سے تین گنا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کو اُن کی تعداد بہت کم کر کے دکھلائی تاکہ مسلمانوں میں کمزوری اور اختلاف پیدا نہ ہو جائے۔ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ کو خواب میں دکھلایا گیا۔ آپؐ نے سب مسلمانوں سے بتلا دیا جس سے ان کی ہمت بڑھ گئی۔ دوسری مرتبہ عین میدانِ جنگ میں جبکہ دونوں فریق آمنے سامنے کھڑے تھے مسلمانوں

کو اُن کی تعداد کم دکھلائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالٰے عنہ فرماتے ہیں کہ ہماری نظروں میں اپنا مقابل لشکر ایسا نظر آرہا تھا کہ میں نے اپنے قریب کے ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ نوّے آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے۔ اس شخص نے کہا کہ نہیں سو میں ہوں گے۔

یُقَلِّلُکُمْ فِی اَعْیُنِہِمْ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مُسلمانوں کی تعداد تو حقیقت ہی میں کم تھی وہ صحیح تعداد ان کو دکھلا دی اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جتنی تعداد واقعی تھی اس سے بھی کم کر کے دکھلایا گیا۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ابو جہل نے مُسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کی تعداد تو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی جن کی خوراک ایک اُونٹ ہو۔

عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کے لئے اس سے اندازہ قائم کیا جاتا تھا کہ کتنے جانوران کی خوراک کے لئے ذبح ہوتے ہیں؟ ایک اونٹ سو آدمیوں کی خوراک سمجھا جاتا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے بھی اس میدانِ بدر میں وہاں کے کچھ لوگوں سے قریشِ مکہ کے لشکر کا پتہ چلانے کے لئے پوچھا تھا کہ اُن کے لشکر میں روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں تو آپؐ کو دس اونٹ روزانہ بتلائے گئے جس سے آپؐ نے ایک ہزار لشکر کا تخمینہ قائم فرمایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابو جہل کی نظر میں مُسلمان کُل سو آدمی کی تعداد میں دکھلائے گئے۔ یہاں بھی کم کر کے دکھلانے میں یہ حکمت تھی کہ مشرکین کے قلوب پر مُسلمانوں کا رعب پہلے ہی نہ چھا جائے جس کی وجہ سے وہ میدان چھوڑ بھاگیں۔

(ف) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ بعض اوقات معجزہ اور خرق عادت کے طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھوں کا مشاہدہ غلط ہو جائے جیسا یہاں ہُوا۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۲۴۸، ص ۲۴۹)

شیطان کا سراقہ بن مالک کی صورت میں کفار کے لشکر کے سامنے آنا اور پھر ملائکہ کو دیکھ کر بھاگنا

امام ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریشِ مکّہ کا لشکر مُسلمانوں کے مقابلے کے لئے مکّہ سے نکلا تو اُن کے دلوں پر ایک خطرہ اس کا سوار تھا کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنی بکر بھی ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مُسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقع پاکر ہمارے گھروں اور عورتوں، بچّوں پر چھاپہ مار دے۔ امیر قافلہ ابوسفیان کی گھبرائی ہوئی فریاد پر تیار ہو کر نکل تو کھڑے ہوئے۔ مگر یہ خطرہ ان کے لئے زنجیر پا بنا ہوا تھا کہ اچانک شیطان سراقہ بن مالک کی صُورت میں اس طرح سامنے آیا کہ اُس کے ہاتھ میں جھنڈا اور اُس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا تھا۔ سراقہ بن مالک اس علاقے اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا جس سے حملے کا خطرہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر قریشی جوانوں کے لشکر سے خطاب کیا اور دو طرح سے فریب میں مُبتلا کیا۔ اوّل یہ کہ لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ، یعنی آج تمام لوگوں میں تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں۔

مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہارے مقابل فریق کی قوّت کا بھی اندازہ ہے اور تمہاری قوّت و کثرت کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم بے فکر ہو کر آگے بڑھو، تم ہی غالب رہو گے۔ کوئی تمہارے مقابلے پر غالب آنے والا نہیں۔

دُوسرے یہ کہ اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ یعنی تمہیں جو بنی بکر وغیرہ سے خطرہ لگا ہُوا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے مکّہ پر چڑھ دوڑیں گے، اس کی مَیں ذمّہ داری لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو گا، مَیں تمہارا حامی ہوں۔ قریش مکّہ سراقہ بن مالک اور اُس کی بڑی شخصیت اور اثر و رسوخ سے پہلے ہی واقف تھے۔ اس کی بات سُن کر اُن کے دل جم گئے اور قبیلہ بنی بکر کے خطرہ سے بے فکر ہو کر مسلمانوں کے مقابلے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس دوگونہ فریب سے شیطان نے ان لوگوں کو اپنے مقتل کی طرف ہانک دیا۔ جب مشرکین مکّہ اور مُسلمانوں کی دونوں جماعتیں (مقام بدر میں) آمنے سامنے ہوئیں تو شیطان

پچھلے پاؤں لوٹ گیا۔

غزوۂ بدر میں چونکہ مشرکینِ مکہ کی پیٹھ پر ایک شیطانی لشکر بھی آ گیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے مقابلے میں فرشتوں کا لشکر جبرائیل و میکائیل کی قیادت میں بھیج دیا۔ امام ابن جریرؒ وغیرہ نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ شیطان نے جو اس وقت بشکلِ انسانی سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنے شیطانی لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ جب جبرائیل امین اور اُن کے ساتھ فرشتوں کا لشکر دیکھا تو گھبرا اُٹھا۔ اُس وقت اُس کا ہاتھ ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں تھا۔ فوراً اُس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔ حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ تو اس کے سینہ پر مار کر اُس کو گرا دیا اور اپنے شیطانی لشکر کو لے کر بھاگ پڑا۔ حارث نے اُس کو سراقہ سمجھتے ہوئے کہا کہ اے عرب کے سراقہ سردار! تُو نے یہ کہا تھا کہ میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں اور عین میدانِ جنگ میں یہ حرکت کر رہے ہو تو شیطان نے بشکل سراقہ جواب دیا" اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ۔ یعنی میں تمہارے معاہدے سے بری ہوتا ہوں۔ کیونکہ میں وہ چیزیں دیکھ رہا ہوں جو تمہاری آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ اس سے مراد فرشتوں کا لشکر تھا اور یہ کہ میں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہوں، اس لئے تمہارا ساتھ چھوڑتا ہوں۔

شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو اُن کی قوت سے وہ واقف تھا۔ سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہوں، امام تفسیر قتادہ نے کہا کہ یہ اُس نے جھوٹ بولا۔ اگر وہ خدا تعالےٰ سے ڈرا کرتا تو اس کی نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر اکثر حضرات نے فرمایا ہے کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالےٰ کی قدرتِ کاملہ اور عذابِ شدید کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ سزا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

ابوجہل نے جب سراقہ اور اُس کے لشکر کی پسپائی سے اپنے لشکر کی ہمت ٹوٹتے دیکھا تو بات بنائی اور کہا کہ سراقہ بھاگ جانے سے تم متاثر نہ ہو۔ اس نے تو خفیہ طور

سے محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے ساتھ سازش کر رکھی تھی۔ شیطان کی پسپائی کے بعد ان کا جو حشر ہونا تھا ہو گیا۔ پھر جب لوگ مکّہ واپس آئے اور ان سے کسی کی ملاقات سراقہ بن مالک کے ساتھ ہوئی، تو اس نے سراقہ کو ملامت کی کہ جنگِ بدر میں ہماری شکست اور سارے نقصان کی ذمہ داری تجھ پر ہے کیونکہ تُو نے عین میدانِ جنگ میں پسپا ہو کر ہمارے جوانوں کی ہمت توڑی۔ اُس نے کہا کہ نہ میں تمہارے ساتھ گیا۔ نہ تمہارے کسی کام میں شریک ہُوا۔ میں نے تمہاری شکست کی خبر بھی تمہارے مکّہ پہنچنے کے بعد سُنی۔ یہ سب روایات امام ابن کثیرؒ نے نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ شیطان لعین کی یہ عام عادت ہے کہ انسانی کو بُرائی میں مُبتلا کر کے عین موقع پر الگ ہو جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۲۵۶، ص ۲۵۷)

غزوہ بدر میں سرکارِ دو عالم کا ساری رات عبادت کرنا اور صحابہؓ پر غلبۂ نیند کا طاری ہونا

جس وقت کفر و اسلام کا یہ پہلا معرکہ ٹھن گیا تو کفّارِ مکّہ کا لشکر پہلے پہنچ کر ایسے مقام پر پڑاؤ ڈال چکا تھا جو اونچائی پر واقع تھا اور پانی بھی اس کے قریب تھا۔ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ اس جگہ پہنچے تو وادی کے نچلے حصّے میں جگہ ملی۔ اس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جو مقام آپؐ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے ہے، جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیشِ نظر اختیار فرمایا گیا ہے؟

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "نہیں یہ کوئی حکم خداوندی نہیں۔ اس میں تغیّر و تبدّل کیا جا سکتا ہے"۔

تب حضرت خبابؓ بن منذر نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکّی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اس پر قبضہ کیا جائے تو وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ ملے گا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ان کا مشورہ

قبول فرمایا اور وہاں جاکر پانی پر قبضہ کیا۔ ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔ اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپؐ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ میں بنا دیں جہاں آپؐ مقیم رہیں۔ اور آپؐ کی سواریاں بھی آپؐ کے پاس رہیں۔ منشاء اس کا یہ ہے کہ ہم دشمن کا مقابلہ میں جہاد کریں گے۔ اگر اللہ تعالےٰ نے ہمیں فتح نصیب فرمائی تو یہی مقصد ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی دوسری صورت ہو تو آپؐ اپنی سواری پر سوار ہو کر ان صحابہ کرامؓ کے ساتھ جا ملیں جو مدینہ طیبہ میں رہ گئے ہیں۔ کیونکہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ لوگ بھی جاں نثاری اور آپؐ سے محبت میں ہم سے کم نہیں اور اگر ان کو آپؐ کے نکلنے کے وقت یہ خیال ہوتا کہ آپؐ کا اس مسلح لشکر سے مقابلہ ہوگا تو ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہ رہتا۔ آپؐ مدینہ میں پہنچ جائیں گے تو وہ آپؐ کے رفیق کار رہیں گے۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُن کی اس جانبازانہ پیش کش پر دعائیں دیں اور ایک مختصر سا سایہ بان آپؐ کے لئے بنا دیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ دروازے پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ کی پہلی رات تھی۔ تین سو تیرہ بے سروسامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا۔ میدانِ جنگ کا بھی اچھا مقام اُن کے قبضہ میں آچکا تھا۔ نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتلا جس میں چلنا دشوار، مسلمانوں کے حصہ میں آیا تھا۔ طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی۔ بعض لوگوں کے دل میں شیطان نے یہ وساوس بھی ڈالنے شروع کئے کہ تم لوگ اپنے آپ کو حق پر کہتے ہو اور اس وقت بھی بجائے آرام کرنے کے نماز تہجد وغیرہ میں مشغول ہو۔ مگر حال یہ ہے کہ دشمن ہر حیثیت سے تم پر غالب اور تم سے بڑھا ہوا ہے۔

ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر ایک خاص قسم کی نیند مسلّط کر دی جس نے ہر مسلمان کو خواہ اس کا ارادہ سونے کا تھا یا نہیں، جبرًا سلا دیا۔ حافظِ حدیث

ابویعلی نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سو نہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نمازِ تہجد میں مشغول رہے۔

ابن کثیرؒ نے بحوالہ صحیح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اس رات میں جبکہ اپنے عریش یعنی سائبان میں نمازِ تہجد میں مشغول تھے۔ آپؐ کو بھی کسی قدر اُونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔

"اے ابوبکر! خوشخبری سُنو، یہ جبرائیل علیہ السّلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں"

اور یہ کہہ کر آپؐ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے :-
سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۔ یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔

بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے۔ یہ فلاں کی یہ فلاں کی، اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری) اور جیسا غزوہ بدر میں تکان اور پریشانی دُور کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے تمام صحابہ کرامؓ پر خاص قسم کی نیند مسلّط فرمادی اسی طرح کا واقعہ غزوہ اُحد میں بھی ہُوا۔

سفیان ثوری رحمتہ اللہ تعالےٰ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالےٰ کی طرف سے امن واطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۱۹۳ تا ص ۱۹۶)

سنہ ۳ھ

غزوۂ اُحد و غطفان وغیرہ

غزوۂ غطفان اور آپؐ کے خلقِ عظیم کا معجزہ

سنہ ۳ھ میں ساڑھے چار سو آدمی لے کر وعشور بن الحارث محاربی مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لئے چلا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقابلے کے لئے تشریف لائے تو سب نے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لی۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مطمئن ہو کر میدان سے واپس آئے۔ اس وقت اتفاقاً بارش سے آپؐ کے کپڑے تر ہو گئے۔ آپؐ نے ان کو سکھانے کے لئے نکال کر درخت پر پھیلا دیئے اور خود اُن کے سایہ میں لیٹ گئے۔ ادھر پہاڑ کے اُوپر وعشور دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ آپؐ مطمئن ہو کر لیٹ گئے تو سیدھا آپؐ کے سرہانے پہنچا اور تلوار کھینچ کر سامنے آیا اور کہا بتلاؤ، اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ مگر مقابلے میں خدا تعالیٰ کا رسول تھا۔ بغیر کسی ہراس کے جواب دیا کہ ہاں اللہ تعالیٰ! بچائے گا۔ اس کلمہ کا سُننا تھا کہ وعشور کے بدن میں رعشہ پڑ گیا اور تلوار ہاتھ سے گر گئی۔ اب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تلوار اُٹھا کر فرمایا۔ تم بولو، اب تمہیں کون بچائے گا؟ اس کے پاس اس کے سوا کیا جواب تھا کہ کوئی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بے چارگی پر رحم آگیا اور اس کو معاف فرما کر چھوڑ دیا[1]۔

(سیرت مغلطائی ص ۴۹)

وعشور یہاں سے اُٹھا اور یہ اثر لے کر اُٹھا کہ نہ فقط خود مسلمان ہوا بلکہ اپنی قوم میں

---

[1] شمشیر جنگی سے اعتراض کرنیوالی یورپین اقوام دیکھیں کہ اشاعتِ اسلام کا ذریعہ یہ خلقِ عظیم تھا نہ کہ تلوار کا زور یا مال کی طمع ؎

جاکر اسلام کا ایک زبردست مبلغ بن گیا ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں   دو، چار دن رہے تھے کسی کی نگاہ میں

حضرت حفصہؓ اور زینبؓ سے نکاح

شعبان ۳ھ میں ام المؤمنین حضرت حفصہؓ اور رمضان ۳ھ میں حضرت زینب بنت خزیمہ آپؐ کے نکاح میں آئیں۔ (سیرت مغلطائی)، (سیرت ص۱۱۳، ص۱۱۴)۔

غزوۂ احد

احد مدینہ طیبہ کے قریب ایک پہاڑ ہے جس جگہ جہاد ہوا ہے۔ اسی جگہ حضرت ہارون علیہ السلام کی قبر بھی ہے۔ یہ جہاد باتفاق جمہور شوال ۳ھ میں ہوا ہے اور تاریخ میں مختلف اقوال ہیں، ۷۔۸۔۹۔۱۰۔۱۱۔   (زرقانی شرح مواہب ج ۳ ص۲۰)

بدر کے شکست خوردہ مشرکین نے سال بھر کے بعد جب ہوش سنبھالا تو حرارت انتقام بڑھنے لگی اور اس مرتبہ نہایت اہتمام سے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور اس غرض کے لئے تین ہزار نوجوانوں کا لشکر پورے سازوسامان کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھا جن میں سات سو زرہیں اور دوسو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے اور چودہ عورتیں بھی اس غرض کے لئے ساتھ تھیں کہ مردوں کو غیرت دلائیں اور اگر بھاگیں تو لعنت ملامت سے اُن کو شرما دیں۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ جو اس وقت اسلام لاچکے تھے۔ مگر ابھی تک مکہ میں ہی مقیم تھے، انہوں نے فوراً تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے پاس بھیج دیئے۔

آپؐ کو اطلاع ہوئی تو فوراً دو آدمی تحقیق حالات کے لئے بھیجے۔ انہوں نے آکر خبر دی کہ قریش کا لشکر مدینہ آپہنچا۔ چونکہ شہر پر حملے کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھادیئے گئے اور صبح کو آپؐ صحابہؓ سے مشورہ کرنے کے بعد ایک ہزار صحابہؓ کی جمعیت کے ساتھ

مدینہ سے باہر تشریف لائے، جن میں عبداللہ بن اُبی منافق اور اُس کے تین سو ہم خیال منافقین بھی شامل تھے۔ مگر یہ سب کے سب راستے ہی سے واپس ہو گئے اور اب مسلمانوں کا لشکر صرف سات سو ہی رہ گیا۔

فوج کی تربیت اور صحابہؓ کے لڑکوں کا شوقِ جہاد

مدینہ سے نکل کر جب فوج کا جائزہ لیا گیا تو کمسن بچے واپس کر دیئے گئے۔ مگر بچوں میں جہاد کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ جب رافع بن خدیج سے کہا گیا کہ تمہاری عمر کم ہے، تم واپس جاؤ تو پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ اُونچے معلوم ہونے لگیں چنانچہ وہ جہاد میں لے لئے گئے۔

سمرۃ ابن جندب رضی اللہ تعالےٰ عنہ جو اُن کے ہم عمر تھے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو عرض کیا کہ میں تو رافعؓ کو لڑائی میں پچھاڑ دیتا ہوں۔ اگر وہ جہاد میں لئے جاتے ہیں تو مجھے بدرجہ اُولیٰ لینا چاہیئے۔ اُن کے کہنے کے مطابق دونوں میں مقابلہ کرایا گیا تو سمرہؓ نے رافعؓ کو پچھاڑ لیا اور اس طرح ان کو بھی جہاد میں لے لیا گیا۔

(تاریخ طبری جلد سوم)

کیا اشاعتِ اسلام کو بزورِ شمشیر کہنے والے ان قربانیوں کو دیکھ کر بھی اپنے افتراء سے نہ شرمائیں گے؟

الغرض مقابلہ پہ پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صف آرائی فرمائی۔ اُحد پہاڑ پُشت کی طرف تھا اس لئے اس کی طرف سے غنیم کے آنے کا احتمال تھا۔ آپؐ نے پچاس آدمی پہرے کے لئے کھڑے کر دیئے اور ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی فتح ہو یا شکست۔ تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔

لڑائی شروع ہوئی اور دیر تک گھمسان کی لڑائی کے بعد جب فوجیں ہٹیں، تو مُسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ قریش بدحواس ہو کر منتشر ہو گئے۔ مُسلمانوں نے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی وہ لوگ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر یہاں آ گئے جن کو عقب

کی جانب پہاڑ پر نگرانی کے لئے مقرر فرمادیا تھا ان کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے بہت منع کیا۔ مگر یہ سمجھ کر کہ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں سے ہٹ گئے اور نہ رُکے اور یہاں صرف چند صحابہؓ رہ گئے۔ یہ دیکھ کر خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفار کی طرف سے لڑ رہے تھے) نے عقب کی جانب سے دفعتہً حملہ کیا۔ عبداللہ بن جبیرؓ اور اُن کے باقی ماندہ چند ساتھیوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ انکا مقابلہ کیا۔ بالآخر سب کے سب شہید ہو گئے۔ اب راستہ صاف ہو گیا تو خالدؓ اپنے دستے کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور دونوں فوجیں اس طرح مل گئیں کہ خود مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارے گئے۔

مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ شہید ہوئے۔ یہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ ان کی شہادت سے یہ مشہور ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شہید ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ کسی شیطان یا مشرک نے زور سے یہ آواز دے دی کہ محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم قتل ہو گئے۔ (زرقانی شرح مواہب ج۲ ص۳۳)۔ اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مسلمانوں کی فوج میں مایوسی چھا گئی۔ بڑے بڑے بہادروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ لیکن بہت سے جاں نثار لوگ بھی برابر سرگرم قتال تھے۔ مگر سب کی نگاہیں اس کعبہ مقصود (رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو اشتیاق کے ساتھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعب ابن مالکؓ کی نظر آپؐ پر پڑی تو انہوں نے خوشی سے پکارا۔ مبارک ہو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بخیر و عافیت تشریف فرما ہیں۔ یہ سنتے ہی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین آپؐ کی طرف دوڑ پڑے مگر ساتھ ہی کفار نے بھی سب طرف سے ہٹ کر اسی جانب رُخ کیا۔ کئی مرتبہ آپؐ پر حملہ ہوا مگر آپؐ محفوظ رہے۔

ایک مرتبہ جب کفار نے ہجوم کیا تو ارشاد ہوا، کون مجھ پر جان دیتا ہے؟ حضرت زیاد ابن اسکن مع چار اصحابؓ کے آگے بڑھے۔ سب کے سب نہایت دلیرانہ جانبازی کے ساتھ شہید ہو گئے۔ جب زیادؓ زخمی ہو کر گرے تو ارشاد فرمایا کہ ان کا

لاشہ قریب لاؤ۔ اس وقت تک کچھ جان باقی تھی۔ قدموں پر مُنہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے[1] دی۔ سبحان اللہ!

آپؐ کے چہرۂ انور کا زخمی ہونا

قریش کا مشہور بہادر عبداللہ ابن قمیہ صفوں کا چیرتا ہوا آگے بڑھا اور آنحضرتؐ کے چہرۂ انور پر تلوار ماری جس سے خود کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں گُھس گئیں اور ایک دندان مبارک شہید ہوگیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ خود کی کڑیوں کو زخم سے نکالنے کے لئے آگے بڑھے تو ابوعبیدہ ابن جراح نے قسم دی کہ خدا کے لئے یہ خدمت مجھے کرنے دو اور خود آگے بڑھ کر ہاتھ کے بجائے اپنے مُنہ سے ان کڑیوں کو کھینچا تو پہلی مرتبہ ایک کڑی نکلی مگر ساتھ ہی اس کے زور سے ابوعبیدہؓ کا ایک دانت بھی گر گیا۔ یہ دیکھ کر دوسری کڑی نکالنے کے لئے پھر حضرت صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ بڑھنے لگے تو ابوعبیدہؓ نے پھر قسم دے کر اُن کو روکا اور خود ہی دوبارہ اسی طرح منہ سے دوسری کڑی نکالی جس کے ساتھ ابوعبیدہؓ کا دوسرا دانت بھی گر گیا۔ (ابن حبان و طبرانی و دارقطنی وغیرہ از کنز ج ۵ ص ۲۷۴) ۔ آپؐ ایک گڑھے میں گر پڑے جو کفار نے اس لئے بنایا تھا کہ مسلمان اس میں گریں۔

صحابہؓ کی جاں نثاری

یہ دیکھ کر جانباز صحابہؓ آپؐ پر چھا گئے۔ تیروں اور تلواروں کی بارش ہو رہی تھی مگر یہ سب صحابہؓ اپنے اُوپر لیتے تھے۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ جُھک کر آپؐ کی ڈھال بن گئے جو تیر آتا ان کی پُشت میں لگتا تھا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے تیروں اور تلواروں کو اپنے اُوپر روکا جس سے ہاتھ کٹ کر گر گیا (بخاری) اور جنگ کے بعد دیکھا گیا تو اُن کے بدن پر ستر سے زیادہ زخم تھے (ابن حبان وغیرہ از کنز ج ۵ ص ۲۷۴)

---

[1] بقول شاعر ؎ نکل جائے دَم تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے
(احقر قریشی غفرلہٗ)

ابوطلحہؓ ایک ڈھال کے ذریعے آپؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔ آپؐ جب گردن اٹھا کر فوج کی طرف دیکھتے تو ابوطلحہؓ کہتے تھے۔ یا رسول اللہ! آپؐ سر نہ اٹھائیے۔ نصیب اعداء کے کوئی تیر نہ لگ جائے، اس کے لئے آپؐ سے پہلے میرا سینہ موجود ہے۔ (بخاری، غزوہ احد)۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اگر میں قتل ہو گیا تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا کہ "جنت میں" ان کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جو وہ کھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی انہیں پھینک کر سیدھے معرکے میں پہنچے اور سرگرم قتال ہونے کے بعد شہید ہو گئے۔

(بخاری، غزوہ احد)

یہ قریش بدبخت بے رحمی کے ساتھ آپؐ پر تیر و تلواریں برسا رہے تھے مگر رحمت للعالمینؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: اللّٰھُمّ اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ (اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دیجئے، کیونکہ وہ جانتے نہیں)

(فتح الباری ہندی پارہ ۱۶ صـ۴۸ غزوہ احد)

چہرہ انور سے خون جاری تھا اور سراپا رحمت اس کو کبھی کپڑے وغیرہ سے پونچھتے جاتے تھے اور فرمایا اگر اس خون سے ایک قطرہ بھی زمین پر گر جاتا تو سب پر عذابِ خداوندی نازل ہو جاتا۔ (فتح الباری، غزوہ احد)

اس غزوہ میں کفار کے صرف بائیس یا تئیس آدمی مارے گئے اور مسلمانوں میں سے ستر شہید ہوئے۔ (سیرت صـ۱۱۳ تا صـ۱۱۹)

غزوۂ احد کا پس منظر

رمضان المبارک سـ۲ھ میں بدر کے مقام پر قریش کی فوج اور مسلمان مجاہدین میں جنگ ہوئی جس میں کفارِ مکہ کے ستر نامور اشخاص مارے گئے اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اس تباہ کن اور ذلت آمیز شکست سے جو حقیقتاً عذابِ الٰہی کی پہلی قسط تھی، قریش کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا، جو سردار مارے گئے تھے اُن کے اقارب نے تمام عرب کو غیرت دلائی اور یہ معاہدہ کیا کہ جب تک ہم اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے

اور اہلِ مکہ سے اپیل کی کہ ان کا تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے وہ سب اسی مہم پر خرچ کیا جائے تاکہ ہم محمد (صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں۔ سب نے منظور کر لیا اور ۳ھ میں قریش کے ساتھ بہت سے دوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کی غرض سے نکل پڑے۔ حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں تاکہ موقع آنے پر مردوں کو غیرت دلا کر پسپائی سے روک سکیں۔ جس وقت یہ تین ہزار کا لشکر اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل جبلِ احد کے قریب خیمہ زن ہُوا تو نبی کریم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ کیا کہ آپؐ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبی جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھا، اس سے بھی رائے لی گئی جو حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی، مگر بعض پُرجوش مسلمان جنہیں بدر کی شرکت نصیب نہ ہوئی تھی اور شوقِ شہادت بے چین کر رہا تھا مُصر ہُوئے کہ ہم کو باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیئے تاکہ دشمن ہمارے بارے میں بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ کرے۔ کثرتِ رائے اسی طرف ہو گئی۔

اس عرصہ میں آپؐ مکان کے اندر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر آئے تو اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہُوا کہ ہم نے آپؐ کو آپؐ کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر جنگ کرنے پر مجبور کیا، یہ غلط ہُوا۔ اس لئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ کا منشاء نہ ہو تو یہیں تشریف رکھئے۔ فرمایا کہ "ایک پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے اور ہتھیار لگا لے، پھر بدوں قتال کئے ہُوئے بدن سے اُتار دے۔"

اس جملہ میں نبی اور غیر نبی کا فرق واضح ہو رہا ہے کہ نبی کی ذات سے کبھی کمزوری کا اظہار نہیں ہو سکتا اور اس میں اُمت کے لئے بھی ایک بڑا سبق ہے۔ جب آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، تقریباً ایک ہزار آدمی ساتھ تھے۔ مگر منافق عبد اللہ بن اُبی تقریباً تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر راستہ سے یہ کہتا ہُوا واپس ہو گیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا اور دُوسروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں ہم خواہ مخواہ

اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں۔ اس کے ساتھیوں میں زیادہ تو منافقین ہی تھے۔ مگر بعض مسلمان بھی اُن کے فریب میں آکر ساتھ لگ گئے تھے۔

آخر آپؐ کُل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ آپؐ نے بہ نفسِ نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں۔ صف آرائی اس طرح کہ اُحد کو پُشت کی جانب رکھا اور دُوسرے انتظامات اس طرح کئے کہ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا۔ حضرت زبیرؓ بن عوام کو رسالہ کا افسر مقرر کیا۔ حضرت حمزہؓ کو اس حصّہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پُشت کی طرف احتمال تھا کہ دُشمن ادھر سے آئے اس لئے پچاس تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا اور حکم دیا کہ وہ پُشت کی جانب ٹیلہ پر حفاظت کا کام سرانجام دیں۔ لڑنے والوں کی فتح و شکست سے تعلق نہ رکھیں اور اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔ قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے بھی ترتیب سے صف آرائی کی۔

نبی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں

نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی اس صف آرائی اور فوجی قاعدہ کے لحاظ سے نظم و ضبط کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اُمّت کے رہبرِ کامل، مقدّس نبی ہونے کے ساتھ ساتھ سپہ سالارِ اعظم کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہیں۔ آپؐ نے جس انداز میں مورچے قائم کئے اور لڑائی کا نظم قائم کیا اس وقت کی دُنیا اس سے ناآشنا تھی اور آج جب کہ فنِ حرب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر گیا ہے وہ بھی آپؐ کے فوجی قواعد اور نظم و ضبط کو سراہتا ہے۔ اسی حقیقت کو دیکھ کر ایک مسیحی مؤرخ بول اُٹھا:

"برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمّت و شجاعت ہی رکھتے تھے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے کہنا چاہیئے کہ فنِ حرب کی بھی نئی راہ نکالی۔ مکّہ والوں کی بے دھڑک اور اندھا دھند لڑائی میں مقابلہ میں خوب دُور اندیشی سے کام لیا۔"

یہ الفاظ بیسویں صدی کے ایک مؤرخ "ٹام اندر" کے ہیں جو اس نے "لائف آف محمدؐ" میں
بیان کئے ہیں۔

جنگ کا آغاز

اس کے بعد جنگ شروع ہوئی، ابتداءً مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا۔ یہاں تک کہ مقابل کی
فوج میں ابتری پھیل گئی، مسلمان سمجھے کہ فتح ہو گئی، مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے۔ ادھر جن
تیراندازوں کو نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے پشت کی طرف حفاظت کے لئے بٹھایا انہوں
نے جب دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن کی طرف آنے لگے۔
حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا تاکیدی
حکم یاد دلا کر روکا۔ مگر چند آدمیوں کے سوا دوسروں نے کہا کہ حضورؐ کی تعمیل تو موقت تھی۔ اب
ہمیں سب کے ساتھ مل جانا چاہیئے۔ اس موقع سے خالد بن ولید نے جو ابھی تک مسلمان
نہ تھے اور اس وقت لشکرِ کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے، بروقت فائدہ اٹھایا اور
پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درہ سے حملہ کر دیا۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ
اور اُن کے قلیل ساتھیوں نے اس حملہ کو ہمت و شجاعت سے روکنا چاہا مگر مدافعت نہ
کر سکے اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔

دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح لڑائی
کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا اور مسلمان اس غیر متوقع صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ
ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہو کر میدان سے چلا گیا۔ تاہم کچھ صحابہؓ ابھی تک میدان
میں ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اُڑ گئی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم
شہید ہو گئے۔ اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیئے اور باقی ماندہ
لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے گرد و پیش
دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے اور آپؐ خود بھی زخمی ہو گئے تھے شکست کی تکمیل میں
کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی کہ عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

بسلامت تشریف رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر صرف آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔ اس شکست کے بعد مسلمان حد درجہ پریشان رہے اور یہ عارضی شکست چند اسباب کا نتیجہ تھی۔ قرآن مجید نے ہر سبب پر جچے تلے الفاظ میں تبصرہ کیا اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔

اس واقعہ کی تفصیل میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر عظیم سبق لئے ہوئے ہیں اور اس میں تمام مسلمانوں کے لئے موعظت وحکمت کے جواہر پارے مخفی ہیں۔

اُحدؔ کے واقعے سے چند سبق

(۱) پہلی بات جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ کفارِ قریش اس جنگ میں عورتوں کو بھی لائے تھے تاکہ وہ مردوں کو پسپائی سے روک سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے دیکھا کہ عورتیں ہندہ زوجہ ابی سفیان کی سربراہی میں اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلا رہی ہیں ؎

ان تقبلوا نعانق — و نفرش النمارق
او تدبروا نفارق — فراق و امق

مطلب یہ تھا کہ اگر مقابلہ پر ڈٹے رہے اور فتح پائی تو ہم تم کو گلے لگائیں گے اور تمہارے لئے نرم بستر بچھائیں گے۔ لیکن اگر تم نے پیٹھ موڑی تو ہم تم کو بالکل چھوڑ دیں گے "

خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے:۔

اللھمّ بک اصول و فیک اقاتل حسبی اللہ و نعم الوکیل۔

"اے اللہ! مَیں تجھ ہی سے قوت حاصل کرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی دین کے لئے قتال کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ ہی کافی ہے اور بڑا اچھا کارساز ہے "

اس دُعا کا ایک ایک لفظ تعلق مع اللہ کی تاکید اور مُسلمانوں کے تمام افعال و اعمال حتیٰ کہ جنگ وقتال کو بھی دیگر اقوام کے جنگ وقتال سے ممتاز کر رہا ہے۔

(۲) دُوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ اس غزوہ میں بعض صحابہؓ نے بہادری وشجاعت و جاں نثاری وفدائیت کے وہ نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے جسم کو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنایا تھا کہ ہر آنے والا تیر اپنے سینہ پر کھاتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے بھی اسی طرح اپنے بدن کو چھلنی کرایا تھا لیکن حضورؐ کی رفاقت کو نہیں چھوڑا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضیر جنگِ بدر سے غیر حاضر رہے تھے اس لئے ان کو اس کا افسوس تھا اور آرزو کرتے تھے کہ نبی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رفاقت میں اگر کوئی موقعہ ہاتھ آیا تو اپنے دل کی حسرت پوری کروں گا۔ جب کچھ دن کے بعد جنگ اُحد کا واقعہ پیش آیا تو انس بن النضیر شریک ہوئے۔ مُسلمان جب منتشر ہوگئے تھے اور کفارِ قریش کا سیلاب امنڈ رہا تھا تو یہ اپنی تلوار لے کر آگے بڑھے۔ اتفاقاً حضرت سعدؓ سے ملاقات ہوئی، پکار کر کہا سعدؓ کہاں جا رہے ہو؟ مَیں تو اُحد کے اس دامن میں جنّت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور شدید قتال کے بعد اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ (ابن کثیر)

حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مُسلمان منتشر ہو گئے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ صرف گیارہ صحابہؓ رہ گئے تھے۔ جن میں حضرت طلحہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ بھی تھے۔ کفارِ قریش کا سیلاب امڈ آرہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کون ان کی خبر لے گا؟ حضرت طلحہؓ بول اُٹھے مَیں، یا رسول اللہ! ایک دُوسرے انصاری صحابیؓ نے کہا "مَیں حاضر ہوں"۔ انصاری کو آپؐ نے جانے کا حکم دیا۔ وہ قتال کے بعد شہید ہو گئے۔ پھر ایک ریلہ آیا۔ آپؐ نے پھر وہی سوال کیا۔ حضرت طلحہؓ نے وہی جواب دیا اور بے تاب ہو رہے تھے کہ حضورؐ حکم دیں تو مَیں آگے بڑھوں۔ حضورؐ نے پھر کسی دوسرے صحابی کو بھیج دیا اور حضرت طلحہؓ کی تمنّا پوری نہیں ہوئی۔ اسی طرح سات بار حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کہا اور ہر مرتبہ حضرت طلحہؓ کو اجازت نہیں دی گئی اور دوسرے صحابہؓ کو اجازت دی جاتی تھی وہ شہید ہو جاتے ہیں۔

(۳) جنگِ بدر میں باوجود قلتِ تعداد کے مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ غزوۂ احد میں بدر کی بہ نسبت کثرت تھی۔ پھر بھی شکست ہوئی۔ اس میں بھی مسلمانوں کے لئے عبرت ہے کہ مسلمان کو کبھی کثرت ساز و سامان پر نہیں جانا چاہیئے بلکہ فتح کو ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے سمجھے اور اسی سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھے۔ (معارف القرآن ج ۲ صـ۱۲۳ تا صـ۱۲۷)

اُحد کے مصائب سزا نہیں بلکہ آزمائش تھے

ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم (الاٰیۃ) سے معلوم ہوا کہ غزوۂ احد میں جو مصائب اور تکالیف صحابہ کرامؓ کو پیش آئیں وہ بطور سزا نہیں بلکہ بطور آزمائش تھیں۔ اس امتحان کے ذریعے مومنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اظہار کرنا تھا اور اَثَابَکُمْ غَمًّا (العمران آیت) کے الفاظ سے جو اس کا سزا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تطبیق یہ ہے کہ صورت تو سزا ہی کی تھی مگر یہ سزا مربیانہ اصلاح کے لئے تھی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو، استاد اپنے شاگرد کو کچھ سزا دیتا ہے تو عرف میں اس کو سزا بھی کہہ سکتے ہیں مگر درحقیقت یہ تربیت اور اصلاح کی ایک صورت ہوتی ہے (جو) حاکمانہ سزا سے مختلف ہے۔

واقعہ احد میں مسلمانوں پر مصائب کے اسباب کیا تھے؟

جملہ مذکورہ لِیَبْتَلِیَکُمْ سے آخر آیت تک جو ارشاد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوع مصائب کا سبب یہ ربانی حکمتیں تھیں۔ لیکن اگلی آیت میں اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کوئی سابقہ لغزش اس شیطانی اثر کا سبب ہے؟

جواب یہ ہے کہ ظاہری سبب تو وہ لغزش ہی ہوئی کہ اس کی وجہ سے شیطان کو ان سے اور معصیت کرا دینے کی بھی طمع ہو گی اور اتفاق سے اس کی وہ طمع پوری بھی ہو گئی مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں یہ تکوینی حکمتیں مستور تھیں جن کو لِیَبْتَلِیَکُمْ میں بیان فرمایا ہے۔ روح المعانی میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعضے وہ گناہ

یاد دلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس لئے جہاد سے ہٹ گئے تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر کے پھر پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور شہید ہو کر اللہ تعالیٰ سے ملیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرامؓ کا مقام

واقعہ اُحد میں جو لغزشیں اور خطائیں بعض صحابہ کرامؓ سے صادر ہوئیں وہ اپنی ذات میں بڑی شدید اور سخت تھیں۔ جس مورچہ پر پچاس صحابہؓ کو یہ حکم دے کر بٹھایا تھا، ان کی بڑی تعداد یہاں سے ہٹ گئی۔ اگرچہ ہٹنے کا سبب ان کی یہ اجتہادی غلطی سہی کہ اب فتح ہو چکی ہے، اس حکم کی تعمیل پوری ہو چکی ہے، یہاں سے نیچے آکر سب مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہیئے، مگر درحقیقت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی واضح ہدایات کے خلاف تھا۔ اسی خطا و قصور کے نتیجے میں میدانِ جنگ سے بھاگنے کی غلطی سرزد ہونی چاہیئے۔ اس میں بھی کسی تاویل ہی کا سہارا لیا گیا ہو جیسا کہ زجاج سے اور نقل کیا جا چکا ہے۔ پھر یہ میدانِ جنگ سے بھاگنے کی غلطی سرزد ہونی چاہیئے۔ اس میں بھی کسی تاویل ہی کا سہارا لیا گیا ہو۔

پھر یہ میدانِ جنگ سے بھاگنا ایسی حالت میں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہیں اور پیچھے سے ان کو آواز دے رہے ہیں۔ یہ چیزیں اگر شخصیات اور گرد و پیش کے حالات سے الگ کر کے دیکھی جائیں، تو بلاشبہ سخت ترین اور ایسے سنگین ترین جرم تھے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے سلسلہ میں مختلف صحابہؓ پر جتنے الزامات مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے ہیں یہ ان سب سے زیادہ شدید جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر غور کیجئے کہ حق تعالیٰ نے ان تمام خطاؤں اور لغزشوں کے بعد بھی ان حضرات کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ وہ (سورہ آل عمران کی آیات ۱۵۳ تا ۱۵۵ میں) بڑی وضاحت سے آگیا کہ اوّل ظاہری انعام اُونگھ کا بھیج کر اُن کی تکلیف اور تکان و پریشانی دُور کی گئی پھر یہ بتلایا گیا کہ جو مصائب اور غم مسلمانوں کو اس وقت پہنچا ہے وہ نِری سزا و عقوبت

نہیں بلکہ اس میں کچھ مربیانہ حکمتیں مستور ہیں۔ پھر صاف لفظوں میں معافی کا اعلان فرمایا۔ یہ سب چیزیں ایک مرتبہ اس سے پہلے آ چکی ہیں، اس جگہ پھر ان کا اعادہ فرمایا۔ اس تکرار کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ تو خود صحابہ کرامؓ کی تسلی کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا اور اس جگہ منافقین کے اس قول کا رد بھی مقصود ہے جو وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم نے ہماری رائے پر عمل نہ کیا اس لئے مصائب و تکالیف کا سامنا ہُوا۔

بہرحال ان تمام آیات میں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آگئی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہے کہ اتنی بڑی عظیم خطاؤں اور لغزشوں کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ صرف عفو و درگزر کا نہیں بلکہ لطف و کرم کا فرمایا گیا۔ یہ معاملہ تو خود حق تعالیٰ کا اور نصوص قرآنی کا بیان کیا ہُوا ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کے سامنے پیش ہُوا۔ انہوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے حالات کے متعلق ایک خط لکھ دیا تھا جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی اس کی حقیقت کھلی اور خط پکڑا گیا تو صحابہ کرامؓ میں حاطب ابن ابی بلتعہ کے خلاف سخت غیظ و غضب تھا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن مار دوں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ وہ منافق نہیں، مومن خالص ہیں مگر یہ غلطی ان سے سرزد ہوگئی اس لئے اس کو معاف فرمایا اور فرمایا کہ یہ اہل بدر میں سے ہیں اور شاید اللہ تعالےٰ نے تمام حاضرین بدر کے متعلق مغفرت اور معافی کا حکم نافذ کر دیا ہے (یہ روایت حدیث کی سب معتبر کتب میں موجود ہے)۔

صحابہ کرامؓ کے متعلق مسلمانوں کے لئے ایک سبق

یہیں سے اہلسنت والجماعت کے اس عقیدہ اور عمل کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحابہؓ اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں، ان سے بڑے گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہُوئے بھی ہیں لیکن

اس کے باوجود اُمت کے لئے یہ جائز نہیں کہ اُن کی طرف کسی بُرائی اور عیب کو منسوب کرے، جب اللہ تعالے اور اُس کے رسول صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اُن کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر کے ان کے ساتھ لطف وکرم کا معاملہ فرمایا اور ان کو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا مقام عطا فرمایا تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالے عنہ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالے عنہ اور بعض صحابہ کرامؓ پر غزوۂ احد کے اسی واقعہ کا ذکر کر کے طعن کیا تھا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز کی معافی کا اللہ تعالے نے اعلان فرما دیا اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے؟

(صحیح بخاری)

اس لئے اہلِ سُنت والجماعت کے عقائد کی کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ تمام ہی صحابہ کرامؓ کی تعظیم اور ان پر طعن واعتراض سے پرہیز واجب ہے۔ عقائد نسفیہ میں ہے :-

"واجب ہے کہ صحابہؓ کا ذکر بغیر خیر اور بھلائی کے نہ کرے"

اور شرح مسامرہ ابن ہمام میں ہے :-

"یعنی اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ کو عدول اور ثقات سمجھیں، ان کا ذکر مدح وثناء کے ساتھ کریں"

شرح مواقف میں ہے :

"یعنی تمام صحابہ کی تعظیم واجب ہے اور ان پر طعن واعتراض سے باز رہنا واجب ہے"

حافظ ابن تیمیہ نے عقیدہ واسطیہ میں فرمایا ہے :

"اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو اختلافات اور قتل وقتال ہوئے ہیں ان میں کسی پر الزام واعتراض کرنے سے باز رہیں"

وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں جو روایات اُن کے عیوب کے متعلق آئی ہیں ان میں بکثرت تو جھوٹی اور غلط ہیں جو دُشمنوں نے اُڑائی ہیں اور بعض وہ ہیں جن میں کمی بیشی کر کے اپنی

اصلیت کے خلاف کر دی گئی ہیں اور جو بات صحیح بھی ہے تو صحابہ کرامؓ اس میں اجتہادی رائے کی بناء پر معذور ہیں اور بالفرض جہاں وہ معذور بھی نہ ہوں تو اللہ تعالےٰ کا قانون یہ ہے کہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئٰاتِ ۔ یعنی اعمالِ صالحہ سے بُرے اعمال کا بھی کفارہ ہو جاتا ہے ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اعمالِ صالحہ کے برابر دوسرے کے اعمال نہیں ہو سکتے اور اللہ تعالےٰ کے عفو و کرم کے جتنے وہ مستحق ہیں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ۔ اس لئے کسی کو یہ حق نہیں کہ اُن کے اعمال پر مواخذہ کرے اور ان میں سے کسی پر طعن و اعتراض کی زبان کھولے ۔ (عقیدہ واسطیہ ملخص معارف القرآن ج ۲ صہ ۲۰۹ تا صہ ۲۱۳)

سنہ ۴ھ

سریہ منذر بجانب بیر معونہ

اسی سال ماہ صفر میں آپ نے ستر صحابہ کا ایک دستہ اہلِ نجد کی طرف تبلیغِ اسلام کے لئے بھیجا جن میں بڑے بڑے علماء وصلحاء شامل تھے، وہاں پہنچے تو عامر، رعل، ذکوان اور عصیہ اُن کے مقابلے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بالآخر جنگ ہوئی اور اتفاقاً سب شہید ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اس سے سخت رنج پہنچا، یہاں تک کہ آپ نے ان لوگوں کے قاتلین کے لئے چند روز صُبح کی نماز میں بددُعا فرمائی (سیرت مغلطائی ص۵۳)

اور اسی سال ماہِ شوال میں حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ولادت ہُوئی اور حضرت ام سلمہ رضؓ، آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔

(سیرت ص۱۲۰)

۵ھ

قریش اور یہود کی متفقہ سازش اور غزوۂ احزاب

قُریش اور یہُود کا اتفاق

جب نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود سے مصالحت کا معاہدہ فرمایا تھا جس کو نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم وفا کرتے رہے۔ لیکن چونکہ یہودی مدینہ طیبہ کے رئیس اور بڑے مانے جاتے تھے۔ آپؐ کے تشریف لانے کے بعد اسلام کی روز افزوں ترقی اور شوکت کو دیکھ کر ان کو سخت غیظ ہوتا تھا اور اسی لئے ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور مُسلمانوں کے درپے آزار رہتے تھے۔

غزوہ بدر میں جب مُسلمانوں کو حیرت انگیز فتحیابی ہوئی تو اُن کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور بالآخر انہوں نے اعلانیہ عہد شکنی شروع کر دی چنانچہ ۲ھ میں ان کے قبیلہ بنی قینقاع نے اعلانِ جنگ کیا اور پھر بنی نضیر نے بغاوت شروع کردی۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری شروع کی۔ مقابلہ ہُوا تو وہ سب قلعہ بند ہوگئے۔ کچھ عرصہ محصور رہنے کے بعد جلاوطن ہوکر قینقاع شام کے علاقے میں بنونضیر خیبر وغیرہ میں چلے گئے۔

ادھر قریش مکہ پہلے سے یہاں کے یہود اور منافقین کو خطوط لکھ کر نہ صرف مخالفت پر اکسا رہے تھے بلکہ یہ دھمکی بھی ساتھ تھی کہ اگر تم محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کو وہاں سے نکال نہ دو گے تو ہم تمہارے ساتھ بھی جنگ کریں گے۔ (ابو داؤد)

اس وقت یہ اسباب باہمی ربط و اتحاد کا بہانہ بن گئے اور اب قریشِ مکہ یہود مدینہ اور منافقین، سب کی مجموعی طاقتیں اسلام کے خلاف کھڑی ہوگئیں۔ مکہ سے مدینہ تک تمام

قبائل میں ایک آگ سی لگ گئی۔ چنانچہ غزوۂ ذات الرقاع مورخہ ۱۰ محرم ۵ھ اسی سازش کا نتیجہ تھا اور پھر غزوہ دومۃ الجندل جو ربیع الاول ۵ھ میں واقع ہوا۔ وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ غزوہ بنی مصطلق مورخہ ۲ شعبان ۵ھ کا باعث بھی یہی متفقہ سازش تھی۔ یہ سازشیں ایک عرصہ تک اسی طرح مختلف صورتوں میں ظاہر ہو کر ترقی کرتی رہیں۔

(سیرت ص ۱۲۰ تا ص ۱۲۲)

غزوۂ احزاب اور واقعۂ خندق

بالآخر ذی قعد ۵ھ میں سب نے اپنی پوری قوتیں جمع کر کے یکبارگی مدینہ طیبہ پر حملہ کی ٹھہرائی اور اسی طرح دس ہزار آدمیوں کا لشکر جرار مسلمانوں کو مٹانے کے لئے مدینہ کی طرف بڑھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جب خبر ہوئی تو سب کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ کھلے میدان میں جنگ کرنا مناسب نہیں، بلکہ جس طرف سے مدینہ کے اندر اُن کے گھسنے کا احتمال ہے، اس طرف خندق کھودی جائے۔ چنانچہ آپؐ تین ہزار صحابہؓ کو ساتھ لے کر خندق کھودنے کے لئے خود بھی کمربستہ ہو گئے۔ چھ دن میں یہ پانچ گز خندق اس طرح تیار ہوئی کہ اس کے کھودنے میں خود بھی سید الرسل صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کا ایک بڑا حصہ تھا۔

(سیرت مغلطائی ص ۵۶)

ایک مرتبہ خندق کھودتے ہوئے ایک پتھر کی چٹان نکل آئی جس کی وجہ سے سب کے سب عاجز ہو گئے۔ آپؐ نے خود دستِ مبارک سے پھاوڑا مارا تو اُس کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ گئے۔ غرض خندق تیار ہو گئی۔

ادھر کفار کا لشکر آ پہنچا اور مدینہ طیبہ کا محاصرہ کر لیا۔ تقریباً پندرہ روز تک مسلمان اس میں محصور رہے۔ محاصرہ کی وجہ سے مدینہ میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ رسد کی قلت سے صحابہ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک روز مضطر ہو کر صحابہؓ نے اپنے

پیٹ کھول کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو دکھائے کہ سب نے پیٹ سے پتھر باندھ رکھے تھے۔ آپ نے اپنا شکم مبارک کھول کر دکھایا جس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ ادھر محاصرین جب خندق عبور نہ کر سکے تو وہیں سے تیر اور پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ اسی سلسلے میں آنحضرتؐ کی چار نمازیں قضاء ہوئیں۔

کفار پر ہوا کا طوفان اور نصرتِ الٰہی

بالآخر خداوند کریم نے اس بے سروسامان جماعت کی امداد فرمائی اور لشکرِ کفار پر ہوا کا ایک ایسا طوفان مسلط فرما دیا کہ خیموں کی چوبیں اکھڑ گئیں۔ چولہوں سے دیگچیاں اُلٹ گئیں، جس نے ان کی فوج کے حواس معطل کر دیئے اور ان کا سامانِ رسد بھی ختم ہو گیا۔

ادھر حضرت نعیم ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک ایسی تدبیر کی کہ جس سے کفار کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی۔ غرض ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ اب کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں میدان صاف ہو گیا۔

واقعاتِ متفرقہ

اسی سال میں حج فرض ہوا۔ اس کی تاریخ میں اور بھی مختلف اقوال ہیں۔ اس سال ماہ جمادی الاولیٰ میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے نواسے عبداللہ بن عثمانؓ یعنی رقیہ کے صاحبزادے فوت ہوئے اور آخر شوال میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کی والدہ کی وفات ہوئی اور ذی قعدہ میں زینب بنت جحشؓ آپؐ کے عقد میں آئیں۔ اسی سال مدینہ میں زلزلہ آیا اور خسوف قمر ہوا۔ (سیرت ص ۱۲۲ تا ص ۱۲۴)

واقعہ غزوۂ خندق

بدر و احد میں مشرکینِ مکہ کا مسلسل شکست اور مسلمانوں کے خلاف ہر جد و جہد میں ناکامی کے ساتھ مسلمانوں کی مسلسل ترقی اور اسلام کی روز افزوں اشاعت نے قریشِ مکہ

اور تمام غیر مسلموں میں ایک بوکھلاہٹ پیدا کر دی تھی جس سے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو رہے تھے۔ جس کا نتیجہ ایک عام سازش کی صورت میں یہ ظاہر ہوا کہ مشرکینِ عرب اور یہود و نصاریٰ سب کا ایک متحدہ محاذ مسلمانوں کے خلاف بن گیا اور سب نے مل کر مدینہ پر یکبارگی حملہ اور فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی اور ان کا بے پناہ لشکر اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے مٹا ڈالنے کا عزم لے کر مدینہ پر چڑھ آیا جس کا نام قرآن میں غزوہ احزاب اور تاریخ میں غزوۂ خندق ہے۔ کیونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے یہ طے فرمایا تھا کہ مدینہ سے باہر خندق کھودی جائے۔ بیہقی اور ابو نعیم اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ خندق کھودنے کا کام مجاہدینِ اسلام صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا تو چالیس چالیس ہاتھ لمبی خندق دس دس آدمیوں کے سپرد تھی۔ یہ خندق کئی میل لمبی اور خاصی گہری اور چوڑی تھی جس کو غنیم عبور نہ کر سکے اور کھدائی کے لئے تکمیل جلد سے جلد کرنا تھی اس لئے جاں نثار صحابہ کرامؓ بڑی محنت سے اس میں مشغول تھے کہ قضائے حاجت اور کھانے وغیرہ کی ضروریات کے لئے یہاں سے ہٹنا مشکل ہو رہا تھا مسلسل بھوکے رہ کر یہ کام انجام دیا جا رہا تھا اور یقیناً یہ کام ایسا تھا کہ آج کل کی جدید آلات والی پلٹن بھی ہوتی تو اس تھوڑے عرصہ میں اس کام کا پورا ہونا آسان نہ ہوتا، مگر یہاں ایمانی طاقت کام کر رہی تھی جس نے بآسانی تکمیل کرا دی۔

سید الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بھی ایک فرد کی حیثیت میں اس کھدائی کا کام میں شریک تھے۔ اتفاقاً خندق کے ایک حصہ میں پتھر کی ایک بڑی چٹان نکل آئی۔ جن حضرات کے حصہ میں خندق کا یہ ٹکڑا تھا وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے عاجز ہو گئے تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ اب حضورؐ کا کیا حکم ہے؟ آپؐ اسی وقت موقع پر تشریف لائے اور کدال اپنے خود دستِ مبارک میں لے کر ایک ضرب لگائی تو اس چٹان کے ٹکڑے ہو گئے اور ایک آگ کا شعلہ بلند ہوا جس سے دور تک اس کی روشنی پھیل گئی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں ملکِ فارس کے محلات و عمارات دکھلائی گئیں۔ پھر دوسری ضرب لگائی اور پھر ایک شعلہ

برآمد ہُوا تو فرمایا کہ اس کی روشنی میں مجھے رُومیوں کے سُرخ سُرخ محلات و عمارات دکھلائی گئیں۔ پھر تیسری ضرب لگائی اور روشنی پھیلی تو فرمایا کہ اس میں مجھے صنعاء یمن کے عظیم محلات دکھلائے گئے اور فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ مجھے جبرائیل امین نے خبر دی ہے کہ میری اُمت ان تمام ممالک پر غالب آئے گی۔

منافقین مدینہ نے یہ سُنا تو ان کو استہزاء و تمسخر کا موقع ہاتھ آگیا۔ مسلمانوں کا مذاق اڑایا کہ دیکھو ان لوگوں کو جو حریف مقابل کے خوف سے خندق کھودنے میں اس طرح مشغول ہیں کہ ان کو اپنی ضروریات کا بھی ہوش نہیں۔ اپنی جانوں کی حفاظت ان کو مشکل ہو رہی ہے۔ ملک فارس و روم اور یمن کی فتوحات کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حق تعالےٰ نے ان بے خبر ظالموں میں یہ آیت نازل فرمائی: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ جس میں مناجات و دُعا کے پیرایہ میں قوموں کے عروج و زوال اور ملکوں کے انقلاب میں حق جلّ و علا شانہٗ کی قدرت کاملہ کا بیان ایک نہایت بلیغ انداز سے کیا گیا ہے۔ اور فارس و روم کی فتوحات کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے پُورا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اس میں دُنیا کے انقلابات سے بے خبر، قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے ناواقف قوم نوح اور عاد و ثمود کے واقعات سے غافل اور جاہل دشمنانِ اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ظاہری شان و شوکت کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ دُنیا کی ساری طاقتیں اور حکومتیں سب ایک ذات پاک کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ عزت و ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے وہ بلاشبہ اسی پر قادر ہے کہ غریبوں اور فقیروں کو تخت و تاج کا مالک بنا دے اور بڑے بڑے بادشاہوں سے حکومت و دولت چھین لے۔ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ آج کے خندق کھودنے والے فقیروں کو کل شام و عراق اور یمن کی حکومت عطا فرمائے ؎

ذرّہ ذرّہ دہر کا پابستہ تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

(معارف القرآن ج ۲ صد ۳۲ تا ۳۴)

غزوۂ خندق یا غزوۂ احزاب

احزاب، حزب کی جمع ہے جس کے معنے پارٹی یا جماعت کے آتے ہیں۔ اس غزوہ میں کفار کی مختلف جماعتیں متحد ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا معاہدہ کر کے مدینہ پر چڑھ آئی تھیں۔ اس لئے اس غزوہ کا نام غزوۂ احزاب رکھا گیا اور چونکہ اس غزوہ میں دشمن کے آنے کے راستے پر باامر نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم خندق کھودی گئی اس لیئے اس غزوہ کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

واقعہ کی تفصیل

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جس سال مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہوئے۔ اس کے دوسرے ہی سال میں غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ تیسرے سال میں غزوۂ احد پیش آیا۔ چوتھے سال میں یہ غزوہ احزاب واقع ہوا اور بعض روایات میں اس کو پانچویں سال کا واقعہ قرار دیا ہے۔ بہرحال ابتداء ہجرت سے اس وقت تک کفار کے حملے مسلمانوں پر مسلسل جاری تھے۔ غزوۂ احزاب کا حملہ بڑی بھرپور طاقت وقوت اور پختہ عزم اور عہد و میثاق کے ساتھ کیا گیا۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ پر یہ غزوہ سب دوسرے غزوات سے زیادہ اشد تھا۔ کیونکہ اس میں حملہ آور احزاب کفار کی تعداد بارہ ہزار سے پندرہ ہزار تک بتلائی گئی ہے اور اس طرف سے مسلمانوں کی تعداد کل تین ہزار، وہ بھی بے سروسامان اور زمانہ سخت سردی کا۔ مگر جیسا کہ یہ وقت مسلمانوں پر زیادہ سخت تھا ویسے ہی اللہ تعالےٰ کی نصرت و امداد سے اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ایسی عظیم فتح و کامیابی کی صورت میں سامنے آیا کہ اس نے تمام مخالف گروہوں مشرکین، یہود اور منافقین کی کمریں توڑ دیں اور آگے ان کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ مسلمانوں پر کسی حملے کا ارادہ کر سکیں۔ اس لحاظ سے یہ غزوہ کفر و اسلام کا آخری معرکہ تھا جو مدینہ منورہ کی زمین پر ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال لڑا گیا۔

اس واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ یہود کے قبیلہ بنو نضیر اور قبیلہ ابو وائل کے تقریباً بیس آدمی جو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ مکہ مکرمہ پہنچے اور قریشی سرداروں سے ملاقات کر کے ان کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ قریشی سردار سمجھتے تھے کہ جس طرح مسلمان ہماری بت پرستی کو کفر کہتے ہیں اور اس لئے ہمارے مذہب کو برا سمجھتے ہیں۔ یہود کا بھی یہی خیال ہے تو ان سے موافقت و اتحاد کی کیا توقع رکھی جائے۔ اس لئے ان لوگوں نے یہود سے سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے درمیان دین و مذہب کا اختلاف ہے اور آپ لوگ اہل کتاب اور اہل علم ہیں پہلے ہمیں یہ بات بتلائیے کہ آپ کے نزدیک ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔ ان یہودیوں نے اپنے علم وضمیر کے بالکل خلاف ان کو یہ جواب دیا کہ تمہارا دین محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے دین سے بہتر ہے اور اس پر یہ لوگ کچھ مطمئن ہوتے مگر اس پر بھی یہ معاملہ ٹھہرا کہ بیس آدمی یہ آنے والے اور پچاس آدمی قریشی سرداروں کے مسجد حرام میں جا کر بیت اللہ کی دیواروں سے سینے لگا کر اللہ تعالےٰ کے سامنے یہ عہد کریں کہ ہم میں جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہے گا ہم محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالےٰ کے حلم و کرم کا ایک اعجوبہ

اللہ تعالےٰ کے گھر میں اللہ کے بیت سے چمٹ کر اللہ کے رسول کے خلاف جنگ لڑنے کا معاہدہ کر رہے ہیں اور مطمئن ہو کر جنگ کا نیا جذبہ لے کر لوٹتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے حلم و کرم کا عجیب مظہر ہے۔ پھر ان کے اس معاہدے کا حشر بھی آخر قصہ میں معلوم ہوگا۔ کہ سب کے سب اس جنگ سے منہ موڑ کر بھاگے۔

یہ یہودی قریش مکہ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد عرب کے ایک بڑے اور جنگجو قبیلہ غطفان کے پاس پہنچے اور ان کو بتلایا کہ ہم اور قریش مکہ اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ اس نئے دین (اسلام) کے پھیلانے والوں کا ایک مرتبہ سب مل کر استیصال کریں۔ آپ بھی اس پر

ہم سے معاہدہ کریں اور ان کو یہ رشوت بھی پیش کی کہ خیبر میں جس قدر کھجور ایک سال میں پیدا ہوگی وہ اور بعض روایات میں اس کا نصف قبیلہ غطفان کو دیا جانے کا وعدہ کیا۔ قبیلہ غطفان کے سردار عُیینہ بن حصن نے اس شرط کے ساتھ ان سے شرکت کو منظور کر لیا اور یہ لوگ بھی جنگ میں شامل ہو گئے اور باہمی قرارداد کے مطابق مکہ سے قریشیوں کا لشکر چار ہزار جوانوں اور تین سو گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹوں کے سامان کے ساتھ ابو سفیان کی قیادت میں مکہ مکرمہ سے نکلا اور مرظہران میں قیام کیا۔ یہاں قبیلہ اسلم اور قبیلہ اشجع اور بنو مرہ ابنو کنانہ اور فزارہ اور غطفان کے سب قبائل شامل ہوئے جن کی مجموعی تعداد بعض روایات میں دس ہزار بعض میں بارہ ہزار اور بعض میں پندرہ ہزار بیان کی گئی ہے۔

مدینہ منورہ پر سب سے بڑا حملہ

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے مقابل آنے والا لشکر ایک ہزار کا تھا۔ پھر غزوۂ احد میں حملہ کرنے والا لشکر تین ہزار کا تھا۔ اس مرتبہ لشکر کی تعداد بھی ہر پہلی مرتبہ سے زائد تھی اور سامان بھی اور تمام قبائل عرب و یہود کی اتحادی طاقت بھی۔

قبائلی اور نسبی قومیتوں کا انتظامی معاشرتی امتیاز، اسلامی وحدت کے منافی نہیں

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس جہاد کے لئے مہاجرین کا جھنڈا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سپرد فرمایا۔ اس وقت مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات (بھائی چارے) کے تعلقات بڑی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم تھے اور سب بھائی بھائی تھے۔ مگر انتظامی سہولت کے لئے مہاجرین کی قیادت الگ اور انصار کی الگ کردی گئی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قومیت اور اسلامی وحدت انتظامی اور معاشرتی تقسیم کے منافی نہیں۔ بلکہ ہر جماعت کی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دینے سے باہمی اعتماد اور تعاون و تناصر کے جذبہ کی تقویت ہوتی تھی اور اس جنگ کے سب سے پہلے کام یعنی خندق کھودنے میں اس تعاون و تناصر کا مشاہدہ ہوا۔

اسلامی لشکر کی تعداد

اس وقت مسلمانوں کی کُل جمعیت تین ہزار تھی اور اُن کے پاس کُل چھتیس گھوڑے تھے۔

ساڑھے تین میل لمبی خندق چھ دن میں مکمّل ہوگئی

صحابہ رضوان اللہ تعالٰے علیہم اجمعین کی جدّوجہد اور کوشش کا نتیجہ چھ روز میں سامنے آگیا کہ اتنی طویل اور چوڑی اور گہری خندق کی چھ روز میں تکمیل ہوگئی۔ (مظہری)

حضرت جابرؓ کی دعوت میں ایک کھلا ہُوا معجزہ

اسی خندق کی کھُدائی کے دوران وہ مشہور واقعہ پیش آیا کہ ایک روز حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم کو دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ بھُوک کے سبب آپؐ متاثر ہو رہے ہیں۔ اپنی اہلیہ سے جا کر کہا کہ تمہارے پاس کچھ ہو تو پکالو۔ حضور صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم پر بھُوک کا اثر دیکھا نہیں جاتا۔ اہلیہ نے بتلایا ہمارے گھر میں ایک صاع بھر جَو رکھے ہیں، میں پیس کر آٹا بناتی ہوں۔ ایک صاع ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوتا ہے۔ اہلیہ پیسنے پکانے میں لگی۔ گھر میں ایک بکری کا بچّہ تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالٰے عنہ نے اس کو ذبح کر کے گوشت تیار کیا اور آنحضرت صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم کو بُلانے کے لئے چلے تو اہلیہ نے پکار کر کہا کہ دیکھئے حضورؐ کے ساتھ بہت بڑا مجمع صحابہؓ کا ہے۔ صرف حضورؐ کو کسی طرح تنہا بُلا لائیں۔ مجھے رسوا نہ کیجئے کہ صحابہ کرامؓ کا بڑا مجمع چلا آئے۔ حضرت جابر رضؓ نے آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم سے پوری حقیقت حال عرض کر دی کہ صرف اتنا کھانا ہے مگر آپؐ نے پورے لشکر میں اعلان فرمادیا کہ چلو جابرؓ کے گھر دعوت ہے۔ حضرت جابرؓ حیران تھے۔ گھر پہنچے تو اہلیہ نے سخت پریشانی کا اظہار کیا اور پوچھا کہ آپؐ نے آنحضرتؐ کو اصل حقیقت اور کھانے کی مقدار بتلادی تھی؟ جابرؓ نے کہا۔ ہاں! وہ میں بتلا چکا ہوں

تو اہلیہ محترمہ مطمئن ہوئیں کہ پھر ہمیں کچھ خبر نہیں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مالک ہیں جس طرح چاہیں کریں۔ واقعہ کی تفصیل اس جگہ غیر ضروری ہے۔ اتنا نتیجہ معلوم کر لینا کافی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے روٹی اور سالن سب کو دینے اور کھلانے کا اہتمام فرمایا اور پورے مجمع نے شکم سیر ہو کر کھایا اور حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سب مجمع کے فارغ ہونے کے بعد بھی نہ ہماری ہنڈیا میں سے کچھ گوشت کم نظر آیا اور نہ گوندھے ہوئے آٹا میں کوئی کمی معلوم ہوتی تھی۔ ہم سب گھر والوں نے بھی شکم سیر ہو کر کھایا اور باقی پڑوسیوں میں تقسیم کر دیا۔

اسی طرح چھ روز میں جب خندق سے فراغت ہو گئی تو احزاب کا لشکر آپہنچا اور صحابہ کرامؓ نے جبل سلع کو اپنی پُشت کی طرف رکھ کر فوج کی صف بندی کر دی۔

یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور احزاب کے ساتھ شرکت

اس وقت دس بارہ ہزار کے باسامان لشکر کے ساتھ تین ہزار بے سروسامان لوگوں کا مقابلہ بھی عقل و قیاس میں آنے کی چیز نہ تھی۔ اس پر ایک اور نیا اضافہ ہُوا کہ احزاب میں قبیلہ بنونضیر کے سردار حیّی بن اخطب نے جس نے سب کو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی دشمنی پر جمع کرنے میں بڑا کام کیا تھا مدینہ پہنچ کر یہود کے قبیلہ بنونضیر کو بھی اپنے ساتھ ملانے کا منصوبہ بنایا۔ بنو قریظہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مابین ایک صُلح نامہ پر دستخط ہو چکے تھے اور معاہدہ مکمل ہو کر ایک دوسرے سے بے فکر تھے۔ بنو قریظہ کا سردار کعب بن اسد تھا۔ حیّی بن اخطب اُس کے پاس پہنچا، جب کعب کو اُس کے آنے کی خبر ملی تو اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر لیا کہ حیّی اس تک پہنچ نہ سکے۔ مگر حیّی بن اخطب نے آوازیں دیں اور دروازہ کھولنے پر اصرار کیا۔ کعب نے اندر ہی سے جواب دے دیا کہ ہم تو محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے ساتھ صُلح کر چکے ہیں اور ہم نے آج تک اُن کی طرف سے معاہدہ کی پابندی اور صدق و سچائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اس لئے ہم اس معاہدہ کے پابند ہیں آپ کے ساتھ نہیں آ سکتے۔ دیر تک حیّی بن اخطب دروازہ کھولنے اور

کعب سے باتیں کرنے پر اصرار کرتا رہا۔ یہ اندر ہی سے انکار کرتا رہا اور بالآخر جب کعب کو بہت عار دلایا تو اُس نے دروازہ کھول کر حیُی کو بُلایا۔ اُس نے بنو قریظہ کو وہ سب باغ دکھلائے کہ بالآخر کعب اُس کی باتوں میں آگیا اور احزاب میں شرکت کا وعدہ کر لیا اور جب کعب نے اپنے قبیلہ کے دُوسرے سرداروں کو یہ بات بتلائی تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ تم نے غضب کیا کہ مسلمانوں سے بلا وجہ عہد شکنی کی اور اُن کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دیا۔ کعب بھی ان کی باتوں سے متاثر ہُوا اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا مگر اب بات اُس کے قبضہ سے نکل چُکی تھی اور بالآخر یہی عہد شکنی بنو قریظہ کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنی۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ کو اس کی اطلاع ملی تو اس وقت میں ان کی عہد شکنی سے سخت صدمہ پہنچا اور بہت بڑی فکر اس کی لاحق ہو گئی کہ احزاب کے راستہ پر تو خندق کھودی گئی تھی، مگر یہ لوگ تو مدینہ کے اندر تھے۔ ان سے بچاؤ کیسے ہو؟ قرآن کریم میں جو اس حملہ کے متعلق فرمایا ہے کہ لشکرِ احزاب کے کفار تم پر چڑھ آئے تھے: مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ۔ اس کی تفسیر میں بعض ائمہ تفسیر نے یہی فرمایا ہے کہ فوق کی جانب سے مُراد بنو قریظہ ہیں اور اسفل سے آنے والے باقی احزاب ہیں۔

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اس عہد شکنی کی حقیقت اور صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے انصار کے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ کو بصورت وفد کعب کے پاس بھیجا کہ اس سے گفتگو کریں کہ اگر عہد شکنی کا واقعہ غلط ثابت ہو تو سب صحابہؓ کے سامنے کھل کر بیان کر دینا اور صحیح ثابت ہو تو آکر گول مول بات کہنا جس سے ہم سمجھ لیں اور عام صحابہ میں سراسیمگی پیدا نہ ہو۔

دونوں بزرگ سعد نامی وہاں پہنچے تو عہد شکنی کے سامان کُھلے دیکھے۔ ان کے اور کعب کے درمیان سخت کلامی بھی ہوئی۔ واپس آکر حسبِ ہدایت گول مول بات کہہ کر آنحضرتؐ کو عہد شکنی کا واقعہ صحیح ہونے سے باخبر کر دیا۔ اس وقت جب کہ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ جو

مسلمانوں کا حلیف تھا وہ بھی بر سرِ جنگ آگیا تو جو نفاق کے ساتھ مسلمانوں میں شامل تھا، ان کا نفاق بھی کھلنے لگا۔ بعض نے تو کھل کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف باتیں کہنا شروع کر دیں اور بعض نے حیلے بہانے بنا کر میدانِ جنگ سے بھاگ جانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی۔

اب محاذِ جنگ کی صورت یہ تھی کہ خندق کی وجہ سے احزاب کا لشکر اندر نہ آسکتا تھا اس کے دوسرے کنارے پر مسلمانوں کا لشکر تھا۔ دونوں میں ہر وقت تیر اندازی کا سلسلہ رہتا تھا۔ اسی حال میں تقریباً ایک مہینہ ہوگیا کہ نہ کھل کر کوئی فیصلہ کن جنگ ہوتی تھی اور نہ کسی وقت بے فکری۔ دن رات صحابہ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خندق کے کنارے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود بھی بنفسِ نفیس اس محنت و مشقت میں شریک تھے۔ مگر آپؐ پر یہ بات بہت شاق تھی کہ صحابہ کرامؓ سب کے سب سخت اضطراب اور بے چینی میں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک جنگی تدبیر

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قبیلہ غطفان کے رئیس نے ان یہودیوں کے ساتھ خیبر کے پھل اور کھجور کی طمع میں کی ہے۔ آپؐ نے غطفان کے دو سردار عیینہ بن حصن اور ابو الحارث بن عمرو کے پاس قاصد بھیجا کہ ہم تمہیں مدینہ طیبہ کا ایک تہائی پھل دیں گے، اگر تم اپنے ساتھیوں کو لے کر میدان سے واپس چلے جاؤ۔ یہ گفتگو درمیان میں تھی اور دونوں سردار راضی ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ معاہدۂ صلح پر دستخط ہو جائیں مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حسبِ عادت ارادہ کیا کہ صحابہ کرامؓ سے اس معاملہ میں مشورہ لیں۔ قبیلہ اوس و خزرج کے دو بزرگ سعدین یعنی سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔

حضرت سعدؓ کی غیرتِ ایمانی اور عزمِ شدید

دونوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ کو اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف

سے تو ہمارے کچھ کہنے کی مجال نہیں، ہم قبول کریں گے۔ ورنہ بتائیے کہ یہ آپؐ کی طبعی رائے ہے یا آپؐ نے ہمیں مشقت و تکلیف سے بچانے کے لئے یہ تدبیر کی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ امر الٰہی اس کا ہے اور نہ میری اپنی طبیعت کا تقاضہ ہے کہ صرف تمہاری مصیبت و تکلیف کو دیکھ کر یہ صورت اختیار کی ہے کیونکہ تم لوگ ہر طرف سے گھبرائے ہوئے ہو، میں نے چاہا کہ فریق مخالف کی قوت کو اس طرح فوراً توڑ دیا جائے۔ حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم جس وقت بتوں کو پوجتے تھے اللہ تعالےٰ کو نہ پہچانتے تھے اُس کی عبادت نہ کرتے تھے، اس وقت ان لوگوں کو ہمارے شہر کے پھل میں سے ایک دانہ کی طمع رکھنے کی ہمت نہیں تھی بجز اس کے کہ وہ ہمارے مہمان ہوں اور مہمانی کے طور پر ہم ان کو کھلا دیں یا پھر ہم سے خرید کر لے جائیں۔ آج جبکہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں اپنی معرفت عطا فرمائی اور اسلام کا اعزاز عطا فرمایا۔ کیا آج ہم ان لوگوں کو اپنا پھل اور اپنے اموال دے دیں گے۔ ہمیں اُن کی مصالحت کی کوئی حاجت نہیں۔ ہم تو ان کو تلوار کے سوا کچھ نہیں دیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سعدؓ کی اولوالعزمی اور غیرتِ ایمانی کو دیکھ کر اپنا یہ ارادہ چھوڑ دیا اور فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے جو چاہو کرو۔ سعدؓ نے صلح نامہ کا کاغذ ان کے ہاتھوں سے لے کر تحریر مٹا دی۔ کیونکہ ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے۔ غطفان کے سردار عینیہ اور حارث جو خود اس صلح کے لئے تیار ہو کر مجلس میں موجود تھے صحابہ کرامؓ کی یہ قوت و شدت دیکھ کر خود بھی اپنے دلوں میں متزلزل ہو گئے۔

حضرت سعد بن معاذؓ کا زخمی ہونا اور ان کی دُعا

ادھر خندق کے دونوں اطراف سے تیر اندازی اور پتھراؤ کا سلسلہ جاری رہا حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنی حارثہ کے قلعہ میں جہاں عورتوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا، اپنی والدہ کے پاس گئے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں بھی اس وقت اسی قلعہ میں تھی اور عورتوں کو پردے کے احکام اس وقت تک نہ آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سعد بن معاذؓ

ایک چھوٹی ذرہ پہنے ہوئے ہیں جس میں سے ان کے ہاتھ نکل رہے تھے اور ان کی والدہ اُن سے کہہ رہی ہیں کہ جاؤ جلدی کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ لشکر میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے ان کی والدہ سے کہا کہ ان کے لئے کوئی بڑی زِرہ ہوتی تو بہتر تھا۔ مجھے ان کے ہاتھ پاؤں کا خطرہ ہے جو زرہ سے نکلے ہوئے ہیں۔ والدہ نے کہا۔ کچھ مضائقہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ لشکر میں پہنچے تو اُن کو تیر لگا جس نے اُن کی رگ اکحل کو کاٹ ڈالا۔ اس وقت حضرت سعدؓ نے یہ دُعا کی کہ یا اللہ! اگر آئندہ بھی قریش کا کوئی حملہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مقابلہ پر ہونا مقدر ہے تو مجھے اس کے لئے زندہ رکھئے کیونکہ اس سے زیادہ میری کوئی تمنا نہیں کہ مَیں اس قوم سے مقابلہ کروں کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچائیں، وطن سے نکالا اور آپؐ کی تکذیب کی اور اگر آئندہ آپؐ کے علم میں یہ جنگ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے تو آپؐ مجھے موت شہادت عطا فرمائیں۔ مگر اس وقت تک مجھے موت نہ آئے جب تک کہ بنی قریظہ سے اُن کی غدّاری کا انتقام لے کر میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ حق تعالےٰ نے یہ آپ کی دونوں دُعائیں قبول فرمائیں۔ اس واقعہ احزاب کو کفار کا آخری حملہ بنا دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کا دَور شروع ہُوا۔ پہلے خیبر پھر مکّہ مکرّمہ اور پھر دوسرے بلاد فتح ہُوئے اور بنو قریظہ کا واقعہ آگے آتا ہے کہ وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور اُن کے معاملے کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ ہی کے سپرد کیا گیا۔ ان کے فیصلہ کے مطابق ان کے جوان قتل کئے گئے اور عورتیں و بچے قید کر لئے گئے۔

اس واقعہ احزاب میں صحابہ کرامؓ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو رات بھر خندق کی دیکھ بھال کرنی پڑی۔ اگر کسی وقت آرام کے لئے لیٹے بھی تو ذرا کسی طرف سے شور و شغب کی آواز آئی تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اسلحہ باندھ کر میدان میں جاتے تھے۔ حضرت اُمِّ سلمہؓ اُمّ المؤمنین فرماتی ہیں کہ ایک رات میں کئی کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ ذرا آرام کرنے کے لئے تشریف لائے اور کوئی آواز سُنی تو فوراً باہر تشریف لے گئے، پھر کچھ آرام کے

لئے ذرا کمر لگائی اور پھر کوئی آواز سنی تو باہر تشریف لے گئے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں بہت سے غزوات مثلاً غزوہ مریسیع، خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوہ حنین میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ رہی ہوں آپ پر کسی غزوہ میں ایسی شدت اور مشقت نہیں ہوئی جیسی غزوۂ خندق میں پیش آئی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو زخم بھی بہت لگے، سردی کی شدت سے بھی تکلیف اٹھائی۔ اس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کی ضروریات میں بھی تنگی تھی۔ (مظہری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں اس جہاد میں قضاء ہوئیں

ایک روز مقابل کفار نے یہ طے کیا کہ سب مل کر یکبارگی حملہ کرو اور کسی طرح خندق کو عبور کرکے آگے پہنچو۔ یہ طے کرکے بڑی بے جگری سے مسلمانوں کے مقابلے میں آگئے اور سخت تیراندازی کی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو دن بھر ایسا مشغول رہنا پڑا کہ نماز کے لئے بھی ذراسی مہلت نہ ملی۔ چار نمازیں اکٹھی عشاء کے وقت میں پڑھی گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا

جب مسلمانوں پر شدت کی انتہا ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے احزاب کفار کے لئے بددعا کی اور تین روز پیر، منگل اور بدھ میں مسجد فتح کے اندر مسلسل احزاب کی شکست و فرار اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لئے دعا کرتے رہے۔

تیسرے روز بدھ کے دن ظہر و عصر کے درمیان دعا قبول ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم شاداں و فرحاں صحابہ کرامؓ کے پاس تشریف لائے اور فتح کی بشارت سنائی۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت کے بعد سے کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پیش نہیں آئی۔

(مظہری)

کشود کار اور فتح کے اسباب کا آغاز

دشمنوں کی صفوف میں قبیلہ غطفان ایک بڑی طاقت تھی۔ حق تعالےٰ کی قدرتِ کاملہ نے انہی میں سے ایک شخص نعیم ابن مسعودؓ کے دل میں ایمان ڈال دیا اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا اور بتلایا کہ ابھی تک میری قوم میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ میں مسلمان ہوچکا ہوں۔ اب مجھے فرمائیں کہ میں اسلام کی کیا خدمت کروں؟ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اکیلے آدمی ہو، یہاں کوئی خاص کام نہ کرسکو گے۔ اپنی قوم میں واپس جاکر انہی میں اسلام سے مدافعت کا کوئی کام کرسکو تو کرو۔ نعیم بن مسعودؓ ذہین اور سمجھدار آدمی تھے۔ ایک منصوبہ دل میں بنا لیا اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی کہ میں ان لوگوں میں جاکر جو مصلحت دیکھوں کہوں۔ آپؐ نے اجازت دے دی۔

نعیم بن مسعودؓ یہاں سے بنو قریظہ کے پاس گئے جن کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں اُن کے قدیم تعلقات تھے، ان سے کہا کہ اے بنو قریظہ! تم جانتے ہو کہ میں تمہارا قدیم دوست ہوں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ ہمیں آپ کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے بعد حضرت نعیم بن مسعودؓ نے بنو قریظہ کے سرداروں سے ناصحانہ اور خیرخواہانہ انداز میں سوال کیا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ قریش مکہ ہوں یا ہمارا قبیلہ، غطفان یا دوسرے قبائل یہود وغیرہ۔ ان کا وطن یہاں نہیں۔ یہ اگر شکست کھاکر بھاگ جائیں تو ان کا کوئی نقصان نہیں، تمہارا معاملہ ان سب سے مختلف ہے۔ مدینہ تمہارا وطن ہے۔ تمہاری عورتیں اور تمہارے اموال سب یہاں ہیں۔ اگر تم نے ان لوگوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کی اور بعد میں یہ لوگ شکست کھاکر بھاگ گئے تو تمہارا کیا بنے گا؟ کیا تم تنہا مسلمانوں کا مقابلہ کرسکو گے؟ اس لئے میں تمہاری خیرخواہی سے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم لوگ ان کے ساتھ اس وقت تک شریکِ جنگ نہ ہو جب تک یہ لوگ اپنے خاص سرداروں کی ایک تعداد تمہارے پاس رہن نہ رکھ دیں کہ وہ تم کو مسلمانوں کے حوالے کرکے نہ بھاگ جائیں۔ بنو قریظہ کو ان کا

یہ مشورہ بہت اچھا معلوم ہُوا۔ اس کی قدر کی اور کہا کہ آپ نے بہت اچھا مشورہ دیا۔ اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ قریشی سرداروں کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ مَیں آپ کا دوست ہوں اور محمد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) سے بری ہوں۔ مُجھے ایک خبر ملی ہے، تمہاری خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ مَیں وہ خبر تمہیں پہنچادوں، بشرطیکہ آپ لوگ میرے نام کا اظہار نہ کریں۔ وہ خبر یہ ہے کہ یہود بنی قریظہ تمہارے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد اپنے فیصلہ پر نادم ہُوئے اور اس کی اطلاع محمد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) کے پاس یہ کہہ کر بھیج دی ہے کہ کیا آپؐ ہم سے اس شرط پر راضی ہوسکتے ہیں کہ ہم قریش اور غطفان کے چند سرداروں کو آپؐ کے حوالے کردیں کہ آپؐ اُن کی گردن مار دیں۔ پھر ہم آپؐ کے ساتھ مل کر ان سب سے جنگ کریں۔ محمد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) نے ان کی بات کو قبول کر لیا ہے۔ اب بنو قریظہ تم سے بطور رہن کے تمہارے کچھ سرداروں کا مطالبہ کریں گے۔ اب آپ لوگ اپنے معاملہ کو خود سوچ لیں۔

اس کے بعد نعیم بن مسعودؓ اپنے قبیلہ غطفان میں گئے اور ان کو بھی یہی خبر سُنائی۔ اس کے ساتھ ہی ابوسفیان نے قریش کی طرف سے عکرمہ بن ابی جہل کو غطفان کی طرف سے ورقہ بن غطفان کو اس کام کے لئے مقرر کیا کہ وہ بنی قریظہ سے جا کر کہیں کہ اب ہمارا سامانِ جنگ ختم ہو رہا ہے اور ہمارے آدمی بھی مسلسل جنگ سے تھک رہے ہیں، ہم آپ کے معاہدے کے مطابق آپ کی امداد اور شرکت کے منتظر ہیں۔ بنو قریظہ نے ان کو اپنی قرارداد کے مطابق یہ جواب دیا کہ ہم تمہارے ساتھ جنگ میں اس وقت تک شریک نہیں ہوں گے جب تک تم دونوں قبیلوں کے چند سردار ہمارے پاس بطور رہن (یرغمال) کے نہ پہنچ جائیں۔

عکرمہ اور ورقہ نے یہ خبر ابوسفیان کو پہنچا دی تو قریش اور غطفان کے سرداروں نے یقین کر لیا کہ نعیم بن مسعودؓ نے جو خبر دی ہے وہ صحیح ہے اور بنو قریظہ سے کہلا بھیجا کہ ہم ایک آدمی بھی اپنا تم کو نہ دیں گے، پھر آپ کا دل چاہے تو ہمارے ساتھ جنگ میں شرکت کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں۔ بنو قریظہ کو یہ حال دیکھ کہ اس بات پر جو نعیم بن مسعودؓ

نے لکھی تھی اور زیادہ یقین ہو گیا۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے دشمن گروہ میں سے ایک شخص کے ذریعے ان کی آپس میں پھوٹ ڈلوادی اور اُن لوگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

اس کے ساتھ دُوسری آسمانی افتاد ان پر یہ آئی کہ اللہ تعالےٰ نے ایک سخت اور برفانی ہَوا اُن پر مسلط کر دی جس نے اُن کے خیمے اُکھاڑ پھینکے۔ ہنڈیاں چُولہوں سے اُڑا دیں تو یہ ظاہری اسباب اللہ تعالےٰ نے ان کے پاؤں اکھاڑنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے پیدا فرما دیئے۔ اس پر مزید اپنے فرشتے بھیج دیئے جو باطنی طور پر ان کے دلوں پر رُعب طاری کر دیں۔ (کما قال سبحانہٗ وتعالےٰ، فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا) اس کا نتیجہ تھا کہ اب ان لوگوں کے لئے بھاگ کھڑے ہونے کے سِوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

حضرت حذیفہؓ کا دُشمن کے لشکر میں جانے اور خبر لانے کا واقعہ

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو نعیم بن مسعودؓ اور احزاب کے درمیان پھوٹ کے واقعات کی خبر ملی تو ارادہ فرمایا کہ اپنا کوئی آدمی جاکر دشمن کے لشکر اور اُن کے ارادوں کا پتہ لائے مگر وہ سخت برفانی ہَوا جو دشمن پر بھیجی گئی تھی۔ بہرحال پُورے مدینہ پر حاوی ہوئی اور مسلمان بھی اس سخت سردی کے سبب سمٹے بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کون ہے جو کھڑا ہو اور دشمن کے لشکر میں جاکر ان کی خبر لائے اور اللہ تعالےٰ اُس کو جنّت میں داخل فرمائے۔ جاں نثار صحابہ کا مجمع تھا، مگر حالات نے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ کوئی کھڑا نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے اور کچھ دیر نماز میں مشغول رہنے کے بعد پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ "ہے کوئی شخص جو دشمن کے لشکر کی مجھے خبر لا دے اور اس کے عوض میں جنت حاصل کرے" اس مرتبہ بھی پورے مجمع میں سناٹا رہا، کوئی نہیں اُٹھا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پھر نماز میں مشغول ہو گئے اور کچھ دیر کے بعد پھر تیسری مرتبہ وہی خطاب فرمایا کہ جو ایسا کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔ مگر پوری قوم دن بھر کے سخت تکان اور کئی وقت کے فاقہ سے اور بھوک سے اور اُوپر سے سردی کی شدت

سے ایسی بے بس ہو رہی تھی کہ پھر بھی کوئی نہ اُٹھا۔

حضرت حذیفہ بن یمان راوی حدیث فرماتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے میرا نام لے کر فرمایا کہ تم جاؤ۔ حالت میری بھی سب جیسی تھی مگر نام لے کر حکم دینے پر اطاعت کے سوا چارہ نہ تھا، مَیں کھڑا ہو گیا اور سردی سے میرا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ آپؐ نے اپنا دستِ مبارک میرا سر اور چہرے پر پھیرا اور فرمایا کہ دشمن کے لشکر میں جاؤ اور مجھے صرف خبر لاکر دو اور میرے پاس واپس آنے سے پہلے کوئی کام نہ کرو۔ پھر آپؐ نے میری حفاظت کے لئے دُعا فرمائی۔

مَیں نے اپنی تیر کمان اُٹھائی اور اپنے کپڑے اپنے اُوپر باندھ لئے اور ان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب یہاں سے روانہ ہُوا تو عجیب ماجرا دیکھا کہ خیمے کے اندر بیٹھے ہُوئے جو سردی سے کپکپی طاری تھی وہ ختم ہو گئی اور مَیں اس طرح اُچھل رہا تھا جیسے کوئی گرم حمام کے اندر ہو۔ یہاں تک کہ مَیں اُن کے لشکر میں پہنچ گیا۔ مَیں نے دیکھا کہ ہَوا کے طوفان نے اُن کے خیمے اُکھاڑ دیئے تھے اور ہانڈیاں اُلٹ دی تھیں۔ ابوسفیان آگ کے پاس بیٹھ کر سینک رہے تھے۔ مَیں نے یہ دیکھ کر اپنا تیر کمان مستحکم کیا اور ابوسفیان پر تیر پھینکنے ہی والا تھا کہ مجھے حضورؐ کا یہ فرمان یاد آ گیا کہ کچھ کام وہاں سے واپس آنے تک نہ کرنا۔ ابوسفیان بالکل میری زد میں تھے مگر اس فرمان کی بناء پر مَیں نے اپنا تیر الگ کر لیا۔

ابوسفیان حالات سے پریشان ہو کر واپسی کا اعلان کرنا چاہتے تھے مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ قوم کے ذمّہ داروں سے بات کریں۔ رات کی تاریکی میں اور سناٹے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی جاسوس موجود ہو اور اُن کی بات سُن لے۔ اس لئے ابوسفیان نے یہ ہوشیاری کی کہ بات کرنے سے پہلے سارے مجمع کو کہا کہ ہر شخص اپنے برابر والے آدمی کو پہچان لے تاکہ کوئی غیر آدمی ہماری بات نہ سُن سکے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اب مجھے خطرہ ہُوا کہ میرے برابر کا آدمی جب مجھ سے پُوچھے گا کہ تُو کون ہے؟ تو میرا راز کُھل جائے گا۔ اُنھوں نے بڑی ہوشیاری اور دلیری سے خود مسابقت کر کے اپنے برابر والے آدمی کے ہاتھ پر ہاتھ

مار کر پُوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا تعجب ہے تم مجھے نہیں جانتے۔ میں فلاں ابن فلاں ہوں۔ وہ قبیلہ ہوازن کا آدمی تھا۔ اس طرح اللہ تعالےٰ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو گرفتاری سے بچا دیا۔

ابوسفیان نے جب یہ اطمینان کر لیا کہ مجمع اپنا ہی ہے کوئی غیر نہیں تو اُس نے اپنے پریشان کُن حالات اور بنو قریظہ کی بدعہدی اور سامانِ جنگ ختم ہو جانے کے واقعات سُنا کر کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اب آپ سب واپس چلیں اور میں بھی واپس جا رہا ہوں۔ اسی وقت لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور سب واپس جانے لگے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یہاں سے واپس چلا تو ایسا محسوس ہُوا کہ میرے گرد کوئی گرم حمام ہے جو مجھے سردی سے بچا رہی ہے۔ واپس میں پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو نماز میں مشغول پایا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے سارے واقعہ کی خبر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اس خبرِ مسرّت سے خوش ہو کر ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ رات کی تاریکی میں آپؐ کے دندان مبارک چمکنے لگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے مجھے اپنے قدموں میں جگہ دی اور جو چادر آپؐ اوڑھے ہُوئے تھے اس کا ایک حصّہ مجھ پر ڈال دیا۔ یہاں تک کہ میں سو گیا۔ جب صُبح ہو گئی تو آپؐ نے ہی یہ کہہ کر مجھے بیدار فرمایا کہ قُمْ یَا نَوْمَانُ کھڑا ہو جا اے بہت سونے والے۔

آئندہ کفّار کے حوصلے پست ہو جانے کی خوشخبری

صحیح بخاری میں حضرت سلیمان بن صرد کی روایت ہے کہ احزاب کے واپس جانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا "یعنی اب وہ ہم پر حملہ آور نہ ہوں گے بلکہ ہم اُن پر حملہ کریں گے اور اُن کے ملک پر چڑھائی کریں گے (مظہری)۔

یہ ارشاد فرماتے ہیں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام رضؓ شہر مدینہ میں واپس آ گئے اور ایک مہینہ بعد مسلمانوں نے اپنے ہتھیار کھولے۔

تنبیہ

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واقعہ صحیح مسلم میں ہے اور یہ مستقلاً ایک درسِ عبرت ہے جو بہت سی ہدایات اور معجزات رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر مشتمل ہے۔ غور کرنے والے خود معلوم کرلیں گے۔ تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(معارف القرآن ج ۷ ص ۱۱۰ تا ص ۱۱۲)

غزوۂ بنو قریظہ

ابھی آپ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ مدینہ میں واپس پہنچے ہی تھے کہ اچانک جبرائیل امین علیہ السلام حضرت دحیہ کلبی صحابیؓ کی صورت میں تشریف لائے اور فرمایا کہ اگرچہ آپ لوگوں نے ہتھیار کھول دیئے ہیں مگر فرشتوں نے اپنے ہتھیار نہیں کھولے۔ اللہ تعالےٰ کا آپ کو یہ حکم ہے کہ آپ بنو قریظہ پر حملہ کریں اور میں آپ سے آگے وہیں جا رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے مدینہ میں اعلان کرنے کے لئے ایک منادی بھیج دیا جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا یہ حکم لوگوں کو سنایا اور پہنچایا کہ "کوئی آدمی عصر کی نماز نہ پڑھے جب تک بنو قریظہ میں نہ پہنچ جائے۔ صحابہ کرامؓ سب کے سب اس دوسرے جہاد کے لئے فوراً تیار ہو کر بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کا وقت آیا تو بعض حضرات نے حکمِ نبویؐ کے ظاہر کے موافق راستہ میں نمازِ عصر ادا نہیں کی بلکہ منزل مقرر بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا مقصد عصر کے وقت میں بنو قریظہ پہنچ جانا ہے۔ ہم اگر نماز راستہ میں پڑھ کر عصر کے وقت میں وہاں پہنچ جائیں تو یہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ارشاد کے منافی نہیں۔ انہوں نے نمازِ عصر اپنے وقت پر راستہ میں ادا کر لی۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو صحابہ کرامؓ کے اس اختلافِ عمل کی خبر دی گئی تو آپؐ نے دونوں فریق میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی۔

بنو قریظہ سے جہاد کے لئے نکلنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے جھنڈا حضرت علی المرتضٰے رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سپرد فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کے آنے کی خبر سن کر بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے اور اسلامی لشکر نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

بنو قریظہ کے رئیس کعب کی تقریر

بنو قریظہ کے سردار کعب جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا عہد توڑ کر احزاب کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، اس نے اپنی قوم کو جمع کر کے حالات کی نزاکت بیان کرتے ہوئے تین صورتیں عمل کی پیش کیں :

اوّل یہ کہ تم سب کے سب اسلام قبول کرو اور محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے تابع ہو جاؤ۔ کیونکہ مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب لوگ جانتے ہو کہ وہ حق پر ہیں اور تمہاری کتاب تورات میں ان کی پیشین گوئی موجود ہے جو تم پڑھتے ہو۔ اگر تم نے ایسا کرلیا تو دُنیا میں اپنی جان و مال اور اولاد کو محفوظ کر لوگے اور تمہاری آخرت بھی درست ہو جائے گی ۔

دوسری صُورت یہ ہے کہ تم اپنی اولاد اور عورتوں کو پہلے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کردو اور اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرو ، یہاں تک کہ تم بھی سب کے سب مقتول ہو جاؤ ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ یوم السبت (ہفتہ کے دن) تم مُسلمانوں پر یکبارگی حملہ کردو۔ کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں یوم السبت میں قتال حرام ہے اس لئے وہ ہماری طرف سے اس دن میں بے فکر ہوں گے۔ ہم ناگہانی طور پر حملہ کریں تو ممکن ہے کامیاب ہو جائیں ۔

کعب رئیسِ قوم کی یہ تقریر سُن کر قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ پہلی بات یعنی مُسلمان ہو جانا یہ تو ہم ہرگز قبول نہ کریں گے۔ کیونکہ ہم تورات کو چھوڑ کر اور کسی کتاب کو نہ مانیں گے۔ رہی دوسری بات تو عورتوں بچّوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم اُن کو قتل کردیں۔ باقی تیسری بات خود حکم تورات اور ہمارے مذہب کے خلاف ہے یہ بھی ہم نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد سب نے اس پر اتفاق کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور آپؐ اُن کے بارے میں جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی ہو جائیں ۔

انصاری صحابہ کرامؓ میں جو لوگ قبیلہ اوس سے متعلق تھے ان کے اور بنو قریظہ کے درمیان قدیم زمانے میں معاہدہ رہا تھا تو اوسی صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ان لوگوں کو ہمارے حوالے کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ میں ان کا معاملہ تمہارے ہی ایک سردار کے سپرد کروں۔ یہ لوگ اس پر راضی ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تمہارے سردار سعد بن معاذؓ ہیں۔ اس کا فیصلہ میں اُن کے سپرد کرتا ہوں۔ اس پر سب لوگ راضی ہوگئے۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو واقعہ خندق میں تیر کا زخم پہنچا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُن کی تیمارداری کے لئے مسجدِ نبویؐ کے احاطہ میں ایک خیمہ لگوا کر اس میں ٹھہرا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق بنو قریظہ کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں سے جو جنگ کرنے والے جوان ہیں وہ قتل کر دیئے جائیں اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ جنگی قیدیوں کا معاملہ کیا جائے جو اسلام میں معروف ہے یہی فیصلہ نافذ کر دیا گیا اور اس فیصلہ کے فوراً بعد ہی حضرت سعد بن معاذؓ کے زخم سے خون بہہ پڑا۔ اسی میں اُن کی وفات ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کی دونوں دُعائیں قبول فرمائیں۔ ایک یہ کہ آئندہ قریش کا رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر کوئی حملہ نہ ہوگا۔ دوسرے بنو قریظہ کی غداری کی سزا ان کو مل جائے وہ اللہ تعالےٰ نے ان ہی کے ذریعہ دلوادی۔

جن کو قتل کرنا تجویز ہُوا تھا اُن میں سے بعض مُسلمان ہو جانے کی وجہ سے آزاد کر دیئے گئے۔ عطیہ قرظی جو صحابہ کرامؓ میں معروف ہیں۔ انہی لوگوں میں سے ہیں، انہی لوگوں میں زبیر بن باطا بھی تھے۔ ان کو حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ تعالےٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے درخواست کر کے آزاد کرایا جس کا سبب یہ تھا کہ زبیر بن باطا نے ان پر زمانۂ جاہلیت میں ایک احسان کیا تھا وہ یہ کہ جاہلیت کے زمانہ کی جنگ بعاث میں ثابت بن قیس ہو کر ہو کر زبیر بن باطا کے قبضہ میں آگئے تھے۔ زبیر بن باطا نے ان کے سر کے بال کاٹ کر اُن کو آزاد کر دیا قتل نہیں کیا تھا۔

احسان کے بدلے اور غیرتِ قومی کے دو عجیب نمونے

حضرت ثابت قیس زبیر بن باطا کی رہائی کا حکم حاصل کر کے اُن کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تمہارے اس احسان کا بدلہ کر دوں جو تم نے جنگ بعاث میں مجھ پر کیا تھا۔ زبیر بن باطا نے کہا کہ بے شک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرتا ہے۔ مگر یہ بتلاؤ کہ وہ آدمی زندہ رہ کر کیا کرے گا جس کے اہل و عیال نہ رہے ہوں۔ یہ سُن کر ثابت بن قیسؓ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا کہ ان کے اہل و عیال کی بھی جان بخشی کر دی جائے، آپؐ نے قبول فرمالیا۔ زبیر بن باطا کو اس کی اطلاع دی تو یہ ایک قدم اور آگے بڑھے کہ ثابت یہ تو بتلاؤ کہ کوئی انسان صاحبِ عیال کیسے زندہ رہے گا؟ جب کوئی اس کے پاس مال نہ ہو۔ ثابت بن قیسؓ پھر حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور ان کا مال بھی ان کو دلوا دیا۔ یہاں تک تو ایک مومن کی شرافت اور احسان شناسی کا قضیہ تھا جو حضرت ثابت بن قیسؓ کی طرف سے ہُوا۔

اب دُوسرا رُخ سنیئے کہ زبیر بن باطا کو جب اپنے اور اپنے اہل و عیال کی آزادی اور اپنے مال و متاع سب واپس مل جانے کا اطمینان ہو چکا تو اُس نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے قبائل یہود کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ ابن ابی الحقیق کا کیا ہُوا جس کا چہرہ چینی آئینہ جیسا تھا۔ انہوں نے بتلایا کہ وہ تو قتل کر دیا گیا۔ پھر پوچھا کہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن قریظہ اور عمرو بن قریظہ کا کیا انجام ہُوا؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ دونوں بھی قتل کر دیئے گئے پھر دو جماعتوں کے متعلق سوال کیا۔ اس کے جواب میں ان کو خبر دی گئی کہ وہ سب قتل کر دیئے گئے۔

یہ سُن کر زبیر بن باطا نے حضرت ثابت بن قیسؓ سے کہا کہ آپ نے اپنے احسان کا بدلہ پورا کر دیا اور اپنی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا، مگر میں اب اپنی زمین جائداد کو ان لوگوں کے بعد آباد نہیں کروں گا۔ مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل کر دو۔ ثابت بن قیسؓ نے

اس کو قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اس کے اصرار پر کسی دوسرے مسلمان نے اس کو قتل کر دیا۔ (قرطبی)

یہ ایک کافر کی غیرتِ قومی تھی جس نے سب کچھ ملنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے بغیر زندہ رہنا پسند نہ کیا۔ ایک مومن، ایک کافر کے یہ دونوں عمل ایک تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنو قریظہ کی یہ فتح ہجرت کے پانچویں سال میں ماہ ذی قعدہ کے آخر اور ذی الحجہ کے شروع میں ہوئی ہے۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ج ۷ ص ۱۱۶ تا ص ۱۲۰)

۶ھ

صُلح حدیبیہ، بیعتِ رضوان، سلاطینِ دُنیا کو دعوتِ اسلام

شروع ذیقعدہ ۶ھ میں نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ فرمایا اور عمرہ کا احرام باندھا۔ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت جس کی تعداد چودہ پندرہ سو بیان کی جاتی ہے۔ آپؐ کے ساتھ ہوئی۔ (سیرت مغلطائی)

حدیبیہ، مکہ معظمہ سے منزل کے فاصلے پر ایک کنواں ہے اور اسی کے نام سے گاؤں کا نام بھی حدیبیہ مشہور ہے۔ آپؐ نے وہاں پہنچ کر قیام فرمایا۔

آپؐ کا معجزہ

ایک کنواں بالکل خشک تھا۔ آپؐ کے اعجاز سے اس کنوئیں میں اتنا پانی آگیا کہ سب سیراب ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر آپؐ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو مکہ بھیجا کہ قریش کو مطلع کر دیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس وقت محض زیارت بیت اللہ کے اور عمرہ کے لئے تشریف لائے ہیں اور کوئی سیاسی غرض نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ مکہ پہنچے تو کفار نے ان کو روک لیا۔ ادھر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جہاد پر بیعت لی جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور جس کو بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی بلکہ قریش نے سہیل بن عمرو کو شرائط صُلح کرنے کے لئے بھیجا، حسبِ ذیل شرائط طے ہو کر عہد نامہ لکھا گیا اور دس سال کے لئے باہمی صُلح ہو گئی۔

(۱) مسلمان اس وقت واپس جائیں۔

(۲) آئندہ سال صرف تین دن قیام کر کے واپس جائیں۔

(۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں۔ تلوار ساتھ ہو تو نیام میں رکھیں۔

(۴) مکہ سے کسی مسلمان کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔

(۵) اگر کوئی مسلمان مکہ میں رہنا چاہے تو اسے منع نہ کریں۔

(۶) اگر کوئی شخص مکہ سے مدینہ چلا جائے تو اُسے واپس کر دیں۔

(۷) اگر مدینہ سے کوئی آ جائے تو کفار اُسے واپس نہ کریں۔

یہ تمام شرائط اگرچہ مسلمانوں کے خلاف تھیں اور یہ صلح بظاہر مغلوبانہ تھی لیکن خدا تعالیٰ نے اس کا نام فتح رکھا اور اسی سفر میں سورہ فتح نازل ہوئی۔ صحابہؓ کو اس طرح دب کر صلح کرنا ناگوار تھا۔ حضرت عمرؓ نے تو باصرار آپؐ کی خدمت میں عرض بھی کیا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ مجھے خدا تعالیٰ کا یہی حکم ہے اور اسی میں ہمارے مستقبل کی تمام فلاح مضمر ہے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے اس معمہ کو حل کر دیا۔ کیونکہ اس صلح کی بدولت اطمینان کے ساتھ مکہ اور مدینہ کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ کفار آپؐ کی خدمت میں اور مسلمانوں کے پاس آنے جانے لگے۔

ادھر اسلامی اخلاق کی مقناطیسی کشش نے ان کو کھینچنا شروع کیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس عرصے میں اس قدر کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے کہ اتنے کبھی نہیں ہوئے تھے اور درحقیقت یہ صلح فتح مکہ کا پیش خیمہ تھی۔ (سیرت ص۱۲۴، ص۱۲۵)

واقعۂ حدیبیہ

حدیبیہ ایک مقام مکہ مکرمہ سے باہر حدودِ حرم کے بالکل قریب ہے جس کو آج کل شمیسہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس مقام پر پیش آیا ہے۔

جزو اوّل: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

اس واقعہ کا ایک جزو بروایت عبد بن حمید و ابن جریر و بیہقی وغیرہ یہ ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہ خواب دیکھا کہ آپؐ مکہ مکرمہ میں مع صحابہ کرامؓ کے امن و اطمینان کے ساتھ داخل ہوئے اور احرام سے فارغ ہو کر کچھ لوگوں نے حسبِ قاعدہ سر کا حلق کرایا۔ بعض نے بال کٹوا لیئے اور یہ کہ آپؐ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کی چابی آپؐ کے ہاتھ میں آئی۔ یہ اس واقعہ کا جزو ہے (کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے) مگر خواب میں اس واقعہ کے لئے کوئی سال یا مہینہ متعین نہیں کیا گیا اور درحقیقت یہ خواب فتح مکہ کے وقت پورا ہونے والا تھا، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو خواب سنایا اور وہ سب کے سب مکہ مکرمہ جانے اور بیت اللہ کا طواف کرنے وغیرہ کے ایسے مشتاق تھے کہ ان حضرات نے فوراً تیاری شروع کر دی اور جب صحابہ کرامؓ کا ایک مجمع تیار ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بھی ارادہ فرمایا کہ کیونکہ خواب میں کوئی خاص خاص سال یا مہینہ متعین نہیں تھا، تو احتمال یہ بھی تھا کہ ابھی یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ (کذا فی بیان القرآن بحوالہ روح المعانی)

جزو دوم، آپؐ کا صحابہ کرام اور دیہات کے مسلمانوں کو بلانا

ابن سعد وغیرہ کی روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو آپؐ کو یہ خطرہ سامنے تھا کہ قریشِ مکہ ممکن ہے کہ ہمیں عمرہ کرنے سے روکیں اور ممکن ہے کہ مدافعت کے لئے جنگ کی صورت پیش آ جائے۔ اس لئے آپؐ مدینہ طیبہ کے قریبی دیہات میں اعلان کر کے ان لوگوں کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ان میں سے بہت سے اعراب (دیہات) نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحابؓ ہمیں قریشِ مکہ سے لڑوانا چاہتے ہیں جو ساز و سامان والے اور طاقتور ہیں ان کا انجام تو یہ ہونا ہے کہ یہ اس سفر سے واپس زندہ نہ لوٹیں گے۔ (مظہری)

جزو سوم، مکہ کی طرف روانگی

امام احمد و بخاری، ابوداؤد و نسائی وغیرہ کی روایت کے مطابق روانگی سے پہلے حضرت

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے غسل فرمایا اور نیا لباس زیب تن فرمایا اور اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار ہوئے۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کو ساتھ لیا اور آپؐ کے ساتھ مہاجرین و انصار اور دیہات کے آنے والوں کا بڑا مجمع تھا جن کی تعداد اکثر روایات میں چودہ سو بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خواب کی وجہ سے ان میں کسی کو شک نہیں تھا کہ مکہ اسی وقت فتح ہو جائے گا۔ حالانکہ بجز تلواروں کے اُن کے ساتھ اور کچھ اسلحہ نہ تھے۔ آپؐ مع صحابہ کرامؓ کے شروع ماہ ذی قعدہ میں پیر کے دن روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ میں پہنچ کر احرام باندھا۔ (مظہری ملخصاً)

جزو چہارم، اہل مکہ کی مقابلے کے لئے تیاری

دوسری طرف جب اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ایک بڑی جماعت صحابہؓ کے ساتھ مکہ کے لئے روانہ ہونے کی خبر ملی تو جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لئے آ رہے ہیں۔ اگر ہم نے اُن کو مکہ میں آنے دیا تو تمام عرب میں یہ شہرت ہو جائے گی کہ وہ ہم پر غلبہ پا کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ حالانکہ ہمارے اور اُن کے درمیان کئی جنگیں ہو چکی ہیں۔ سب نے عہد کیا کہ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے اور آپؐ کو روکنے کے لئے خالد بن ولید (جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک جماعت کو مکہ سے باہر مقام کراع العمیم میں بھیج دیا اور آس پاس کے دیہات والوں کو بھی ساتھ ملا لیا اور طائف کا قبیلہ بنو ثقیف بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ انہوں نے مقام بلدح پر اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ ان سب نے آپس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے اور آپؐ کے مقابلہ میں جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

خبر رسانی کا ایک عجیب سادہ طریقہ

ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ مقام بلدح سے لے کر اس مقام تک جہاں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

پہنچ چکے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کچھ آدمی بٹھا دیئے تا کہ آپؐ کے پورے حالات دیکھ کر آپ کے متصل پہاڑ والا بہ آواز بلند دوسرے پہاڑ والے تک وہ تیسرے تک اور وہ چوتھے تک پہنچا دے۔ اس طرح چند منٹوں میں آپؐ کی نقل و حرکت کا بلدح والوں کو علم ہو جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خبر رساں

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بشر ابن سفیان کو آگے مکہ مکرمہ بھیج دیا تھا کہ وہ خفیہ طور پر اہلِ مکہ کے حالات جا کر دیکھیں اور آپؐ کو اطلاع کریں۔ وہ مکہ سے واپس آئے تو اہلِ مکہ کی ان جنگی تیاریوں اور مکمل مزاحمت کے واقعات کی خبر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افسوس ہے قریش پر کہ متعدد جنگوں نے ان کو کھا لیا ہے۔ پھر بھی وہ جنگ سے باز نہیں آتے۔ ان کے لئے تو اچھا موقع تھا کہ وہ مجھے اور دوسرے اہلِ عرب کو آزاد چھوڑ دیتے۔ اگر یہ عرب لوگ مجھ پر غالب آجاتے تو ان کی مراد گھر بیٹھے حاصل تھی اور میں اُن پر غالب آجاتا۔ تو یا تو پھر وہ بھی اسلام میں داخل ہو جاتے اور اگر یہ نہ کرتے اور جنگ ہی کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ تازہ اور قوی ہوتے اور پھر وہ میرے مقابلہ پر آجاتے۔ معلوم نہیں کہ یہ قریش کیا سمجھ رہے ہیں۔ قسم ہے اللہ تعالےٰ کی کہ میں اس حکم پر جو اللہ تعالےٰ نے مجھے دے کر بھیجا ہے ہمیشہ اُن کے خلاف جہاد کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ تنہا میری گردن ہی کیوں نہ رہ جائے۔

جزو پنجم، آنحضرتؐ کی ناقہ کا راستہ میں بیٹھ جانا

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ اب ہمیں یہیں سے ان عربوں کے خلاف جہاد شروع کر دینا چاہیئے یا ہم بیت اللہ کی طرف بڑھیں، پھر جو ہمیں روکے اس سے قتال کریں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے مشورہ دیا کہ آپؐ بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں کسی سے جنگ کے لئے نہیں نکلے۔ اس لئے آپؐ اپنے قصد پر رہیں۔ ہاں اگر کوئی ہمیں مکہ سے روکے گا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔

اس کے بعد حضرت مقداد بن اسودؓ اُٹھے اور عرض کیا کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں کہ آپؐ سے یہ کہہ دیں اِذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلاَ۔ یعنی جائیے آپؐ اور آپ کا رب لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ ہم تو ہر حال میں آپ کے ساتھ قتال کریں گے۔

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یہ سُن کر فرمایا۔ اب بس اللہ کے نام پر مکّہ کی طرف چلو، جب آپؐ مکّہ مکرمہ کے قریب پہنچے اور خالد بن ولید اور اُن کے ساتھیوں نے آپ کو مکّہ مکرمہ کی طرف بڑھتے ہُوئے دیکھا تو اپنے لشکر کی صفوف جانب قبلہ کی طرف مستحکم کر کے کھڑا کر دیا۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے عباد بن بشر کو ایک دستہ فوج کا امیر بنا کر آگے کیا۔ اُنھوں نے خالد بن ولید کے لشکر کے بالمقابل صفوف بنالیں۔ اسی حالت میں نماز ظہر کا وقت آگیا۔ حضرت بلالؓ نے اذان کہی اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے تمام صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی۔ خالد بن ولید نے کہا کہ ہم نے بڑا اچھا موقع ضائع کر دیا۔ جب یہ سب لوگ نماز میں تھے، اس وقت ہم ان پر ٹوٹ پڑتے مگر کچھ بات نہیں۔ اب ان کی دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے اس کا انتظار کرو۔ مگر جبرائیل علیہ السلام صلوٰۃ الخوف کے احکام لے کر نازل ہو گئے اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو اُن کو ارادوں سے باخبر کر کے نماز کے وقت لشکر کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا طریقہ بتلا دیا اور اُن کے شر سے محفوظ رہے۔

جزو ششم، مقامِ حدیبیہ میں ایک مُعجزہ

جب رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم حدیبیہ کے قریب پہنچے تو آپؐ کی اونٹنی کا پاؤں پھسل گیا، وہ بیٹھ گئی۔ صحابہ کرامؓ نے اُٹھانا چاہا تو نہ اُٹھی۔ لوگوں نے کہا کہ قصویٰ بگڑ گئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ قصویٰ کا قصور نہیں، نہ اُس کی ایسی عادت ہے بلکہ اس کو تو اس ذات نے روک دیا ہے جس نے اصحاب فیل کو روک دیا تھا۔ (غالباً اس وقت رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جو واقعہ خواب میں دکھلایا گیا ہے اس کا یہ وقت نہیں ہے) آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمّد کی جان ہے، آج

کے دن قریش مجھ سے جو بات بھی ایسی کہیں گے جس میں شعائر اللیہ کی تعظیم ہو تو میں اُس کو ضرور مان لوں گا۔ پھر آپؐ نے اُونٹنی پر ایک آواز لگائی تو وہ اُٹھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے خالد بن ولید کی جانب سے ہٹ کر حدیبیہ کی دُوسری جانب قیام فرمایا جہاں پانی بہت ہی کم تھا۔ پانی کے مواقع پر خالد بن ولید اور بلاح والے قابض ہو چکے تھے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم کا یہ معجزہ ظاہر ہُوا کہ ایک کنواں جس میں پانی کچھ کچھ رِستا تھا۔ اس میں آپؐ نے کُلّی کر دی اور اپنا ایک تیر دیا کہ اس کے اندر گاڑ دو۔ یہ عمل ہوتے ہی اُس کا پانی جوش مار کر کنوئیں کی من کے قریب پہنچ گیا۔ کنوئیں کے اُوپر والوں نے اپنے برتنوں سے پانی نکالا اور سیراب ہو گئے۔

جزو ہفتم، اہلِ مکّہ کے ساتھ بواسطہ وفود بات چیت

اس طرح سب صحابہ مطمئن ہو کر یہاں مقیم ہوُئے اور اہلِ مکّہ سے بواسطہ وفود بات چیت شروع ہوئی پہلے بدیل بن ورقا، (جو بعد میں مسلمان ہو گئے) اپنے ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہُوئے اور آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم سے خیر خواہانہ عرض کیا کہ قریشِ مکّہ پوری قوت کے ساتھ نکل آئے ہیں اور پانی کی جگھوں پر انھوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ہرگز آپ کو نہ چھوڑیں گے کہ آپؐ مکّہ میں داخل ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں آئے البتّہ اگر کوئی ہمیں عمرہ کرنے سے روکے گا تو ہم قتال کریں گے۔ پھر آپؐ نے اسی بات کا اعادہ فرمایا جو پہلے جاسوس بشر کے سامنے کہی تھی کہ قریش کو متعدد جنگوں نے کمزور کر دیا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو کسی معین مُدت تک کے لئے ہم سے صُلح کر لیں تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنی تیاری میں لگ جائیں اور ہمیں اور باقی عرب کو چھوڑ دیں۔ اگر وہ مجھ پر غالب آ گئے تو اُن کی مراد گھر بیٹھے پُوری ہو جائے گی اور اگر ہم غالب آ گئے اور وہ اسلام میں داخل ہونے لگے تو اُن کو اختیار ہو گا کہ وہ بھی اسلام میں داخل ہو جائیں یا ہمارے خلاف جنگ کریں اور اس عرصہ میں وہ اپنی قوت محفوظ رکھ کر بڑھا چکے ہوں گے اور اگر قریش اس بات سے انکار کریں تو بخدا ہم اپنے معاملے پر ان سے جہاد کرتے رہیں گے جب تک کہ میری

تنہا گردن باقی ہے۔ بُدَیل یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ میں جا کر قریشی سرداروں سے آپؐ کی بات کہہ دیتا ہوں۔ وہاں پہنچے تو کچھ لوگوں نے اُن کی بات ہی سُننا نہ چاہی بلکہ جنگ کے جوش میں رہے۔ پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ بات تو سُن لیں۔ یہ کہنے والے عروہ ابن مسعود اپنی قوم کے سردار تھے۔ جب بات سُنی تو عروہ بن مسعود نے قریشی سرداروں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو بات پیش کی ہے وہ درست ہے اس کو قبول کر لو اور مجھے اجازت دو کہ میں جا کر اُن سے بات کروں۔ چنانچہ دوسری مرتبہ عروہ بن مسعودؓ گفتگو کے لئے حاضر ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر آپ اپنی قوم قریش کا صفایا ہی کر دیں تو یہ کون سی اچھی بات ہو گی۔ کبھی دُنیا میں آپ نے سُنا ہے کہ کوئی شخص اپنی ہی قوم کو ہلاک کر دے۔ پھر صحابہ کرامؓ سے ان کی نرم و گرم باتیں ہوتی رہیں۔ اسی حال میں عروہ صحابہ کرامؓ کے حالات کا مشاہدہ کرتے رہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے تھوکا بھی تو صحابہ کرامؓ نے اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے چہروں سے مَل لیا اور جب آپؐ نے وضو کیا تو وضو کے گرنے والے پانی پر صحابہؓ ٹوٹ پڑتے اور اپنے چہروں کو مَلتے تھے اور جب آپؐ گفتگو فرماتے تو سب اپنی آوازیں پست کر لیتے۔ عروہ نے واپس جا کر قریشی سرداروں سے یہ حال بیان کیا کہ میں بڑے بڑے شاہی درباروں، قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے پاس جا چکا ہوں۔ خدا کی قسم! میں نے کوئی بادشاہ ایسا نہیں دیکھا جس کی قوم اس پر اس طرح فدا ہو جیسے اصحاب محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) ان پر فدا ہیں اور وہ ایک صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ان کی بات مان لو۔ مگر لوگوں نے کہا کہ یہ بات نہیں مان سکتے۔ بجز اس کے کہ اس سال تو آپؐ لوٹ جائیں پھر اگلے سال آ جائیں۔ جب عروہ کی بات نہ مانی گئی تو وہ اپنی جماعت کو ساتھ لے کر واپس ہو گئے۔

اس کے بعد ایک صاحب حلیس بن علقمہ جو اعراب کے سردار تھے وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحابہ کرامؓ کو احرام کی حالت میں قربانی کے جانور ساتھ لئے دیکھا تو واپس ہو کر اُس نے بھی اپنی قوم کو سمجھایا کہ یہ لوگ بیت اللہ کے عمرہ کے لئے آئے ہیں ان کو روکنا کسی طرح درست نہیں۔ لوگوں نے اس کا کہنا نہ سُنا تو یہ بھی اپنی جماعت کو لے کر واپس ہو گیا

پھر ایک چوتھا آدمی آپؐ سے بات کرنے کے لئے آیا اور آپؐ سے گفتگو کی تو آپؐ نے اپنی وہی بات پیش کر دی جو اس سے پہلے بدیل اور عروہ بن مسعود کے سامنے پیش کی تھی۔ اس نے جاکر آپؐ کا جواب قریش کو سُنا دیا۔

جزو ہشتم، حضرت عثمانؓ کو اہلِ مکّہ کے لئے بھیجنا

امام بیہقیؒ نے حضرت عروہ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے حدیبیہ میں پہنچ کر قیام فرمایا تو قریش گھبرا گئے اور آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ارادہ کیا کہ ان کے پاس کوئی آدمی بھیج کر بتلادیں کہ ہم جنگ کرنے نہیں عمرہ کرنے آئے ہیں، ہمارا راستہ نہ روکو۔ اس کام کے لئے حضرت عمرؓ کو بُلایا۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ یہ قریش میرے سخت دشمن ہیں۔ کیونکہ ان کو میری عداوت وشدت کا حال معلوم ہے اور میرے قبیلہ کا کوئی آدمی ایسا مکّہ میں نہیں جو میری حمایت کرے۔ اس لئے میں آپؐ کے سامنے ایک ایسے شخص کا نام پیش کرتا ہوں جو مکّہ مکرمہ میں اپنے قبیلہ وغیرہ کی وجہ سے خاص قوت و عزت رکھتے ہیں۔ یعنی عثمان بن عفان رضی اللہ تعالےٰ عنہ، آپؐ نے حضرت عثمان رضؓ کو اس کام کے لئے مامور فرما کر بھیج دیا اور یہ بھی فرمایا کہ جو ضعفاء مسلمین مرد اور عورتیں مکّہ مکرمہ سے ہجرت نہیں کر سکے اور مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں اُن کے پاس جاکر تسلی کر دیں کہ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالےٰ مکّہ مکرمہ فتح ہوکر تمہاری مشکلات کے ختم ہونے کا وقت آگیا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ پہلے ان لوگوں کے پاس پہنچے جو مقام بلدح میں حضور صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا راستہ روکنے اور مقابلے کے لئے جمع ہوئے تھے ان سے جاکر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی وہی بات سُنادی جو آپؐ نے بدیل اور عروہ بن مسعودؓ کے سامنے کہی تھی۔ ان لوگوں نے کہا ہم نے پیغام سُن لیا، آپ جاکر اپنے بزرگ سے کہہ دو کہ یہ بات ہرگز نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کا جواب سُن کر آپؐ مکّہ مکرمہ کے اندر جانے لگے تو ابان بن سعید (جو بعد میں مُسلمان ہو گئے تھے) ان سے مُلاقات ہوئی

انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالٰے عنہ کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی پناہ میں لے کر اُن سے کہا کہ مکہ میں اپنا پیغام لے کر جہاں چاہیں جا سکتے ہیں، اس میں آپ کوئی فکر نہ کریں۔ پھر اپنے گھوڑے پر حضرت عثمانؓ کو سوار کر کے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے کیونکہ اُن کا قبیلہ بنوسعید مکہ مکرمہ میں بہت قوی اور عزت دار تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ مکہ مکرمہ میں قریش کے ایک ایک سردار کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا کہ ہم کسی سے لڑنے کے لئے نہیں آئے، عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے۔ ہاں کوئی ہمارا راستہ روکے گا تو لڑیں گے اور قریش خود جنگوں سے نیم جان ہو چکے ہیں ان کے لئے مناسب یہ ہے کہ ہمیں اور دوسرے اہلِ عرب کو چھوڑ دیں۔ قریش ہمارے مقابلے پر نہ آئیں۔ پھر دیکھیں کہ اگر عرب ہم پر غالب آگئے تو ان کی مراد پوری ہو جائے گی اور ہم غالب آئے تو انہیں پھر بھی اختیار باقی ہوگا، اس وقت قتال کر سکتے ہیں اور اس عرصہ میں اُن کو اپنی طاقت بڑھانے اور محفوظ رکھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ مگر ان سب نے آپ کی بات کو رد کر دیا۔ پھر عثمان غنیؓ ضعفاء مسلمین سے ملے ان کو رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا، وہ بہت خوش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کو سلام بھیجا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالٰے عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغامات پہنچانے سے فارغ ہوئے تو اہلِ مکہ نے اُن سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو طواف کر سکتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالٰے عنہ نے فرمایا، میں اس وقت تک طواف نہیں کروں گا، جب تک رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم طواف نہ کریں۔ حضرت عثمان غنیؓ مکہ میں تین رات رہے اور رؤساء قریش کو رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی بات ماننے کی دعوت دیتے رہے۔

جزو نہم، اہلِ مکہ اور مسلمانوں میں آویزش

اسی عرصے میں قریش نے اپنے پچاس آدمی اس کام پر لگائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ کر انتظار کریں اور موقع ملنے پر (معاذ اللہ) آپؐ کا قصہ تمام کر دیں۔ یہ لوگ اسی تاک میں تھے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کی حفاظت و نگرانی پر مامور حضرت

محمد بن مسلمہ نے ان سب کو گرفتار کر لیا اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں قید کر کے حاضر کر دیا۔

دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ جو مکہ میں تھے اور اُن کے ساتھ تقریباً دس مسلمان اور مکہ معظمہ میں پہنچ گئے تھے، قریش نے جب اپنے پچاس آدمیوں کی گرفتاری کا حال سُنا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ سمیت ان سب مسلمانوں کو روک لیا اور قریش کی ایک جماعت مسلمانوں کے لشکر کی طرف نکلی اور مسلمانوں کی جماعت پر تیر اور پتھر پھینکے۔ اس میں مسلمانوں میں سے ایک صحابی ابن زنیم شہید ہو گئے اور مسلمانوں نے ان قریشیوں کے دس سواروں کو گرفتار کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کسی نے یہ خبر پہنچائی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے۔

جزو دہم، بیعتِ رضوان کا واقعہ

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے یہ خبر سُن کر صحابہ کرامؓ کو ایک درخت کے نیچے جمع کیا کہ سب جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کے لئے بیعت کریں۔ سب صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ احادیثِ صحیحہ میں ان لوگوں کی بڑی فضیلت آئی ہے جو اس بیعت میں شریک تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ چونکہ آپؐ کے حکم سے مکہ گئے ہوئے تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر فرمایا کہ یہ عثمانؓ کی بیعت ہے۔ یہ خصوصی فضیلت حضرت عثمانؓ کی تھی کہ آپؐ نے اپنے ہی ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر ان کی طرف سے بیعت کر لی۔

جزو یازدہم، حدیبیہ کا واقعہ

دوسری طرف اہلِ مکہ پر اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کا رُعب مسلط کر دیا اور خود مصالحت پر آمادہ ہو کر انہوں نے اپنے تین آدمی سہیل بن عمرو، حویطب بن عبد العزیٰ اور مکرز بن حفص کو عذر معذرت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ ان میں سے

پہلے دو حضرات بعد میں مسلمان بھی ہو گئے۔ سہیل بن عمرو نے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ تک جو خبر پہنچی ہے کہ عثمان غنیؓ اور اُن کے ساتھی قتل کر دیئے یہ بالکل غلط ہے، ہم اُن کو آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ ہمارے قیدیوں کو آزاد کر دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا۔ مسند احمد اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت ہے کہ سہیل اور اُن کے ساتھیوں نے جاکر بیعتِ رضوان میں صحابہ کرامؓ کی سعادت اور جاں نثاری کے عجیب و غریب منظر کا حال قریش کے سامنے بیان کیا تو قریش کے اصحاب رائے لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ ہم محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) سے اس بات پر صُلح کر لیں کہ وہ اس سال تو واپس چلے جائیں تاکہ پورے عرب میں یہ شہرت نہ ہو جائے کہ ہم نے ان کو روکنا چاہا مگر وہ زبردستی مکّہ میں داخل ہو گئے اور اگلے سال عمرہ کے لئے آجائیں اور تین روز مکّہ میں قیام کریں۔ اس وقت اپنے جانور قربانی کے ذبح کر ڈالیں اور احرام کھول دیں۔ چنانچہ یہی سہیل بن عمرو یہ پیغام لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کو دیکھتے ہی فرمایا کہ اب معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم نے صُلح کا ارادہ کر لیا ہے کہ سہیل کو پھر بھیج دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چہار زانو بیٹھ گئے اور صحابہ میں سے عباد بن بشر اور سلمہ ہتھیاروں سے مسلح آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس حفاظت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ سہیل حاضر ہوئے تو ادب کے ساتھ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گئے اور قریش کا پیغام آپؐ کو پہنچایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہ عموماً اس پر راضی نہ تھے کہ اس وقت احرام بغیر عمرہ کے کھول دیں۔ انھوں نے سہیل سے سخت گفتگو کی۔ آوازیں کبھی بلند ہو گئیں کبھی پست ہوئیں۔ عبادہ بن بشر نے سہیل کو ڈانٹا کہ حضورؐ کے سامنے آواز بلند نہ کر۔ طویل گفتگو کے بعد آپ اس شرط کو قبول کر کے صُلح کر لینے پر راضی ہو گئے۔ سہیل نے کہا کہ لائیے کہ ہم اپنے اور آپؐ کے درمیان صلح نامہ لکھ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلایا اور فرمایا لکھو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سہیل نے یہیں سے بحث شروع کر دی اور کہا کہ لفظ رحمٰن اور رحیم ہمارے محاورات

میں نہیں ہے۔ آپ یہاں وہی لفظ لکھیں جو پہلے لکھا کرتے تھے۔ یعنی باسمک اللّٰھم۔ آپ نے اس کو بھی مان لیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالٰے عنہ سے فرمایا ایسا ہی لکھ دو۔ اس کے بعد آپ نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ یہ لکھو کہ یہ وہ عہد نامہ ہے جس کو فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے کیا ہے۔ سہیل نے اس پر پھر ضد کی کہ اگر ہم آپؐ کو اللہ تعالٰے کا رسول مانتے تو آپؐ کو ہرگز بیت اللہ سے نہ روکتے۔ (صُلح نامہ میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہونا چاہیئے جو کسی فریق کے عقیدہ کے خلاف ہو) آپ صرف محمد بن عبداللہ لکھوائیں۔ حضرت علیؓ نے باوجود سراپا اطاعت ہونے کے عرض کیا میں تو یہ نہیں کر سکتا کہ آپ کے نام کو مٹا دوں۔ حاضرین میں سے حضرت اسید بن حضیر اور سعد بن عبادہؓ نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اس کو نہ مٹائیں اور بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے اور کچھ نہ لکھیں۔ اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ہمارے اور اُن کے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی اور کچھ آوازیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے صلح نامہ کا کاغذ خود اپنے دستِ مبارک میں لے لیا اور باوجود اس کے کہ آپ اُمّی تھے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا، مگر اس وقت خود اپنے قلم سے آپؐ نے یہ لکھ دیا ھٰذا ما قاضی محمد بن عبد اللہ وسھیل بن عمرو واصطلحا علیٰ وضع الحرب عن الناس عشر سنین یأمن فیہ الناس ویکف بعضھم عن بعض۔ یعنی یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو نے دس سال کے لئے باہم جنگ نہ کرنے کا کیا ہے جس میں سب لوگ مامون رہیں۔ ایک دوسرے پر چڑھائی اور جنگ سے بھی پرہیز کریں۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہماری ایک شرط یہ ہے کہ اس وقت ہمیں طواف کرنے سے نہ روکا جائے۔ سہیل نے کہا کہ بخدا یہ نہیں ہو سکتا۔ آپؐ نے اس کو بھی قبول فرما لیا۔ اس کے بعد سہیل نے اپنی ایک شرط یہ لکھی کہ جو شخص مکہ والوں میں سے اپنی ولی کی اجازت کے بغیر آپ کے پاس جائے گا اس کو آپؐ واپس کر دیں گے اگرچہ وہ آپؐ ہی کے دین پر ہو۔ اس پر عام مسلمانوں کی آواز اُٹھی۔ سبحان اللہ! یہ کیسے

ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے مسلمانوں بھائی کو مشرکین کی طرف لوٹا دیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی قبول فرما لیا اور یہ فرمایا کہ ہم میں سے کوئی آدمی اگر ان کے پاس گیا تو اس کو اللہ تعالےٰ ہی نے ہم سے دُور کر دیا اس کی ہم کیوں فکر کریں اور ان میں کا کوئی آدمی ہمارے پاس آیا اور ہم نے لوٹا بھی دیا تو اللہ تعالےٰ اس کے لئے سہولت کا راستہ نکال دیں گے۔ حضرت براء رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس صلح نامہ کا خلاصہ تین شرطیں بیان کیا ہے:

ایک یہ کہ ان کا کوئی آدمی ہمارے پاس آجائے گا تو ہم اس کو واپس کر دیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا کوئی آدمی اُن کے پاس چلا جائے گا تو وہ واپس نہ کریں گے۔ تیسرے یہ کہ اب آئندہ سال عمرہ کے لئے آئیں گے اور تین روز مکہ میں قیام کریں گے اور زیادہ ہتھیار لے کر نہیں آئیں گے۔ آخر میں لکھا گیا کہ یہ عہد نامہ اہلِ مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے درمیان ایک محفوظ دستاویز ہے جس کی کوئی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ اور باقی سب عرب آزاد ہیں جس کا جی چاہے محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے عہد میں داخل ہو جائے اور جس کا جی چاہے قریش کے عہد میں داخل ہو جائے۔ یہ سُن کر قبیلہ خزاعہ اچھل پڑا اور کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) کے عقد میں داخل ہیں اور بنو بکر نے آگے بڑھ کر کہا کہ ہم قریش کے عقد و عہد میں داخل ہیں۔

شرائطِ صُلح سے عام صحابہ کرام کی ناراضی اور رنج

جب یہ شرائط طے ہو گئیں تو عمر بن خطابؓ سے نہ رہا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپؐ اللہ تعالےٰ کے نبی برحق نہیں ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا تو پھر ہم کیوں اس ذلت کو قبول کریں کہ بغیر عمرہ کے لئے واپس چلے جائیں، جب تک جنگ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کوئی فیصلہ نہ کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہوں، ہرگز اس کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا اور اللہ تعالےٰ

مجھے ضائع نہ فرمائے گا۔ وہ میرا مددگار ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا کہ ہم بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ بے شک یہ کہا تھا مگر کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ کام اسی سال ہو گا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے کہا کہ یہ تو آپؐ نے نہیں فرمایا تھا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ بس یہ واقعہ جیسا کہ میں نے کہا تھا ہو کر رہے گا کہ آپؐ بیت اللہ کے پاس جائیں گے اور طواف کریں گے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے مگر غم و غصہ نہیں گیا۔

آپؐ کے پاس سے گئے اور حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور اسی گفتگو کا اعادہ کیا جو حضور صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے سامنے کی تھی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا خدا کے بندے محمد صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اللہ کے رسول ہیں اور وہ اللہ تعالےٰ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کریں گے اور اللہ تعالےٰ ان کا مددگار ہے، اس لئے تم مرتے دم تک آپؐ کی رکاب تھامے رہو، خدا کی قسم وہ حق پر ہیں۔

غرض حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ان شرائط صلح سے سخت رنج و غم پہنچا خود انہوں نے فرمایا کہ واللہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا مجھے کبھی شک پیش نہیں آیا بجز اس واقعہ کے (رواہ البخاری)۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے سمجھایا اور فرمایا کہ شیطان کے شر سے پناہ مانگو۔ فاروق اعظمؓ نے کہا کہ میں شیطان سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں برابر صدقہ خیرات کرتا اور روزے رکھتا اور غلام آزاد کرتا رہا کہ میری یہ خطا معاف ہو جائے۔

ایک اور حادثہ اور معاہدہ کی پابندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بے نظیر عمل

ابھی ابھی یہ شرائط طے ہوئی تھیں اور صحابہ کرامؓ کی ناگواری اس پر ہو رہی تھی کہ اچانک سہیل بن عمر کا (جو صلح نامہ کا فریق منجانب قریش تھا) بیٹا ابو جندل جو مسلمان ہو چکا تھا اور

باپ نے اس کو قید کر رکھا تھا اور سخت ایذائیں اُن کو دیتا تھا وہ کسی طرح بھاگ کر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا اور آپؐ سے پناہ مانگی۔ کچھ مسلمان بڑھے اور اُس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ مگر سہیل چلا اُٹھا کہ یہ پہلی عہدنامہ کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اگر اس کو واپس نہ کیا گیا تو میں صُلح کی شرط نہ مانوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم عہد کر کے پابند ہو چکے تھے، اس لئے ابوجندل کو آواز دے کر فرمایا کہ اے ابوجندل! تم چند روز اور صبر کر لو، اللہ تعالےٰ تمہارے لئے اور ضعفاء مسلمین کے لئے جو مکّہ میں محبوس ہیں جلد رہائی اور فراخی کا انتظام کرنے والا ہے۔ مُسلمانوں کے دلوں پر ابوجندل کے اس واقعہ نے اور زیادہ نمک پاشی کی۔ وہ تو یقین کر کے آئے تھے کہ اسی وقت مکّہ فتح ہو گا اور یہاں یہ حالات دیکھے تو اُن کے رنج وغم کی انتہا نہ رہی اور قریب تھا کہ وہ ہلاکت میں پڑ جاتے اور معاہدۂ صلح مکمّل ہو چکا تھا۔ اس صُلح نامہ پر مسلمانوں کی طرف سے ابوبکر و عمر، عبدالرحمان بن عوف اور عبداللہ بن سہیل بن عمر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن سلمہ اور علی بن ابی طالب وغیرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم کے دستخط ہوئے۔ اسی طرح مشرکین کی طرف سے سہیل کے ساتھ چند دوسرے لوگوں کے بھی دستخط ہو گئے۔

احرام کھولنا اور قربانیؑ کے جانور ذبح کرنا

جب صُلح نامہ کی کتابت سے فراغت ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرار دادِ صلح کے مطابق اب ہمیں واپس جانا ہے۔ سب لوگ اپنی قربانی کے جانور جو ساتھ ہیں ان کی قربانی کر دیں اور سر کے بال منڈوا کر احرام کھول دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی مسلسل رنج وغم کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی تھی کہ آپؐ کے فرمانے کے باوجود کوئی اس کام کے لئے نہیں اُٹھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مغموم ہوئے اور ام المؤمنین حضرت امّ سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور اپنے اس رنج کا ذکر کیا۔ امّ المومنینؓ نے بہت مناسب اور اچھا مشورہ دیا کہ آپؐ صحابہ کرامؓ کو اس پر کچھ نہ کہیں ان کو اس وقت

سخت صدمہ اور رنج شرائطِ صُلح اور بغیر عمرہ کے واپسی کی وجہ سے پہنچا ہُوا ہے۔ آپؐ سب کے سامنے حجام کو بُلا کر خود اپنا حلق کر کے احرام کھول دیں اور اپنی قربانی کر دیں۔ آپؐ نے مشورے کے مطابق ایسا ہی کیا۔ صحابہ کرامؓ نے جب یہ دیکھا تو سب کھڑے ہو گئے ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے اور قربانی کے جانوروں کی قربانی کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے سب کے لئے دُعا فرمائی۔

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اس مقام حدیبیہ میں انیس اور بعض روایات کے اعتبار سے بیس دن قیام فرمایا تھا۔ اب یہاں سے واپسی شروع ہُوئی اور آپؐ صحابہ کرامؓ کے مجمع کے ساتھ پہلے مرّ ظہران پھر عسفان پہنچے۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ایک دسترخوان بچھایا اور سب کو حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ ہے لاکر یہاں جمع کر دے۔ اس طرح جو باقیماندہ کھانے کا سامان تھا سب اس دسترخوان پر جمع کیا گیا۔ چودہ ۱۴۰۰ سو حضرات کا مجمع تھا۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے دُعا فرمائی اور سب کو کھانا شروع کرنے کا حکم دیا۔ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے کہ پورے چودہ سو حضرات نے خُوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا، پھر اپنے برتنوں میں بھر لیا۔ اس کے بعد بھی اتنا ہی کھانا باقی تھا۔ اس مقام پر یہ دُوسرا مُعجزہ ظاہر ہُوا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کو دیکھ کر بہت مسرور ہُوئے۔

صحابہ کرامؓ کے ایمان اور اطاعتِ رسول کا ایک اور امتحان

صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین پر ان شرائطِ صلح اور بغیر عمرہ اور بغیر جنگ میں اپنے حوصلے نکالنے کے واپسی سخت بھاری اور ناگوار تھی۔ یہ انہی کا ایمان تھا کہ ان سب حالات میں ایمان اور اطاعتِ رسولؐ پر جمے رہے۔ حدیبیہ سے واپسی پر جب آپ مقام کراع غمیم میں پہنچے تو آپؐ پر سُورہ فتح نازل ہُوئی۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو پڑھ کر سنایا۔ صحابہ کرامؓ کے قلوب اس طرح کی شرائطِ صُلح اور بغیر عمرہ کے واپسی سے زخم خوردہ پہلے ہی سے تھے اب اس سورت نے یہ بتلایا کہ فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پھر سوال کر بیٹھے کہ یا رسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی

جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ فتح مبین ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس پر بھی سر تسلیم خم کیا اور ان سب چیزوں کو فتح مبین یقین کیا۔

صُلح حدیبیہ کے ثمرات و برکات کا ظہور

سب سے پہلی بات تو اس واقعہ میں یہ ہُوئی کہ قریش مکہ اور اُن کے بہت سے متبعین پر ان کی ضد اور بے جا ہٹ دھرمی واضح ہو کر خود اُن میں پھوٹ پڑی۔ بدیل ابن ورقاء اپنے ساتھیوں کو لے کر اُن سے الگ ہو گئے۔ پھر عروہ بن مسعود اپنی جماعت کو لے کر ان سے الگ ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ صحابہ کرامؓ کی بے نظیر جاں نثاری اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی بے مثال اطاعت، محبّت و عظمت دیکھ کر قریش مکہ کا مرعوب ہو جانا اور صُلح کی طرف مائل ہونا، حالانکہ اُن کے لئے مُسلمانوں کا صفایا کر دینے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا کیونکہ وہ اپنے گھروں میں مطمئن تھے۔

مسلمان مسافرت کی حالت میں تھے۔ قریش نے پانی کی جگہوں پر قبضہ کیا ہُوا تھا اور یہ بے آب و دانہ جنگل میں تھے۔ ان کی پوری قوّت موجود تھی۔ مُسلمانوں کے پاس کچھ زیادہ اسلحہ بھی نہیں تھے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اُن کے دلوں میں رُعب ڈالا اور اُن کی جماعت کے بہت سے افراد کو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے مُلاقات اور اختلاط کے مواقع مل کر ان میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام و ایمان راسخ ہو گیا اور وہ بعد میں مسلمان ہوُئے۔

تیسرے صُلح و امان کی وجہ سے راستے مامون ہو گئے۔ دعوتِ اسلام کے لئے رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ کے واسطے راستے کُھل گئے۔ عرب کے وفود کو آپؐ کی خدمت کا موقع ملا۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اور صحابہ کرامؓ نے گوشہ گوشہ میں دعوتِ اسلام کو پھیلایا۔ دُنیا کے بادشاہوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لئے خطوط بھیجے گئے۔ ان میں سے چند بڑے بڑے بادشاہ متاثر ہوُئے جس کا حاصل یہ نکلا کہ واقعۂ حدیبیہ میں رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو دعوتِ عامہ اور سب کو عمرے

کے لئے نکلنے کی تاکید کے باوجود ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مُسلمان ساتھ نہیں تھے اور صُلح حدیبیہ کے بعد جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسی عرصے میں ۷ھ میں خیبر فتح ہو کر مسلمانوں کو سامان بڑی مقدار میں مل گیا اور اُن کی مادّی قوّت مستحکم ہو گئی اور اس صُلح پر دو سال گزرنے نہ پائے تھے کہ مُسلمانوں کی تعداد اتنی کثیر ہو گئی جو اس سے پہلے تمام پچھلی مدّت میں نہیں تھی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جب قریش مکّہ نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے معاہدہ توڑ ڈالا اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے مکّہ فتح کرنے کی خُفیہ تیاری شروع کی تو اس صُلح نامہ پر بیس اکیس مہینے گزرے تھے کہ فتح مکّہ کے لئے آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ساتھ جانے والے جاں نثار سپاہی دس ہزار تھے۔ قریش مکّہ کو خبر لگی تو گھبرا کر ابو سفیان کو عذرِ معذرت کر کے تجدید معاہدہ پر آمادہ کرنے کے لئے آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں بھیجا۔ آپؐ نے معاہدہ کی تجدید کے لئے نہ مانا اور بالآخر دس ہزار کے اس حزب اللہ کے ساتھ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم مکّہ مکرّمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

لیکن یہ قریش ایسے مرعوب و مغلوب ہو چکے تھے کہ مکّہ مکرّمہ میں کچھ زیادہ لڑائی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ کچھ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی حکیمانہ سیاست نے جنگ نہ ہونے کا یہ انتظام کر دیا کہ آپؐ نے مکّہ مکرّمہ میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص اپنے گھر کے دروازے کو بند کر لے وہ مامون ہے جو مسجد میں داخل ہو جائے وہ بھی مامون، جو ابو سفیان کے گھر میں چلا جائے وہ بھی مامون ہے۔ اس طرح سب لوگوں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی اور قتل و قتال کی زیادہ نوبت نہیں آئی۔ اس لئے ائمہ فقہاء میں یہ اختلاف ہو گیا کہ مکّہ مکرّمہ صُلح سے فتح ہُوا یا جنگ سے۔ بہر حال بڑی سہولت کے ساتھ مکّہ مکرّمہ فتح ہُوا اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا خواب واقعہ بن کر سامنے آ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم نے بے خطر ہو کر بیت اللہ کا طواف اور پھر حلق و قصر کیا۔ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ بیت اللہ میں داخل ہوئے

اور بیت اللہ کی چابی آپؐ کے ہاتھ میں آئی۔

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خصوصاً اور سب صحابہؓ کو عموماً خطاب کر کے فرمایا:

"یہ ہے وہ واقعہ جو میں نے آپ سے کہا تھا۔"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ بے شک کوئی فتح صلح حدیبیہ سے بہتر اور اعظم نہیں ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ تو پہلے سے فرماتے تھے "کہ کوئی فتح صلح حدیبیہ کے برابر نہیں ہے۔"

لیکن لوگوں کی رائے اور بصیرت وہاں تک نہ پہنچی جو اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کے درمیان ایک طے شدہ حقیقت تھی۔ یہ لوگ جلد بازی کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کی جلد بازی سے متاثر ہو کر جلدی نہیں کرتا بلکہ حکمت و مصلحت کے ساتھ ہر کام اپنے صحیح وقت پر انجام پاتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۵۴ تا ص ۶۶)

سلاطینِ دُنیا کو دعوتی خطوط

اس صُلح کی وجہ سے راستہ مامون ہو گیا تو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ارادہ کیا کہ یہ حق کی آواز تمام دُنیا کے بادشاہوں تک بھی پہنچا دی جائے۔ چنانچہ عمرو بن اُمیہ رضؓ کو اصحمہ نامی نجاشی بادشاہ حبشہ کی طرف بھیجا۔ اُس نے آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے نامہ مبارک کو دونوں آنکھوں پر رکھا اور تخت سے نیچے اُتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور خوش دلی سے اسلام قبول کر لیا اور آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں انتقال کر گیا۔

دحیہ کلبیؓ ہرقل نامی بادشاہ روم کے پاس بھیجا، اسے بھی دلائل قاطعہ اور کُتب سابقہ کی شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ آپؐ نبی برحق ہیں۔ چنانچہ اسلام لانے کا ارادہ کر لیا، مگر اس پہ تمام رعیت برہم ہو گئی اور اس کو یہ قوی خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر میں مُسلمان ہو گیا تو یہ لوگ مجھے سلطنت سے معزول کر دیں گے اس لئے اسلام لانے سے رُک گیا۔

حضرت عبداللہ ابن حذافہؓ کو کسریٰ خسرو پرویز کج کلاہ ایران کی طرف روانہ فرمایا۔ اس بدبخت نے نامہ مبارک کے ساتھ گستاخی کی اور چاک کر کے پارہ پارہ کر دیا۔ جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اس کی سلطنت کو اسی طرح پارہ پارہ کرے جس طرح اس نے ہمارے خط کو کیا ہے۔ سیدالرسل صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی دُعا کیسے خالی جاتی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خسرو پرویز خود اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے نہایت بے دردی کے ساتھ مارا گیا۔

حاطب ابن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو سلطان مصر و اسکندریہ (مقوقس) کی طرف بھیجا۔ اس کے دل میں بھی اللہ تعالےٰ نے اسلام کی حقانیت اور آپؐ کی صداقت ڈال دی۔ چنانچہ حضرت حاطبؓ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے لئے چند تحفے بھیجے جن میں ایک کنیز ماریہ قبطیہؓ اور ایک سفید خچر جس کا نام دلدل تھا اور

ایک روایت میں ہے کہ ایک ہزار دینار اور بیس جوڑے بھی ہدیہ میں بھیجے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ کو بادشاہان عمان یعنی جعفر اور عبد اللہ کے پاس بھیجا۔ ان کو بھی ذاتی تحقیق اور کتب سابقہ کے ذریعہ سے آپؐ کی نبوت کا کما حقہٗ یقین ہو گیا اور دونوں مسلمان ہو گئے اور اسی وقت سے مالِ زکوٰۃ کا جمع کرنا شروع کر دیا اور حضرت عمرو بن عاصؓ کے سپرد کر دیا۔

(از سرور المحزون وغیرہ، سیرت صد ۱۲۶ا، صد ۱۲۷ا)

خط و کتابت کی سُنّت کے متعلّق ایک خط اور اُس کا جواب

از حضرت مجدد الملت حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

مکتوب از حضرت مفتی اعظم پاکستان قدس سرہٗ

احقر کی عادت خط لکھنے میں عام طور پر یہی ہے کہ اُوپر اپنا نام لکھ کر نیچے مکتوب الیہ کے القاب وغیرہ لکھتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ طریق سُنّت بھی ہے مگر بڑوں کو بالخصوص حضرت والا کی خدمت میں اس طرح لکھنے سے طبیعت ہمیشہ رُکتی ہے۔ آج بے ساختہ اسی طرح لکھا گیا۔ خیال آیا تو کاٹ دینے کا ارادہ ہوا۔ پھر یہ سمجھ میں آیا کہ حضرت والا سے دریافت ہی کر لوں کہ یہ طبیعت کا رُکنا محض رسم و رواج کی بناء پر ہے اور غیر محمود ہے یا منشاء ترکِ ادب ہونے کی وجہ سے محمود ہے۔ امید ہے کہ حضرت والا اس پر متنبہ فرمائیں گے۔

جواب از حضرت حکیم الاُمّت مولانا تھانویؒ

ادب کے خیال سے محمود ہے مگر بالغیر یعنی للادب اور رسنت محمود بالذات اور محمود بالذات کو ترجیح ہوگی محمود بالغیر پر تو اصولِ شرعیہ کے اعتبار سے جواب ہے اور اس میں ایک عقلی مصلحت بھی ہے کہ آخیر میں اپنا نام لکھنے میں بعض اوقات کسی عارض سے ذہول ہو جاتا ہے۔ وقد غیر مرۃ۔ اور ایک طبعی مصلحت بھی ہے کہ مکتوب الیہ کو پہلے سے معلوم ہو جائے، اگر

خط بھی نہ پہچانتا ہو یا پہچانتا ہو، مگر کسی عذر سے کاتب نے کسی دوسرے سے لکھوایا ہو تو پہچاننے سے مضمون کے ہر جزو سے خاص اثر لیتا رہے گا اور ابہام کی صورت میں اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے پھر اخیر میں اپنا نام دیکھ کر تبدیلِ خیال کی کلفت ہوگی۔ بہر حال شرعاً وعقلاً ہر طرح یہی طریقہ محمود ہے۔ لیکن اگر کسی کی ان مقتضیات پر نظر نہ جاوے اور وہ اس تقدیم سے بخیال ادب بچے تو اس کو تارکِ سنت بھی نہ کہیں گے کیونکہ یہ سنت عادت ہے، سنت عبادت نہیں جس پر بالذات وعدہ اجر اور ترک میں کراہت ہو۔ واللہ اعلم۔

ضمیمہ :- تحریر خط کے بعد یہ عبارت دیکھی گئی۔ مناسب معلوم ہوا کہ ان کو بھی لکھ دیا جائے۔

کتب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الی منذر بن ساوی بالبحر بعدما اسلم بما نصہ فی نصب الرایہ للزیلعی - ج ۲ ص ۳۸ -

من محمد الرسول اللہ الی منذر بن ساوی سلام علیک، فانی احمد اللہ الیک الحدیث وقال العینی فی شرح کتابہ علیہ السلام الی ہرقل وقال الشیخ قطب الدین وفیہ ان السنۃ فی المکاتبات ان یبتداء بنفسہ فیقول من فلان الی فلان وھو قول الاکثرین وکذا فی العنوان ایضا یکتب کذلک واحتجوا بھذا الحدیث وبما اخرجہ ابوداؤد عن العلاء بن الحضرمی و کان عامل النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علی البحرین وکان اذا کتب الیہ بدأ بنفسہ وفی لفظ بدأ باسمہ وقال حماد بن زید کان الناس یکتبون من فلان بن فلان الی فلان بن فلان۔ اما بعد قال بعضھم وقال یبدأ الصحابۃ وقال ابوجعفر والنحاس وھذا ھو الصحیح قال غیرہ وکرہ جماعۃ من السلف خلافہ وھو ان یکتب افلا باسم المکتوب الیہ ورخص فیہ بعضھم وقال یبدا باسم المکتوب الیہ روی ان زید بن ثابت رض کتب الی معاویہ فبدا۔ باسم معاویۃ وعن محمد بن الحنفیۃ وایوب السختیانی انھما قال

لا باس بذلک وقیل یقدم الاب ولا یبدأ ولد باسمہ علی والدہ والکبیر السن کذلک - قلت یرد ہ الحدیث العلاء لکتابۃ افضل البشر وحقہ اعظم من حق الوالد وغیرہ - (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۱۶)

روایات و عبارات مرقومہ سے معلوم ہوا کہ سنت خط یہی ہے کہ اول اپنا نام لکھے - پھر مکتوب الیہ کا۔ خواہ مکتوب الیہ چھوٹا ہو یا بڑا اور مسلم ہو یا کافر۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کبھی اس کے خلاف بھی ہو جائے تو قول راجح یہی ہے کہ وہ بھی مکروہ نہیں جیسا کہ اصل تحریر میں لکھا گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک ۔

اشرف علی عفا عنہ

۱۵ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ

حضرت خالدؓ بن ولید اور عمروؓ بن العاصؓ کا اسلام

خالدؓ بن ولید اس وقت اسلام کے ہر معرکہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرتے تھے۔ اکثر غزوات میں اور بالخصوص اُحد میں محض ان ہی کے ذریعہ کفار کے اُکھڑے ہوئے پاؤں جمے تھے۔ لیکن صلح حدیبیہ کے بعد خود بخود مسلمان ہونے کے لئے سفر کرتے ہیں۔ راستہ میں عمرو بن عاصؓ سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی اسی قصد سے جا رہے ہیں۔ دونوں ساتھ پہنچ کر مشرف باسلام ہوئے۔ (اصابہ للحافظ ، سیرت ص ۱۲۷) ۔

۷ھ

غزوہ خیبر[1]، فتح فدک[2] و عمرہ قضاء

یہود مدینہ بنو نضیر جب خیبر میں جاکر آباد ہوئے تو خیبر یہودیت کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ لوگ تمام اطراف سے عرب کو اسلام کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ محرم یا جمادی الاوّل ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چارسو پیادہ اور دوسو سواروں کے ساتھ ان پر جہاد کے لئے تشریف لے گئے۔ قتل و قتال کے بعد اللہ تعالےٰ نے ان مسلمانوں کو فتح دی اور یہود کے تمام قلعے مسلمانوں کے قبضے میں آگئے۔

اس جہاد میں حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے زیادہ حصہ لیا اور باب خیبر کو تنہا ہاتھ سے اکھاڑ دیا۔ حالانکہ ستر آدمی اس کے ہلانے سے عاجز تھے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے بجائے ڈھال کے استعمال کیا۔ (زرقانی ج۲ صہ۲۲۹) (سیرت صہ۱۲۸)

فتح خیبر

خیبر درحقیقت ایک صوبہ کا نام ہے جس میں بہت سی بستیاں، قلعے اور باغات شامل ہیں (مظہری) وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا (الفتح آیت ۱۸) اس فتح قریب سے مراد باتفاق فتح خیبر ہے جو حدیبیہ سے واپس آنے کے بعد واقع ہوئی ہے۔ بعض روایات کے مطابق حدیبیہ سے واپسی کے بعد آپؐ کا قیام مدینہ منورہ میں صرف دس روز اور دوسری روایت کے مطابق بیس روز رہا۔ اس کے بعد خیبر کے لئے روانہ ہو گئے اور ابن اسحاق کی روایت کے مطابق

---

[1] مدینہ طیبہ سے شام کی جانب میں چار منزل کے فاصلے پر ایک بڑا شہر ہے (زرقانی ج۲ صہ۲۷) (منہ)

آپؐ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ واپس تشریف لائے اور محرم ۷ھ میں آپؐ غزوہ خیبر کے لئے تشریف لے گئے اور ماہ صفر ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ واقدی کے مغازی میں یہی لکھا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ یہی راجح ہے۔ (تفسیر مظہری)

(معارف القرآن ج ۸ صـ۸۱)

فتح فدک

خیبر فتح ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یہود فدک کی طرف ایک رسالہ بھیجا۔ انہوں نے صُلح کر لی۔

عمرہ قضاء

صلح حدیبیہ میں جو عمرہ چھوڑ دیا گیا تھا اور کفار قریش سے یہ معاہدہ ہُوا تھا کہ آئندہ سال عمرہ کریں گے اور تین دن سے زائد قیام نہ کریں گے۔

اس سال حسبِ وعدہ آپؐ مع تمام رفقاء کے پھر تشریف لے گئے اور شرائطِ معاہدہ کی پوری پابندی کے ساتھ عمرہ ادا فرما کر واپس تشریف لائے۔

(سیرت صـ۱۲۸ ، صـ۱۳۲)

۸ھ

سریہ موتہ و فتح مکہ

سریہ موتہ

موتہ[1] ملک شام میں شہر بلقاء کے مضافات میں بیت المقدس سے تقریباً دو منزل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام ہے۔ یہاں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی جس کا باعث یہ تھا کہ عمرو بن شرجیل نے جو شاہِ روم کی طرف سے بصرہ کا گورنر تھا، آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قاصد حارث بن عمیر کو قتل کر دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ۸ھ کے نصف میں تین ہزار صحابہ کا لشکر اس کی طرف روانہ کیا۔

جب لشکر موتہ کے قریب پہنچا تو رومیوں کو اطلاع ہوئی اور وہ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر لے کر مقابلے کے لئے نکلے۔ چند روز جنگ ہونے کے بعد خدا تعالےٰ نے ڈیڑھ لاکھ کفار پر تین ہزار مسلمانوں کا رُعب اس طرح ڈال دیا کہ پسپا ہونے کے سوا ان کو کوئی صورتِ نجات نہ ملی۔ (تلخیص السیرۃ)

(سیرت صـ۱۲۹)

---

[1] بضم میم وسکون واو بغیر ہمزہ اور بعض کے نزدیک واو پر ہمزہ ہے۔

(زرقانی ج ۲ صـ۲۶۷) ؞

فتح مکّہ[1]

حدیبیہ میں جو صلحنامہ لکھا گیا تھا، مسلمان اپنی عادت کے موافق پُوری پابندی کے ساتھ اس پر عامل تھے کہ ۸ھ میں قریش نے عہد شکنی کی۔ نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ایک قاصد بھیج کر قریش کے سامنے چند شرطیں تجدید عہد صُلح کے لئے پیش فرمائیں اور آخر میں تحریر فرمادیا کہ اگر یہ شرطیں منظور نہ ہوں تو حدیبیہ کا معاہدہ ٹُوٹ گیا۔ قریش نے نقض معاہدہ ہی کو پسند کیا۔

بالآخر آپؐ نے جہاد کی پوری تیاری شروع کر دی اور ۱۰ ر رمضان المبارک ۸ھ بروز چہارشنبہ عصر کے بعد دس ہزار صحابہ کی جمعیت کے ساتھ آپؐ مدینہ سے نکلے۔ مقام کدیدیہ میں مغرب کا وقت ہوگیا تو روزہ افطار فرمایا۔ مکّہ معظمہ پہنچ کر حضرت خالد بن ولید کو لشکر کے ایک حصّہ کے ساتھ روانہ کیا کہ اُوپر کی جانب سے مکّہ میں داخل ہوں اور ان سے فرمایا کہ جو شخص تم سے مقابلہ نہ کرے تم بھی اُس سے قتال نہ کرنا۔

ادھر دوسری جانب سے خود نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم داخل ہُوئے اور اعلان فرمادیا کہ جو شخص مسجد میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ مامون ہے البتہ صرف گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا خون معاف نہ فرمایا جن کا وجود ہر قسم کے فتنوں کا مجسّمہ تھا مگر یہ سب منتشر ہو گئے اور پھر ان میں سے اکثر آدمی بعد فتح مکّہ کے مدینہ طیبہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔

۲۰ ر رمضان المبارک بروز جمعۃ المبارک کو نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے طواف کیا۔ اس وقت تک کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بُت رکھے ہُوئے تھے۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک

---

[1] سیرت از ص ۱۲۹ تا ص ۱۳۲ ::

لکڑی تھی۔ جب آپؐ کسی بُت کے پاس سے گزرتے تو اشارہ فرما دیتے تھے اور وہ بُت منہ کے بل گر پڑتا تھا اور یہ آیت کریمہ زبان مبارک پر تھی جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

فتح مکّہ کے بعد قریش کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک

طواف سے فارغ ہو کر آپؐ نے کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ شیبی حاجب کعبہ سے لے لی اور اندر تشریف لے گئے۔ وہاں سے باہر تشریف لانے کے بعد مقام ابراہیم پر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ لوگ اس کے منتظر تھے کہ آج قریش کے حق میں آپؐ کا کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم ہر طرح آزاد اور مامون ہو۔ پھر کعبہ کی کنجی بھی ان ہی کو واپس دے دی۔ (تلخیص السیّرۃ)

نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خلق اور ابوسفیان کا اسلام

ابوسفیان جو اَب تک نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خلاف قریش کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور تقریباً قریش کے تمام معرکوں میں ان کی فوج کے افسر بھی یہی ہوتے تھے۔ فتح مکّہ سے پہلے اسلامی لشکر کی خبر لینے کے لئے مکّہ سے باہر نکلتے تھے، صحابہؓ نے گرفتار کر لیا۔ لیکن جب گرفتار ہو کر رحمت اللعالمینؐ کے دربار میں حاضر کئے جاتے ہیں تو وہاں سے معافی کا حکم ہو جاتا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ ابوسفیان فوراً اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں اور اب ہم ان کو حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں۔

فتح مکّہ کے ایک دن ایک شخص ہانپتا کانپتا ہوا حاضر ہوا۔ سراپا رحمت نے ارشاد فرمایا کہ ٹھہرو مطمئن رہو، میں کوئی بادشاہ نہیں بلکہ ایک معمولی عورت کا بیٹا ہوں۔

فتح مکّہ کے بعد آپؐ پندرہ[1] روز مکّہ معظمہ میں مقیم رہے۔ اس وقت انصار کو یہ خیال ہوا

---

[1] سیرت مغلطائی بروایت بخاری صلا۔ اس میں اور بھی اقوال ہیں۔

کو رنج تھا کہ آپؐ یہیں اقامت فرمائیں گے اور ہم آپؐ سے دُور ہو جائیں گے۔ مگر جب آپؐ کو اُن کے اس خیال کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ نہیں! بلکہ اب تو ہماری موت و حیات تمہارے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو مکّہ کا امیر مقرّر فرما کر خود مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

فتح مکّہ کے وقت مغلوب دشمنوں کے ساتھ بے نظیر کریمانہ سلوک

فتح کے وقت بہت سے رؤسا قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کر سکتے تھے۔ اب ان کو موقع مل گیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے ہوئے تھے ان کو بھی بجز معدودے چند افراد کے رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے سب کو جان و مال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا وہ ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کی تمام گذشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظر انداز فرما کر ارشاد فرمایا:

"میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السّلام نے اپنے بھائیوں سے اُس وقت کہی تھی جبکہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السّلام کے پاس مصر پہنچے تھے: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ یعنی تمہارے ظلم و جور کا انتقام لینا یا کوئی سزا دینا تو کیا، ہم تم کو ملامت کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

(معارف القرآن ج ۴ صـ ۳۰۹)

غزوۂ حنین

فتح مکّہ کے بعد عام طور سے عرب اسلام کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ کیونکہ ان میں کثرت سے وہ لوگ تھے جو اسلام کی حقانیت کا پورا یقین رکھنے کے باوجود قریش کی شوکت کے ڈر سے

مسلمان ہونے میں توقف اور فتح مکّہ کا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت وہ سب کے سب فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔ باقی ماندہ عرب کی بھی ہمت نہ رہی کہ اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہوں۔

البتہ دو قبیلے ہوازن اور ثقیف غیرت کی وجہ سے آمادۂ جنگ ہو کر مکّہ معظمہ کی طرف مسلمانوں کے قتال کے لئے بڑھے۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو خبر ملی تو آپؐ نے بارہ ہزار کا لشکر مقابلے کے لئے جمع کیا جن میں دس ہزار تو مہاجرین و انصار تھے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار نومسلم تھے جو فتح مکّہ میں مُسلمان ہُوئے تھے اور یہ اب تک اسلامی لشکروں میں سب سے بڑی تعداد تھی۔ ۶ رشوال ۸ھ کو یہ حزب اللہ (خدائی لشکر) روانہ ہُوا اور جب وادی حنین میں پہنچا تو دشمن پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھُپے ہُوئے تھے، فوراً مُسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ چونکہ ابھی تک ترتیب صفوف بھی نہیں ہوئی تھی اس لئے اسلامی لشکر کا اگلا حصّہ پسپا ہونے لگا۔ اس پسپائی کا ظاہری سبب تو یہی بے ترتیبی تھی لیکن حقیقی سبب وہ ہے جس کی طرف قرآن عزیز نے اشارہ کیا ہے یعنی مسلمان اس وقت خلافِ عادت اپنی کثرت اور ساز و سامان دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور بعض صحابہؓ کی، یہاں تک کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی زبان پر کلمات آ گئے کہ آج تک ہم مغلوب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مالک بے نیاز نے ان کو تنبیہ کرنے کے لئے یہ صورت ظاہر فرمائی تا کہ مُسلمان سمجھ لیں کہ ہماری فتح و شکست ہمارے ہاتھوں اور تیروں اور تلواروں کا کھیل نہیں بلکہ ؎

این همه[1] مستی و بے ہوشی نہ حد بادہ بود!
با حریفاں آنچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

بدر میں بے سروسامانی کے ساتھ فتح مبین اور حنین میں اس قدر ساز و سامان کے باوجود شکست کا یہی راز تھا۔

---

[1] اور غالباً اسی شعر کا ترجمہ کسی نے اردو زبان میں اس طرح کیا ہے ؎

چرخ کو یہ کب سلیقہ ہے ستمگاری میں	کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس وقت دو زرہ پہنے ہوئے ایک خچر پر سوار تھے۔ جس کو دُلدُل کہا جاتا تھا۔ قبائل کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھا تو آپؐ کے ارشاد سے حضرت عباسؓ نے ایک دلیرانہ آواز دی جس سے لوگوں کے اُکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے اور طرفین سے قتل وقتال شروع ہو گیا۔

ایک عظیم الشان معجزہ

ادھر آپؐ نے زمین سے ایک مُٹھی اُٹھا کر لشکرِ غنیم کی طرف پھینکی جس کو قدرت نے مخالف لشکر کے ہر سپاہی کی آنکھ میں اس طرح پہنچا دیا کہ کوئی ایک آنکھ اس سے نہ بچ سکی۔ آخر دشمن مرعوب ومغلوب ہو کر بھاگے۔ مُسلمانوں میں سے صرف چار آدمی اور کفار کے ستر آدمی مارے گئے۔ مُسلمانوں نے جوشِ انتقام میں بچّوں اور عورتوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آپؐ نے اس سے منع فرما دیا۔ (سیرت ص۱۳۲ تا ص۱۳۴)

حنین، مکّہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جو مکّہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے۔ رمضان المبارک ۸ھ میں جب مکّہ مکرمہ فتح ہوا اور قریش مکّہ نے رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی۔ انہوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ مکّہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہو گئی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رُخ ہماری طرف ہوگا۔ اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود اُن پر حملہ کر دیں۔ اس کام کے لئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکّہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا۔ اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی سب ہی جمع ہو گئے۔ اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا۔ قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان

کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دو شاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالےٰ نے ان کو کچھ بصیرت دے دی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مشرق سے مغرب تک ساری دُنیا بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جمع ہو جائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آجائیں گے۔ ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے اور مالک بن عوف نے ان سب کو پوری قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل و عیال بھی ساتھ چلیں اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچے اُن کے پاؤں کی زنجیر بن جائے۔ میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے۔ ان کی تعداد کے بارے میں اہلِ تاریخ کے مختلف اقوال ہیں۔

حافظ حدیث علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ وغیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ سب اہل و عیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپؐ نے اُن کے مقابلہ پہ جانے کا عزم فرمالیا۔ مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسیدؓ کو امیر بنالیا اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو اُن کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا اور قریشِ مکہ سے اسلحہ اور سامانِ جنگ عاریت کے طور پر مانگا۔

صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا، بول اُٹھا۔ کیا آپؐ یہ سامانِ جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں؟ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی۔ یہ سُن کر اس نے سو زرہیں مستعار دیں اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اس طرح پیش کر دیئے۔

امام زہریؒ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہؓ کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوتے جن میں سے بارہ ہزار انصارِ مدینہ تھے جو فتح مکہ کے سلسلہ آپؐ کے ساتھ آئے تھے اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں

میں سے بوقت فتح مسلمان ہو گئے تھے جن کو طلقاء کہا جاتا ہے۔ شوال کی چھ تاریخ ہفتہ کے دن آپؐ اس غزوہ کے لئے نکلے اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ تعالٰے ہمارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہو گا جہاں جمع ہو کر قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا۔ یہ چودہ ہزار کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا۔ ان کے ساتھ مکہ کے بے شمار لوگ مرد و عورت تماشائی بن کر نکلے جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا اور اگر یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ اسی قسم کے لوگوں میں شیبہ بن عثمان بھی تھے جنہوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کا جوشِ انتقام اور انتہائی غیظ میرے دل میں تھا۔ میں اس موقع کو غنیمت جان کر ساتھ ہو لیا کہ جب کہیں موقع پاؤں رسول کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم پر حملہ کر دوں۔ میں اُن کے ساتھ ہو کر ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پا کر آنحضرتؐ کے قریب پہنچا۔ مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ آپؐ کی حفاظت کر رہے ہیں اور بائیں طرف ابو سفیان بن حارث۔ اس لئے میں پیچھے کی طرف پہنچ کر ارادہ کر ہی رہا تھا کہ یکبارگی تلوار سے آپؐ پر حملہ کر دوں کہ یکایک آپؐ کی نظر مجھ پر پڑی اور آپؐ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ۔ اپنے قریب بلا کر دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! اس سے شیطان کو دور کر دے۔

اب جو میں نظر اٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم میرے دل میں اپنے کان، آنکھ اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو۔ اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان آپؐ پر قربان کر رہا تھا اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی کر دی کہ تم مکہ سے اس نیت پر چلے تھے۔ مگر اللہ تعالٰے کا ارادہ تم سے نیک کام

لینے کا تھا جو ہو کر رہا۔

اس طرح کا واقعہ نضر بن حارث کو پیش آیا کہ وہ بھی اس نیت سے حنین گئے تھے اور وہاں پہنچ کر اللہ تعالےٰ نے اُن کے دل میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی اور ایک مردِ مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرا گئے۔

اسی سفر میں ابو بردہ بن نیاز رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پر پہنچ کر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں اور ایک اور شخص آپؐ کے پاس بیٹھا ہے۔ آپؐ نے ذکر فرمایا کہ میں سو گیا تھا، یہ شخص آیا اور میری تلوار اپنے قبضے میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے محمدؐ! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ اللہ بچا سکتا ہے۔ یہ سُن کر تلوار اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ ابو بردہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ میں اس دشمنِ خدا کی گردن مار دوں۔ یہ دشمن قوم کا جاسوس معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بردہ خاموش رہو، اللہ تعالےٰ میری حفاظت کرنے والا ہے جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے اور آپؐ نے اس شخص کو کوئی ملامت بھی نہ فرمائی اور آزاد چھوڑ دیا۔

مقام حنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے اور وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورے کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آ گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے یہ سُن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ پرواہ نہ کرو، یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن حداد کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں، وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے۔ سب حالات دیکھتے سُنتے رہے۔ ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے

کہہ رہا ہے کہ محمدؐ کو اب تک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا۔ مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے اُنہیں اپنی طاقت کا زعم ہو گیا، اب اُن کو پتہ لگے گا۔ تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے اپنے بیوی بچے اور مال ہو اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو اور سب مل کر یکبارگی ہلّہ بولو۔ یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے۔ اپنی فوج کے چند دستوں کو انہوں نے مختلف گھاٹیوں میں چھپا دیا تھا۔

اس طرف کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دُوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلے کے لئے نکلے تھے اور سامانِ جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا اور یہ لوگ بدرؔ و احدؔ کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامانوں نے ایک ہزار کے لشکر جرّار پر فتح پائی تو آج اپنی کثرت اور تیاری پر نظر کر کے حاکم اور بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہو جائیں۔ آج تو مقابلے کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک والملکوت کو یہی چیز ناپسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلہ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلّہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا۔ گردوغبار نے دن کو رات بنا دیا۔ تو صحابہ کرامؓ کے پاؤں اُکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرامؓ جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ساتھ جمے رہے۔ وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپؐ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہؓ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی ؟ اور

سورہ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں؟ اور وہ انصار کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا؟ سب کو چاہیئے کہ واپس آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم یہاں ہیں"۔

حضرت عباسؓ کی یہ آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی اور یکایک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا۔ اسی حالت میں اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کی مدد بھیجی۔ ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل وعیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا اور طائف کے قلعہ میں جا چھپا اور پھر پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُن کے ستر سردار مارے گئے۔ بعض مُسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا۔ ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ چھ ہزار جنگی قیدی، چوبیس ہزار اُونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۳۴۴ تا ص ۳۴۸)

غزوۂ طائف

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم طائف کی طرف متوجہ ہوئے، جہاں بنی ثقیف اور ہوازن کا مرکز تھا، تقریبًا اٹھارہ دن تک اس کا محاصرہ کیا۔ لیکن فتح نہ ہُوا۔ جب آپؐ وہاں تشریف لائے تو ابھی راستہ ہی میں تھے کہ مقام جرّانہ میں طائف سے قبیلہ ہوازن[۱] کے وفد آپؐ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی کہ حنین کے موقع

---

[۱] ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مُسلمان ہونا اور قیدیوں کی واپسی | حنین میں قبیلہ ہوازن وثقیف کے کچھ سردار مارے گئے۔ کچھ بھاگ کھڑے ہُوئے، اُن کے ساتھ جو اُن کے اہل وعیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مالِ غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اُونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی (جس کے تقریبًا چار من ہوتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

پر جو اُن کے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئے تھے ان کو واپس کر دیں۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے منظور فرما کر ان کے قیدی واپس کر دیئے۔ جب آپؐ طائف سے واپس آکر مدینہ طیبّہ میں مقیم ہو گئے تو اہلِ طائف کا ایک وفد حاضرِ خدمت ہو کر اور خود درخواست

(بقیہ حاشیہ ص۲۶۴ سے آگے) حضرت ابوسفیان بن حرب کو اموالِ غنیمت کا نگران مقرر فرمایا۔ پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا۔ مگر ہر مقام پہ اُن کو شکست ہوتی گئی۔ وہ سخت مرعوب ہو کر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ان لوگوں کے لئے بددُعا فرمائیے، مگر آپؐ اُن کے لئے ہدایت کی دُعا فرماتے اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ فرما کر واپسی کا قصد فرمایا اور مقام جعرانہ پہ پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکّہ معظمہ جا کر عمرہ ادا کریں۔ پھر مدینہ طیبّہ کو واپسی ہو۔ مکّہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح و شکست کا امتحان کرنے آئی تھی اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت سے لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مالِ غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ ابھی اموالِ غنیمت کی تقسیم ہو رہی تھی کہ دفعتہً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ جن میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ کے رضاعی چچا ابو یرقان بھی تھے۔ انہوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل و عیال اور اموال ہمیں واپس دے دیئے جائیں۔ اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہم بہ سلسلہ رضاعت آپؐ کے خویش و عزیز ہیں اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپؐ سے مخفی نہیں۔ آپؐ ہم پر احسان فرمائیں۔ رئیسِ وفد ایک شاعر آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر ہم بادشاہ روم یا شاہِ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیشِ نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو ردّ نہ کرتے اور آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے۔ آپؐ سے ہم بڑی اُمید لے کر آئے ہیں۔

رحمت اللعالمین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا کہ ایک طرف ان لوگوں پر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کر کے داخل اسلام ہو گیا۔

عمرہ جعرانہ

اس کے بعد نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے جعرانہ ہی سے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵ سے آگے) رحم و کرم کا تقاضا یہ تھا کہ اُن کے سب قیدی اور اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں۔

دوسری طرف یہ کہ اموالِ غنیمت کا تمام مجاہدین کا حق ہوتا ہے۔ اِن سب کو اُن کے حق سے محروم کر دینا از روئے انصاف درست نہیں۔ اس لئے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اُن کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے جو اِن اموال کے حق دار ہیں، مَیں سچی اور صاف بات کو پسند کرتا ہوں، اس لئے آپ لوگوں کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو یا اموالِ غنیمت۔ ان دونوں میں جس کو چاہو انتخاب کر لو وہ تمہیں دے دیئے جائیں گے۔"

سب نے قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا تو رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے تمام صحابہ رضؓ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

"یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آ گئے ہیں، مَیں یہ چاہتا ہوں کہ اُن کے قیدی ان کو واپس دے دیئے جائیں۔ تم میں سے وہ لوگ جو خوش دلی کے ساتھ اپنا حصّہ واپس دینے کے لئے تیار ہوں، وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم اُن کو آئندہ اموالِ فدیہ میں سے بدلہ دے دیں گے۔"

مختلف اطراف سے یہ آواز اُٹھی کہ ہم خوش دلی کے ساتھ تیار ہیں۔ مگر عدل و انصاف اور حقوق کے معاملے میں احتیاط کے پیشِ نظر رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اس طرح کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

احرام باندھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ادائے عمرہ کے بعد پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہوئی۔
۶ ذی قعدہ ۸ھ کو مدینہ میں داخل ہوئے۔

(سیرت ص۱۳۴، ص۱۳۵)

(بقیہ حاشیہ ص۲۶۶ سے آگے) مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے خوش دلی سے تیار ہوئے اور کون ایسے ہیں جو شرما شرمی خاموش رہے۔ معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہے اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کے لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔"

اس کے مطابق سرداروں نے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ اجازت[عہ] حاصل کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ سب لوگ خوش دلی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی اُن کو واپس کر دیئے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص۳۴۹ تا ص۳۵۱) ⁂

عہ حقوق کے معاملے میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے عوامی جلسوں کی آوازیں کافی نہیں، ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ رائے معلوم کرنا چاہیئے۔

⁂

۹ھ

غزوۂ تبوک، حج الاسلام

وفود کی آمد اور فوج در فوج اُن کا مسلمان ہونا

غزوۂ تبوک اور اسلام میں چندہ کا رواج

طائف سے واپسی کے بعد ۹ھ کے نصف تک آپؐ مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ پھر آپؐ کو اطلاع ملی کہ غزوہ موتہ کے شکست خوردہ رومیوں نے مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لئے مقام تبوک میں (جو مسلمانوں سے چودہ میل کے فاصلہ پر ہے) بہت کچھ تیاری کر رکھی ہے۔ رسول اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے جہاد کی تیاری شروع کی لیکن اس وقت مسلمان قحط سالی کی وجہ سے نہایت تنگ دستی اور افلاس کی حالت میں تھے اور اس پر مزید یہ کہ سخت گرمی پڑ رہی تھی، لیکن جانثاروں کی جماعت تھی کہ اس کے باوجود بھی جہاد کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ چندہ کیا گیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ لاکر رکھ دیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک عظیم الشان امداد سامانِ جنگ وغیرہ کے لئے پیش کی جو نوسو اُونٹ اور سو گھوڑوں پر مشتمل تھی۔ (سیرت مغلطائی ص ۲۷)

جمعرات کے روز ماہ رجب میں تیس ہزار صحابہ کی جمعیت لیکر آنحضرتؐ تبوک تشریف لے گئے۔

چند معجزات

راستے میں ابوذر غفاریؓ کو دیکھا کہ سب سے علیحدہ علیحدہ چل رہے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا

دُنیا سے علیحدہ ہی چلیں گے اور علیحدہ ہی زندگی گزاریں گے اور علیحدہ ہی مریں گے۔
چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

اسی غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اُونٹنی گم ہوگئی اور آپؐ کو بذریعہ وحی بتلایا گیا کہ اس کی مہار ایک درخت میں فلاں جگہ اُلجھ گئی ہے۔ وہاں جاکر دیکھا تو یہی صُورت سامنے آئی۔ (مغلطائی صـ۷۶)

تبوک جب پہنچے تو اس جگہ کوئی نہ تھا، ہرقل بادشاہ حمص چلا گیا تھا۔ آپؐ نے حضرت خالدؓ کو اکیدر نصرانی کی طرف بھیجا اور پیشین گوئی کے طور پر فرمایا کہ تم رات کے وقت اس سے ملو گے جب کہ وہ شکار کر رہا ہوگا۔ حضرت خالدؓ پہنچے تو ٹھیک یہی واقعہ پیش آیا اور اس کو گرفتار کر لائے۔

الغرض آپؐ پندرہ بیس روز وہیں مقیم رہے۔ لیکن کوئی مقابلے پر نہیں آیا تو واپسی کا ارادہ فرمایا اور یہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا آخری غزوہ تھا۔ رمضان المبارک ۹ھ میں آپؐ واپس مدینہ طیبہ پہنچے۔ (سیرت صـ۱۳۵، صـ۱۳۶)

تبوک، مدینہ کے شمال میں سرحد شام پر ایک مقام کا نام ہے۔ شام اس وقت رومی مسیحیوں کا ایک صوبہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ۸ھ میں جب فتح مکّہ اور غزوہ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت جزیرۃ العرب کے اہم حصّے اسلامی حکومت کے زیرنگیں آچکے تھے اور مشرکین مکّہ کی ہشت سالہ مسلسل جنگوں کے بعد اب ذرا مسلمانوں کو ذرا سا سکون کا وقت ملا تھا، مگر جس ذات کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے پہلے ہی لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ نازل فرما کر پورے عالم کی فتوحات اور اس میں دین حق کو غالب کرنے کی بشارت دے دی تھی، اُس کو اور اُس کے رفقاءِ کار کو فرصت کہاں؟

مدینہ پہنچتے ہی ملک شام سے آنے والے تجارت پیشہ لوگ جو شام سے زیتون کا تیل لاکر مدینہ وغیرہ میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے یہ خبر پہنچائی کہ شاہِ روم ہرقل نے اپنی فوجیں مقام تبوک میں سرحد شام پر جمع کر دی ہیں اور فوجیوں کو پورے ایک

سال کی تنخواہیں پیشگی دے کر مطمئن اور خوش کر دیا ہے اور عرب کے بعض قبائل سے بھی اُن کی ساز باز ہے۔ اُن کا تہیہ یہ ہے کہ مدینہ پر یکبارگی حملہ کر دیں۔ جب رسول کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے یہ ارادہ فرمالیا کہ اُن کے حملہ آور ہونے سے پہلے پیش قدمی کر کے وہیں مقابلہ کیا جائے جہاں اُن کی فوجیں جمع ہیں۔ (تفسیر مظہری بحوالہ محمد بن یوسف صلاحی)

یہ اتفاق سے سخت گرمی کا زمانہ تھا اور مدینہ کے حضرات عموماً زراعت پیشہ لوگ تھے۔ ان کی کھیتیاں اور باغات کے پھل پک رہے تھے جس پر ان کی ساری معیشت اور پورے سال کے گزارہ کا مدار تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جس طرح ملازمت پیشہ لوگوں کی جیبیں مہینہ کے آخری دنوں میں خالی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح زراعت پیشہ لوگ فصل کے ختم ہونے پر خالی ہاتھ ہوتے ہیں۔ ایک طرف افلاس، دوسری طرف قریب آمدنی کی اُمید، اس پر مزید موسم گرما کی شدّت اس قوم کے لئے جس کو ابھی ابھی ایک حریف کے ساتھ آٹھ سال مسلسل جنگوں کے بعد ذرا دم لینے کا موقع ملا تھا، ایک انتہائی صبر آزما امتحان تھا۔ مگر وقت کا تقاضا تھا اور یہ جہاد اپنی نوعیّت میں پہلی سب جنگوں سے اس لئے بھی ممتاز تھا کہ پہلے تو اپنی ہی طرح کے عوام سے جنگ تھی اور یہاں ہرقل شاہ روم کی تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ تھا اس لئے رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مدینہ طیّبہ کے پورے مسلمانوں کو اس جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دے دیا اور کچھ آس پاس کے دوسرے قبائل کو بھی شرکتِ جہاد کے لئے دعوت دے دی۔

یہ اعلان عام اسلام کے فدا کاروں کا ایک سخت امتحان تھا اور منافق دعویداروں کا امتیاز بھی اس کے علاوہ لازمی نتیجہ کے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کے مختلف حالات ہو گئے۔ قرآن کریم نے ان میں سے ہر حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں۔

ایک حالت ان کامل مکمل حضرات کی تھی جو بلا تردّد جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔

دوسرے وہ لوگ جو ابتدائً کچھ تردّد کے بعد ساتھ ہو گئے (یہ دونوں طبقے قابلِ مدح ہیں۔)

تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح عذر کی بناء پر اس جہاد میں نہ جا سکے۔ قرآن کریم

نے آیت لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى الخ میں ان کے عذر کی قبولیت کا اظہار فرمایا۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں، جن میں ان کی کاہلی پر زجر و تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی توبہ کے قبول ہونے کی بشارت ہے۔

پانچواں طبقہ ان منافقین کا تھا جو اپنے نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے اور اپنے نفاق کو نہ چھپا سکے۔

چھٹا طبقہ ان منافقین کا تھا جو جاسوسی اور شرارت کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہو گیا تھا لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود شرکتِ جہاد سے باز رہنے والوں کی مجموعی تعداد پھر بھی برائے نام تھی، بھاری اکثریت ان ہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے منافع اور راحت کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی لئے اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی جو اس سے پہلے کسی جہاد میں نظر نہیں آئی۔

نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ جب ہرقل شاہ روم کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کے مقابلے پر آنے کی خبر پہنچی تو اس پر رعب طاری ہو گیا۔ مقابلہ پر نہیں آیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فرشتہ خصلت صحابہ کرامؓ کے لشکر کے ساتھ چند روز محاذ جنگ پر قیام کر کے جب مخالف کے مقابلہ پر آنے سے مایوس ہو گئے تو واپس تشریف لے آئے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۳۷۶ تا ص ۳۷۸)

مسجد ضرار کو آگ لگانا

واپسی کے بعد آپؐ نے اس جگہ کو آگ لگا دینے کا حکم فرمایا جو منافقین نے مسلمانوں کے خلاف مشورہ کرنے کے لئے مسجد کے نام سے بنائی تھی اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس کا نام مسجد رکھ دیا تھا (مغلطائی) اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مسجد ضرار درحقیقت مسجد نہ تھی۔ (سیرت ص ۱۳۶، ص ۱۳۷)

جب رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم مدینہ طیّبہ تشریف لائے تو ابو عامر راہب حاضرِ خدمت ہُوا (یہ شخص زمانۂ جاہلیت میں راہب ہو گیا تھا) اور اسلام پر اعتراضات کیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم کے جواب پر بھی اس بدنصیب کا اطمینان نہ ہُوا بلکہ یہ کہا کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہو، وہ مردود اور احباب و اقارب سے دُور ہو کر مسافرت میں مرے اور کہا کہ آپ کے مقابلے میں جو بھی دُشمن آئے گا میں اس کی مدد کروں گا۔ چنانچہ غزوۂ حنین تک تمام غزوات میں مُسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ قتال میں شرکت کی۔ جب ہوازن کا بڑا اور قوی قبیلہ بھی شکست کھا گیا تو یہ مایوس ہو کر مُلکِ شام پہنچا۔ کیونکہ یہی مُلک نصرانیوں کا مرکز تھا۔ وہیں جاکر اپنے احباب و اقارب سے دُور مر گیا۔ جو دُعا کی تھی اُس کے سامنے آگئی۔ جب کسی شخص کی رسوائی مقدر ہوتی ہے تو وہ ایسے ہی کام کیا کرتا ہے۔ خود ہی اپنی دُعا سے ذلیل و خوار ہُوا۔ مگر جب تک زندہ رہا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگا رہا۔ چنانچہ قیصر ملک روم کو اس پر آمادہ کیا کی کوشش کی کہ وہ اپنے لشکر سے مدینہ پر چڑھائی کر دے اور مسلمانوں کو یہاں سے نکال دے۔

اسی سازش کا ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ اس نے منافقینِ مدینہ کو جن کے ساتھ اُس کی سازباز تھی، خط لکھا کہ میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ قیصر مدینہ پر چڑھائی کرے، مگر تم لوگوں کی کوئی اجتماعی طاقت ہونی چاہیئے جو اس وقت قیصر کی مدد کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تم مدینہ ہی میں ایک مکان بناؤ اور یہ ظاہر کرو کہ ہم مسجد بنا رہے ہیں تاکہ مُسلمانوں کو شبہ نہ ہو۔ پھر اس مکان میں تم اپنے لوگوں کو جمع کرو اور جس قدر اسلحہ اور سامان جمع کر سکتے ہو وہ بھی کرو۔ یہاں مُسلمانوں کے خلاف آپس کے مشورہ سے معاملات طے کیا کرو۔

اس کے مشورہ پر بارہ[۱۲] منافقین نے مدینہ طیّبہ کے محلّہ قباء میں جہاں اوّل ہجرت میں رسول اللہ صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے قیام فرمایا اور ایک مسجد بنائی تھی وہیں ایک دوسری مسجد کی بُنیاد رکھی۔ ان منافقین کے نام بھی ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کیئے ہیں۔ پھر مسلمانوں کو فریب دینے اور دھوکہ میں رکھنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ خود رسول اللہ صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم سے ایک نماز اس جگہ پڑھوا دیں تاکہ سب مُسلمان مطمئن ہو جائیں کہ یہ بھی ایک مسجد ہے جیسا

کہ اس سے پہلے ایک مسجد یہاں بن چکی ہے۔ ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قبا کی موجودہ مسجد بہت سے لوگوں سے دُور ہے ضعیف بیمار آدمیوں کو وہاں تک پہنچنا مشکل ہے اور خود مسجد قبا اتنی وسیع بھی نہیں کہ پوری بستی کے لوگ اس میں سما سکیں۔ اس لئے ہم نے ایک دوسری مسجد اس کام کے لئے بنائی ہے، تاکہ ضعیف مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آپؐ اس مسجد میں ایک نماز پڑھ لیں تاکہ برکت ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس وقت غزوۂ تبوک کی تیاری میں مشغول تھے آپؐ نے یہ وعدہ کر لیا کہ اس وقت تو ہمیں سفر درپیش ہے۔ واپسی کے بعد ہم اس میں نماز پڑھ لیں گے۔ لیکن غزوہ تبوک سے واپسی کے وقت جب کہ آپؐ مدینہ طیبہ کے قریب ایک مقام پر فروکش ہوئے تو آیات (التوبہ آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰) آپؐ پر نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کی سازش کھول دی گئی تھی۔ آیات کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے چند اصحاب جن میں عامر بن سکن اور وحشی قاتل، حمزہؓ وغیرہ شریک تھے۔ ان کو حکم دیا کہ ابھی جا کر اس مسجد کو ڈھا دو اور اس میں آگ لگا دو۔ یہ سب حضرات اسی وقت گئے اور حکم کی تعمیل کر کے اس عمارت کو ڈھا کر زمین برابر کر دی۔ یہ تمام واقعہ تفسیر قرطبی اور مظہری کی بیان کی ہوئی روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔

تفسیر مظہری میں محمد بن یوسف صالحی کے حوالہ سے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہؐ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قبا سے مدینہ منورہ میں پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی۔ آپؐ نے عاصم بن عدی کو اس کی اجازت دی کہ وہ اس جگہ میں اپنا گھر بنا لیں۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! جس جگہ کے متعلق قرآن حکیم کی یہ آیات نازل ہو چکی ہیں، مَیں تو اس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا۔ البتہ ثابت بن اکرم ضرورت مند ہیں کہ اُن کے پاس کوئی گھر نہیں، ان کو اجازت دیجئے کہ وہ یہاں مکان بنوا لیں۔ ان کے مشورہ کے مطابق آپؐ نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دے دی۔ مگر ہوا یہ کہ جب ثابتؓ اس مکان میں مقیم ہوئے اُن کے کوئی بچہ نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا۔ اہلِ تاریخ نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا، اس جگہ میں کوئی مُرغی بھی انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی۔ کوئی کبوتر اور جانور

بھی اس میں پھلا پھولا نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے یہ جگہ آج تک مسجد قبا کے کچھ فاصلہ پر ویران پڑی ہے۔ (معارف القرآن ج ۴ ص ۴۶۱ ، ص ۴۶۲)

وفد ثقیف

تبوک سے واپسی کے بعد ہی مدینہ طیبہ میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ پھر پے در پے وفود آنے شروع ہو گئے، جن کی تعداد ستر تک نقل کی جاتی ہے، ان میں سے بعض کے واقعات مختصراً یہ ہیں:

وفد بنی فزارہ | پہلے ہی مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

وفد بنی تمیم | آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ مکالمات کے بعد سب کے سب مسلمان ہو کر وطن ہو گئے۔

وفد بنی سعد بن بکر | اس وفد کے امیر ضمام بن ثعلبہ تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم سے بہت سے سوالات کئے۔ آپ نے سب کے شافی جواب دیئے اور پوری تحقیق مذہب اور شرح صدر کے بعد مشرف بہ اسلام ہو کر اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے اور قوم میں جا کر انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی جس کی وجہ سے اُن کی ساری قوم مسلمان ہو گئی۔

وفد کندہ | سورۂ صافات کی ابتدائی آیات سنتے ہی ان کے قلوب میں اسلام نے گھر کر لیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔

وفد بنی عبد القیس | پہلے نصاریٰ تھے، سب کے سب آپ کی خدمت میں ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم نے ضروری امور اسلامی ان کو تعلیم فرمائے۔

وفد بنی حنیفہ | بھی حاضر خدمت ہو کر مسلمان ہو گئے۔ ان میں مسیلمہ بھی شامل تھا جو بعد میں نبوت کا دعویٰ کرنے پر مسیلمہ کذاب کے نام سے پکارا گیا۔ محض اس

دعوے نبوت کی بناء پر صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے زمانے میں جماعتِ صحابہؓ کے ہاتھوں سے مع اپنے رفقاء کے قتل کیا گیا۔

فائدہ مسیلمہ کذاب بوقتِ دعویٰ نبوت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور قرآن و اسلام کا منکر نہیں تھا۔ چنانچہ[1] امام الحدیث والتفسیر شیخ ابوجعفر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ مسیلمہ نے اپنے مؤذن کو حکم دیا تھا کہ اذان میں برابر اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللہ کہا کرے، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا دعویٰ نبوت[2] جائز نہیں، بلکہ مطلقاً دعوے نبوت بہت سی نصوص قرآنی اور احادیث متواترہ اور اجماعی عقیدۂ نبوت سے انکار ہے۔ اس لئے باجماع صحابہؓ مسیلمہ کا غیر تشریعی نبوت کا دعویٰ بھی کفر و ارتداد سمجھا گیا اور بہ اجماعِ صحابہ اس پر جہاد کیا گیا۔ صحابہ کو اس کی اذان و نماز و تلاوت قرآن نے اس کو کافر کہنے سے نہیں روکا۔

قادیانی مرزا صاحب جن کے دعوے[3] اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ یہی نہیں کہ اپنے آپ کو تمام انبیاءؑ سے افضل بتاتے ہیں بلکہ بہت سے انبیاء کی ایسی جگر خراش توہین کرتے ہیں کہ کسی شریف انسان سے ممکن نہیں۔ بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو اپنا ترکش خالی کر دیا ہے اور وہ بازاری گالیاں دی ہیں کہ کوئی ان کو سن کر کسی طرح صبر نہیں کر سکتا جس کی تصدیق خود مرزا صاحب کی تصانیف انجام آتھم اور دافع البلاء، نزول المسیح سے ہر شخص کر سکتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے مشرکانہ دعوے دیکھ کر تمام اسلامی فرقوں کے علماء نے متفقہ طور پر اگر ان کو کفر کا فتویٰ دیا اور اُن کی نماز، روزہ اور ان کی مزعومہ تبلیغ اسلام کی پرواہ نہیں کی تو بلاشبہ اسوۂ صحابہ کی پیروی کی ان پر اس میں کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] اور اپنے آپ کو مستقل تشریعی نہیں کہتا تھا، بلکہ ہمارے زمانہ کے قادیانی مرزا صاحب کی طرح غیر تشریعی طور پر آپؐ کے ماتحت نبوت کا دعویٰ کرتا تھا۔ (منہ قدس سرہ اللہ تعالیٰ) [2] اس باب کے آخر میں ہم عقیدۂ ختم نبوت پر مختصر مقالہ لکھیں گے۔ احقر قریشی عفرلہ [3] حضرت مفتئ اعظم قدس سرہٗ کا رسالہ دعاوی مرزا ملاحظہ فرمائیں۔ احقر قریشی عفی عنہ

وفد بنی قحطان جس کے امیر زید الخیل تھے۔ یہ بھی سب کے سب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گئے۔

وفد بنی الحارث ان میں خالد ابن الولیدؓ بھی تھے، جو مع اپنے رفقاء کے مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح بنی اسد، بنی محارب، ہمدان اور غان وغیرہ کے وفود کچھ حاضری سے پہلے اور کچھ بعد میں مسلمان ہو گئے۔ حمیر کے مختلف سردار جو اپنی جماعت کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے، اُن کی طرف سے قاصد یہ خبر لائے کہ ان سب نے بہ رضا و رغبت اسلام قبول کر لیا اور اسی طرح پیادہ و سوار وفود حاضر ہو کر اسلام لاتے رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ھ میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ ایک لاکھ مسلمان تھے اور جو لوگ اس حج میں حاضر نہیں تھے ان کی تعداد بھی اس سے کئی گنی تھی۔

صدیق اکبرؓ کا امیر حج ہونا

غزوہ تبوک کے بعد ذی قعد ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو امیر حج بنا کر مکہ معظمہ روانہ فرمایا۔ (سیرت ص ۱۳۷ تا ص ۱۴۰)

ختمِ نبوّت اور اُس کا مفہوم

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط (محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں)۔

ختم النبیین میں آپؐ کی مخصوص شان اور تمام انبیاء علیہم السلام پر آپؐ کا فائق ہونا واضح کیا گیا ہے۔ لفظ خاتم میں دو قرأتیں ہیں۔ امام حسنؒ اور عاصمؒ کی قرأت میں خاتَم بفتح تاء سے اور دوسرے ائمہ قرأت خاتِم بکسر تاء پڑھتے ہیں حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے کیونکہ خاتم بفتح التاء ہو یا بکسر التاء دونوں کے معنے آخر کے بھی

آتے ہیں اور مُہر کے معنی میں بھی یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں اور نتیجہ دوسرے معنی کے بھی وہی آخر کے معنی ہوتے ہیں۔ کیونکہ مُہر کسی چیز پر بند کرنے کے لئے آخر ہی میں کی جاتی ہے۔ لفظ خاتم بالکسر و الفتح دونوں کے معنی لغت عربی میں تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔

امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا و خاتم النبیّین لانّہ ختم النبوۃ ای تممہا بمجیئہ یعنی آپؐ کو خاتم نبوت اس لئے کہا گیا کہ آپؐ نے نبوّت کو اپنے تشریف لانے سے ختم اور مکمل کر دیا ہے۔

محکم ابن سیدہ میں ہے وخاتِمۃ کل شیٔ وخاتِمَتُہٗ عاقبتہ و اٰخرہٗ یعنی ہر چیز کا خاتم اور خاتمہ اس کے انجام اور آخر کو کہا جاتا ہے۔ خلاصہ معنی دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ آپؐ ختم کرنے والے ہیں، انبیاء کے یعنی سب کے آخر اور بعد میں مبعوث ہوئے ہیں۔

صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جو تمام کمالات نبوّت و رسالت میں آپؐ کی اعلےٰ فضیلت اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی ہوتی ہے اور انتہاء پر پہنچ کر اس کی تکمیل ہوتی ہے اور جو آخری نتیجہ ہوتا ہے وہی اصل مقصود ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔ یعنی آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے۔

انبیائے سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے کوئی ناقص نہ تھا لیکن کمال مطلق اسی دین مصطفوی کو حاصل ہُوا جو اوّلین و آخرین کے لئے حجت اور قیامت تک چلنے والا دین ہے۔

اس جگہ صفت خاتم النبیّین کے اضافہ سے اس مضمون کی اور بھی زیادہ وضاحت اور تکمیل ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو مقطوع النّسل کہنا جہالت ہے جبکہ ساری اُمّت کے باپ ہونے کی حیثیت سے آپؐ متصف ہیں۔ کیونکہ لفظ خاتم النبیّین نے یہ بھی بتلا دیا کہ آپؐ کے بعد قیامت تک آنے والی سب نسلیں اور قومیں آپؐ ہی کی اُمّت

میں شامل ہوں گی۔ اس وجہ سے آپؐ کی اُمت کی تعداد بھی دُوسری اُمتوں سے زیادہ ہوگی اور آپؐ کی روحانی اولاد دوسرے انبیاء کی نسبت سے بھی زیادہ ہوگی۔

صفت خاتم النّبیّین نے یہ بھی بتلا دیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی شفقت اپنی اولادِ روحانی یعنی پُوری اُمت پر دوسرے تمام انبیاء سے زائد ہوگی اور آپؐ قیامت تک پیش آنے والی ضرورتوں کو واضح کرنے کا پورا اہتمام فرمائیں گے۔ کیونکہ آپؐ کے بعد کوئی نبی اور کوئی وحی دُنیا میں آنے والی نہیں۔ بخلاف انبیاء سابقین کے کہ ان کو اس کی فکر نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جب قوم میں گمراہی پھیلے گی تو ہمارے بعد دوسرے انبیاء آکر اس کی اصلاح کر دیں گے۔ مگر خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کو یہ فکر لاحق تھی کہ قیامت تک اُمت کو جن حالات سے سابقہ پڑے گا۔ ان سب حالات کے متعلق ہدایات اُمت کو دے کر جائیں جن پر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی احادیث شاہد ہیں۔ آپؐ کے بعد جتنے لوگ قابلِ اقتداء آنے والے تھے اکثر اُن کے نام لے کر بتلا دیا ہے۔ اسی طرح جتنے گمراہی کے علمبردار ہیں، ان کے حالات اور پتے ایسے کھول کر بتلا دیئے کہ ذرا غور کرنے والے کو کوئی اشتباہ باقی نہ رہ جائے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ "میں نے تم کو ایسے روشن راستہ پر چھوڑا ہے جس میں رات دن برابر ہیں کسی وقت بھی گمراہی کا خطرہ نہیں"۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اوپر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ذکر بصفت رسول آیا ہے۔ اس کے لئے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے خاتم الرُّسل یا خاتم المرسلین کا لفظ ہوتا مگر قرآن حکیم نے اس کے بجائے خاتم النّبیّین کا لفظ استعمال فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو حق تعالےٰ اصلاح خلق کے لئے مخاطب فرمائیں اور اپنی وحی سے مشرف فرمائیں خواہ اس کے لئے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں یا پہلے ہی کسی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو۔ جیسے حضرت ہارون علیہ السّلام، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے اور لفظ رسول

خاص اس نبی کے لئے بولا جاتا ہے جس کو مستقل کتاب و شریعت دی گئی ہو۔ اسی طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظ رسول کے عموم زیادہ ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپؐ انبیاء کے ختم کرنے والے اور سب سے آخر میں ہیں خواہ وہ صاحبِ شریعت بھی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قسمیں اللہ تعالےٰ کے نزدیک ہو سکتی ہیں وہ سب آپؐ پر ختم ہو گئیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی معبوث نہیں ہو گا۔ امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

"یعنی یہ آیت صریح ہے اس عقیدہ کے لئے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولیٰ رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام اور لفظ رسول خاص ہے اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں جو صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے ہم تک پہنچی ہیں۔"

اس آیت کی لفظی تشریح میں کسی قدر تفصیل ہے۔ اس سے کام لیا گیا کہ ہمارے مُلک میں مرزا قادیانی مدعی نبوت نے اس آیت کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھ کر اس کی تفسیر میں طرح طرح کی تحریفات اور احتمالات پیدا کئے۔ مذکور الصدر تقریر سے الحمدللہ ان سب کا جواب ہوتا ہے۔

مسئلہ ختم نبوّت

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا خاتم النّبیّین ہونا اور آپؐ کا آخری پیغمبر ہونا آپؐ کے بعد کسی نبی کا دُنیا میں معبوث نہ ہونا اور ہر مدعی نبوّت کا کاذب و کافر ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک ہر دَور کے مسلمانوں کا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ اس لئے ضرورت نہ تھی کہ اس پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے لیکن قادیانی فرقے نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے بڑا زور لگایا ہے۔ سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں شائع کر کے کم علم لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے احقر نے اس مسئلہ کی پوری

تفصیل ایک مستقل کتاب "ختم نبوت"[1] لکھ دی ہے جس میں ایک سو آیات، دو سو سے زائد احادیث اور سینکڑوں آیات و آثار، سلف و خلف سے اس مسئلہ کو پورا واضح کر دیا ہے اور قادیانی دجل کے شبہ کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔ یہاں ان میں سے چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں۔

آپؐ کا خاتم النبیین ہونا، عیسیٰؑ کے نزول کے منافی نہیں

چونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات و احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ قیامت سے پہلے آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر دنیا میں تشریف لائیں گے اور دجالِ اعظم کو قتل کریں گے اور اس وقت ہر گمراہی کو ختم کریں گے جس کی تصریح احقر کے رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" میں مذکور ہے۔

مرزا قادیانی نے عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان میں اٹھایا جانا اور پھر آخر زمانے میں تشریف لانا جو قرآن و سنت کی بے شمار نصوص سے ثابت ہیں، ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعوے کیا اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہو گا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی شخص عہدۂ نبوت پر فائز نہ ہو گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپؐ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے اُن کی نبوت سلب ہو جائے گی یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آسکتا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بعد جو بھی آپؐ کی اُمت میں اصلاح و تبلیغ کے لئے آئے گا وہ اپنے منصبِ نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اس اُمت میں اصلاح کی تبلیغ

---

[1] یہاں پوری کتاب لکھنے نقل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، علیحدہ مستقل جلد ہے جو "ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور" سے مل سکتی ہے۔ (احقر قریشی غفرلہٗ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کے تابع انجام دے گا۔ جیسا کہ احادیثِ صحیحہ میں تصریح ہے۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اسی آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے سے یہ مُراد ہے کہ وصفِ نبوت آپؐ کے بعد منقطع ہوگیا۔ اب کسی کو یہ وصف اور منصب نہیں ملے گا۔ اس سے اس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جس پر اُمت کا اجماع ہے اور قرآن اس پر ناطق ہے اور احادیثِ رسول جو تقریباً درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں وہ یہ کہ حضرت عیسٰےؑ علیہ السلام آخر زمانہ میں نازل ہوں گے۔ کیونکہ ان کو نبوت اس دُنیا میں ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پہلے مل چُکی تھی۔"

نبوّت کے مفہوم کی تحریف ظلی اور بروزی نبوّت کی ایجاد

اس مدعی نبوت نے دعویٰ نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ایک نئی چال یہ چلی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی جس کا قرآن وسنت میں کوئی وجود و ثبوت موجود نہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں معروف ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے جنم میں دوسرے کے رُوپ میں آسکتا ہے؟ اور پھر یہ کہا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مکمل اتباع کی وجہ سے آپؐ کا ہم رنگ ہوگیا ہو، اس کا آنا گویا خود ہی آپؐ کا آنا ہے، وہ درحقیقت آپؐ ہی کا ظل اور بروز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دعوے سے عقیدۂ ختم نبوت متاثر نہیں ہوتا۔

مگر اوّل تو یہ خود نو ایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلامیہ کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا واضح کردیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی۔ اس جواب کی پوری تفصیل تو احقر کی کتاب "ختم نبوت" میں ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں چند چیزیں بقدرِ ضرورت

پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ تمام کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی یہ روایت اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک مکان بنایا ہو اور اس کو خوب مضبوط اور مزین کیا ہو، مگر اس کے ایک گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے چلیں پھریں اور تعمیر کو پسند کریں، مگر سب یہ کہیں کہ اس مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل مکمل ہو جاتی۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ (قصرِ نبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں اور بعض الفاظِ حدیث میں ہے کہ میں نے اس خالی جگہ کو پُر کر کے قصرِ نبوت کو مکمل کر دیا۔"

اس تمثیل بلیغ کا حاصل یہ ہے کہ نبوت ایک عالی شان محل کی طرح ہے جس کے ارکان انبیاء علیہم السلام ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے پہلے یہ محل بالکل تیار ہو چکا تھا اور اس میں صرف ایک اینٹ کے سوا کسی اور قسم کی گنجائش تعمیر میں باقی نہیں تھی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس جگہ کو پُر کر کے قصرِ نبوت کی تکمیل فرما دی۔ اب اس میں نہ کسی نبوت کی گنجائش ہے نہ رسالت کی۔ اگر نبوت یا رسالت کی کچھ اقسام مان لی جائیں تو اب ان میں سے کسی قسم کی گنجائش قصرِ نبوت میں نہیں ہے۔

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد وغیرہ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام خود انبیاء کرامؑ کے ہاتھ میں تھا جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا تھا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ میرے خلیفہ ہوں گے اور وہ بہت سے ہوں گے۔"

اس حدیث نے یہ بھی واضح کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین

ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا تو اُمّت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟
اس کے متعلق فرمایا کہ آپؐ کے بعد اُمّت کی تعلیم و ہدایت کا انتظام آپؐ کے خلفاء کے ذریعہ سے ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصدِ نبوّت کو پورا کریں گے۔ اگر ظلّی بروزی کوئی نبوّت کی قسم ہوتی یا غیر تشریعی نبوّت باقی ہوتی تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوّت ختم ہو چکی، مگر فلاں قسم کی نبوّت باقی ہے جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔

اس حدیث میں صاف واضح الفاظ میں بتلا دیا کہ نبوّت کی کوئی قسم آپؐ کے بعد باقی نہیں اور ہدایت خلق کا کام جو پچھلی اُمّتوں میں انبیاء بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا وہ اس اُمّت میں آپؐ کے خلفاء سے لیا جائے گا۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیث مرفوع ہے :-

"یعنی نبوّت میں سے کچھ باقی نہیں رہا بجز مبشرات کے"۔

مسند احمد وغیرہ میں حضرت صدیقہ عائشہؓ اور امّ کرز کعبیہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا :-

"میرے بعد نبوّت میں سے کچھ باقی نہیں رہا بجز مبشرات کے"۔

صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا چیز ہے؟ فرمایا۔

"سچے خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے متعلق کوئی دوسرا دیکھے"۔

اس حدیث نے کس قدر وضاحت سے بتلا دیا کہ نبوّت کی کوئی قسم تشریعی یا غیر تشریعی اور بقول مرزا قادیانی ظلّی یا بروزی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے بعد باقی نہیں صرف مبشرات یعنی سچے خواب لوگوں کو آئیں گے جن سے کچھ معلومات ہو جائیں گی۔

اور مسند احمد و ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :-

"بے شک رسالت اور نبوّت میرے بعد منقطع ہو چکی ہے، میرے بعد نہ

کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی ۔"

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر تشریعی نبوت بھی آپؐ کے بعد باقی نہیں اور ظلّی بروزی تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں ۔ نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔ اس جگہ ختم نبوت کی احادیث جمع کرنا مقصود نہیں وہ تو دو سو زیادہ رسالۂ "ختم نبوت" میں جمع کر دی گئی ہیں صرف چند احادیث سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ مرزائی قادیانی نے جو بقاءِ نبوت کے لئے ظلّی اور بروزی کا عنوان ایجاد کیا ہے، اوّل تو اسلام میں اس کی کوئی اصل و بنیاد نہیں اور اگر بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیثِ مذکورہ نے واضح طور پر یہ بتلا دیا کہ آپؐ کے بعد نبوت کی کوئی قسم کسی طرح باقی نہیں ہے اور بالفرض ہوتی بھی تو ان احادیثِ مذکورہ نے واضح طور پر یہ بتلادیا کہ آپؐ کے بعد نبوّت کی کوئی قسم کسی طرح کی باقی نہیں ہے ۔

اسی لئے صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک اُمّتِ مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا جو یہ دعویٰ کرے وہ کاذب ، منکرِ قرآن اور کافر ہے اور صحابہ کرامؓ کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رُو سے مسیلمہ کذّاب مدعی نبوت سے صدیق اکبرؓ خلیفہ اوّل کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا ۔

ائمہ سلف اور علماءِ اُمّت کے اقوال و تصریحات بھی اس معاملے میں رسالہ "ختم نبوت" کے تیسرے حصّہ میں بڑی تفصیل سے لکھ دیئے ہیں۔ اس جگہ چند کلمات نقل کئے جاتے ہیں ۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے :-

> "اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے احادیث متواترہ میں خبر دی ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں تاکہ لوگ سمجھ لیں کہ آپؐ کے بعد جو شخص اس مقام نبوّت کا دعویٰ کرے وہ کذّاب ، مفتری، دجّال گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے۔ اگرچہ وہ کتنی ہی شعبدہ بازی کرے اور قسم قسم کے جادو اور طلسم اور نیرنگیاں دکھلائے کہ سب کے سب محال اور گمراہی ہیں عقل والوں کے نزدیک جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے اسود عنسی (مدّعی نبوت) کے

ہاتھ پر یمامہ میں اس طرح کے حالاتِ فاسدہ اور بے ہُودہ اقوال ظاہر کرائے جن کو دیکھ کر سُن کر ہر عقل وفہم والے نے سمجھ لیا کہ یہ دونوں کاذب اور گمُراہ ہیں، اللہ تعالےٰ ان پر لعنت کرے۔ اسی طرح جو شخص بھی قیامت تک نبوّت کا دعوےٰ کرے وہ کاذب و کافر ہے۔ یہاں تک کہ یہ مدعیانِ نبوّت کا سلسلہ مسیح دجّال پر ختم ہو گا۔"

امام غزالی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی کتاب "الاقتصاد فی الاعتقاد" میں آیت مذکورہ کی تفسیر اور عقیدہ ختم نبوّت کے متعلق یہ الفاظ لکھے :-

"اس آیت میں کسی تاویل یا تخصیص کی گنجائش نہیں اور جو شخص تاویل کر کے اس میں کوئی تخصیص نکالے اس کا کلام ہذیان کی قسم سے ہے اور یہ تاویل اس کو کافر کہنے سے نہیں روک سکتی، کیونکہ وہ اس آیت کی تکذیب کر رہا ہے جس کے متعلق اُمّت کا اجماع ہے کہ وہ ماؤّل یا مخصوص بالکل نہیں۔"

قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی کتاب "شفاء" میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بعد دعویٰ نبوّت کرنے والے کو کافر اور کذّاب اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی تکذیب کرنے والا اور آیت مذکورہ کا منکر کہہ کر یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"اُمت نے اجماع کیا ہے کہ اس کلام کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے اور اس پر کہ اس آیت کا نفس مفہوم ہی مراد ہے بغیر کسی تاویل کے یا تخصیص کے اس لئے ان تمام فرقوں کے کفر میں کوئی شک نہیں (جو کسی مدعی نبوّت کی پیروی کریں) بلکہ ان کا کفر قطعی طور سے اجماعِ اُمّت اور نقل یعنی کتاب و سُنت سے ثابت ہے۔"

(معارف القرآن ج ۷، صنہ ۱۶۰ تا صنہ ۱۷۰)

سنہ ۱۰ھ

حجۃ الاسلام

۲۵ر ذی قعد سنہ ۱۰ھ روز دو شنبہ کو حضور صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم حج کے لئے مکّہ معظمہ کی طرف روانہ ہُوئے۔ صحابہؓ کی بھی عظیم الشان جماعت ساتھ ہوئی جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد منقول ہے۔ مدینہ منورہ سے چھ میل پر بمقام ذوالحلیفہ احرام باندھا۔ ۴ر ذی الحجہ کو بروز شنبہ مکّہ معظمہ میں داخل ہُوئے اور حسب قواعد حج ادا فرمایا۔

خُطبۂ عرفات

نویں تاریخ کو عرفات تشریف لے جا کر آپؐ نے ایک مفصّل اور بلیغ خطبہ دیا، جو نصائح و حکم سے بھرا ہُوا اور خدا تعالےٰ کے آخری رسولؐ کا آخری پیغام تھا۔ خصوصًا اس کے مندرجہ ذیل ارشادات ہر مُسلمان کو اپنے صفحہ دل پر لکھ لینا چاہیئے۔

"اے لوگو! میرا کلام سُنو تاکہ مَیں تمہارے لئے ضروری امور کو بیان کر دوں، نہ معلوم آئندہ سال مَیں تم سے مل سکوں یا نہیں۔"

اس کے بعد ارشاد فرمایا:۔

"مسلمانوں کی جان و مال و آبرو تم پر قیامت تک اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن (عرفہ) اس مہینہ (ذوالحجہ) اور اس شہر (مکّہ) کی حرمت ہے۔ اس لئے جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو تو وہ اس شخص کی امانت واپس کر دے۔"

اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! تمہاری عورتوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں اور ان پر تمہارے حقوق ہیں۔ اے لوگو! مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کا مال بغیر اُس کی خوشی کے حلال نہیں۔ میرے بعد تم پھر کافر نہ ہو جائیو کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ اس لئے کہ میں نے تمہارے لئے اپنے بعد خدا تعالےٰ کی کتاب چھوڑی ہے کہ اگر تم اُس کے احکام کو مضبوطی سے پکڑے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے"

پھر ارشاد فرمایا :-

"اے لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارے ماں باپ ایک ہیں، تم سب آدم علیہ السّلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السّلام مٹی سے پیدا ہوئے۔ تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو کہ میں تبلیغ کر چکا اور یا اللہ تو گواہ ہے کہ میں تبلیغ کر چکا۔ حاضرین کو چاہیئے کہ یہ کلمات غائبین کو پہنچائیں"

حج سے فارغ ہو کر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم دس روز تک مکّہ معظّمہ میں مقیم رہ کر مدینہ طیّبہ واپس ہوئے۔

(سیرت صہ ۱۴۱ تا صہ ۱۴۲)

۱۱ھ

سریہ اُسامہ اور مرضِ وفات

سریہ اُسامہ

مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد ۲۶ صفر ۱۱ھ بروز دوشنبہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ایک سریہ جہادِ روم کے لئے تیار فرمایا جس میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور فاروق اعظم رضؓ اور ابو عبیدہؓ جیسے اکابر شامل تھے۔ مگر اس سریہ کے امیر حضرت اسامہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ مقرر ہوئے اور یہ آخری لشکر تھا جس کی روانگی کا انتظام خود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور یہ سریہ ابھی روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بخار شروع ہو گیا۔

آپؐ کا مرضِ وفات

۲۸ صفر ۱۱ھ چہار شنبہ کی رات کو آپؐ نے قبرستان بقیع غرقد میں تشریف لے جا کر اہلِ قبور کے لئے دُعائے مغفرت کی اور فرمایا :-

"اے اہلِ مقابر! تمہیں اپنا یہ حال اور قبروں کا قیام مبارک ہو، کیونکہ اب دُنیا میں تاریک فتنے ٹوٹ پڑے ہیں۔"

وہاں سے تشریف لائے تو سر میں درد تھا اور پھر بخار ہو گیا اور یہ بخار صحیح روایات کے مطابق تیرہ روز تک متواتر رہا اور اسی حالت میں وفات ہو گئی۔ اسی عرصہ میں آپؐ اپنے دستور کے مطابق بہ روز ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں میں منتقل ہوتے رہے۔ جب آپؐ کا

مرض طویل اور سخت ہو گیا تو ازواجِ مطہرات سے اجازت لی کہ ایامِ مرض میں صدیقہ عائشہؓ کے گھر میں رہیں، سب نے اجازت دے دی۔

صدیق اکبرؓ کی امامت

رفتہ رفتہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ آپؐ مسجد تک بھی تشریف نہ لا سکے تو ارشاد فرمایا کہ حضرت صدیق اکبرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں۔ حضرت صدیقؓ نے تقریباً سترہ نمازیں پڑھائیں۔ پھر ایک روز اتفاقاً صدیق اکبرؓ اور حضرت عباسؓ انصار کی ایک مجلس پر گزرے تو وہ سب رو رہے تھے، سبب پوچھا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مجلس کو یاد کر کے رو رہے ہیں۔ حضرت عباسؓ نے یہ خبر آپؐ کو بھی پہنچا دی۔ یہ سُن کر آپؐ حضرت علیؓ اور حضرت فضلؓ کے کاندھوں پر ٹیک لگاتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ حضرت عباسؓ آگے آگے تھے۔ آپؐ منبر پر چڑھے، لیکن نیچے ہی سیڑھی پر جلوہ افروز رہے اور اوپر نہ چڑھ سکے اور بلیغ خطبہ دیا جس کے بعض کلمات یہ ہیں۔

آخر الانبیاءؐ کا آخری خطبہ

"اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے نبی کی موت سے ڈر رہے ہو، کیا مجھ سے پہلے کوئی نبی ہمیشہ رہا ہے جو میں رہتا۔ ہاں میں اپنے پروردگار سے ملنے والا ہوں اور تم مجھ سے ملنے والے ہو، ہاں تمہارے ملنے کی جگہ حوضِ کوثر ہے۔ پس جو شخص کہ یہ پسند کرے کہ بروز قیامت اس حوض سے سیراب ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنے ہاتھ اور زبان کو لا یعنی اور بے ضرورت باتوں سے روکے۔ میں تمہیں مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں اور ارشاد فرمایا کہ جب لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں تو ان کے حکام اور بادشاہ ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور جب وہ اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ بے رحمی کرتے ہیں۔" (دروس السیرۃ المحمدیہ)

اس کے بعد مکان میں تشریف لے گئے اور وفات سے پانچ یا تین روز پہلے پھر ایک مرتبہ باہر تشریف لائے۔ سر مبارک بندھا ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نماز پڑھا رہے تھے[1] وہ پیچھے ہٹنے لگے، آپؐ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع فرمایا اور خود حضرت ابوبکرؓ کے بائیں جانب[2] بیٹھ گئے۔ نماز کے بعد ایک مختصر خطبہ دیا جس کے دوران فرمایا:۔

"ابوبکرؓ سب سے زیادہ میرے محسن ہیں اور اگر میں خدا تعالےٰ کے سوا کسی کو خلیل بناتا۔ لیکن چونکہ خلیل کے سوا کوئی نہیں اس لئے ابوبکرؓ میرے بھائی اور دوست ہیں"

اور فرمایا:۔

"مسجد میں جتنے لوگوں کے دروازے ہیں، وہ سب سوائے ابوبکرؓ کے دروازے کے بند کر دیئے جائیں" (صحیح بخاری مع فتح ج ۱ ص ۳۵۶)

محدّث ابن حبان نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حدیث میں صاف اشارہ ہے کہ آپؐ کے بعد صدیق اکبرؓ ہی خلیفہ ہیں۔ (فتح الباری پ ۲ ص ۳۵۶)

اس کے بعد دوسری ربیع الاوّل دوشنبہ کے روز لوگ صبح کی نماز حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پیچھے پڑھ رہے تھے کہ یکایک آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کا پردہ کھول کر لوگوں کی طرف دیکھا اور تبسم فرمایا۔ صدیق اکبرؓ یہ دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے اور خوشی کی وجہ سے صحابہؓ کے قلوب نماز میں منتشر ہونے لگے ؎

در نماز سے خم ابروئے تو چوں یاد آمد !
حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

آپؐ نے اُن کو ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ نماز پوری کرو اور خود اندر تشریف لے گئے

---

[1] صحیح یہ ہے کہ ظہر کی نماز تھی۔ (فتح الباری ص ۱۰۶ ہندی ۱۲۔

[2] صحیح روایت کے موافق اس وقت آپؐ ہی امام تھے۔ صدیق اکبرؓ اور تمام جماعت آپؐ کی مقتدی تھی۔ البتہ صدیق اکبرؓ بلند آواز سے تکبیر کہتے جاتے تھے۔ (مشکوٰۃ باب متابعت الاسلام)

اور پردہ چھوڑ دیا اور اس کے بعد پھر باہر تشریف نہیں لائے۔ اسی روز ظہر کے بعد اس عالم سے انتقال فرما کر رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ واصل ہوئے۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق اس وقت حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عمر شریف[1] تریسٹھ برس تھی۔

آپؐ کے آخری کلمات

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس مرض کے دوران میں کبھی کبھی آپؐ چہرۂ مبارک سے چادر اُٹھا کر فرماتے تھے کہ یہود و نصاریٰ پر اس لئے خدا تعالےٰ کی لعنت آئی ہے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے۔ غرض یہ تھی کہ مسلمان اس سے بچیں۔ (بخاری ص۱۰)

آہ! رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے آخری لمحات میں جس چیز سے ڈرایا تھا وہ بھی آج مسلمان کر رہے ہیں اور اولیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا ڈالا (نعوذ باللہ)۔

حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ قریب وفات آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چھت کی طرف دیکھتے اور فرماتے تھے۔

[2] بیہقی نے بروایت صدیقہؓ نقل کیا ہے کہ آخری لمحہ حیات میں زبانِ مبارک پر یہ الفاظ تھے اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (یعنی نماز کا اور ان لوگوں کے حقوق کا بڑا خیال رکھو جو تمہارے قبضہ میں ہیں۔

---

[1] تاریخ وفات میں مشہور ہے کہ ۱۲ ربیع الاوّل کو واقع ہوئی اور یہی جمہور مؤرخین لکھتے چلے آئے ہیں۔ لیکن حساب سے کسی طرح یہ تاریخ وفات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ بھی متفق علیہ ہے اور یقینی امر ہے کہ آپؐ کی وفات دوشنبہ کو ہوئی اور یہ بھی یقینی ہے کہ آپؐ کا حج ۹ ذی الحجہ بروز جمعۃ المبارک کو ہوا۔ ان دونوں باتوں کو ملانے سے ۱۲ ربیع الاوّل بروز دوشنبہ نہیں پڑتی۔ اسی لئے حافظ ابنِ حجرؒ نے شرح صحیح بخاری میں طویل بحث کے بعد یہی صحیح قرار دیا ہے کہ آپؐ کی تاریخ وفات دوسری ربیع الاوّل ہے۔ کتابت کی غلطی سے ۲ کا (۱) اور عربی عبارت میں ثانی شہر ربیع الاوّل کا ثانی عشر ربیع الاوّل بن گیا۔ حافظ مغلطائیؒ نے بھی دوسری تاریخ کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم

"یعنی یا اللہ! مَیں رفیقِ اعلیٰ کو پسند کرتا ہوں اور بعض روایات میں ہے کہ آخری لمحاتِ حیات میں زبانِ رسالت اَلصَّلٰوۃُ ، اَلصَّلٰوۃُ کے کلمات جاری رہے ہیں۔[1] (خصائص کبریٰ)

وفات کی خبر صحابہؓ میں شائع ہوئی تو گویا سب کی عقلیں اُڑ گئیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ جیسے جلیل القدر صحابی فرطِ غم سے آپؐ کی موت کا انکار کرنے لگے۔ صدیق اکبرؓ اس وقت تشریف لائے تو ایک مختصر سا خطبہ دیا جس میں لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو سُن لے کہ آپؐ وفات پا چکے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو سمجھ لے کہ وہ حیّ قیوم آج بھی زندہ ہے۔ یہ سُن کر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو کچھ ہوش آیا۔

پھر چونکہ آپؐ کے بعد خلیفہ کا قائم کرنا سب سے پہلا اور مقدم کام تھا۔ کیونکہ دوسرے دینی و دنیوی معاملات کے خلل اور بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے حملے کے علاوہ خود آپؐ کی تجہیز و تکفین سے پہلے ہی خلیفہ کا قائم کرنا ضروری سمجھا اور اس قضیہ کے طے ہونے میں کچھ دیر ہوئی اور اسی پیر کے دن سے بُدھ کی رات تک توقف ہُوا۔ بُدھ کی رات میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ وغیرہ نے آپؐ کو غسل و کفن دیا اور نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔

قبر شریف، حدیث شریف کے موافق صدیقہ عائشہؓ کے حجرہ میں اسی جگہ کھودی گئی جہاں وفات ہوئی تھی۔ ابوطلحہؓ نے قبر کھودی اور حضرت علیؓ و عباسؓ نے قبر میں رکھا۔ آپؐ کی قبر شریف ایک بالشت اُونچی رکھی گئی۔

سیرت نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو مختصراً بیان کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے اخلاق کریمہ کا کچھ حصّہ مختصراً پیش کر دیا جائے۔ شاید خداوند کریم ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما ذٰلک علی اللہ بعزیز ہ

---

[1] حافظؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے (فتح الباری)

آپؐ کے اخلاق و خصائل و معجزات

اخلاق شریفہ

آپؐ سب سے زیادہ شجاع و بہادر اور سب سے زیادہ سخی تھے۔ جب کبھی آپؐ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو فوراً اعطا فرما دیتے تھے۔ سب سے زیادہ حلیم و بردبار تھے، یہاں تک کہ صحابہؓ نے کفار کی ایک قوم کے متعلق آپؐ سے عرض کیا کہ ان کے متعلق بددعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں رحمت ہو کر آیا ہوں، عذاب بن کر نہیں آیا۔ آپؐ کا دندان مبارک شہید کیا گیا مگر اس وقت بھی اُن کے لئے دُعائے مغفرت فرمانے لگے۔

آپؐ سب سے زیادہ حیادار تھے۔ آپؐ کی نگاہ کسی چیز پر نہ ٹھہرتی تھی۔ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے انتقام نہ لیتے تھے اور نہ غصے ہوتے تھے۔ ہاں جب حدود خداوندی پر دست اندازی کی جاتی تو غصہ آتا تھا اور جب غصہ آتا تھا تو پھر آپؐ کے سامنے کوئی ٹھہر نہ سکتا تھا۔ جب آپؐ کو دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو ہمیشہ ان میں سے آسان کو اختیار فرمایا کرتے تاکہ اُمت کے لئے سہولت ہو۔ آپؐ نے کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، البتہ اگر مرغوب ہوتا تو کھا لیتے ورنہ چھوڑ دیتے۔ آپؐ تکیہ لگا کر نہ کھاتے اور نہ میز پر بیٹھ کر کھاتے تھے، نہ سینی پر اور نہ کبھی آپؐ کے لئے پتلی چپاتی پکائی گئی۔ ککڑی خربوزہ کو کھجور کے ساتھ کھایا کرتے تھے، شہد اور تمام چیزوں کو طبعاً پسند فرماتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم دُنیا سے تشریف لے گئے اور کبھی آپؐ نے اور آپؐ کے اہلِ بیت نے جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔ آپؐ کے گھر والوں پر دو دو مہینے صاف اس طرح گزر جاتے تھے کہ چولہے میں آگ جلانے کی بھی نوبت نہ آتی تھی بلکہ صرف چھواروں اور پانی پر گزر ہوتی تھی۔

آپؐ اپنا جُوتا خود سی لیتے اور کپڑے میں پیوند خود لگاتے تھے۔ اپنے اہل بیت

کے کاروبار میں رہتے تھے۔ مریضوں کی عیادت کرتے تھے۔ جب کوئی آدمی آپ کو دعوت دیتا خواہ وہ امیر ہوتا یا مفلس، اس کے یہاں تشریف لے جاتے تھے۔ کسی مفلس کو اس کے فقر کی وجہ سے حقیر نہ جانتے تھے اور کسی بڑے سے بڑے بادشاہ سے بھی اُس کے مُلک کی وجہ سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ اپنے پیچھے اپنے غلام وغیرہ سوار کر لیتے تھے۔ موٹے کپڑے پہنتے تھے اور گٹھے ہُوئے جوتے پہن لیتے تھے۔ سفید کپڑے آپؐ کو سب سے زیادہ پسند تھے۔

کثرت سے اللہ تعالےٰ کا ذکر فرماتے اور بے کار باتوں سے اجتناب فرماتے تھے۔ نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر پڑھتے تھے۔ غلاموں اور مفلسوں کے ساتھ چلنے پھرنے سے پرہیز نہ فرماتے تھے۔ کبھی کبھی ہنسی اور خوش طبعی کی باتیں فرماتے۔ لیکن اس وقت بھی واقعہ کے خلاف نہ بولتے تھے۔ تمام انسانوں سے زیادہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی فرماتے تھے۔ عذرخواہ کا عذر قبول فرما لیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں یعنی آپؐ کا خلق قرآن مجید تھا۔ یعنی جس چیز کو قرآن پسند کرتا، اُس کو آپؐ بھی پسند فرماتے تھے اور جس کو قرآن پسند نہ کرتا تھا اُس کو آپؐ بھی پسند نہ فرماتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے آپؐ کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہیں سُونگھی۔

مُعجزات

دنیوی بادشاہ جب کسی کو اپنی طرف سے کسی صُوبہ کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے ہیں تو اُس کے ساتھ ساتھ کچھ نشانیاں دی جاتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر لوگوں کو اس کی گورنری کا یقین آ جائے۔ مثلاً کچھ حشم و خدم اور فوج اور وہ اختیارات جن کو عام رعایا نافذ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح خدا تعالےٰ کے رسول جب دُنیا میں آتے ہیں تو ان کے ساتھ صدق و دیانت اور حسن خلق اور جُملہ کمالاتِ بشریہ کی نشانیوں کے ساتھ ایک قوّتِ

قاہرہ بھی ہوتی ہے جس کے ذریعے سے معاندین کی گردنیں جُھک جاتی ہیں۔ اسی قوت قاہرہ اور فوق العادت اختیارات کا نام معجزات اور خرق عادت ہے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے معجزات تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے بھی تمام انبیاء سابقین سے بھی زائد اور افضل ہیں۔ پہلے انبیاء علیہم السلام کے معجزات ان کی مقدس ہستیوں تک محدود تھے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا معجزۂ قرآن[1] آج بھی ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی ساری قوتیں اور جن و انس عاجز ہیں۔

اس کے علاوہ چاند کے دو ٹکڑے کر دینا، انگلیوں سے پانی جاری ہونا اور

---

[1] شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی کتاب "خصائص کبریٰ" میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دو معجزوں کے متعلق بحوالہ حدیث لکھا ہے کہ قیامت تک باقی ہیں۔ ایک قرآن کا معجزہ اور دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! ایام حج میں تینوں جمرات پر لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل کنکریاں پھینکتے ہیں۔ پھر کوئی ان کنکریوں کے ڈھیر کو یہاں سے اُٹھاتا بھی نظر نہیں آتا اور ایک مرتبہ پھینکی ہوئی کنکر کو دوبارہ استعمال کرنا بھی ممنوع ہے اس لئے ہر حاجی اپنے لئے مزدلفہ سے کنکریاں نئی لے کر آتا ہے۔ اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جمرات کے گرد ایک ہی سال میں ٹیلہ لگ جاتا جس میں جمرات چھپ جاتے۔ اور چند سال میں تو یہاں پہاڑ ہو جاتا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! مگر اللہ تعالےٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے کہ جس جس شخص کا حج قبول ہو اس کی کنکریاں اٹھالی جائیں تو اب اس جگہ صرف ان کم نصیبوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج قبول نہیں ہوا۔ اس لئے اس جگہ پڑی ہوئی کنکریاں بہت کم نظر آتی ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو یہاں پہاڑ کھڑا ہو گیا ہوتا۔

یہ روایت سنن بیہقی میں موجود ہے۔ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کے ذریعے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق ہر سال اور ہر زمانے میں ہو سکتی ہے۔ اسی طرح معجزۂ قرآن ہمیشہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، لکڑی کے ستون کا رونا، درختوں کا آپ کو سلام کرنا، درختوں کو بلانا اور اُن کا آجانا۔ ہزاروں پیشین گوئیوں کا آفتاب کی طرح صادق ہونا وغیرہ وغیرہ ہزاروں معجزات ہیں جو نہ صرف آیات اور صحیح احادیث میں وارد ہیں، بلکہ کفّار کی شہادت سے بھی ثابت ہیں جن کو علماء متقدمین و متاخرین نے مستقل تصنیفوں میں بھی ثابت کیا ہے۔

علامہ سیوطی رح کی خصائص کبریٰ اور متاخرین میں رسالہ الکلام المبین اردو، اسی مضمون میں لکھے گئے ہیں۔ مگر اس مختصر رسالہ میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین۔

مولائی صلِّ وسلّم دائماً ابداً
علیٰ حبیبک خیر الخلق کلّہم

(سیرت صـ ۱۴۲ تا صـ ۱۵۳)

(بقیہ حاشیہ صـ ۲۹۵ سے آگے) باقی رہنے والا اور ایک زندہ معجزہ ہے۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس کی نظیر یا مثال نہیں پیش کی جاسکتی، آج بھی نہیں کی جاسکتی۔ (معارف القرآن ج ۱ صـ ۱۴۳) ٭

سیرتِ رسولِ اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم

حصّہ دوم
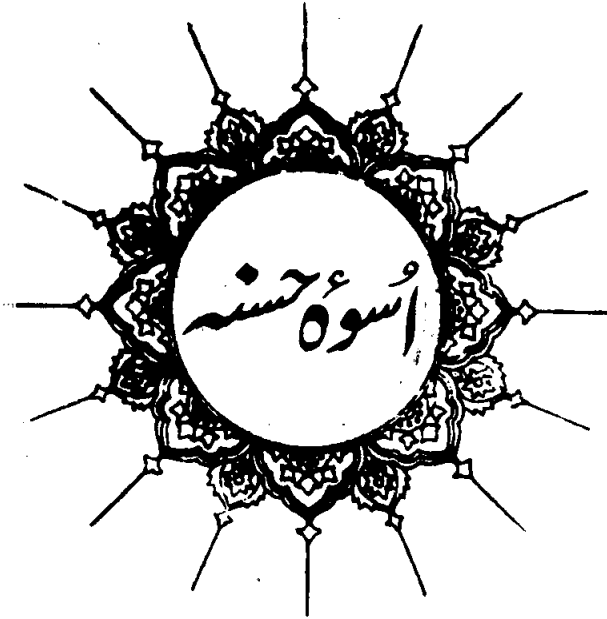
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ[1] (ماخوذ از آداب النبیؐ)

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

امّا بعد احقر نے ۱۳۴۶ھ میں ایک مختصر رسالہ سیرت خاتم الانبیاء، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں مستند کتابوں کے حوالہ سے جمع کیا تھا جس کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حُسن قبول عطا فرمایا۔ عام مسلمانوں اور عورتوں بچوں کی تعلیم کے لئے اُس کو پسند کیا گیا اور سینکڑوں مدراس میں داخل نصاب کر لیا گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کے بعد اتفاقاً ایک رسالہ حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا بنام "آداب النبیؐ" نظر سے گزرا جس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نظر کے اخلاق وشمائل اور حُلیہ شریفہ ومعجزات کو اسی طرح اختصار کے ساتھ جمع فرمایا ہے۔ مگر اس میں نہ احادیث کی اسانید مذکور تھی نہ کتب حدیث کا حوالہ۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہُوا کہ یہ رسالہ دراصل احیاء العلوم ربع ثانی کا آخری حصّہ ہے جس کو کسی نے علیٰحدہ طبع کر دیا ہے۔ یہ معلوم ہو کر اس لئے مسرت ہوئی کہ احیاء العلوم پر جو تخریج احادیث حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تحریر فرما دی ہے اس میں اس رسالہ کی تمام روایات کا حوالہ کتبِ حدیث کا بآسانی مِل گیا۔

اب دل چاہا کہ اس رسالہ کا سلیس اُردو میں ترجمہ ہو جائے تو سیرت خاتم الانبیاء کا گویا دوسرا حصّہ ہو جائے گا اور انشاء اللہ تعالیٰ اسی کی طرح مفید ہو گا۔ بلکہ حضرت مصنفؒ کی برکت سے انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ مفید ہونے کی توقع ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ شروع کیا اور ساتھ ساتھ ایک ماہوار رسالہ میں اس کی اشاعت شروع ہو گئی۔ لیکن اتفاقاً اسباب ایسے پیش آئے کہ یہ رسالہ بند ہو گیا اور اس کے ترجمہ کا جو ایک تقاضا اشاعت موقت کی وجہ سے تھا وہ نہ رہا اور یہ سلسلہ متروک ہو گیا۔ اس درمیان میں بعض احباب نے تقاضا بھی کیا۔ لیکن دوسرے مشاغل کے سبب یہ ارادہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ اب پورے بیس سال کے

[1] ماخوذ از آدابُ النبیؐ۔

بعد ربیع الاول ۱۳۶۷ھ میں پھر خود اس رسالہ کے اتمام کا تقاضا دل میں پیدا ہوا۔ نصف رسالہ باقی تھا۔ بنام خدا تعالےٰ شروع کیا تو بحمد اللہ صرف تین روز میں یہ بقیہ نصف پورا ہو گیا اور ابتدائی نصف پر بھی نظر ثانی اور اس کی مختصر ترمیم ہو گئی۔ واللہ الموفق والمعین۔

اس ترجمہ میں احقر نے اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کتاب کا پورا مضمون سلیس اردو میں بے کم و کاست آجائے مگر زبان کی سلاست کے خیال سے لفظی ترجمہ کی پوری رعایت نہیں کی بلکہ خلاصۂ مضمون اردو میں لکھ دیا۔ نیز بعض مواقع میں تائید کے لئے کچھ تاریخی واقعات اور توضیح کے لئے کچھ فوائد کا اضافہ بھی کیا ہے جس کو اسی جگہ ظاہر کر دیا ہے اور بعض جگہ طویل عبارات میں اختصار بھی کیا ہے۔ نیز چونکہ اصل کتاب میں روایاتِ حدیث کے حوالے بھی مذکور نہ تھے اور وہ بہت اہم اور ضروری چیز ہے تاکہ حدیث کا درجہ قوی یا ضعیف وغیرہ ہونے کے متعلق معلوم ہو جائے۔ احقر نے تمام روایات کے حوالے حافظ زین الدین عراقی کی تخریج احیاء سے لے کر ہر روایت کے ساتھ یا اس کے حاشیہ پر نقل کر دیئے ہیں۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ اس رسالہ کو احقر اس کے والدین اور مشائخ و اساتذہ اور جملہ احباب و اقارب اور تمام مسلمانوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے محبتِ کاملہ پیدا کرنے اور آپؐ کی سنت و شریعت پر چلنے کا ذریعہ بنا دیں۔

وبیدہ التوفیق ولا حول ولا قوۃ الا باللہ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

ناکارۂ خلائق

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفی اللہ عنہ

۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تادیب و تربیت کا قدرتی انتظام

عموماً حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم و تربیت کا حق تعالےٰ خود انتظام فرماتے ہیں۔ خصوصاً حضرت سید الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تربیت و تادیب ایک امتیازی شان سے ہوئی کہ تربیت اور تادیب تعلیم و تہذیب کے جتنے ظاہری ذرائع تھے سب منقطع کر دیئے گئے۔ ایسے شہر میں پیدا ہوئے جہاں نہ کوئی علمی مشغلہ نہ کوئی مکتب و مدرسہ، نہ کوئی عالم نہ علمی مجلسیں، والدِ ماجد کا سایہ سر سے پیدائش سے پہلے ہی اُٹھ گیا۔ ایسے لوگوں میں پلے اور بڑھے، جنہیں علم و تہذیب سے دُور کا بھی علاقہ نہیں تھا۔ پھر کسی دوسری جگہ بھی طلبِ علم کے لئے سفر نہیں کیا۔ یہاں رہتے ہوئے بھی معمولی لکھنا پڑھنا جو دوسرے لوگ سیکھ لیتے تھے۔ آپؐ نے وہ بھی نہ سیکھا۔ اُمّی محض (اَن پڑھ) رہے۔ اپنا نام خود نہ لکھتے تھے۔

ان حالات میں حق تعالےٰ نے جبرائیل امین کے ذریعے آپؐ کی تربیت اور تہذیب کا وہ انتظام فرمایا کہ دُنیا حیرت میں رہ گئی۔ آپؐ ہی کی ذاتِ گرامی ساری دُنیا کے لئے علم و حکمت اور اخلاق و آداب، تہذیب و تادیب کا معیار ثابت ہوئی۔ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی مضمون کو مولانا جامیؒ نے اپنے دو شعروں میں بہت ہی بلیغ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

نَقَدْ یَثْرِبْ سَدَا لَہٗ بَطْحٰی ۔۔۔ اُمّی لوح خوانِ مَا اَوحیٰ

فیضِ اُمّ الکتاب پرورشش ۔۔۔ لقبِ اُمّی خدا از اں کردش

حق تعالےٰ نے آپؐ کا قلبِ مبارک بھی اوّل ہی سے ایسا بنایا تھا کہ ابتداء ہی سے آپؐ کا

نصب العین مکارمِ اخلاق کی تکمیل تھی ۔ آپؐ کی دُعا حق تعالیٰ سے یہ تھی ۔

"یا اللہ! ہمیں نیک عمل اور اچھے اخلاق کی ہدایت کر کہ عُمدہ اخلاق کی ہدایت آپ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا اور بُرے اخلاق کو ہم سے دور کر دے کہ بُرے اخلاق کو بھی آپ کے سوا کوئی زائل نہیں کر سکتا ۔"

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا خُلق خود قرآن ہے

حضرت سعد بن ہشام رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک روز حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور درخواست کی کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ بیان کیجئے ۔ تو فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ؟ میں نے عرض کیا کہ الحمد للہ قرآن تو روز پڑھتا ہوں ۔ فرمایا کہ "بس قرآن ہی آپؐ کا خلق ہے ۔" کیونکہ حق تعالےٰ نے آپؐ کو قرآن ہی کے ذریعہ مکارمِ اخلاق سے آراستہ فرمایا ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں :۔

قرآن کریم میں ایک جگہ آپؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے :

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ۔ (اعراف)

"عفو درگزر کو اختیار کیجئے اور لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلایئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے ۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۔

"بیشک اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کرنے کا اور رشتہ داروں کو دینے کا اور بےحیائی کی باتوں سے اور بُرے کاموں سے اور ظلم سے بچنے کا حکم فرماتا ہے ۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے ۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۔

"لوگوں کی طرف سے جو آپؐ کو ایذا پہنچے اُس پر صبر کیجئے کہ یہی پُختہ کاموں میں سے ہے ۔"

اور ایک جگہ نیک خصلت عفو و کرم فرمانے والے لوگوں کی مدح کر کے اس طرح ترغیب دی گئی ۔

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۔

"جنت تیار کی گئی اُن لوگوں کے لئے جو غصّہ کو دبانے اور لوگوں کی خطائیں معاف کرنے والے ہیں ۔"

مزید ارشاد ہے۔

وَاجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ۔

"بچتے رہو بہت گمان قائم کرنے سے، بیشک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا اور پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا نہ کہو۔"

غزوۂ احد میں جب آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا اور آہنی ٹوپی کی چند کڑیاں رخسارِ مبارک میں گھس گئیں تو چہرۂ مبارک سے خون پونچھتے ہوئے زبان پر یہ کلمات آ گئے کہ "وہ قوم کس طرح فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کا چہرہ اس طرح خون آلود کر دیا جبکہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف دعوت دے رہا تھا۔"

بدنصیب قوم کی اس وحشیانہ حرکت پر یہ کلمات کچھ سخت نہ تھے۔ لیکن شانِ رحمۃ اللعالمین اس سے بھی بلند تھی، اس لئے خود آپؐ کی تادیب کے لئے یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ بددعا کرنا آپؐ کی شان کے شایاں نہیں۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران)

"تیرا اختیار اس کام میں کچھ نہیں چاہے اللہ ان کو توبہ نصیب کرے یا ان کو سزا دے کیونکہ وہ ناحق پر ہیں اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، معاف کرے جسے چاہے اور سزا دے جسے چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

قرآن مجید میں اس قسم کی تادیبات بے شمار ہیں جن کا مقصود اوّل سرورِ کائنات سیدِ موجودات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اخلاقِ فاضلہ کے ساتھ آراستہ کرنا اور پھر اس آفتابِ رسالت کی روشنی سے کل عالم کا منوّر کرنا اور اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت قرآن مجید سے کی گئی ہے اور تمام عالم کی تادیب و تہذیب آپؐ کی ذات سے۔ اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

بعثت لاتمم مکارم اخلاق ۔
(رواہ احمد الحاکم والبیہقی من حدیث ابن ہریرۃ ؓ ۱۲ تخریج)

"میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں۔"

حق تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خلق کی تعلیم دی اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تمام مخلوق کو بتلادیا کہ :-

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَیَبْغُضُ سَفْسَافَھَا۔ (بیہقی عن سہل بن سعد و طلحہ بن عبید) "اللہ تعالیٰ عمدہ اخلاق کو پسند فرماتے ہیں اور خراب اخلاق سے ناراض ہوتے ہیں"

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ اور صلح و جنگ کے حالات اس کے شاہد ہیں کہ آپؐ کی تمام تر کوششیں صرف اخلاقِ صالحہ کی تکمیل اور لوگوں کو زیورِ اخلاق سے آراستہ کرنا تھا۔

حاتم طائی[1] جو عرب کا سخی اور شریف آدمی مشہور ہے۔ ایک جہاد میں اس کی لڑکی گرفتار ہو کر آگئی، جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئی تو اس نے بیان کیا۔

"اے محمدؐ! مَیں اپنی قوم کے سردار کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ نہایت وفاشعار اور عہد کا پابند تھا۔ قیدیوں کو چھڑاتا اور بھوکے آدمیوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اس نے کبھی کسی طالبِ حاجت کا سوال رد نہ کیا۔ مَیں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے آزاد کر دیں اور میرے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دیں"

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو ٹھیک مسلمانوں کے اخلاق ہیں اگر تمہارے باپ مسلمان ہوتے تو ہم ان کے لئے دعا کرتے اور پھر حکم فرمایا کہ اس کو آزاد کر دیا جائے کیونکہ اس کا باپ اخلاقِ حسنہ کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی اخلاقِ حسنہ کو پسند کرتا ہے۔

یہ سُن کر ابو بردہؓ ابن نیار کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا خدا تعالیٰ مکارمِ اخلاق کو محبوب رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

والذی نفسی بیدہٖ لا یدخل الجنۃ الاحسن الخلاق۔ (حکیم ترمذی) "قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جنت میں اچھے اخلاق والے کے سوا کوئی نہ جاسکے گا"

---

[1] یہ روایت حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں لکھی ہے جس کی اسناد میں کچھ ضعف ہے۔ ۱۲ تخریج احیاء

فتح[1] مکہ کے موقعہ پر جب حضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور صحابہ کرام کی عظیم الشان جمعیت مکہ مکرمہ کی طرف بڑھی تو راستہ میں ایک شخص حاضر خدمت ہُوا۔ آپؐ کے ارادۂ جہاد کو بھی اُس نے عام بادشاہوں کی جنگ پر قیاس کیا اور عرض کیا کہ اگر آپؐ حسین عورتیں اور سُرخ اونٹ چاہتے ہیں تو قبیلہ بنی مدلج پر چڑھائی کیجئے (کیونکہ ان میں ان کی کثرت ہے) لیکن اسے کیا معلوم تھا ؎

گریہ وخندۂ عشاق ز جائے دگر ست　　　　می سرایم بشب و وقت سحر می مویم

یہاں صلح وجنگ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہُوا کہ :-

"مجھے حق تعالےٰ نے بنی مدلج پر حملہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ صلۂ رحمی کرتے ہیں اور اپنے اقرباء کے حقوق پہچانتے ہیں۔"

(کذا فی الاحیاء، فی غیر ہذا الموضع)

عین حالتِ جنگ میں بھی اس کی رعایت رکھی جاتی ہے کہ جو لوگ اخلاقِ حسنہ سے کچھ حصّہ رکھتے ہیں ان کو ہر قسم کی تکلیف سے بچایا جاوے۔ جس سے حدیث مذکور کی عملی شرح معلوم ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی بعثت اور آپؐ کی تمام مساعی صلح وجنگ کا مقصدِ اعلیٰ مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے اخلاق واعمال کا نمونہ ہیں۔ اس لئے اُن کے تمام صلح وجنگ کے حالات بھی اسی طرز پر واقع ہوتے ہیں۔ مورخ بلاذری[2] نقل کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں اہلِ کندہ نے مرتد ہوکر عُمّالِ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تو اشعث ابنِ قیس فریقِ مخالف کا قائد اور سردار تھا۔ حق تعالےٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور دشمن بہت سے قتل وغارت کے بعد مغلوب ہو کر ایک قلعہ میں محصور ہو گئے۔ لیکن جب محاصرہ طویل ہو گیا تو عاجز ہو کر اشعث

---

[1] یہ واقعہ اور اس کے بعد کا واقعہ امام غزالیؒ کے اصل رسالہ میں نہ تھے۔ احقر نے اضافہ کیا ہے۔ ۱۲ محمد شفیع غفرلہٗ۔

[2] فتوح البلدان ۱۰۱ ش

ابن قیس نے قلعہ کا دروازہ کھولنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن چونکہ اشعث مسلمانوں کی فیاضی اور دریا دلی سے واقف تھے، مناسب سمجھا کہ اس وقت اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ سوچ کر چند آدمیوں کے لئے امان طلب کی مسلمانوں نے حسبِ عادت منظور کر لیا۔ لیکن جس وقت معاہدۂ امن ہو چکا اشعث کے ساتھیوں میں سے معد ابن اسعود نے اشعث کی کمر پکڑ لی اور اصرار کیا کہ مجھے بھی ان لوگوں میں داخل کر دے جن کو امن دیا گیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد مقرر ہو چکی تھی اب زیادتی مشکل تھی۔

اشعث کو جب کوئی صورت اس کے داخل کرنے کی نظر نہ آئی تو ایک عظیم الشان ایثار سے کام لیا کہ اپنی جگہ اس کا نام درج کر دیا اور خود ان سے علیحدہ ہو کر اپنے آپ کو لشکرِ اسلام کے حوالے کر دیا۔ لشکرِ اسلام کے امیر زیادؓ بن لبید نے ان کو قید کر کے خلیفۂ وقت حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں دار الخلافت بھیج دیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کو جب اشعث کے ایثار اور حسن خلق کا حال معلوم ہوا تو ان کو آزاد کر دیا۔ اشعث کے دل میں اسلام پہلے سے گھر کر چکا تھا اس وقت مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر مسلمانوں کے مبلغ بن کر شام و عراق میں اسلام کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنی حقیقی ہمشیرہ فروہ بنت ابی قحافہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ الغرض حضرت صدیق اکبرؓ نے اشعث کو محض حسنِ اخلاق کی وجہ سے یہ اعزاز بخشا۔ (فتوح البلدان صہ ۱۰۸ ۱۲ مترجم)

حضرت معاذ[1] رضی اللہ تعالےٰ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مذہبِ اسلام محاسن اخلاق اور محاسنِ اعمال سے گھرا ہوا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں :۔

(۱) دوستوں، عزیزوں اور تمام ملنے والوں سے اچھا سلوک کرنا یعنی اُن کو ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ رکھنا۔

(۲) نیک عمل کرنا۔

---

[1] قال فی تخریج الحدیث بطولہ، طرقت ولکنہٗ علی اصل ولعنی عنہ حدیث الاتی بعدہٗ بحدیث اللعاقہ ۱۲

(۳) سب سے نرمی کا برتاؤ کرنا۔

(۴) سب پر احسان و بخشش کرنا۔

(۵) لوگوں کو کھانا کھلانا اور سلام کو عام شائع کرنا، یعنی جان پہچان ہو یا نہ ہو، ہر مسلمان کو سلام کرنا۔

(۶) بیمار کی عیادت کرنا خواہ نیک ہو یا بد (اپنا ہو یا بیگانہ)۔

(۷) مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلنا (خواہ اس سے جان پہچان کا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

(۸) پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔

(۹) ہر مسلمان بوڑھے آدمی کی تعظیم کرنا۔

(۱۰) جو شخص کھانے کی دعوت کرے اُس کو قبول کرنا اور دعوت کرنے والے کے لئے دُعا کرنا۔

(۱۱) لوگوں کی خطاؤں اور زیادتی کو معاف کرنا۔

(۱۲) جن لوگوں میں اختلاف ہو اُن میں صُلح کرا دینا۔

(۱۳) سخاوت اور شرافت اور ہمت کو اختیار کرنا۔

(۱۴) سلام کرنے میں سبقت کرنا۔

(۱۵) غُصّہ کو پی جانا۔ یعنی غصّے کے مقتضا پر عمل نہ کرنا اور اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ سے علیحدہ ہو جاوے اور کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جاوے۔

(۱۶) لوگوں کی خطائیں معاف کرنا۔

اسلام انسان کو ان چیزوں سے روکتا ہے

(۱) لہو و لہب سے

(۲) تمام باطل کاموں سے

(۳) گانے بجانے اور مزامیر سے

(۴) کینہ سے

(۵) مکر و فساد سے

(۶) جھوٹ اور غیبت سے

(۷) بخل اور کنجوسی سے

(۸) تیز مزاجی سے

(۹) مکر اور دھوکہ بازی سے

(۱۰) چغل خوری سے

(۱۱) آپس کی نااتفاقی سے
(۱۲) قطع رحمی سے
(۱۳) بد خلقی سے
(۱۴) تکبر اور فخر سے
(۱۵) کسی کی مدح میں مبالغہ آمیز زبان درازی سے۔
(۱۶) بے شرمی سے
(۱۷) بغض اور حسد سے
(۱۸) بری فال لینے سے
(۱۹) بغاوت سے
(۲۰) کسی کام میں حد سے تجاوز کرنے سے
(۲۱) ظلم کرنے سے ؛

حضرت[1] انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کوئی نیک چیز نہیں چھوڑی جس کی طرف ہمیں دعوت نہیں دی اور ہمیں اس کی حقیقت نہیں بتلادی اور کوئی باطل (یا عیب) نہیں چھوڑا جس سے ہمیں ڈرایا نہ ہو اور اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ (شک راوی ۱۲ منہ)

حضرت[2] معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے معاذ! میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کی اور سچ بولنے کی اور عہد کو وفا کرنے کی اور امانت کو ادا کرنے کی اور خیانت ترک کرنے کی اور پڑوسی کی حفاظت کرنے کی اور یتیم پر رحم کرنے کی اور نرم کلام کرنے کی اور سلام کو عام کرنے کی، اور نیک عمل کرنے کی اور (دنیا کی) تمنائیں کم کرنے کی یعنی دور دراز تمنائیں اور خیالات نہ باندھے اور ایمان کو لازم پکڑنے کی اور قرآن مجید کو سمجھنے کی اور آخرت کی محبت اور حسابِ قیامت سے ڈرنے گھبرانے کی اور فروتنی اور عاجزی کرنے کی۔

اور میں تم کو منع کرتا ہوں اس سے کہ تم کسی حکیم آدمی کو برا کہو یا کسی سچے آدمی کو جھٹلاؤ یا کسی گناہ گار حاکم کی (گناہ میں) اطاعت کرو یا کسی حاکم عادل کی نافرمانی کرو یا زمین پر فساد مچاؤ۔ اور تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ تعالےٰ سے ڈرنے کی ہر پتھر[3] اور درخت اور ڈھیلے کے

---

[1] لم اقف لہ علی اسناد وہو صحیح من حیث الواقع ۱۲ [2] اخرجہ ابونعیم فی الحلیۃ والبیہقی فی الزہد ۱۲ تخریج عراقی

[3] یعنی ہر جگہ اور ہر وقت، مطلب یہ ہے کہ ڈھیلے پتھر جن کو تم بے جان سمجھتے ہو قیامت کے روز یہ بھی تمہارے اعمال کی گواہی دیں گے، تو جس طرح آدمی کے سامنے گناہ کرنے سے ڈرتے ہو، اسی طرح ان چیزوں کے سامنے بھی ڈرنا چاہیئے۔ ۱۲ اش ؛

سامنے اور اس بات کی کہ تم ہر گناہ سے توبہ کرو جو گناہ خفیہ کیا ہے اس کی توبہ بھی خفیہ کرو اور جو گناہ اعلانیہ کیا ہے اس کی توبہ بھی اعلانیہ کرو۔ اس طرح سرورِ عالم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کو ادب سکھلایا اور بہترین اخلاق و آداب کی طرف دعوت دی ہے۔

اخلاق نبویؐ کے چند نمونے

جن کو بعض علماء نے روایات حدیث سے جمع کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سب سے زیادہ حلیم[1] (بردبار) اور سب سے زیادہ شجاع[2] تھے۔ سب سے زیادہ انصاف[3] کرنے والے اور سب سے زیادہ معافی دینے والے تھے۔ آپؐ سب سے زیادہ عفیف تھے۔ ساری[4] عمر آپؐ کا مبارک ہاتھ کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو نہیں لگا، جب تک کہ آپؐ اس کے مالک نہ ہوئے ہوں یا اس سے نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپؐ کی محرم نہ ہو۔

آپؐ سب سے زیادہ سخی[5] تھے، کبھی کوئی درہم و دینار آپؐ کے پاس ایک رات نہ گزارتا تھا۔ تقسیم کرنے کے بعد اگر کچھ بچ جاتا اور (اس وقت) کوئی محتاج نہ ملتا تو رات آتے ہی تلاش کرکے کسی محتاج کو دے کر بے فکر ہو جاتے تھے۔ جو کچھ مال آپؐ کے پاس آتا تھا، آپؐ اس میں سے صرف[6] سال بھر کے خرچ کی مقدار اپنے لئے رکھتے اور باقی کو تقسیم فرما دیتے تھے اور وہ بھی محض معمولی ادنیٰ درجہ کی چیزوں میں سے جیسے کھجوریں اور جو وغیرہ۔ اور پھر اس میں بھی آپؐ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو کبھی رد نہ فرماتے تھے۔ اور اس سال بھر کے خرچ میں سے بھی ایثار فرما کر لوگوں کو دیتے تھے۔ اسی وجہ سے سال تمام ہونے سے پہلے ہی آپؐ کا سامان[8] ختم ہو جاتا تھا۔

---

[1] رواہ الشیخ فی کتاب اخلاق ۱۲ [2] اخراجہ البخاری و مسلم [3] اخرجہ الترمذی فی الشمائل ۱۲ [4] بخاری و مسلم ۱۲

[5] الطبرانی فی الاوسط و رجالہ ثقات ۱۲ [6] بخاری و مسلم ۱۲ [7] الطیالسی والدارمی و البخاری من غیر لفظہ ۱۲

[8] مستفاد من روایۃ الترمذی والنسائی ۱۲

اور نبی کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اپنا جوتہ[1] خود گانٹھ لیتے تھے اور کپڑے میں پیوند لگا لیتے تھے اور اپنے اہل و عیال کے کاروبار اور خدمت کرتے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر گوشت کاٹتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سب سے زیادہ حیادار تھے[2]کسی کے چہرے پر (بوجہ شدۃ حیا) آپؐ کی نظر مبارک نہ جمتی تھی۔ آزاد اور غلام[3] سب کی دعوت قبول فرما لیتے تھے اور ہدیہ[4] کو قبول فرماتے اگرچہ وہ دُودھ کا ایک گھونٹ یا خرگوش کی ایک ران ہو۔ اور پھر ہدیہ کا بدلہ دیتے تھے اور ہدیہ[5] کی چیز کو تناول فرماتے اور صدقہ کا مال نہ کھاتے تھے۔ معمولی کنیز[6] اور مسکین آدمیوں کی دعوت سے انکار نہ فرماتے تھے۔

خدا[7] کے لئے یعنی حدود اللہ اور شریعت کے خلاف کرنے پر ناراض ہوتے اور اپنے نفس کے لئے غصہ نہ فرماتے تھے۔ حق[8] بات بولتے تھے اگرچہ اس کا نقصان آپؐ ہی کی ذاتِ اقدس پر عائد ہوتا ہو۔

آپؐ سے عرض کیا گیا کہ مشرکین کے مقابلے میں دوسرے مشرکین سے مدد لیجئے تو انکار فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ ہم مشرکین سے مدد[9] نہیں لیتے۔ حالانکہ یہ وقت وہ تھا کہ آپؐ کے ساتھی بہت کم تھے اور آپؐ بظاہر ایک انسان کے محتاج تھے۔

آپؐ کے صحابہ[10] کرامؓ میں سے ایک نہایت بزرگ صحابیؓ کی لاش یہود کے محلّہ سے برآمد ہوئی۔ مگر آپؐ نے اُن سے کوئی زیادتی نہیں فرمائی۔ بلکہ قاعدۂ شریعت کے موافق صرف سو اونٹ سے ان کی دیت دلوا دی اور بس۔ حالانکہ اس وقت صحابہ کرامؓ کو ایک ایک اونٹ کی شدید ضرورت تھی اور یہودی مالدار تھے اور ان سے جس قدر بھی حکم کیا جاتا وہ خوشی سے برداشت کر لیتے۔

---

[1] رواہ احمد عن حدیث عائشہ ورجالہ رجال الصحیح ۱۲ وکل ذلک منقول عن تخریج العراقی علی الاحیاء صفحہ ۳۱۴ ج ۲ [2] رواہ البخاری ومسلم عن ابی سعید الخدری ۱۲ عراقی [3] الترمذی والحاکم عن حدیث انسؓ ۱۲ عراقی [4] مستفاد عن حدیث ام الفضل وانسؓ عند البخاری ومسلم وعن حدیث عائشہؓ ۱۲ عراقی [5] البخاری ومسلم [6] النسائی والحاکم عن حدیث عبد اللہ ابن اوفی ۱۲ عراقی [7] الترمذی فی الشمائل ۱۲ [8] حدیث عائشہؓ عند مسلم ۱۲ منہ [9] مشرکین سے جنگ میں مدد لینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے یہاں وہ شرائط موجود نہ تھیں۔ [10] بخاری ومسلم اور عراقی ۱۲

(بعض اوقات) نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بھوک کی وجہ سے اپنے شکم[1] مبارک پر پتھر باندھ لیتے تھے اور جب کچھ مل جاتا خوشی سے کھا لیتے اور کسی حلال کھانے سے احتراز نہ فرماتے تھے۔ اگر فقط چھوارے مل جاتے تو انہیں پر اکتفا فرماتے اور اگر گوشت بُھنا ہُوا مل جاتا یا روٹی گیہوں یا جو کی مل جاتی یا کوئی شیریں چیز یا شہد مل جاتا تو تناول فرماتے۔ اور اگر کبھی روٹی نہ ہوتی اور صرف دُودھ مل جاتا تو اسی پر اکتفا فرماتے اور اگر خربوزہ یا کھجوریں مل جائیں تو وہی تناول فرما لیتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تکیہ لگا کر یا میز یا چوکی وغیرہ پر کھانا رکھ کر کبھی نہ کھاتے تھے۔ آپؐ کا رومال (ہاتھ پونچھنے کے لئے) پاؤں کا تلوہ تھا۔ (یعنی بوجہ بے تکلفی کے اس کا اہتمام نہ تھا کہ کوئی تولیہ یا رومال ہی رکھا جاوے بلکہ ہاتھ دھونے کے بعد ہاتھوں یا پاؤں سے مل کر خشک فرما لیا جاتا)۔

آپؐ نے گیہوں کی روٹی تین دن متواتر پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھائی اور آپؐ کا یہ طرزِ عمل فقر و احتیاج یا بخل کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اپنے اوپر دوسرے فقراء و مساکین کو ترجیح دیتے اور ایثار کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ولیمہ کی دعوت[2] قبول فرماتے اور مریضوں[3] کی مزاج پرسی کرتے اور جنازوں میں شریک ہوتے تھے۔

اپنے دشمنوں[4] کے جتھے میں تنہا بلا کسی پاسبان (ساتھی) کے چلتے پھرتے تھے۔ آپؐ[5] سب سے زیادہ تواضع اور عاجزی کرنے والے اور سب سے زیادہ خاموش رہنے والے تھے مگر یہ خاموشی تکبّر کی وجہ سے نہیں تھی۔

آپؐ سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے۔ مگر کلام زیادہ طویل نہ فرماتے تھے[6]۔ آپؐ

---

[1] مستفاد عن حدیث الترمذی عن ام ہانیؓ ۱۲ محمد شفیع [2] فی الاوسط طبرانی عن حدیث ابن عباسؓ ۱۲ [3] رواہ الترمذی وضعفہ واخرجہ الحاکم صحیحہ ۱۲ عراقی [4] اخرجہ الترمذی والحاکم عن حدیث عائشہؓ ۱۲ [5] مستفاد من حدیث النسائی عن ابی اوفیٰ ۱۲ [6] بخاری و مسلم ۔

ظاہری شکل وصورت میں بھی سب سے زیادہ حسین وخوبصورت تھے۔ (شمائل ترمذی) دُنیا کی کسی خوفناک چیز سے نہ ڈرتے تھے (مسند احمد عن عائشہؓ) جو کچھ مل جاتا پہن لیتے تھے کبھی سادہ چادر اور کبھی یمن کی منقش چادر اور کبھی اُونی جُبّہ۔ غرض حلال مال سے جو کچھ مل جاتا زیب تن فرمالیا جاتا تھا۔ (بخاری عن سہل بن سعد)

آپؐ کی انگشتری چاندی کی تھی جس کو اکثر داہنے ہاتھ کی اور کبھی بائیں ہاتھ کی کن انگلی میں پہنتے تھے (مسلم بروایت انسؓ)

اپنے ساتھ کبھی اپنے غلام کو اور کبھی کسی دوسرے کو سواری پر ردیف بنا کر سوار فرما لیتے تھے (امراء وسلاطین کی طرح اس سے عار نہ تھا۔ (بخاری ومسلم)

(سواری کے متعلق کوئی تکلف نہ تھا) کبھی گھوڑے پر کبھی اونٹ پر کبھی خچر پر کبھی حمار پر (جیسا موقع ہوتا) سوار ہو جاتے تھے اور بعض اوقات پیادہ ننگے پاؤں بغیر چادر اور بغیر عمامہ اور ٹوپی کے چلتے پھرتے تھے اور مدینہ کے دُور محلوں میں جا کر مریضوں کی عیادت (مزاج پرسی) فرماتے تھے (بخاری ومسلم بروایت ابن وجابر ابن سمرہ وغیرہ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم خوشبو کو پسند فرماتے تھے اور بدبو سے نفرت رکھتے تھے۔ (نسائی بروایت انسؓ)

فقراء ومساکین کے ساتھ مجالست (ہم نشینی) کی عادت تھی۔ (ابوداؤد عن ابی سعیدؓ) مساکین کے ساتھ بیٹھ کر آپؐ کھانا تناول فرما لیتے تھے (بخاری عن ابی ہریرہؓ)۔

اہلِ فضل وکمال کا احترام واکرام ان کے اخلاق سے وجہ سے فرماتے تھے اور (ہر قوم کے) شریف لوگوں کو احسان وانعام کے ساتھ مانوس کیا جاتا تھا۔ (ترمذی فی شمائل)

اپنے عزیز واقربا کے حقوقِ صلہ ادا فرماتے مگر جو لوگ ان سے افضل ہوں ان پر اقربا کو ترجیح نہ دیتے تھے (حاکم فی المستدرک عن ابن عباسؓ)

کسی کے ساتھ بدمزاجی اور درشتی کا معاملہ نہ فرماتے (ابوداؤد وترمذی فی الشمائل و نسائی فی الیوم واللیلہ عن انسؓ)

ف:۔ حدود شرعیہ کے خلاف کرنے کی صورت میں کسی پر غصّہ کرنا یا سزا دینا بدمزاجی

میں داخل نہیں، بلکہ درستیٔ اخلاق کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

جو شخص آپؐ کے سامنے معذرت پیش کرتا تو آپؐ اس کا عُذر قبول فرما لیتے تھے۔ (بخاری ومسلم عن کعب بن مالکؓ)۔

آپؐ مزاح (ہنسی خوش طبعی) کی باتیں بھی کرتے تھے۔ مگر اس میں بھی کوئی خلاف واقعہ بات زبان مبارک سے نہ نکلتی تھی۔ (ترمذی ومسند احمد عن ابی ہریرہؓ)

آپؐ ہنستے تھے مگر قہقہہ نہ لگاتے۔ بلکہ آپؐ کا ہنسنا محض تبسم ہوتا تھا۔ (بخاری ومسلم عن عائشہؓ)

آپؐ مباح (جائز) کھیل کو دیکھتے تو منع نہ فرماتے (بخاری ومسلم عن عائشہؓ)

فائدہ مباح کھیل وہ ہیں جو بدن کی چستی ومضبوطی کے لئے یا جہاد کی تیاری کے لئے یا طبیعت کی تکان دُور کرنے کے لئے کھیلے جاویں اور ان میں کوئی ناجائز چیز مثل قمار (ہار جیت) یا مشابہت کفار یا ستر کھولنا وغیرہ نہ ہوں۔ حدیث میں نشانہ سیکھنے اور تیرنے کشتی لڑنے اور گتکہ وغیرہ کھیلنے کو پسند کیا گیا ہے اور فقہاء نے گیند وغیرہ کے کھیل کو بھی اس میں داخل قرار دیا ہے (شامی، عالمگیری وغیرہ) مگر شرط یہ ہے کہ گتکہ کا کھیل تعزیہ داری میں اور کشتی کا کھیل گھٹنے کھول کر اور گیند کا کھیل کفار اور فساق کے مخصوص طریقہ پر نہ ہو۔ ورنہ ان چیزوں کی شمولیت سے یہ کھیل بھی ممنوع ہو جائیں گے۔ (مترجم)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنی بیبیوں کے ساتھ (بعض اوقات سفر میں جب کہ بے پردگی کا خطرہ نہ ہو) دوڑتے بھی تھے (ابوداؤد ونسائی عن عائشہؓ)۔

بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے لوگوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں تو آپؐ صبر فرماتے تھے۔ (بخاری عن عبداللہ بن الزبیرؓ)

فائدہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اخلاقِ کمال تھا کہ اس پر صبر فرمایا۔ مگر حضرات صحابہؓ کے لئے ایسا کرنا مناسب نہ تھا اسی لئے اس کی ممانعت قرآن کریم میں نازل ہوئی۔ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے گھر میں چند اونٹنیاں اور بکریاں تھیں جن کے دُودھ سے آپؐ کا اور آپؐ کے اہل وعیال کا گزارہ تھا۔ (طبقات ابن سعد عن ام سلمہؓ)

آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے پاس چند غلام اور باندیاں بھی تھیں جن کو کھانے پہننے میں اپنے سے کم نہ رکھتے تھے (بلکہ ہر چیز میں ان کو برابر رکھا جاتا تھا (طبقات ابن سعد عن ام سلمیٰ رضؓ

فائدہ بعض روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم اپنے غلاموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے۔ (ابو بکر بن ضحاک فی الشمائل عن ابن سعید الخدری باسناد ضعیف) اور حدیث میں ہے کہ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ (صحیح حدیث ابی الیسرؓ)

لیکن یہ سب تواضع اور حسنِ اخلاق کی تعلیم بدرجۂ مستحب ہے اور ایسا کرنا واجب نہیں۔ بشرطیکہ ان کو کھانے پہننے کی تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ ضرورت کے موافق کھانا کپڑا وغیرہ دینا ان کو واجب ہے اور اس کے خلاف کرنے والا گناہگار ہے۔

تنبیہ:۔ آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا یہ معاملہ ان غلاموں کے ساتھ ہے جو آپؐ کی مِلک تھے اور جن پر ہر طرح آپؐ کو اختیار حاصل تھا۔ افسوس ہے کہ آج کل مسلمان اپنے ملازم اور نوکروں کے ساتھ بھی وہ معاملہ نہیں کرتے۔ باورچی سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کرائے جاتے ہیں، لیکن اس بے چارے کا حصّہ اس میں بجز آگ اور دھوئیں کے کچھ نہیں ہوتا۔ تیار ہونے کے بعد اس کی خوشبو بھی اُس کے پاس نہیں جاتی۔ اخلاق کی بات یہ ہے کہ تھوڑا بہت ہر کھانے میں سے اس کو بھی دیا جائے۔ جو کام کسی نوکر کے سپرد کیا جائے اس میں اُس کی راحت و طاقت کا خیال رکھا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی وقت بیکاری میں نہ گزرتا تھا بلکہ اللہ تعالٰے کے اور دین کے کاموں میں یا اپنی دنیوی ضرورتوں میں۔ (شمائل ترمذی عن علیؓ)

(کبھی کبھی) اپنے اصحاب کے باغات میں تشریف لے جاتے تھے (تخریج عراقی)

آپؐ نہ کسی مسکین یا اپاہج کو اس کے فقر و محتاجی کی وجہ سے حقیر سمجھتے تھے اور نہ بادشاہ و امیر سے اس کی دولت و سلطنت کے سبب مرعوب ہوتے تھے بلکہ دونوں کو یکساں طور پر حق تعالٰے کی طرف دعوت دیتے تھے (مستفاد من حدیث مسلم عن انسؓ وحدیث البخاری عن سہل بن سعد)۔

حق تعالٰے نے آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم میں اخلاقِ فاضلہ اور سیاستِ کاملہ جمع فرمادی تھی۔ حالانکہ آپؐ اُمّی (اَن پڑھ) تھے اور لکھنا بھی نہ جانتے تھے۔ آپؐ ایسے شہر میں پیدا ہوئے جہاں کوئی علم کی جگہ (مدرسہ و یونیورسٹی) نہ تھی بلکہ جہالت عام تھی پھر آپؐ کا نشوونما، فقروفاقہ اور بکریاں چرانے میں ہوا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ آپؐ بے ماں اور بے باپ کے یتیم بچے تھے۔ مگر حق تعالٰے نے آپؐ کو محاسنِ اخلاق اور خصائلِ حمیدہ کی تعلیم دی اور اوّلین و آخرین کے علوم عطا فرمائے اور ان چیزوں کی تعلیم دی جن سے آخرت میں نجات اور فلاح نصیب ہو اور دُنیا میں پریشانیوں سے خلاصی اور لوگوں کے لئے غبطہ (رشک) کا سبب ہو اور آپؐ کو مفید و ضروری کاموں میں مشغولی اور بے فائدہ و فضول کاموں سے اجتناب عطا فرمایا۔

حق تعالٰے ہم سب کو آپؐ کی اطاعت اور آپؐ کی سُنت اور آپؐ کے اخلاق و عادات کا اتباع نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خلقِ عظیم

حضرت ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ خلق عظیم سے مُراد دینِ عظیم ہے کہ اللہ تعالٰے کے نزدیک اس دین اسلام سے کوئی محبوب دین نہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ آپؐ کا خلق خود قرآن ہے۔ یعنی قرآن کریم جن اعلیٰ اعمال و اخلاق کی تعلیم دیتا ہے آپؐ ان سب کا عملی نمونہ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ خلق عظیم سے مراد آداب القرآن ہیں، یعنی وہ آداب جو قرآن نے سکھائے ہیں، حاصل سب کا تقریبًا ایک ہی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا وجود باجود میں حق تعالٰے نے تمام ہی اخلاق فاضلہ بدرجہ کمال جمع فرمادیئے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ یعنی مجھے اس کام کے لئے بھیجا گیا ہے کہ مَیں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں" (ابوحیان)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت کی ۔ اس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا، آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا ؟ اور جو کام نہیں کیا، اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا ۔ (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ دس سال کی مدت میں خدمت کرنے والے کے بہت سے کام خلافِ طبع ہوئے ہوں گے (بخاری و مسلم)

اور حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے مکارم اخلاق کا یہ حال تھا کہ مدینہ کی کوئی لونڈی باندی بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں سے جانا چاہے لے جاسکتی تھی ۔

(رواہ البخاری)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا ۔ بجز جہاد فی سبیل اللہ کے کہ اس میں کفار کو مارنا اور قتل کرنا ثابت ہے ورنہ آپؐ نے نہ کسی خادم کو نہ کسی عورت کو کبھی مارا ۔ اُن میں سے کسی سے خطا و لغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا ۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالےٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو اُس پر شرعی سزا جاری فرمائی ۔ (مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے کبھی کسی چیز کا سوال نہیں کیا گیا جس کے جواب میں آپؐ نے نہیں فرمایا ہو ۔

(بخاری و مسلم)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے، نہ بازاروں میں شور وشغب کرتے تھے ۔ بُرائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہ دیتے تھے، بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے ا ۔

اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں خلق حسن کے برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا اور اللہ تعالےٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں

(رواہ الترمذی و قال حدیث حسن صحیح)

اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو رات کی ہمیشہ عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔

اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل مقرر کرکے بھیجنے کے وقت) آخری وصیت جو آپؐ نے مجھے اس وقت فرمائی، جب کہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا وہ یہ تھی: یَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَكَ لِلنَّاس۔ اے معاذ! لوگوں سے حسن خلق کا برتاؤ کرو۔" (مالک)

(معارف القرآن ج ۸ ص۵۳۲، ص۵۳۳)

کفار سے معتدل بدلہ

سابقہ[1] آیات کے ضمن میں یہودیوں اور منافقوں کی ایک شرارت یہ بھی ذکر کی گئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بجائے السلام علیکم کے السّام علیکم کہتے تھے۔ سام کے معنی موت کے ہیں اور لفظوں میں زیادہ فرق نہ ہونے کے سبب مسلمانوں کو اس طرف التفات نہ ہوتا تھا، ایک روز ایسا ہی ہوا۔ صدیقہ عائشہ رضؓ بھی سن رہی تھیں جب انہوں نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو السّام علیکم کہا تو صدیقہ عائشہ رضؓ نے جواب دیا السّام علیکم ولعنکم اللہ وغضب علیکم یعنی ہلاکت تم پر ہو اور خدا تعالےٰ کی لعنت وغضب۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے حضرت صدیقہ عائشہ رضؓ کو ایسا کہنے سے روکا اور فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فحش کلام کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کو سختی ودرشتی سے بچنا اور نرمی اختیار کرنی چاہیئے۔ حضرت صدیقہ رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپؐ نے نہیں سنا کہ ان لوگوں نے آپؐ کو کیا کہا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں سن بھی لیا اور اس کا معتدل بدلہ بھی لے لیا کہ میں نے جواب میں کہہ دیا علیکم یعنی ہلاکت تم پر ہو اور ظاہر ہے کہ ان کی دعا قبول نہ ہوگی میری دعا قبول ہوگی اس لئے ان کی شرارت کا بدلہ ہوگیا۔ (معارف القرآن ج ۸ ص۳۶۵)

---

[1] سورۃ مجادلہ ؞

اطاعتِ رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

رسولؐ کی اطاعت کو اللہ تعالےٰ سے الگ کر کے بیان کرنے کی حکمت

پہلی مختصر آیت میں اس طرح بیان فرمایا: اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ہ
یعنی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔ اس میں رحمتِ خداوندی کے لئے جس طرح اللہ تعالےٰ کی اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے اور یہ پھر صرف اسی آیت میں نہیں پورے قرآن میں بار بار اس کا تکرار اس طرح ہے کہ جہاں پر اللہ تعالےٰ کی اطاعت کا حکم ہوتا ہے وہاں اطاعتِ رسولؐ کا ذکر بھی مستقلاً ہے۔
قرآن حکیم کے یہ متواتر اور مسلسل ارشادات ایک انسان کو اسلام اور ایمان کے بُنیادی اصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ ایمان کا پہلا جز خدائے تعالےٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے تو دُوسرا جزو رسولؐ کی تصدیق اور اس کی اطاعت ہے۔

اب یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ قرآن کریم ہی کے ارشادات سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب باذنِ خداوندی ہوتا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ہ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ہ

یعنی رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو کچھ بولتے ہیں وہ کسی اپنی خواہش سے نہیں کہتے بلکہ وہ سب اللہ تعالےٰ کی طرف سے "وحی" ہوتی ہے۔

اس کا حاصل یہ ہُوا کہ رسولؐ کی اطاعت بعینہٖ خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس سے الگ کوئی چیز نہیں۔ سورہ نساء آیت ۷۹ میں خود قرآن حکیم نے بھی ان الفاظ میں اس کو واضح فرمایا: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ یعنی جس نے اطاعت کی

رسول کی، اُس نے اطاعت کی اللہ تعالیٰ کی "۔

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان دونوں اطاعتوں کو الگ الگ بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ خصوصاً اس التزام اور اہتمام کے ساتھ کہ پورے قرآن کریم میں یہی عادت مستمرہ ہے کہ دونوں اطاعتوں کے ساتھ ساتھ حکم دیا جاتا ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا کی ہدایت کے لئے ایک کتاب بھیجی اور ایک رسولؐ۔ رسول کے ذمّے یہ کام لگائے گئے:۔

اوّل یہ کہ وہ قرآن کریم کی آیات ٹھیک اسی صُورت اور لب ولہجہ کے ساتھ لوگوں کو پہنچا دیں، جس صُورت میں وہ نازل ہوئیں۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو ظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک کریں۔

تیسرے یہ کہ وہ اس کتاب کے مضامین کی اُمّت کو تعلیم دیں اور اُس کے مقاصد کو بیان فرمائیں۔ نیز یہ کہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیں۔ یہ مضمون قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں تقریباً ایک ہی عنوان سے آیا ہے۔

معلوم ہُوا کہ رسولؐ کے فرائض منصبی میں صرف اتنا ہی داخل نہیں کہ وہ قرآن لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اس کی تعلیم اور تبیین بھی رسول کے ذمّہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رسول کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے مخاطب عرب کے فصحاء و بلغاء تھے۔ ان کے لئے قرآن کریم کی تعلیم کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ محض الفاظِ قرآنی کے لغوی معنی ان کو سمجھائے جائیں کیونکہ وہ سب خود بخود ان کو بخوبی سمجھتے تھے۔ بلکہ اس تعلیم و تبیین کا مقصد صرف یہی تھا اور یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن حکیم نے ایک حکم مجمل یا مبہم الفاظ میں بیان فرمایا۔ اس کی تشریح اور تفصیل رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس وحی کے ذریعے لوگوں تک پہنچائی جو قرآن کے الفاظ میں نہیں آئی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے قلب مبارک میں ڈالی جس کی طرف آیت قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن نے بے شمار مواقع میں صرف اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ فرمانے پر اکتفا کیا ہے۔ کہیں نماز کے معاملہ میں قیام، رکوع اور سجدہ کا ذکر بھی آیا تو وہ بالکل مبہم ہے ان کی کیفیات کا

ذکر نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جبرائیل امین نے خود آکر اللہ تعالےٰ کے حکم سے ان تمام اعمال اور ارکان کی تفصیلی صورت عمل کر کے بتلائی اور آپؐ نے اسی طرح قول و عمل کے ذریعے اُمت کو پہنچا دیا۔

زکوٰۃ کے مختلف نصاب اور ہر نصاب پر زکوٰۃ کی مقدار کا تعین، پھر یہ بات کہ کس مال پر زکوٰۃ فرض ہے اور کس مال پر نہیں اور مقادیر نصاب میں کتنا حصّہ معاف ہے۔ یہ سب تفصیلات رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں اور اُن کے فرامین لکھوا کر متعدد صحابہ کرامؓ کے سپرد فرمائے۔ یا مثلاً قرآن حکیم نے حکم دیا کہ لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ یعنی آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ پر ناحق نہ کھاؤ"۔

اب اس کی تفصیل کو رائج الوقت معاملات بیع وشراء اور اجارہ میں کیا کیا صُورتیں ناحق اور بے انصافی یا ضرر عوام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے باطل ہیں۔ یہ سب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باذن خداوندی اُمت کو سکھلائی۔ اسی طرح تمام شرعی احکام کا بھی یہی حال ہے۔

تو یہ تمام تفصیلات جو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے بہ وحی الٰہی اُمت کو پہنچائیں۔ اس لئے یہ احتمال تھا کہ کسی وقت کسی ناواقف کو یہ دھوکہ ہو کہ یہ تفصیلی احکام خدا تعالےٰ کے دیئے ہوئے احکام نہیں۔ اس لئے خدا تعالےٰ کی اطاعت میں ان کی تعمیل ضروری نہیں۔ اس لئے حق تعالےٰ نے سارے قرآن میں بار بار اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے جو حقیقت میں تو تعالےٰ ہی کی اطاعت ہے مگر ظاہری صورت اور تفصیل بیان کے اعتبار سے اس سے کچھ مختلف بھی ہے اس لئے بار بار تاکیدات کے ساتھ بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ بھی حکم دیں اس کو خدا تعالےٰ ہی کی اطاعت سمجھ کر مانو، خواہ وہ قرآن میں صراحتہً موجود ہو یا نہ ہو۔

یہ مسئلہ چونکہ اہم تھا اور کسی ناواقف کو دھوکہ لگ جانے کے علاوہ دشمنانِ اسلام کے لئے اسلامی اصول میں گڑبڑ پھیلانے اور مسلمانوں کو اسلام کے صحیح راستہ سے بہکانے کا بھی ایک موقع تھا اس لئے قرآن کریم نے اس مضمون کو صرف لفظ اطاعتِ رسولؐ کے ساتھ ہی

نہیں بلکہ مختلف عنوانات سے اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کو بتلایا ہے۔ مثلاً آپؐ کے فرائض میں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ علاوہ کتاب کے کچھ اور بھی آپؐ کی تعلیمات میں داخل ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے جس کو لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ کہیں ارشاد فرمایا کہ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ یعنی رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے آپؐ پر نازل شدہ آیات کے مطالب و مقاصد اور تشریحات کو بیان فرمائیں اور کہیں یہ ارشاد فرمایا کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ یعنی رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اس سے باز آجاؤ۔"

یہ سب انتظام اس لئے کیا گیا ہے کہ کل کو کوئی شخص یہ نہ کہنے لگے کہ ہم تو صرف ان احکام کے مکلف ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔ جو احکام ہمیں قرآن میں نہ ملیں ان کے ہم مکلف نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو رسولؐ کی تعلیمات اور تشریحات سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لئے یہی دعوےٰ کریں گے کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے۔ اس لئے ایک حدیث میں صراحتہً بھی اس کا ذکر فرمایا جس کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی اور امام احمدؒ نے اپنی کتابوں میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

لا الفین احدکم متکئاً علیٰ اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نہیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ ۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ میں تم سے کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے ہوئے میرے امر و نہی کے متعلق یہ کہہ دے کہ ہم اس کو نہیں جانتے، ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے جو کچھ اس میں پاتے ہیں اس کا اتباع کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے ساتھ جگہ جگہ رسولؐ کی اطاعت کا بار بار ارشاد اور پھر مختلف عنوانات سے رسولؐ کے دیئے ہوئے احکام کو ماننے کی

ہدایات سب اسی خطرہ کے پیشِ نظر ہیں کہ کوئی شخص ذخیرۂ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی بیان کی ہوئی تفصیلات احکام کو قرآن سے الگ اور اطاعت خدا تعالیٰ سے جُدا سمجھ کر انکار نہ کر بیٹھے کہ وہ درحقیقت الگ نہیں ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ! گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(معارف القرآن ج ۲ صـ۱۷۷ تا صـ۱۸۱)

حکمِ رسول مثلِ حکمِ قرآن کے واجبُ التعمیل ہے

الفاظ آیت مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ۔ عام ہیں صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں اس لئے عام انداز میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا کوئی اور چیز آپ ﷺ کسی کو عطا فرمادیں وہ اس کو لے لینا چاہیئے اور اس کے مطابق عمل کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ اور جس چیز سے روک دیں اس سے رُکنا چاہیئے۔

بہت سے صحابہ کرامؓ نے اسی عام مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہر حکم کو اس آیت کی بناء پر قرآن حکیم ہی کا حکم اور واجبُ التعمیل قرار دیا ہے۔

قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں اٰتیٰ کے بالمقابل نہیٰ کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اٰتیٰ کے معنی یہاں اَمر کے ہیں جو نہیٰ کا صحیح مقابل ہے (اھ) اور قرآن کریم نے نہیٰ کے مقابلہ میں اَمَر کے لفظ کو چھوڑ کر اٰتیٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ شاید اس لئے فرمایا تاکہ جس مضمون کے سیاق میں یہ آیت آئی ہے۔ یعنی مال فئے کی تقسیم اس پر بھی آیت کا مضمون شامل رہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایک شخص کو احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہنے دیکھا تو حکم دیا کہ یہ کپڑے اتار دو۔ اس شخص نے کہا کہ آپ اس کے متعلق مجھے قرآن کریم میں کوئی آیت بتا سکتے ہیں جس میں سِلے ہوئے کپڑوں

کی ممانعت ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا ہاں! وہ آیت میں بتلاتا ہوں۔ پھر یہی آیت مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ پڑھ کر سُنا دی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب قرآن سے دے سکتا ہوں۔ پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ ایک محرم نے زنبور مار ڈالا تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام شافعیؒ نے یہی آیت مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ تلاوت کر کے حدیث سے اس کا حکم بیان فرمایا۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ج ۸ صفحہ ۳۷۰، صفحہ ۳۷۱)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اجتہاد

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم آیت ۳، ۴) یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب کریں اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں بلکہ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی کیا ہُوا ہوتا ہے۔ وحی کی بہت سی اقسام بخاری سے ثابت ہیں۔ ان میں ایک قسم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ سب حق تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس معنی کو اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں اس کا نام حدیث اور سُنّت ہے۔ پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالےٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملے کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے جس سے احکام رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے نکالتے اور بیان کرتے ہیں۔ اس اجتہاد میں اس کا امکان رہتا ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو احکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان کرتے ہیں ان میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ وہ اپنے غلط

اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے۔ بخلاف دُوسرے علماء مجتہدین کے ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان کی یہ خطا بھی عند اللہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ دین کے سمجھنے میں جو اپنی پوری توانائی وہ خرچ کرتے ہیں اس پر بھی ان کو الگ ثواب ملتا ہے۔ (کذا فی الاحادیث الصحیحۃ المعروفۃ)

اس تقریر سے آیت مذکورہ پر اس شُبہ کا جواب بھی ہوگیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب وحی من اللہ ہوتا ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ آپؐ اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ نہیں فرماتے۔ حالانکہ احادیث صحیحہ میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں کہ شروع میں آپؐ نے کوئی حکم دیا پھر بذریعہ وحی اس کو بدلا گیا۔ جو علامت اس کی ہے کہ یہ حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ آپؐ کی رائے اور اجتہاد سے تھا جواب اُوپر آچکا ہے کہ بعض اوقات وحی کسی قاعدہ کلیہ کی شکل میں آتی ہے جس سے احکام کا استخراج کرنے میں پیغمبر کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ قاعدہ کلیہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے آیا ہے اس لئے ان سب احکام کو بھی وحی من اللہ کہا گیا۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۱۹۴، ص ۱۹۵)

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی استنباط واستدلال کے مکلف تھے

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ (سورہ نساء آیت ۸۳)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعے احکام کے استنباط کے مکلف تھے۔ اس سے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایک رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی طرف اور

دوسرے اولو الامر کی طرف اس کے بعد فرمایا لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ - یہ حکم عام ہے جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلف تھی - (احکام القرآن للجصاص)

(معارف القرآن ج ۲ ص۴۹۳)

آنحضرتؐ کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ - (النساء) سے پانچ مسائل ثابت ہوئے :-

۱ - آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح وارد نہ ہو اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا اور مہمات کے فیصلوں میں آپؐ بہت سے فیصلے اپنے اجتہاد سے فرماتے تھے۔

۲ - دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک اجتہاد رائے وہی معتبر ہے جو قرآنی اصول اور نصوص سے ماخوذ ہو۔ خالص رائے اور خیال معتبر نہیں اور نہ اس میں شریعت میں اجتہاد کہا جا سکتا ہے۔

۳ - تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اجتہاد دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح نہ تھا جس میں غلطی اور خطاء کا احتمال ہمیشہ رہتا ہے۔ بلکہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے فرماتے تو اگر اس میں کوئی غلطی ہو جاتی تو حق تعالےٰ اس پر آپؐ کو متنبہ فرما کر آپؐ کے فیصلے کو صحیح اور حق کے مطابق کر دیتے تھے۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیا اور پھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی چیز نہ آئی تو یہ علامت اس بات کی تھی کہ یہ فیصلہ اللہ تعالےٰ کو پسند اور اس کے نزدیک صحیح ہے۔

۴ - چوتھی بات اس سے یہ معلوم ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو کچھ

قرآن حکیم سے سمجھتے تھے وہ اللہ تعالےٰ ہی کا سمجھایا ہوا کرتا تھا، اس میں غلط فہمی کا کوئی امکان نہ تھا۔

بخلاف دوسرے علماء و مجتہدین کے کہ اُن کا سمجھایا ہُوا اللہ تعالےٰ کی طرف اس طرح منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو بتلایا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے متعلق بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ وارد ہے۔

اسی وجہ سے جب ایک شخص نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے یہ کہا فَاحْكُمْ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ تو انہوں نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ہے۔

پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہُوا کہ جھوٹے مقدمہ اور جھوٹے دعویٰ کی پیروی یا وکالت کرنا یا اس کی تائید و حمایت کرنا سب حرام ہے۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۵۴۲، ص ۵۴۳)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عادات وخصائل کی ایک اور فہرست

بروایت ابوالبختری

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اگر کبھی کسی مسلمان کے متعلق کوئی ناگوار کلمہ نکل گیا ہے تو حق تعالےٰ نے اس کو اس شخص کے رحمت اور کفارہ بنا دیا۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرہؓ)

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے کبھی کسی عورت یا خادم پر لعنت و بددُعا نہیں فرمائی یہاں تک کہ ایک مرتبہ عین میدانِ جنگ میں آپؐ سے کہا گیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپؐ مخالفین کے لئے بددُعا فرماتے تو اچھا ہوتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے رحمت بنا کر بھیجا ہے، لعنت اور بددُعا کرنے کے لئے نہیں بھیجا۔ (مسلم عن ابی ہریرہؓ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے جب کبھی یہ درخواست کی گئی کہ کسی شخص مسلم یا کافر کے لئے یا کسی خاص شخص کے لئے یا جماعت کے لئے بددُعا کریں، تو آپؐ نے بجائے بددُعا کرنے کے اس کے لئے دُعا فرمائی۔

فائدہ بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرات صحابہ نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ! قبیلہ اوس کافر اور اسلام سے منکر ہو گیا، آپؐ ان پر بددُعا کیجئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ یا اللہ اس کو ہدایت کر اور مسلمانوں کا مطیع بنا کر لے آ۔

تنبیہ اور حدیث کی صحیح روایات میں جو بعض کفار کے قبائل یا افراد کے لئے آنحضرتؐ سے بددُعا یا لعنت کے الفاظ منقول ہیں، وہ صرف ان لوگوں کے حق میں ہیں جن کے متعلق آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ علم ہو گیا تھا کہ ان میں سے کوئی مسلمان نہ ہو گا، بلکہ کفر ہی کی حالت میں مریں گے۔ جیسا کہ ابوجہل، عتبہ یا رعل وذکوان وغیرہ کے لئے بددُعا کرنا۔ بخاری ومسلم کی احادیث میں منقول ہے۔ (کذا فی الاحیاء واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم)

رسول مقبول صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کبھی اپنے دستِ مبارک سے کسی کو نہیں مارا۔
بجز اس کے کہ اللہ تعالےٰ کے راستے میں کسی کو مارنا پڑے اور آپؐ کی ذات کے ساتھ کسی
نے کچھ بھی بدسلوکی کی۔ آپؐ نے کسی سے انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ حدود اللہ (امور شرعیہ) کی بیحرمتی
کسی نے کی ہو (تو اس کو سزا دی گئی) اور جب کبھی آپؐ کو دو کاموں میں اختیار دیا گیا تو
آپؐ نے ان میں سے اسی کو اختیار فرمایا جو سہل اور آسان زیادہ ہو۔ بجز اس کے کہ اس میں
کوئی گناہ یا قطع رحمی ہوتی ہو تو ایسی صورت میں آپؐ اس سے سب سے زیادہ گریز
فرماتے تھے۔ (بخاری و مسلم عن عائشہؓ)

جب کوئی شخص آزاد ہو یا غلام مرد ہو یا عورت آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم
سے اپنی کسی ضرورت میں امداد طلب کرتا تو آپؐ فوراً اس کی حاجت پوری کرنے کے
لئے کھڑے ہو جاتے۔ (بخاری عن انسؓ تعلیقا)

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے خادمِ خاص ہیں۔
مدّتوں تک خدمت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قسم ہے اُس ذات حق کی جس نے آنحضرت
صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے کہ جب کبھی مجھ سے کوئی کام آپؐ کی
مرضی کے خلاف ہو گیا تو کبھی آپؐ نے مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور جب
کبھی ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی نے مجھے ملامت بھی کی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو۔
جو کچھ ہُوا قضا و قدرت (تقدیر الٰہی) سے ہُوا۔ (بخاری و مسلم عن انسؓ)

فائدہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کام خراب کرنے والا خادم مستحق ملامت نہیں ہے، بلکہ مراد
یہ ہے کہ آقا کا کمال اخلاق اس میں ہے کہ باوجود مستحق ملامت ہونے کے اس سے
درگزر کرے اور تقدیر الٰہی کا حوالہ اس لئے دیا کہ اس پر غور کرنے سے آدمی کو
صبر آجاتا ہے اور غصّہ کم ہو جاتا ہے۔

حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کبھی کسی بستر میں
عیب نہیں نکالا بلکہ (عادت شریفہ یہ تھی کہ) اگر اہل بیت نے آپؐ کے لئے بستر بچھا دیا
تو اس پر آرام فرمایا ورنہ زمین پر لیٹ رہتے تھے۔ (قال العراقی لم اجدہ بھذا اللفظ والمعروف

ما عاب طعاماً قط۔ وہذا المضمون ایضاً مستفاد من عموم الروایات انتہی ملخصاً)۔

حق سبحانہٗ وتعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے توراۃ کی سطر اوّل میں اس طرح مدح فرمائی ہے کہ محمد اللہ کے رسول، میرے منتخب بندے ہیں۔ نہ بدمزاج بدخو ہیں، نہ بازاروں میں شور کرنے والے۔ آپؐ بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف فرماتے اور درگزر کرتے ہیں۔ جائے ولادت آپؐ کی مکّہ ہے اور جائے ہجرت طابہ (جس کو طیبہ اور مدینہ بھی کہا جاتا ہے) اور حکومت آپؐ کی شام میں ہوگی آپؐ تہمد باندھیں گے۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ قرآن اور علم الٰہی کی طرف داعی ہوں گے۔ آپؐ وضو میں اپنے ہاتھ پاؤں اور چہرہ وغیرہ دھویا کریں گے اور یہی تعریف آپؐ کی انجیل میں بھی مذکور ہے۔ (کذا فی الاحیاء للغزالی ولم یتعرض العراقی لشیئ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جس سے ملاقات ہو پہلے آپؐ خود سلام کرتے تھے (ترمذی فی الشمائل عن ہند یا ابی ہالہ)۔

آپؐ کو جب کوئی شخص کسی کام یا کلام کے لئے کھڑا کرتا تو آپؐ برابر کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ وہ شخص خود ہی لوٹ جائے۔ (طبرانی بحدیث علیؓ وابن ماجہ اور حدیث انسؓ)

آپؐ جب کسی صحابی سے ملتے تو خود مصافحہ کی ابتدا فرماتے تھے اور پھر ہاتھ میں ہاتھ اس وقت تک رکھتے جب تک وہ خود علیحدہ نہ ہو جاوے۔ (ترمذی وقال غریب)

فائدہ جس شخص سے مصافحہ کیا جاوے اس کو بشرط طاقت و فرصت اسی سنت کا اتباع کرنا چاہیئے۔ لیکن مصافحہ کرنے والوں کے ادب اور تہذیب کی بات یہ ہے کہ حالت اور موقع کو دیکھیں۔ جس وقت کوئی شخص کام میں مشغول یا بیمار و ضعیف ہو تو اس وقت اس کو مصافحہ پر مجبور کر کے تشویش و تکلیف میں نہ ڈالیں۔ کیونکہ سلام جو مصافحہ سے زیادہ مؤکد سنت ہے اس کا بھی یہی حکم ہے کہ قرآن یا وظیفہ وغیرہ پڑھنے والے یا اذان و تکبیر کہنے والے یا مدرس و واعظ کو بحالتِ وعظ و درس سلام کرنا مکروہ ہے۔ (درمختار و شامی وغیرہ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ آپؐ جب کسی مجلس سے اُٹھتے

یا اس میں بیٹھتے تو ابتداء اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کرتے تھے۔ (ترمذی فی الشمائل)

آپ کی عادت تھی کہ اگر آپؐ نماز میں مشغول ہوں اور کوئی شخص آپؐ کی زیارت کے لئے حاضر ہو تو اس کا علم ہو جانے پر نماز میں تخفیف کر دیتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو کر دریافت فرماتے تھے کہ کیا تمہارا کوئی کام ہے؟ پھر جب اس کے کام سے فارغ ہو جاتے تو پھر نماز شروع فرما دیتے تھے۔ (احیاء العلوم) حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی مجھے کوئی اصل نہیں ملی۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عام نشست یہ تھی کہ گھٹنے کھڑے کر کے دونوں ہاتھ ان پر باندھ لیتے تھے جس کو عربی میں حبوہ کہتے ہیں۔ (ابوداؤد۔ ترمذی عن ابی سعیدؓ)

رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس عام صحابہ کی مجلس سے کچھ ممتاز نہ ہوتی تھی بلکہ جب آپؐ تشریف لاتے تو جہاں موقع ملتا بیٹھ جاتے تھے۔ (ابوداؤد و نسائی عن ابی ہریرہؓ)۔

فائدہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ (آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چونکہ مجلس وغیرہ کے اعتبار سے کوئی امتیازی شان نہ رکھتے تھے اس لئے) اگر کوئی اجنبی آدمی مجلس میں پہنچتا تو اکثر آپؐ کو شناخت نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگوں سے دریافت کرنا پڑتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں کون ہیں۔ (ابوداؤد، نسائی)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کبھی نہیں دیکھا گیا کہ آپؐ مجلس میں پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوں جس سے آپؐ کے ساتھیوں کو تنگی ہو۔ ہاں اگر جگہ وسیع ہوتی تو کبھی ایسا بھی کرتے تھے اور اکثر آپؐ کی نشست رو بقبلہ ہوتی تھی (رواہ الدارقطنی فی غرائب مالک قال باطل)

اور ترمذی ابن ماجہ نے اس روایت کو باین الفاظ نقل کیا ہے کہ آپؐ اپنے زانو اپنے کسی ساتھی کی طرف نہ پھیلاتے تھے اور سند اس کی بھی ضعیف ہے۔ کذا فی تخریج العراقی

جو شخص آپؐ کے پاس آتا آپؐ اس کا اکرام و احترام فرماتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسے لوگوں کے لئے آپؐ اپنا کپڑا بچھا دیتے تھے جن سے نہ آپؐ کی کوئی قرابت ہوتی نہ رضاعی رشتہ اور اس کو اپنے کپڑے پر بٹھاتے تھے۔ (مستدرک حاکم عن انسؓ)

جو گدا یا فرش آپ کے نیچے ہوتا، آنے والے کے لئے اُس کو آپ چھوڑ دیتے اور اپنی جگہ اس کو بٹھاتے۔ اگر وہ انکار کرتا تو آپ اصرار فرما کر اپنی جگہ ہی اس کو بٹھاتے تھے۔ (احیاء)

ہر وہ شخص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کرتا یہ سمجھتا تھا کہ آنحضرتؐ اس کا سب سے زیادہ اکرام اور لحاظ فرماتے ہیں۔ آپ کی عادت تھی کہ آپ ہر ایک مجلسِ حاضر کو اپنی توجہ کا حصّہ عطا فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجلس میں آپ کی گفتگو اور آپ کے کان اور آپ کے اخلاق اور توجہ سب اہلِ مجلس کے لئے وقف ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی مجلس حیاء و تواضع اور امانت کی مجلس ہوتی تھی۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے آپ لوگوں کے لئے نرم ہو گئے اور سخت مزاج بدخو ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔ (شمائل ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو (ان کا نام لے کر نہ پکارتے تھے بلکہ) بطور تعظیم کنیت کے ساتھ پکارتے تھے۔ (بخاری و مسلم من حدیث ابی بکرؓ)

فائدہ باپ یا بیٹے کی طرف نسبت کرنے کو کنیت کہا جاتا ہے۔ عرب میں عام دستور تھا کہ نام کے ساتھ ہر شخص کی کچھ کنیت بھی مشہور ہوتی تھی۔ جیسے ابو بکرؓ، ابن عمر، ابن عباسؓ وغیرہ۔ کنیت کے ساتھ پکارنا اور ذکر کرنا تعظیم واکرام سمجھا جاتا تھا۔

اور جس شخص کی کنیت معروف نہ ہوتی تھی آپ خود اس کی کوئی کنیت مقرر فرما دیتے تھے۔ پھر وہی کنیت مشہور ہو جاتی تھی۔ (ترمذی عن انسؓ)

آپ عورتوں کا بھی کنیت سے نام لیتے تھے خواہ وہ صاحبِ اولاد ہوں یا نہ ہوں۔ (مستدرک حاکم عن ام ایمن)۔

فائدہ مطلب یہ ہے کہ کنیت کے لئے یہ ضروری نہ سمجھا جاتا تھا کہ جس شخص کے حقیقتاً اولاد موجود ہو اسی کو اولاد کے نام سے منسوب کریں بلکہ فرضی نام رکھ کر بھی کبھی یہ نسبت کر دی جاتی تھی۔ آپ کبھی بچوں کو خوش کرنے کے لئے ان کی بھی کنیت رکھ دیتے تھے۔ (بخاری ومسلم عن انسؓ)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم غُصّہ سے بہت دُور اور بہت جلد راضی ہو جانے

والے تھے۔ یعنی غصہ آپ کو جلد نہ آتا تھا اور جب آ گیا تو آپ کا راضی کرنا بھی کچھ دشوار نہ تھا۔ (ترمذی عن ابی سعید الخدریؓ)۔

آپؐ سب لوگوں پہ سب سے زیادہ شفیق اور سب لوگوں کے لئے سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ نفع پہنچانے والے تھے۔ (قال العراقی انہ من المعلوم المعروف)۔

آپؐ کی مجلس میں آوازیں بلند نہ ہوتی تھیں۔ (ترمذی عن علیؓ فی الشمائل)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جب کسی مجلس سے کھڑے ہوتے تو یہ دُعا پڑھا کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ دُعا مجھ کو جبرئیل علیہ السلام نے بتلائی ہے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ - (نسائی فی عمل الیوم واللیلۃ)

فائدہ یہ دُعا کفارۂ مجلس کہلاتی ہے۔ یعنی مجلس کے اندر جو کوئی بُرا کلمہ زبان سے نکل گیا ہو اس سب کا اس دُعا سے کفارہ ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کرنے اور ہنسی کا بیان

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کلام سب سے زیادہ فصیح و بلیغ اور آپؐ کی گفتگو سب سے زیادہ شیریں ہوتی تھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ میں افصح العرب ہوں (طبرانی عن ابی سعیدؓ) اور یہ کہ اہلِ جنت، جنت میں محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ کلام پر کلام کیا کریں گے۔ (مستدرک حاکم عن ابن عباسؓ)

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کم گو اور صاف وسلیس کلام کرنے والے تھے۔ آپؐ جب کلام فرماتے تو فضول باتیں نہ کرتے تھے، آپؐ کا کلام موتیوں کی لڑی کی طرح ہوتا تھا۔ (طبرانی عن ام سعیدؓ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس طرح مسلسل گفتگو نہ فرماتے تھے جس طرح عام طور پر لوگ کرتے ہیں، بلکہ آپؐ کا کلام

مختصر (جامع) ہوتا تھا۔ (بخاری ومسلم)

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بہت مختصر کلام فرماتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی جامع اور مقصود کو پورا واضح کرنے والا کلام ہوتا تھا۔ (عبد بن حمید بن عمر بسند منقطع والدارقطنی عن ابن عباس بسند جید)۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جوامع کلم کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے جس میں نہ کوئی زیادہ بات ہوتی اور نہ مقصود کے سمجھانے میں کوئی کمی ہوتی تھی۔ آپؐ کی گفتگو ٹھہر ٹھہر کر ایک جملہ کے بعد دوسرا جملہ کچھ توقف کے ساتھ ہوتا جس کو سننے والا خوب سمجھ کر یاد کر سکتا تھا۔ (شمائل ترمذی عن ہند بن ابی ہالہ)

رسول مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بلند آواز اور خوش آواز تھے۔

(ترمذی النسائی عن صفوان)

آپؐ طویل السکوت تھے۔ بغیر ضرورت کے کوئی کلام نہ فرماتے تھے۔ (شمائل ترمذی عن ہند ابن ابی ہالہ)۔

کوئی خلاف شرع بات آپؐ کی زبان سے نہ نکلتی تھی۔ راضی و ناراضی دونوں حالتوں میں حق کے خلاف کوئی کلمہ زبان مبارک پر نہ آتا۔ (ابوداؤد عن عمرؓ)

جو شخص کوئی نامناسب گفتگو کرتا تو آپؐ اس سے اعراض فرماتے۔ (شمائل ترمذی عن علیؓ)

کوئی ناپسندیدہ بات کہنے پر کبھی مجبوری ہی ہوتی تو اس کو آپؐ (صاف لفظوں میں نہ فرماتے تھے بلکہ) کنایہ و اشارہ سے کام لیتے تھے (مستفاد من حدیث عائشہ عند البیہقی)۔

آپؐ جب سکوت فرماتے تو صحابہ کرامؓ گفتگو کرتے مگر آپؐ کے مجمع میں کسی بات پر جھگڑا اور نزاع کبھی نہ ہوتا تھا۔ (شمائل ترمذی عن علیؓ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا وعظ و پند قوت و تاکید اور خیر خواہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن پاک کی ایک آیت کو کسی دوسری آیت کے خلاف نہ سمجھو۔ کیونکہ وہ مختلف لغات پر نازل ہوا ہے۔

(طبرانی عن ابی عمرؓ)

فائدہ جیسے اُردو میں مختلف شہروں کے مختلف محاورے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں اختلافات ہیں ایسے ہی عرب کے قبائل میں بھی محاورات کا اختلاف تھا اور قرآن مجید مختلف محاورات پر نازل ہُوا تھا جو معنی کے اعتبار سے متحد تھے۔ اس لئے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے متنبہ فرما دیا کہ اس لفظی اختلاف کی وجہ سے شُبہ میں نہ پڑو۔ اور چونکہ عجم میں ان مختلف لغات کی وجہ سے غلط فہمی کا اندیشہ محسوس ہُوا تو حضرت عثمان غنیؓ نے باجماع صحابہ ان سب لغات میں سے صرف ایک ہی لغت پر قرآن مجید پڑھنے اور لکھنے کا حکم دے دیا وہی آج تک شائع اور محفوظ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ بہت خوش روئی اور تبسم کے ساتھ پیش آتے اور وہ کوئی عجیب واقعہ بیان کرتے تو ان کے ساتھ تعجب میں شریک ہوتے اور سب کے ساتھ ملے جُلے رہتے تھے۔ (ترمذی عن عبد اللہ بن حارث بن جزءؓ)

بعض اوقات آپؐ اس طرح بھی ہنستے تھے کہ دندان مبارک ظاہر ہو جاتے تھے۔ (بخاری ومسلم عن ابن مسعودؓ)۔

حضرات صحابہ کا ہنسنا بھی آپؐ کی مجلس میں آپؐ کی اقتداء و تعظیم کی وجہ سے تبسم کی حد سے نہ بڑھتا تھا۔ (شمائل ترمذی عن ہند ابن ابی ہالہ)۔

حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں والا (اعرابی) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ چہرۂ مبارک پر کچھ رنج وغصہ کا اثر ہے۔ اس نے آپؐ سے کچھ بات دریافت کرنی چاہی۔ صحابہ کرامؓ نے منع کیا کہ اس وقت آپؐ سے گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔ اعرابی نے کہا کہ تم مجھے چھوڑ دو، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے۔ مَیں آپؐ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپؐ تبسم نہ فرماویں، پھر یہ اعرابی سامنے آیا اور آنحضرتؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ آخر زمانہ میں جس وقت لوگ بھوک سے مر رہے ہوں گے تو دجال لوگوں کے سامنے بہت سا ثرید (شوربہ میں توڑی ہوئی روٹی) لے کر آئے گا۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ مجھے رائے دیجئے کہ اس وقت اس کے ثرید سے علیحدہ رہوں

یہاں تک کہ بھوک سے مرجاؤں۔ یا ایسا کروں کہ اس کے ثرید میں خوب ہاتھ ماروں اور جب خوب شکم سیر ہو جاؤں تو پھر اللہ تعالیٰ پر ایمان کا اور اس کے ساتھ کفر و انکار کا اعلان کر دوں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس کی بات سن کر اس قدر ہنسی آئی کہ دندانِ مبارک ظاہر ہو گئے۔ (قال العراقی ہو حدیث منکر لم اقف علی اصل)۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سب سے زیادہ تبسم وانبساط فرمانے والے تھے۔ بجز اس وقت کہ کے آپ پر کوئی آیت قرآن نازل ہو یا قیامت کا ذکر آجاوے یا آپ کوئی خطبہ دے رہے ہوں۔ (الطبرانی من حدیث جابر فی مکارم الاخلاق)

مطلب یہ ہے کہ نزول قرآن اور ذکر قیامت اور وعظ و خطبہ کے وقت آپ پر ایک خاص ہیبت وجلال کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت وہ کیفیت انبساط نہ رہتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حالت رضا میں سب سے زیادہ خوش طبع و خوش مزاج تھے اور جب وعظ فرماتے تھے تو ہیبت وجلال کے ساتھ فرماتے۔ غصہ نہ ہوتے مگر صرف حدود اللہ کی خلاف ورزی پر اور جب آپ کو غصہ آجاتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کے سامنے ٹھہر سکے۔ تمام معاملات میں آپ کا یہ حال تھا کہ جب کوئی حادثہ آپ کو پیش آتا تو معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد فرمادیتے اور اپنی قوت و تدبیر سے عجز کا اعتراف فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے مفید تدبیر و طریق عمل کی دعا مانگتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْحَقَّ حَقًّا فَاَتَّبِعَہٗ وَاَرِنِی الْمُنْکَرَ مُنْکَرًا وَارْزُقْنِی اجْتِنَابَہٗ وَاَعِذْنِی مِنْ اَنْ یَّشْتَبِہَ عَلَیَّ وَاَتَّبِعَ ھَوَایَ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنْکَ وَاجْعَلْ ھَوَایَ تَبَعًا لِطَاعَتِکَ وَخُذْ رِضَا نَفْسِکَ مِنْ نَّفْسِیْ فِیْ عَافِیَۃٍ وَّاھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

ترجمہ:۔ یا اللہ! حق کو میری نظر میں حق ظاہر کر دے تاکہ میں اس کا اتباع کروں اور باطل ومنکر کو میری نظر میں باطل ظاہر کر دے اور اس سے باز رہنے کی مجھے توفیق دے اور مجھے اس سے پناہ دے کہ حق و باطل مجھ پر مشتبہ ہو جاوے اور میں بغیر آپ کی ہدایت کے اپنی خواہش کا اتباع کرنے لگوں۔ یا اللہ! میری خواہش کو اپنی اطاعت کے تابع بنادے

اور میرے نفس سے عافیت کے ساتھ وہ کام لے لے جو تیری مرضی کے مطابق ہوں اور جس چیز میں اختلاف پیش آوے اس میں مجھے صحیح راستہ کی ہدایت فرما۔ کیونکہ آپ جس کو چاہیں سیدھے راستہ کی ہدایت فرما سکتے ہیں۔ (ابن حبان فی کتاب اخلاق النبیؐ عن ابی عمر والدعاء المذکور قال العراقی لم اقف لہٗ علیٰ اصل وردی المستغفری مانیا سبہ)۔

کھانے کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات و اخلاق

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم دکو کسی قسم کے کھانے میں کوئی تکلف نہ تھا) جیسا کھانا مل جاتا تناول فرما لیتے اور آپؐ کو سب سے زیادہ وہ کھانا پسند تھا جس پر بہت سے ہاتھ (کھانے والوں کے) جمع ہوں۔ (ابویعلی والطبرانی فی الاوسط وابن عدی فی الکامل من حدیث جابرؓ بسند حسن)۔

جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے کھانا رکھا جاتا تو آپؐ یہ دُعا پڑھتے تھے:

بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا نِعْمَۃً مَّشْکُوْرَۃً تَصِلُ بِھَا نِعْمَۃَ الْجَنَّۃِ۔

(ترجمہ) بسم اللہ، یا اللہ! اس کو ایسی نعمت بنا دے جس پر شکر ادا کیا گیا ہو اور جس کو نعمتِ جنت کے ساتھ آپ متصل فرما دیں۔"[1]

کھانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نشست بکثرت یہ ہوتی تھی کہ دونوں گھٹنوں اور دونوں قدموں کو ملا کر بیٹھتے تھے۔ جیسے نمازی بیٹھتا ہے[2] لیکن ایک گھٹنا دوسرے گھٹنا پر اور ایک قدم دوسرے قدم پر ہوتا تھا۔ اور آپؐ فرماتے تھے کہ میں ایک بندہ ہوں اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھایا کرتے ہیں اور اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح غلام بیٹھتا ہے۔ (عبدالرزاق فی المصنف)

---

[1] التسمیۃ علی الطعام رواہا الجماعۃ و اما بقیۃ الحدیث فقال العراقی لم اجدہ ۱۲ منہ

[2] اس ہئیت کو عربی میں تورک کہتے ہیں جو عورتوں کے نماز میں بیٹھنے کی ہئیت معروف ہے۔ شافعیہ کے نزدیک مردوں کے لئے بھی یہی ہئیت نماز میں مسنون ہے۔ ۱۲ ❊

فائدہ کھانے کے وقت آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی کیفیت نشست چند طریقہ سے منقول ہے جن میں سے ایک طریقہ وہ ہے جو بحوالہ سند عبدالرزاق مذکور ہوا۔

دوسرا یہ ہے کہ بایاں پاؤں بچھالیا جاوے اور داہنا گھٹنہ کھڑا کر لیا جاوے۔ (رواہ ابن الضحاک فی الشمائل من حدیث انسؓ بسند ضعیف)۔

تیسرا طریقہ ہے دونوں گھٹنے نماز کی نشست کی طرح بچھا لئے جاویں (ابوالشیخ فی اخلاق النبیؐ) کذا فی تخریج العراقی)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ زیادہ گرم کھانے میں برکت نہیں ہے اور یہ کہ اللہ تعالےٰ نے ہمیں آگ نہیں کھلائی۔ اس لئے چاہیئے کہ کھانے کو کچھ ٹھنڈا کر لیا جاوے (تیز گرم نہ کھایا جاوے) بیہقی عن ابی ہریرہؓ بسند صحیح۔

آپؐ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ اپنے سامنے سے کھانا تناول فرماتے تھے۔ طشت یا پلیٹ کے چاروں طرف سے نہ کھاتے تھے۔ (ابن حبان عن عائشہ وقد تکلم فی اسنادہ)۔

کھانا تین انگلیوں سے تناول فرماتے تھے (مسلم) اور بعض اوقات چوتھی انگلی کو بھی شامل فرما لیتے تھے۔ (روی فی الغیلانیات من حدیث عامر بن وجیہ)۔

فائدہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بروایت زہری مرسلاً منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کبھی) پانچ انگلیوں سے بھی کھانا تناول فرماتے تھے (صرف دو انگلیوں سے آپؐ کبھی کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔ اس کے متعلق آپؐ کا ارشاد تھا کہ یہ طریقہ شیطان کے کھانے کا ہے۔ (دار قطنی عن عباسؓ بسند ضعیف)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ ایک مرتبہ آپؐ کے لئے ایک قسم کا حلوہ لائے آپؐ نے تناول فرمایا اور دریافت کیا کہ یہ حلوہ کس چیز کا ہے؟ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ ہم اوّل گھی اور شہد کو ملا کر چولھے پر رکھتے ہیں جب اس کو جوش آجاتا ہے تو کچھ سوجی اس میں ڈال کر پکا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ حلوہ تیار ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کھانا بہت اچھا ہے۔

(بیہقی فی الشعب عن لیث ابن ابی سلیم بلفظ الخبیص)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم بے چھنے ہوئے جَو کے آٹے کی روٹی تناول فرماتے تھے۔ (بخاری عن سہل بن سعدؓ)

آپؐ ککڑی کو (کبھی) کھجور کے ساتھ اور کبھی نمک کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔ (کھجور کی روایت بخاری ومسلم کی ہے اور نمک کی روایت ابن حبان اور ابن عدی نے بسند ضعیف نقل کی ہے)۔

تمام پھلوں میں آپؐ کو خربوزہ اور انگور زیادہ پسند تھے (ابو نعیم فی الطب النبوی) آپؐ خربوزہ کو کبھی روٹی سے اور کبھی شکر کے ساتھ تناول فرماتے تھے۔

فائدہ حافظ عراقی کہتے ہیں کہ خربوزہ کو روٹی کے ساتھ کھانے کی روایت مجھے کہیں نہیں ملی۔ البتہ انگور کو روٹی کے ساتھ کھانا منقول ہے۔ (کما رواہ ابن عدی) اور شکر کے ساتھ کھانے کا اگر مطلب یہ ہے کہ میٹھی چیز مثل کھجور وغیرہ کے ساتھ تناول فرمایا تو یہ صحیح اور منقول ہے اور اگر شکر سے مراد معروف شکر ہے تو اس کی کوئی اصل بجز ایک نہایت ضعیف ناقابلِ اعتبار روایت کے مجھے نہیں ملی۔

اور بسا اوقات آپؐ خربوزہ کو کھجور کے ساتھ بھی تناول فرماتے تھے (ترمذی نسائی)

اور خربوزہ کے کھانے میں آپؐ دونوں ہاتھوں سے کام لیتے تھے اور ایک مرتبہ کھجور داہنے ہاتھ میں اور اس کی گٹھلیاں بائیں ہاتھ میں جمع فرماتے رہے۔ پھر ایک بکری سامنے آئی تو گٹھلیاں اس کے آگے کر دیں۔ بکری آپؐ کے بائیں دستِ مبارک سے گٹھلیاں کھاتی رہی اور آپؐ داہنے ہاتھ سے کھجور تناول فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ فارغ ہو گئے اور بکری بھی چلی گئی۔ (دونوں ہاتھوں سے خربوزے وغیرہ کا تناول فرمانا مسند احمد میں اور بکری کا واقعہ فوائد ابی بکر شافعی میں منقول ہے۔)

بعض اوقات آپؐ انگور کو گچھے سے تناول فرماتے تھے کہ انگور کے دانے آپؐ کی ریشِ مبارک پر موتیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ (ابن عدی فی الکامل الضعف)

اور آپؐ کا اکثر کھانا کھجور اور پانی ہوتا تھا۔ (بخاری عن عائشہؓ)

آپؐ کھجور کو دودھ کے ساتھ جمع فرماتے اور ان کا نام اطیبین رکھتے تھے اور آپؐ کا سب سے زیادہ مرغوب کھانا گوشت تھا۔ فرماتے تھے کہ گوشت قوت سامعہ کو بڑھاتا

ہے اور گوشت دُنیا و آخرت میں سید الطعام ہے اور اگر میں اپنے رب سے دُعا کرتا کہ مجھے روزانہ گوشت عطا فرمائیں تو ضرور عطا فرماتے۔ (ابن حبان)

آپؐ ثرید کو گوشت اور کدو کے ساتھ تناول فرماتے تھے (ثرید شوربے میں چوری ہوئی روٹی کو کہتے ہیں)۔ (مسلم عن انسؓ)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کدو سے بہت رغبت تھی اور فرماتے تھے کہ میرے بھائی یونسؑ کا درخت ہے۔ (مسلم عن ابی ہریرہؓ)

حضرت ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ "اے عائشہؓ! جب تم ہنڈیا پکاؤ تو اس میں کدو زیادہ ڈالو۔ کیونکہ وہ غمگین دل کو مضبوط کر دیتا ہے۔ (فوائد ابو بکر شافعی۔ تخریج عراقی)

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پرندہ شکار کا گوشت تناول فرماتے تھے (تخریج بحوالہ ترمذی)۔

لیکن نہ خود شکار کے پیچھے پڑتے نہ شکار کرتے تھے (بلکہ) پسند یہ تھا کہ شکار کرنے والے شکار کر کے لاویں تو آپؐ بھی تناول فرمالیں اور جب آپؐ گوشت تناول فرماتے تو گوشت کی طرف سر نہ جھکاتے تھے، بلکہ گوشت ہاتھ سے اٹھاتے اور دندان مبارک سے کاٹ کر کھاتے تھے۔ (تخریج ہر مزابی داؤد)

آپؐ (کبھی) روٹی گھی کے ساتھ بھی تناول فرماتے تھے (بخاری و مسلم تخریج)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بکری کے گوشت میں دست اور ہنڈیہ کی ترکاری میں کدو اور سالن میں سرکہ اور کھجور میں عجوہ پسند تھا۔ (تخریج برمز بخاری و مسلم و ابن ماجہ)

آپؐ نے کھجور کی قسم عجوہ کے لئے برکت کی دُعا فرمائی اور فرمایا کہ یہ جنت کا پھل ہے اور زہر اور سحر کے اثر سے شفاء ہے۔ (تخریج بحوالہ بزار و الطبرانی فی الکبیر)

---

[1] حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے تو نہایت ضعیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کدو کا درخت اگایا اس کے کھانے سے ان کو صحت و قوت حاصل ہو گئی ۱۲ منہ

اور تر کاریوں میں آپؐ کو ہندباء (کاسنی اور بازروج[1] اور خرفہ پسند تھا۔ (ابونعیم فی الطب النبوی من حدیث ابن عباسؓ)

کلیجی گردہ کا گوشت آپؐ کو پسند نہ تھا کیونکہ یہ پیشاب کے متصل رہتا ہے۔ (من حدیث ابن عباس باسناد ضعیف)۔

بکری کی سات چیزیں آپؐ تناول نہ فرماتے تھے، عضو مخصوص، انثیین، مثانہ، پتہ غدود، موضع بول و براز۔ ان چیزوں کو آپؐ مکروہ سمجھتے تھے۔ (ابن عدی والبیہقی باسناد ضعیف)

آپؐ لہسن، پیاز، کراث (گندنا) تناول نہ فرماتے تھے۔ (مالک فی المؤطا)

فائدہ لہسن پیاز وغیرہ جن میں بدبو ہے اس کا کھانا اگرچہ دوسروں کے لئے جائز ہے۔ مگر جب تک بدبو کو دور نہ کریں کھا کر مسجد میں جانا مکروہ ہے اور ایسی حالت میں نماز و تلاوت بھی خلافِ ادب ہے۔ (مترجم)

آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کبھی کسی کھانے کو بُرا نہیں کہا بلکہ (عادت یہ تھی کہ) اگر پسند آیا کھا لیا۔ ناپسند ہُوا ترک کر دیا اور جس کھانے سے خود اپنے کو طبعی نفرت بھی ہوتی تو دوسروں کے لئے اس کو مبغوض و مکروہ نہیں ٹھہرایا۔ (مستفاد من حدیث الصحیحین)

آپؐ گوہ اور تلّی سے نفرت کرتے تھے مگر ان کو دوسروں کے لئے حرام نہ قرار دیتے تھے۔

فائدہ حنفیہ کے نزدیک دوسری روایات حدیث کی بناء پر گوہ حرام ہے۔ مگر تلّی کا حکم سب کے نزدیک ایک ہی ہے کہ حرام نہیں۔

آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کھانے کے بعد انگلیوں سے پلیٹ کو صاف کرتے اور چاٹ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ کھانے کے آخری حصّہ میں زیادہ برکت ہوتی ہے۔ (البیہقی فی الشعب من حدیث جابرؓ) اور انگلیوں کو چاٹ کر صاف کر دیتے اور ہاتھوں کو رومال وغیرہ سے اس وقت تک صاف نہ کرتے تھے جب تک ایک ایک انگلی کو چاٹ نہ لیں اور فرماتے تھے کہ کسی کو خبر نہیں کہ کھانے کے کون سے حصّے میں برکت (یعنی بدن انسانی

---

[1] بازروج نوعی است از ریحان کوہی کہ بر دامن کوہ می روید وبعضی گفتہ اند ترہ ایست۔ ۱۲ (منتخب اللغات)

کے لئے غذا کا اصل (نفع) زیادہ ہے۔ (مسلم من حدیث کعب بن مالک و جابر و البیہقی فی الشعب عنہ)۔

جب آپؐ کھانے سے فارغ ہو جاتے تو یہ دُعا پڑھتے تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَطْعَمْتَ فَاَشْبَعْتَ وَسَقَيْتَ فَاَرْوَيْتَ لَكَ الْحَمْدُ غَيْرَ مَكْفُوْرٍ مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ۔

(طبرانی من حدیث الحارث بن الحارثؓ بسند ضعیف)

ترجمہ:- یا اللہ! آپ کے لئے حمد و ثناء ہے۔ آپ نے ہی کھانا کھلایا تو پیٹ بھرا اور پانی پلایا تو پیاس دُور ہوئی۔ آپ کے لئے شکر ہے، نہ آپ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں نہ اس کو بالکل رخصت کرتے ہیں نہ ہم اس سے مستغنی ہیں"۔

جب آپؐ روٹی اور گوشت تناول فرماتے تو خصوصیت سے ہاتھوں کو اچھی طرح دھوتے۔ پھر جو پانی کا اثر ہاتھوں پہ رہتا تو اُس کو چہرۂ انور پر مل لیتے تھے۔

(ابو یعلی من حدیث ابن عمرؓ باسناد ضعیف)

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عادت شریفہ پانی پینے میں یہ تھی کہ تین سانس میں پیتے تھے اور ہر سانس کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہتے تھے۔ (الطبرانی فی الاوسط من حدیث ابی ہریرہؓ و رجالہ ثقات) اور بعض اوقات ایک سانس میں بھی پی لیتے تھے۔ (ابو الشیخ من حدیث زید بن ارقم باسناد ضعیف)۔

نیز پانی کو چُوس چُوس کر پیتے تھے اور ایک دفعہ ہی نہ چڑھاتے تھے۔ (البغوی والطبرانی وابن عدی وغیرہ من حدیث بہز واسنادہ ضعیف)۔

اور بچا ہُوا پانی اپنی داہنی طرف کے آدمی کو دیتے تھے۔ لیکن اگر بائیں جانب میں کوئی ایسا آدمی ہوتا جو درجہ میں داہنی جانب والے سے بڑا ہے تو اس سے فرماتے کہ حق تمہارا ہے لیکن تم اجازت دے دو تو میں اُن کو دے دوں۔ (اس کی اجازت سے بائیں جانب والے کو عطا فرماتے تھے۔

(بخاری و مسلم من حدیث سعل بن سعد)

آپؐ برتن کے اندر سانس نہ چھوڑتے تھے بلکہ (سانس لینے کے وقت) برتن سے مُنہ ہٹا لیتے تھے۔ (مستدرک حاکم من حدیث ابی ہریرہؓ وقال صحیح الاسناد)

ایک مرتبہ ایک برتن آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا جس میں دودھ اور شہد تھا۔ آپؐ نے پینے سے انکار فرما دیا اور فرمایا:۔

"ایک شربت میں دو شربت اور ایک برتن میں دو کھانے"

پھر فرمایا:۔

"مَیں اس کو حرام نہیں کہتا۔ لیکن مَیں فخر کی چیز کو اور زائد از حاجت دنیا کو جس کا کل بروز قیامت حساب دینا پڑے پسند نہیں کرتا۔ تواضع (دلپستی) کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے لئے تواضع کرتا ہے اس کو اللہ تعالےٰ بلند کر دیتے ہیں"

(البزار من حدیث طلحہ بن عبید اللہ بسند ضعیف)

فائدہ مطلب یہ ہے کہ دُودھ اور شہد دونوں مستقل غذائیں اور مستقل چیزیں ہیں۔ دونوں کو ایک جگہ جمع کرنا سید الانبیا صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی شان فقر و تواضع کے شایان نہ تھے۔

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اپنے گھر میں کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیاد کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر والوں سے کسی کھانے کا مطالبہ نہ فرماتے تھے اور کسی خاص چیز کی خواہش کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ پیش کر دیا تناول فرمایا اور جو دے دیا قبول کر لیا جو پلایا پی لیا۔ (بخاری و مسلم من حدیث ابی سعیدؓ)

آپؐ کبھی خود کھڑے ہو کر اپنے دستِ مبارک سے کھانے پینے کی چیزیں بھی لے لیتے اور تناول فرما لیتے تھے۔

(ابو داؤد من حدیث ام المنذر)

لباس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات واخلاق

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو لباس کے بارے میں بھی کوئی اہتمام و تکلف نہ تھا۔ جو کپڑا، تہبند یا چادر یا کرتہ یا جبّہ وغیرہ مل گیا اسی کو زیب تن فرمالیا کرتے تھے۔

(بخاری ومسلم من حدیث عائشہ رضؓ)

آپؐ کا اکثر لباس سفید رنگ کا ہوتا تھا اور فرماتے تھے کہ ایسا ہی (یعنی سفید) لباس اپنے زندہ آدمیوں کو پہناؤ اور اسی میں مُردوں کو کفن دو۔ (ابن ماجہ، مستدرک حاکم وقال صحیح الاسناد)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم روئی دار قبا بلا جنگ اور جنگ میں بھی استعمال فرماتے تھے۔ (بخاری ومسلم من حدیث المسور بن مخرمہ)

بادشاہ اکیدر دومہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ایک جُبّہ سبز ریشم کا جس میں سونے کی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں ہدیہ میں پیش کیا۔ آپؐ نے قبول فرمالیا اور بعض روایات میں ہے کہ مَردوں کے لئے ریشمی لباس پہننے کی ممانعت سے پہلے آپؐ نے ایک روز اس کو استعمال بھی فرمایا تھا پھر نکال دیا (مسلم من حدیث جابر رضؓ) اس کے بعد مَردوں کے لئے ریشمی لباس حرام کردیا گیا۔ (صحیحین ومسند احمد)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سب کپڑے کُرتہ، قباء، چادر وغیرہ ٹخنوں سے اُوپر رہتے تھے اور تہبند اس سے بھی اُوپر نصف ساق تک رہتا تھا۔ (ابوالفضل محمد بن طاہر فی کتاب صفوۃ التصوف باسناد ضعیف ویؤیدہ روایۃ المستدرک من حدیث ابن عباسؓ و روایت الترمذی فی الشمائل من حدیث الاشعب)۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قمیص مبارک کی گھنڈیاں اکثر لگی رہتی تھیں اور بعض اوقات نماز و خارج نماز میں کُھلی بھی رہتی تھیں۔

(ابوداؤد وابن ماجہ شمائل ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ایک چادر زعفران میں رنگی ہوئی تھی اور بسا اوقات یہ چادر اوڑھ کر آپؐ نے نماز بھی پڑھائی۔ (ابوداؤد و ترمذی من حدیث قیلہ بن مخرمہ)

ف ۔ یہ حکم ممانعت سے پہلا ہے۔ بعد میں زعفران کا رنگا ہوا کپڑا ممنوع کر دیا گیا۔ (مترجم)

بعض اوقات آپؐ صرف ایک بڑی چادر پہنتے تھے اور کوئی کپڑا اس کے نیچے نہ ہوتا تھا۔ (ابن ماجہ، ابن خزیمہ، من حدیث ثابت بن الصامت)

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس ایک دوہری چادر تھی جس کو آپؐ استعمال فرماتے۔ ارشاد فرماتے تھے کہ میں (خدا تعالےٰ کا) ایک بندہ ہوں۔ ایسا ہی لباس پہنتا ہوں جیسا غلام پہنا کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم من حدیث ابی بردہ)

جمعہ[1] کے لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے دو کپڑے مخصوص تھے جو صرف جمعہ کے وقت زیبِ تن فرماتے تھے بعد میں لپیٹ کر رکھ دیئے جاتے تھے۔

بعض[2] اوقات آپؐ صرف ایک تہبند استعمال فرماتے تھے جس کی گرہ پشت پر دونوں شانوں کے درمیان لگاتے تھے اور بعض[3] اوقات اسی لباس میں جنازہ کی نماز پڑھائی اور بعض[4] اوقات اپنے گھر میں اسی ایک تہبند میں لپٹ کر نماز ادا فرماتے تھے۔ اور بعض[5] اوقات آپؐ صرف ایک کپڑے میں نماز ادا فرماتے تھے جس کو تہبند کے طور پر باندھ کر بچے ہوئے حصے کا ایک گوشہ بطور چادر استعمال فرماتے اور دوسرا گوشہ بعض ازواجِ مطہراتؓ پر ڈال دیتے تھے۔

آنحضرت[6] صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ایک چادر سیاہ رنگ کی تھی جو آپؐ نے کسی کو ہبہ کر دی۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے دریافت کیا کہ آپؐ کی وہ چادر کیا ہوئی؟ آپؐ

---

[1] الطبرانی فی الاوسط والصغیر من حدیث عائشہؓ بسند ضعیف ۱۲۔ [2] بخاری و مسلم ۱۲ [3] قال العراقی لم اقف علیہ ۱۲ [4] ابوالعلی باسناد حسن من حدیث معاویہ ۱۲ [5] ابوداؤد من حدیث عائشہؓ ۱۲۔

[6] قال العراقی لم اقف علیہ من حدیث ام سلمہ و مسلم من حدیث عائشہؓ خرج النبیؐ مرط مرجل اسود و لابی داؤد والنسائی صنعت والنبی صلی اللہ علیہ وسلم بردۃ سوداء من صوف فلبسہا ۱۲ ؞

نے فرمایا کہ میں نے کسی کو دے دی۔ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا کہ یہ سیاہ چادر آپؐ کے سفید رنگ پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

ایک[۱] مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز صرف ایک کپڑے میں پڑھائی جس کے دونوں پلوں کو باندھ دیا تھا۔

انگشتری

آنحضرت[۲] صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انگشتری استعمال فرماتے تھے۔ بعض اوقات آپؐ باہر تشریف لاتے تو آپؐ کی انگشتری میں ایک دھاگہ بندھا ہوتا تھا جس کے ذریعہ کسی کام کو یاد رکھنا مقصود تھا۔

اس انگشتری سے آپؐ خطوط پر مہر ثبت فرماتے تھے جس کی ابتداء یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ آپؐ نے شاہ روم کے نام خط لکھنے کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ لوگ کسی کا خط اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک اس پر مہر نہ ہو تو آپؐ نے چاندی کی مُہر بنوا لی۔
(بخاری و مسلم)

ٹوپی

آنحضرت[۳] صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عمامہ کے نیچے اور بدون عمامہ کے بھی ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سفید ٹوپی استعمال فرماتے تھے اور[۴] ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ کے پاس تین ٹوپیاں تھیں۔ ایک ٹوپی سفید سُوئی سے کام کی ہوئی اور ایک ٹوپی یمنی چادر سے بنی ہوئی اور ایک ٹوپہ کانوں والا جس کو سفر میں استعمال فرماتے تھے اور بعض اوقات اس کو نماز پڑھنے کے وقت آگے رکھ دیتے تھے۔

---

[۱] بزار و ابویعلی عن انس ۱۲ [۲] الشیخان من حدیث ابن عمرؓ و انسؓ [۳] عد من حدیث واثلہ بسند ضعیف ۱۲۔
[۴] الطبرانی و ابوالشیخ و البیہقی فی شعب الایمان من حدیث ابن عمرؓ [۵] رواہ ابوالشیخ و اسناد ضعیف

عمامہ

بعض[1] اوقات عمامہ نہ ہوتا تو سرِ مبارک اور پیشانی پر ایک عصابہ باندھتے تھے۔ (یعنی پٹی کی طرح ایک چھوٹا کپڑا) آپؐ کے ایک عمامہ کا سحاب نام تھا وہ آپؐ[2] نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرما دیا۔ پھر جب حضرت علیؓ اس کو باندھ کر تشریف لائے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "علی تمہارے پاس سحاب میں آئے ہیں"

عادت[3] شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی کپڑا پہنتے تو داہنی طرف سے شروع کرتے اور یہ[4] دُعا پڑھتے تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ مَا اُوَارِیْ بِہٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِہٖ فِی النَّاسِ۔

(ترجمہ: شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے مجھے وہ کپڑا عطا کیا جس سے میں اپنا ستر چھپاؤں اور لوگوں میں زینت و تجمل حاصل کروں۔")

اور جب[5] کوئی کپڑا نکالتے تو پہلے بائیں جانب سے نکالتے تھے۔

آپؐ[6] جب نیا کپڑا استعمال فرماتے تو پرانا کسی مسکین کو عطا فرما دیتے تھے اور یہ ارشاد ہوتا کہ جو مسلمان اپنا پرانا کپڑا کسی مسکین کو پہنا دے اور اس سے اس کی غرض بجز رضائے حق تعالیٰ کے کچھ نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے ضمان اور حفاظت میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو اچھا[7] لباس عطا فرماتے ہیں زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

بستره

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ایک بستره تھا چمڑے کا جس میں کھجور کا گودہ بھرا

---

[1] بخاری من حدیث ابن عباسؓ ۱۲ [2] ابن عدی ابوالشیخ وہو مرسل ضعیف ۱۲ محمد شفیع عفی عنہ [3] ترمذی من حدیث ابی ہریرہ درجالہ رجال الصحیح ۱۲ [4] ترمذی وقال غریب ۱۲ [5] ابوالشیخ من حدیث ابن عمر بسند ضعیف ۱۲ از تخریج عراقی۔ [6] اخرجہ الحاکم فی المستدرک والبیہقی فی الشعب من حدیث عمرؓ ۱۲ [7] حدیث کے جو الفاظ اس جگہ منقول ہیں وہ یہ ہیں خیره حیاً ومیتاً۔ احقر نے اسکا خلاصہ مفہوم وہی سمجھا ہے جو ترجمہ میں لکھا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم ۱۲ منہ محمد شفیع عفی عنہ

ہُوا تھا۔ اس کی لمبائی دو ذراع کے قریب تھی اور چوڑائی ایک ذراع (ایک بالشت) کے قریب تھی۔ (بخاری و مسلم بدون ذکر الطول والعرض)۔

فائدہ ذراع کا لفظ کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اصل لغت میں تو کہنی تک ہاتھ کو کہتے ہیں اور کبھی معروف گز کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اور اس جگہ بظاہر یہی مراد معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ذراع بمعنی ہاتھ کے حساب سے اس کی پیمائش بہت کم رہتی ہے۔ اس پر آدمی لیٹ نہیں سکتا اور ابوالشیخ کی روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا بستر اتنا لمبا چوڑا ہوتا تھا جیسے انسان کو قبر میں لٹایا جاوے۔ (ذکرہ فی تخریج العراقی)

آنحضرت[1] صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ایک عباء تھی جو اکثر آپؐ کے نیچے دوتہہ کر کے بچھادی جاتی تھی۔

اور بعض[2] اوقات آپؐ کھلے بوریئے پر آرام فرماتے کہ آپؐ کے نیچے بجز بوریئے کے کچھ نہ ہوتا تھا۔

استعمالی چیزوں کا نام رکھنا

آنحضرت[3] صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اپنے جانوروں، ہتھیاروں اور گھر کی اشیاء کا کچھ نام تجویز فرما دیتے تھے۔ آپؐ کے جھنڈے کا نام عقاب اور جو تلوار جنگ میں استعمال فرماتے تھے اس کا نام ذوالفقار تھا اور ایک تلوار تھی جس کو مخذم کہا جاتا تھا اور تیسری اور تلوار تھی جس کا نام رسوب تھا اور ایک اور تلوار کا نام قضیب تھا اور آپؐ کی تلوار کا قبضہ چاندی کے جڑاؤ کا تھا۔

آنحضرت[4] صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم چمڑے کا منطقہ (پیٹی) استعمال فرماتے تھے جس میں

---

[1] ابن سعد فی الطبقات وابوالشیخ من حدیث عائشہؓ ۱۲ تخریج [2] بخاری ومسلم من حدیث عمرؓ فی قصۃ الاعتزال ۱۲

[3] الطبرانی من حدیث ابن عباسؓ ۱۲ تخریج [4] قال العراقی فی التخریج لم اقف لہ علی واصل ولابن سعد فی الطبقات وابی الشیخ من روایۃ محمد بن علی بن الحسین مرسلا کان فی درع النبی صلی اللہ علیہ وسلم حلقتان من فضۃ ۱۲ منہ۔

تین کڑے چاندی کے لگے ہوئے تھے۔

آپؐ[1] کی کمان کا نام کتوم اور ترکش کا نام کافور تھا۔

آپؐ[2] کی ناقہ کا نام قصویٰ تھا اور آپؐ کے خچر کو دُلدُل اور حمار کو یعفور اور جس بکری کا دُودھ نوش فرماتے تھے اس کو عینہ کہا جاتا تھا۔

لوٹا

آنحضرت[3] صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ایک لوٹا مٹی کا تھا جس سے آپؐ وضو کرتے اور پانی پیتے تھے۔ لوگ اپنے چھوٹے بچّوں کو بھیجتے اور وہ آپؐ کے پاس پہنچتے تو ان کو روکا نہ جاتا تھا۔ یہ بچّے آپؐ کے لوٹا میں سے پانی پیتے اور اپنے چہروں کو بھی مَلتے تھے تاکہ برکت حاصل ہو۔

باوجود قدرت کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عفو و کرم

نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سب سے زیادہ حلیم (بردبار) اور باوجود قدرت کے معافی کو پسند کرنے والے تھے۔ یہاں[4] تک کہ ایک مرتبہ آپؐ کی خدمت میں چند بار سونے چاندی کے لائے گئے۔ آپؐ نے ان کو صحابہ میں تقسیم فرمادیا۔ ایک شخص گاؤں والوں میں سے کھڑا ہوا اور کہنے لگا " اے محمد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) اگر آپؐ کو اللہ تعالےٰ نے عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا ہے (تو دیا ہو گا مگر) میں آپؐ کو انصاف کرتے نہیں دیکھتا۔ آپؐ نے (ملاطفت سے) فرمایا " تیرا بھلا ہو (اگر مَیں انصاف نہیں کرتا) تو میرے بعد اور کون تیرے ساتھ انصاف کرے گا " جب اُس نے پُشت پھیری تو آپؐ نے فرمایا کہ ذرا اس کو لوٹا کر میرے پاس لاؤ (غالباً اس کا مقصود اس کی دلداری اور رفع شُبہ تھا)۔

---

[1] قال العراقی لم اجد لہٗ اصلاً ۱۲ [2] الطبرانی من حدیث ابن عباسؓ ۱۲ محمد شفیع عفی عنہ

[3] قال العراقی لم اقف لہٗ علیٰ اصل ۱۲ منہ [4] ابو الشیخ باسناد جیّد من حدیث ابن عمرؓ ۱۲ منہ

اور حضرت جابر رضی اللہ تعالے عنہ نقل فرماتے ہیں کہ جہاد خیبر میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مالِ غنیمت کی چاندی لے کر حضرت بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے کپڑے میں ڈال رہے تھے۔ (تاکہ جمع کرنے کے بعد مستحقین کو تقسیم فرما دیں) ایک شخص نے (یہ سمجھ کر کہ آپ سارا مال صرف بلالؓ کو دے رہے ہیں) کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف کیجئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تیرا بھلا ہو اگر میں انصاف نہ کروں گا تو اور کون کرے گا؟ اگر میں انصاف نہ کروں تو میں تو خائب و خاسر (محروم و تباہ) ہوں گا"

حضرت عمرؓ اس کا یہ کلمہ سُن کر کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ شخص منافق معلوم ہوتا ہے۔ میں اس کی گردن کیوں نہ مار دوں۔ آپ نے فرمایا "خدا کی پناہ! اس سے لوگوں میں یہ چرچا ہو جاوے۔ کہ میں اپنے صحابہؓ کو قتل کرتا ہوں"

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ایک جنگ میں تھے (اتفاقاً ایک وقت) کفار نے دیکھا کہ صحابہ اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں اور آپ کے پاس کوئی نہیں تو ایک شخص آپ کے پاس پہنچا اور سید ھا سر پر آکھڑا ہوا اور تلوار کھینچ کر کہنے لگا کہ آپ کو مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے (بے دھڑک) فرمایا "اللہ!" اس شخص پر رُعب چھا گیا اور (تلوار ہاتھ سے گر پڑی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے تلوار اُٹھالی اور فرمایا کہ (اب تم بتاؤ) تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ اس نے (عاجز ہو کر) عرض کیا کہ آپ بہتر تلوار اُٹھانے والے ہو جائیے (یعنی معاف کر دیجئے) آپ نے فرمایا (کلمہ اسلام) اشهد ان لا اله الا الله محمد رسول الله کہو۔ اُس نے کہا نہیں۔ میں یہ کلمہ نہیں کہوں گا اور بجز اس کے کوئی وعدہ نہیں کرتا کہ میں نہ آپ سے لڑوں گا نہ آپ کے ساتھ ہوں گا اور نہ کسی ایسی قوم کے ساتھ ہوں گا جو آپ سے جنگ کرے۔ آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ یہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو کہنے لگا کہ میں بہترین انسان کے پاس سے آیا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

ل ۵ سر ۱۷ مسلم ۱۲ تخریج ::

حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک یہودی عورت آنحضرتؐ کی خدمت میں بکری کا گوشت زہر ملا کر لائی کہ آپؐ اس کو کھالیں (آپؐ اس کی حقیقت پر مطلع ہو گئے) اور یہودیہ سے پوچھا (تو نے ایسا کیوں کیا) اُس نے (صاف کہہ دیا) کہ میں آپؐ کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالےٰ تجھے ہرگز اس کام پر مسلط نہ کریں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم اس کو کیوں نہ قتل کر دیں۔ آپؐ نے منع فرمایا (اور اس کو چھوڑ دیا)۔ (رواہ مسلم و عند البخاری من حدیث ابی ہریرۃ)۔

ایک[1] یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر جادو کر دیا۔ جبرائیل علیہ السلام نے آپؐ کو اس کی اطلاع کر دی۔ آپؐ نے وہ چیز نکلوائی جس پر جادو کیا گیا تھا اور اس کی گرہیں کھول دیں، آپؐ کو شفاء ہو گئی۔ لیکن آپؐ نے اس یہودی سے اس کا ذکر تک نہیں فرمایا اور نہ کبھی اس کا اظہار فرمایا (انتقام تو کیا لیا جاتا)۔

فائدہ جادو سے جو تکلیف و مرض انسان کو پہنچتا ہے وہ بھی تمام دوسرے امراض کی طرح اسباب طبعیہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے امراض کا اسباب کھلے ہوئے نظر آتے ہیں کہ دھوپ اور لُو میں چلا پھرا اس سے بخار آگیا یا سرد ہوا میں نکلا اس سے بخار ہو گیا اور جادو میں یہ اسباب مخفی ہوتے ہیں جو جنات وغیرہ کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اس دُنیا میں طبیعت بشری کے تمام آثار و خواص کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ جن چیزوں سے سب انسانوں کو تکلیف مرض پیش آتا ہے۔ ان سے انبیاء کو بھی پیش آتا ہے۔ اس لئے جادو کا اثر آنحضرتؐ پر ہو جانا کسی عقلی و نقلی دلیل کے خلاف نہیں اور نہ اس میں کوئی اشکال ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مجھے اور زبیر اور مقداد تین آدمیوں کو حکم دیا کہ روضہ خاخ (ایک مقام کا نام ہے) پہ جاؤ وہاں ایک عورت اونٹ پر سوار جا رہی ہے اس کے پاس ایک خط ہے

---

[1] رواہ النسائی باسناد صحیح عن زید بن ارقم ۱۲

وہ خط اس سے لے لو۔ ہم وہاں پہنچے اور اس عورت سے کہا کہ خط دے دو۔ اس نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں۔ ہم نے کہا کہ یا تو خط نکالو ورنہ تمہارے کپڑے نکالے جاویں گے (اور تلاشی لی جاوے گی) یہ سُن کر اُس نے اپنے سر کے بالوں میں سے خط نکالا۔ ہم یہ خط لے کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔

خط پڑھا گیا تو وہ حاطب بن بلتعہ کی طرف سے چند مشرکین مکّہ کے نام تھا جس میں اُن کو رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے کسی خفیہ معاملے کی اطلاع دی گئی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اے حاطب! یہ کیا بات ہے؟"

حاطب نے عرض کیا آپؐ مجھ پر جلدی نہ فرمائیں۔ (میری گذارش سُن لیں) مَیں مکّہ میں ایک پردیسی اجنبی تھا (میرا کوئی کنبہ قبیلہ وہاں نہ تھا جو میرے اہل وعیال کی حفاظت کرے) بخلاف دوسرے مہاجرین کے ان کے عزیز رشتہ دار وہاں موجود ہیں جو اُن کے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہیں۔ مَیں نے چاہا کہ لوگوں میں میری کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں، جس کی خاطر وہ میرے اہل وعیال کی حفاظت کریں تو مَیں ان پر کوئی احسان کر دوں جس کی وجہ سے میرے اہل وعیال ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں (میری اس حرکت کا سبب یہ تھا) مَیں نے یہ کام کفر کی وجہ سے یا کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے یا اسلام کے بعد ارتداد کی بناء پر نہیں کیا ہے۔
رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا:

"اس نے سچ کہا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم! مُجھے اجازت دیجئے کہ مَیں اس منافق کی گردن مار دوں۔

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حاطب بن بلتعہ ان لوگوں میں سے ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں اور آپ کو کیا خبر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اہل بدر پر خاص توجّہ فرمائی اور فرما دیا ہے کہ ان سے جو گناہ بھی سرزد ہوں مَیں نے معاف کر دیا۔ (بخاری ومسلم)

فائدہ غزوۂ بدر کے شرکاء کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ اللہ تعالے نے ان کی عام مغفرت فرمادی۔ اوّل توان لوگوں کی گناہ سے حفاظت کی جاتی ہے۔ وہ کسی معصیت میں مُبتلا ہی نہیں ہوتے اور اگر اتفاقاً کوئی مُبتلا بھی ہُوا تو فوراً توبہ کی توفیق ہوجاتی ہے جس سے یہ گناہ معاف ہوجاتا ہے۔ جیسا حاطب بن بلتعہؓ کو پیش آیا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کچھ مال صحابہ میں تقسیم فرمایا۔ ایک انصاری صحابی کے منہ سے نکل گیا کہ "یہ ایسی تقسیم ہے جس میں خدا تعالےٰ کی رضا مقصود نہیں"۔ ان کا یہ کلمہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو بھی پہنچ گیا۔ یہ سُن کر چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور (اپنے دل کو تسلّی دینے کے لئے) فرمایا "اللہ تعالےٰ میرے بھائی موسےٰؑ پر رحم کرے کہ ان کو اس سے بھی زیادہ سخت ایذائیں (ان کی قوم کی طرف سے) دی گئیں، انہوں نے صبر کیا۔" (بخاری و مسلم) اور پھر فرمایا کہ کوئی آدمی مجھے کسی صحابی کی ایسی بات نہ پہنچایا کرے جس سے مجھے رنج و غصّہ پیدا ہو۔ کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں تم لوگوں میں آؤں توسب کی طرف سے سلیم الصدر رہوں۔ یعنی کسی کی طرف سے رنج و غصّہ میرے دل میں نہ ہو۔ (ابوداؤد۔ ترمذی عن ابن مسعودؓ)

ناگوار چیزوں سے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی چشم پوشی

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم لطیف البشرہ تھے۔ آپؐ کا ظاہر و باطن لطیف تھا۔ آپؐ کا غصّہ اور رضا (فوراً) آپؐ کے چہرۂ انور سے پہچان لیا جاتا تھا۔ (ابوالشیخ عن ابن عمرؓ)

فائدہ سلامت فطرت کی یہی علامت ہے کہ نہ منافقانہ طور پر کینہ و بغض کا اظہار نہ ہونے دے کہ دوسرا آدمی دھوکہ میں رہے جس کو آج کل کی بدمذاقی کے سبب بڑی دانشمندی اور حوصلہ مندی کہا جاتا ہے۔

جبؐ آپؐ کو کوئی سخت رنج پہنچتا تھا تو بکثرت لحیہ مبارک پر ہاتھ پھیرتے تھے

لہ ابوالشیخ من حدیث عائشہؓ باسناد حسن ۱۲ تخریج ؎

کسی شخص کے روبرو ایسی بات نہ فرماتے تھے جو اس کو ناگوار ہو۔

ایک مرتبہ[1] ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا جس کے لباس میں زرد رنگ کا اثر تھا۔ آپؐ کو یہ رنگ ناگوار ہُوا۔ مگر اس کو کچھ نہ فرمایا۔ جب وہ چلا گیا تو لوگوں سے کہا کہ اس سے کہہ دینا کہ یہ زرد رنگ چھوڑ دیں۔

فائدہ | یہ زرد رنگ غالباً زعفران کا تھا۔ زعفران کا رنگا ہُوا کپڑا پہننا مردوں کے لئے مکروہ ہے۔ عورتوں کے لئے درست ہے (درمختار)

ایک اعرابی (گاؤں والے) نے آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے سامنے مسجد نبویؐ میں پیشاب کر دیا۔ صحابہؓ نے اس کو مارنے کا ارادہ کیا۔ آپؐ نے منع کیا اور فرمایا کہ اس کو کچھ نہ کہو تاکہ اس کا پیشاب منقطع نہ ہو جائے جس سے کہ بیماری پیدا ہو جائے۔ پھر اس گاؤں والے کو سمجھایا کہ مسجدیں اس کام کی لئے مناسب نہیں کہ ان میں کوئی گندگی، پیشاب پاخانہ وغیرہ ڈالا جائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اس کو (نرمی سے سمجھا کر) ادب و انسانیت کے قریب لاؤ (سختی کر کے متنفر نہ کرو)۔

(بخاری و مسلم عن انس رضؓ)

ایک روز[2] ایک اعرابی آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور آپؐ سے کوئی چیز مانگی۔ آپؐ نے عطا فرما دی۔ پھر آپؐ نے اس سے پوچھا کہ مَیں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کیا؟ اعرابی نے جواب دیا کہ نہیں! اچھا سلوک تو کیا ہوتا متوسط درجہ کا معاملہ بھی نہیں کیا۔

اس کا یہ کلام سُن کر مسلمانوں کو غصّہ آیا اور اُس کو مارنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کیا۔ پھر آپؐ گھر میں تشریف لے گئے اور اعرابی کو بلوایا اور کچھ اور زیادہ دیا۔ پھر پوچھا کہ (اب تو) اچھا سلوک کیا؟ اُس نے کہا۔

---

[1] ابوداؤد و ترمذی فی الشمائل و نسائی فی عمل الیوم واللیلہ من حدیث انسؓ واسنادہ ضعیف ۱۲ تخریج۔

[2] رواہ البزار وابو الشیخ من حدیث ابی ہریرہؓ بسند ضعیف ۱۲ تخریج

"ہاں! اللہ تعالےٰ آپؐ کو میرے اور میرے اہل و عیال کی امداد کا اچھا بدلہ دیں"۔

آپؐ نے فرمایا کہ "تو نے لوگوں کے سامنے جو کچھ کہا تجھے معلوم ہے اور اس کی وجہ سے میرے صحابہؓ کے دلوں میں ناگواری ہے۔ اگر تجھے ناگوار نہ ہو، یہی بات جو میرے سامنے کہی ہے ان کے سامنے بھی کہہ دینا تاکہ ان کے دلوں سے غم و غصہ جاتا رہے۔ اس نے وعدہ کیا۔

دوسرے دن شام کو آپؐ باہر تشریف لائے تو صحابہ سے فرمایا کہ اس اعرابی نے جو کچھ کہا تھا وہ آپؐ کو معلوم ہے۔ پھر ہم نے اس کو کچھ زیادہ دے دیا تو اس نے کہا کہ میں اب راضی ہوں۔ پھر (اعرابی کی طرف خطاب کر کے) فرمایا (کیوں بھائی) یہی بات ہے؟ اعرابی نے کہا "ہاں! اللہ تعالےٰ آپؐ کو میرے اہل و عیال کی امداد کرنے کا بہتر بدلہ دے"۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ میری اور اس اعرابی کی ایسی مثال ہے۔ جیسے کسی شخص کی اونٹنی بھاگ گئی ہو۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑے جس سے وہ اور بھی وحشت ناک ہو گئی اور بھاگی تو اونٹنی والے نے لوگوں کو آواز دی کہ تم میری اونٹنی کو چھوڑ دو۔ میں اس کو پکڑنے اور رام کرنے کی ترکیب تم سے زیادہ جانتا ہوں۔

پھر یہ اونٹنی والا خود اس کے پاس گیا اور کچھ دانہ وغیرہ اس کے سامنے ڈالا اور آہستہ آہستہ اسے اپنی طرف لگایا۔ یہاں تک کہ وہ آگئی اور بیٹھ گئی تو اس پر اپنا کجاوہ کس لیا اور سوار ہو گیا۔

جب اس شخص نے وہ کلمات کہے میں اگر تمہیں اسی طرح چھوڑ دیتا تو تم اس کو مار دیتے اور یہ دوزخ میں جاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سب سے زیادہ کریم و سخی تھے خصوصاً رمضان المبارک

میں تو آپؐ کی سخاوت کا یہ عالم ہوتا تھا جیسے ہَوا کے جھونکے کہ اُن کے فیض سے کوئی گھر اور کوئی چیز خالی نہیں رہتی۔ اس وقت تو کوئی چیز اپنے پاس نہ رہنے دیتے تھے۔

(بخاری و مسلم عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عادات اور شمائل طیبہ بیان فرماتے تو کہا کرتے تھے کہ "آپؐ ہاتھ کے سب سے زیادہ سخی، دل کے سب سے زیادہ وسیع، زبان کے سب سے زیادہ وفا کرنے والے تھے۔ سب سے زیادہ نرم اور خاندان کے اعتبار سے سب سے زیادہ شریف تھے۔ جو شخص دفعتًا آپؐ کو دیکھتا تو اس پر رعب و ہیبت طاری ہو جاتی اور جو آپؐ کے ساتھ ملتا اور صحبت میں رہتا تو آپؐ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ آپؐ کا حال بیان کرنے والا اجمالاً اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ مَیں نے نہ آپؐ سے پہلے آپؐ کی مانند کسی کو نہ دیکھا نہ آپؐ کے بعد۔ (ترمذی)

آپؐ سے جب کبھی کوئی چیز مانگی گئی کبھی انکار نہیں فرمایا۔

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور سوال کیا۔ آپؐ نے اس کو اتنی بکریاں دے دیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان سارا میدان بھر دیا۔ وہ اپنی قوم میں گیا اور لوگوں سے کہا کہ مسلمان ہو جاؤ۔ کیونکہ محمد (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) اس طرح بے دریغ عطا کرتے ہیں کہ ان کو ختم ہو جانے اور محتاج ہو جانے کا کوئی خوف نہیں۔ (بخاری و مسلم)

ایک مرتبہ آپؐ کے پاس نوّے ہزار درہم لائے گئے۔ ان کو ایک بوریئے پر رکھ دیا گیا اور آپؐ نے کھڑے ہو کر تقسیم کرنا شروع کیا یہاں تک کہ کسی سائل کو رد نہیں کیا جب تک کہ سب درہم سے فارغ ہو گئے۔ (ابوالحسن ابن الضحاک فی الشمائل)۔

اس حدیث کی اصل بخاری میں بھی ہے اور یہ مال بحرین کا آیا تھا۔ بعض روایات میں اس کی مقدار اسّی ہزار بتلائی ہے۔

ایک روز ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہمارے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ لیکن تم کسی سے ہمارے ذمہ پر قرض لے لو۔ جب ہمارے پاس کچھ آوے گا تو قرض ادا کر دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔

یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی قدرت سے زائد کی تکلیف نہیں دی (تو آپ ایسا کیوں کرتے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اُن کا یہ کہنا ناگوار ہُوا۔ اس شخص نے عرض کیا کہ آپ خرچ کرتے رہو اور آسمان والے سے افلاس کا خوف نہ کرو۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور چہرۂ مبارک پر خوشی کے آثار ظاہر ہُوئے۔ (شمائل ترمذی)

جب آپؐ غزوۂ حنین سے واپس ہوئے تو گاؤں والے بہت سارے جمع ہو گئے اور سوال کرتے رہے آپؐ عطا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اژدہام سے آپؐ کو ایک درخت سے لگا دیا اور کسی نے آپؐ کی چادر بھی اُتار لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میری چادر مجھے دے دو۔ اگر میرے پاس اس جنگل کی گھاس کی تعداد کے موافق اونٹ وغیرہ ہوتے تو بلاشبہ میں سب تقسیم کر دیتا اور تم مجھے بخیل یا جھوٹ بولنے والا یا بزدل نہ پاتے (بخاری عن جبیر بن مطعم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ بہادر تھے (دارمی عن ابن عمر بسند صحیح)۔

حضرت علی[1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں ہم نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہم سب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف پناہ لے رہے تھے۔ حالانکہ آپؐ دُشمن کی طرف ہم سے زیادہ قریب تھے۔ آپؐ اس دن سب سے زیادہ قوی وشجاع نظر آتے تھے۔ نیز فرمایا کہ جب لڑائی سخت ہو جاتی اور دونوں فریق بھڑ جاتی تو ہم آپ کا سہارا تکتے تھے اور دُشمن کی طرف قریب کوئی آپؐ سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ (نسائی باسناد صحیح)۔

---

[1] ابو الشیخ فی اخلاق النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم باسناد جید ۱۲ تخریج۔

آنحضرت[1] صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کم گو قلیل الکلام تھے لیکن جب لوگوں کو جہاد کا حکم دیتے تو خود بھی تیار ہو جاتے اور سب سے زیادہ قوی و بہادر ثابت ہوتے تھے اور وہ شخص بڑا بہادر سمجھا جاتا تھا جو آپؐ کے قریب ہو، کیونکہ آپؐ ہی دشمن کے قریب ہوتے تھے۔

(مسلم عن براء)

حضرت[2] عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کسی لشکر کے مقابلہ میں آتے تو سب سے پہلے وار کرنے والے آپؐ ہوتے تھے اور آپؐ کی گرفت نہایت سخت ہوتی تھی۔

ایک جہاد میں جب مشرکین نے آپؐ کو گھیر لیا تو آپؐ گھوڑے سے نیچے اُتر آئے اور بہادری کے ساتھ للکارا اور فرمایا۔

"میں نبی ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں"

اس روز آپؐ سے زیادہ کوئی قوی و شجاع نظر نہ آتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم باوجود بلند مرتبہ عالی منصب ہونے کے سب سے زیادہ متواضع تھے۔

ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک حج میں آپؐ کو دیکھا کہ ایک سفید اونٹنی پر سوار ہیں۔ جمرات کی رمی فرما رہے ہیں۔ نہ کسی کو آپؐ کے پاس آنے سے روکا جاتا ہے نہ آپؐ کے لئے (بادشاہوں کی طرح) راستہ خالی کرایا جاتا ہے۔

آپؐ بعض اوقات حمار پر سوار ہوتے اور چادر اس کے گلے میں ڈال لیتے تھے اور

---

[1] ابوالشیخ من حدیث سعد بن عیاض الثمالی مرسلا ۱۲ تخریج [2] رواہ ابوالشیخ وقال العراقی فیہ من لم اعرفہ ۱۲ تخریج ❖

اس کے ساتھ بعض اوقات کسی دوسرے کو بھی اپنے ساتھ سوار کر لیتے تھے (بخاری و مسلم)

آپؐ بیماروں کی عیادت فرماتے اور جنازوں کے پیچھے چلتے اور غلاموں کی دعوت قبول فرما لیتے تھے۔ (ترمذی بسند ضعیف والحاکم وصححہ)

اپنا جوتہ خود درست فرما لیتے اور کپڑوں میں پیوند لگا لیتے تھے۔ اپنے گھر میں اہل بیت کے ساتھ کام کاج میں شرکت فرماتے تھے۔ (مسند احمد عن عائشہؓ)

جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تشریف لاتے تو صحابہ کرام آپؐ کے لئے تعظیماً کھڑے نہ ہوتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آپؐ اس کو پسند نہیں کرتے (ترمذی عن انس رضہ وصححہ)۔

فائدہ کسی آنے والے کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا بعض روایات حدیث سے ثابت اور فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بوجہ تواضع کے اپنے لئے لوگوں کا کھڑا ہونا گوارا نہ تھا۔

آپؐ بچوں کے پاس جاتے اور ان کو سلام کرتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو وہ آپؐ کی ہیئت و رعب سے کانپنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا گھبراؤ نہیں میں کوئی بادشاہ نہیں۔ میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو معمولی خوراک قدید (گوشت کا پارچہ) کھایا کرتی تھیں۔ (حاکم عن جریر وصححہ)۔

اپنے صحابہ میں آپؐ اس طرح رَل مِل کر بیٹھتے تھے[1] کہ مجلس سے کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا گویا آپؐ بھی انہیں میں کے ایک فرد ہیں۔ اجنبی آدمی آتا تو یہ پہچان نہ سکتا تھا کہ رسول اللہ ان میں کون ہیں؟ یہاں تک کہ اس کو لوگوں سے دریافت کرنا پڑتا تھا۔ اسی لئے حضرات صحابہؓ نے آپؐ سے یہ درخواست کی کہ ہم آپؐ کے لئے کوئی مخصوص مجلس بنا دیں تاکہ آنے والا اجنبی آدمی آپؐ کو پہچان سکے۔ اس کو تکلیف نہ ہو (اس مصلحت سے آپؐ نے

---

[1] ابوداؤد ونسائی من حدیث ابی ھریرہؓ ۱۲ تخریج ۞

اجازت دے دی) صحابہ کرامؓ نے آپؐ کے لئے ایک چبوترہ مٹی کا بنا دیا جس پر آپؐ تشریف رکھتے تھے۔

ایک[1] مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اللہ تعالےٰ آپؐ پر قربان کرے۔ آپؐ تکیہ لگا کر کھانا کھا لیا کریں کہ یہ آپؐ کے لئے آسان اور آرام دہ ہوگا۔ آپؐ نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔ یہاں تک کہ زمین کے قریب ہو گیا۔ پھر فرمایا۔ نہیں بلکہ میں اس طرح کھاتا ہوں کہ جس طرح غلام کھایا کرتا ہے اور اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح غلام بیٹھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی خوان پہ کھانا کھایا اور نہ سکرجہ میں (شمائل ترمذی)۔ خوان لکڑی کی چوکی جو زمین سے کچھ اونچی ہوتی ہے کھانا اس پر رکھ کر کھانا فارس کے اہلِ تکلف کی عادت تھی۔ اس لئے حضورؐ نے اس سے اجتناب فرمایا اور سکرجہ وہ چھوٹی پیالی جس میں چٹنی رکھی جاتی ہے۔ یہ بھی اوّل تو اہلِ تکلف و ترفہ کی عادت ہے۔ دوسرے ہضم طعام کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بوجہ قلتِ غذا اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ (شمائل بلیجوری ص ۹۳)

آپؐ کے صحابہ کرامؓ میں سے یا غیروں میں سے کوئی بھی آپؐ کو بلاتا تو آپؐ اس کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔

جب آپؐ لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو اگر وہ آخرت کے متعلق کوئی بات کرتے تو آپؐ بھی اس میں شرکت فرماتے اور اگر کسی کھانے پینے کی چیز کا ذکر ہوتا تو اس میں بھی شرکت فرماتے اور دنیا کی کوئی بات ہوتی تو اس میں بھی گفتگو فرماتے تھے تاکہ اہلِ مجلس کو ان کی موافقت سے انس ہو اور آپؐ کی کوئی امتیازی شان ظاہر نہ ہو۔ (شمائل ترمذی)

بعض اوقات صحابہ کرام آپؐ کے سامنے اشعار پڑھتے اور جاہلیت کے قصے بیان کرتے اور ہنستے تھے تو آپؐ بھی اُن کے ساتھ تبسم فرماتے تھے۔ ان کو بجز حرام کے

---

[1] ابو الشیخ من روایہ عبد اللہ بن عبید بن عمرؓ بسند ضعیف ۱۲ تخریج ص ۹۲ ابو نعیم فی الدلائل من حدیث عائشہ رضؓ ۱۲ منہ

کسی خوش طبعی و تفریح سے نہ روکتے تھے۔ (مسلم عن جابر بن سمرہ)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک

قامت مبارک

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صفت باعتبار پیدائشی امور کے یہ تھی کہ نہ آپ[1] بہت زیادہ دراز قامت تھے نہ پست قد بلکہ میانہ قد تھے۔ مگر اس کے باوجود یہ عجیب بات تھی کہ کوئی دراز قامت آدمی آپ کے ساتھ چلتا تو محسوس یہی ہوتا تھا کہ آپ ہی اس سے بلند ہیں اور بعض اوقات دو دراز قد آدمی آپ کے ساتھ معانقہ کرتے تو آپ دونوں سے زیادہ بلند نظر آتے تھے۔ پھر جب وہ علیحدہ ہوتے تو کہا جاتا کہ یہ دونوں دراز قد ہیں اور آپ درمیانہ قامت۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام خیر و خوبی توسط (درمیانہ پن) میں رکھی ہے۔

رنگ مبارک

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سفید رنگ تھے۔ نہ سیاہ اور نہ بہت شدید البیاض (جس کو بھورا کہا جاتا ہے) اور بعض لوگوں نے آپ کے رنگ کی یہ صفت بیان کی کہ سرخ و سفید تھے اور دونوں کی تطبیق یہ ہے کہ بدن کے جو حصے دھوپ اور ہوا میں کھلے رہتے ہیں جیسے چہرہ اور گردن وغیرہ وہ تو سرخ و سفید تھے اور باقی بدن جو لباس میں مستور رہتا ہے وہ سفید خالص تھا۔ آپ کا پسینہ چہرۂ انور پر موتیوں کی لڑی کی طرح معلوم

---

[1] ابو نعیم فی الدلائل النبوۃ من حدیث عائشہؓ بن یادۃ نقصان ۱۲ تخریج

ہوتا تھا۔ پسینہ میں (بدبو کی بجائے) تیز مشک کی سی خوشبو تھی۔

موئے مبارک

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بالوں کی کیفیت بھی متوسط حالت میں تھی۔ نہ بالکل سیدھے نہ بہت مُڑے ہوئے (گھنڈی کی طرح جیسے حبشیوں کے ہوتے ہیں) جب آپؐ کنگھا کرتے تھے تو بال اُلجھتے نہ تھے ایسے صاف نکل جاتے تھے جیسے ریتہ۔

بعض صحابہ کا بیان ہے کہ آپؐ کے بال دونوں شانوں تک تھے اور اکثر روایتوں میں ہے کہ دونوں کانوں کی لَو تک تھے۔

آپؐ کے سفید بال سر اور ڈاڑھی میں سترہ عدد سے زائد نہ تھے۔ آپؐ سب سے زیادہ حسین و جمیل تھے۔ کوئی شخص آپؐ کی صفت بیان کرنا چاہے تو مختصر طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ جیسے چودھویں رات کا چاند۔

آپؐ کا رنگ اور بُشرہ لطیف ہونے کی وجہ سے آپؐ کی رضا اور غصّہ آپؐ کے چہرہ سے ظاہر ہو جاتا تھا۔

چہرۂ مبارک

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کشادہ پیشانی تھے۔ بھوؤں کے بال گنجان اور پورے تھے۔ دونوں بھوؤں کے درمیان ایسی سفیدی تھی جیسے خالص چاندی۔ آنکھیں بڑی اور کشادہ تھیں۔ جن کی سیاہی گہری تھی اور کچھ سرخی جھلکتی تھی۔ آپؐ کی پلکیں بڑی ہوئی تھیں۔ ناک بلند اور دانتوں کے درمیان کشادگی تھی۔ جب آپؐ ہنستے تھے تو بجلی کی سی روشنی محسوس ہوتی تھی۔ آپؐ کے لب مبارک تمام لوگوں سے حسین اور لطیف تھے۔ رخسار مبارک حسین اور صلب تھے۔ چہرۂ مبارک نہ طویل تھا اور نہ بہت پُر گوشت۔ آپؐ کی ڈاڑھی گنجان تھی۔ آپؐ ڈاڑھی کو چھوڑتے اور مونچھوں کو کٹواتے تھے۔ گردن مبارک سب سے زیادہ حسین تھی۔ نہ بہت طویل نہ بہت کوتاہ۔ گردن کا جو حصّہ کھلا رہتا

ہے وہ ایسا چمکتا تھا جیسے چاندی کا ابریق (لوٹا) جس میں سونا ملایا گیا ہو۔ چاندی کی سفیدی اور سونے کی سُرخی جھلکتی ہو۔

سینہ مبارک وسیع کشادہ تھا۔ آپؐ کے بدن مبارک کا گوشت ہر جگہ متناسب تھا کہیں بڑھا گھٹا نظر نہ آتا تھا۔ آئینہ کی طرح برابر صاف اور چاند کی طرح سفید اور روشن۔ حلقوم کے نیچے سے ناف تک بالوں کا ایک باریک خط متصل تھا۔ آپؐ کے سینہ اور بطن پر اس کے سوا اور بال نہ تھے۔ شکم مبارک میں تین شکن تھے جن میں سے ایک ازار کے اندر مستور رہتا تھا اور دو کھُلے رہتے تھے۔

آپؐ کے شانے بڑے اور بالوں والے تھے۔ آپؐ کے جوڑوں کی ہڈیاں مضبوط اور ضخیم تھیں۔ آپؐ کی پشت وسیع اور دونوں مونڈھوں کے درمیان داہنی جانب مائل مہر نبوت تھی۔ جس میں سے ایک سیاہ زرد مائل خائل اور اس کے گرد چند بال تھے۔ بازوئے اور دست مبارک پُر گوشت اور مضبوط تھے۔ کلائی طویل اور ہتھیلیاں وسیع تھیں۔

انگشت ہائے مبارک گویا چاندی کی شاخیں اور ہتھیلی ریشم سے زیادہ نرم اور خوشبو سے مہکنے والی تھی۔ خواہ خوشبو استعمال کریں یا نہ کریں۔ جو کوئی آپؐ سے مصافحہ کرتا تو تمام دن اس کی خوشبو اپنے ہاتھ میں پاتا تھا۔ آپؐ بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو بچہ کے سر میں ایسی خوشبو کی مہک پیدا ہو جاتی تھی کہ دوسرے بچوں میں ممتاز ہو کر وہ پہچانا جاتا تھا۔

آپؐ کا جسم اسفل رانیں اور پنڈلیاں پُر گوشت۔ آپؐ کا پورا جسم مبارک موٹاپا اور لاغری میں متوسط (درمیانہ) تھا۔

آپؐ کی چال

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے چلنے کی کیفیت یہ تھی کہ جیسے کوئی شخص اونچی جگہ سے اُترتا ہو۔ قدم روک روک کر اور قریب قریب رکھتے تھے۔ چال میں

تکبر و فخر کا شائبہ تک نہ تھا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ بہت مشابہ ہوں اور میرے جد امجد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ پیدائشی خلقت اور اخلاق میں سے بہت مشابہ تھے [۱]

اور آپؐ فرماتے تھے کہ میرے پروردگار کے نزدیک میرے دس نام ہیں :۔
میں محمد ہوں۔ میں احمد ہوں۔ میں ماحی ہوں (یعنی کفر کو مٹانے والا) اور میں عاقب ہوں۔ یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور میں حاشر ہوں کہ میرے قدم پر لوگوں کا حشر ہوگا۔ اور رسول الرحمت ہوں اور رسول التوبہ ہوں اور رسول الملاحم (یعنی جہاد و غزوات کے رسول) اور مقفی کہ میں سب کی پشت پر ہوں اور میں قثم ہوں یعنی کامل اور جامع ۔ (واللہ اعلم)۔

---

[۱] حلیہ مبارک کی یہ ساری تفصیل دلائل نبوت ابونعیم سے لی گئی ہے۔ [۲] ابن عدی من حدیث علی وجابر واسامۃ بن زید و عائشہؓ و ابن عباس باسناد ضعیف ۱۲ تخریج ❖

رسولؐ کا صرف اتباع ہی کافی نہیں بلکہ ادب و احترام اور محبّت بھی فرض ہے

آیت[1] کے شروع میں يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ فرمایا اور آخر میں وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ فرمایا۔ ان میں سے پہلے جملہ میں نبی اُمّی کا اتباع کرنے کا حکم ہے اور آخری جملہ میں قرآن کے اتباع کا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نجاتِ آخرت کتاب اور سنّت دونوں کے اتباع پر موقوف ہے اور نبی اُمّی کا اتباع ان کی سنّت ہی کے اتباع کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور ان دونوں جملوں کے درمیان عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے احکام کا ایسا اتباع مقصود نہیں جیسے عام دُنیا کے حکام کا اتباع جبراً قہراً کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ اتباع مقصود ہے جو عظمت و محبت کا نتیجہ ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی عظمت و محبت دل میں اتنی ہو کہ اس کی وجہ سے آپؐ کے احکام کے اتباع پر مجبور ہو کیونکہ اُمّت کو اپنے رسول سے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ امیر و حاکم ہے اور

---

[1] وہ آیت یہ ہے: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(الاعراف آیت ۱۵۷)

اُمت محکوم و رعیت، دوسرے یہ کہ رسول محبوب ہے اور پوری اُمت ان کی محب۔

ایک یہ کہ رسول اپنے کمالات علمی، عملی اور اخلاقی کی بناء پر صاحب عظمت ہے اور ساری اُمت اُن کے مقابلے میں پست اور عاجز۔ ہمارے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سب شانیں درجہ کمال میں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اُمت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں۔ بحیثیت رسول کے اُن پر ایمان لائیں۔ بحیثیت امیر و حاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں۔ بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالاتِ نبوت ان کی تعظیم و تکریم بجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہیئے تھا۔ کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا لیکن حق تعالےٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی بناء پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اُمت پر آپؐ کی تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کو بھی لازم قرار دیا اور قرآن کریم میں جابجا اُس کے آداب سکھائے گئے۔

اس آیت میں تو عَزِّرُوْہُ وَ نَصَرُوْہُ کے الفاظ سے اُس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں تُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ آیا ہے اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپؐ کی آواز سے بڑھ جائے: ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ۔

"یعنی اے مسلمانو! اللہ اور اُس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو۔ یعنی جس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپؐ سے پہلے کوئی نہ بولے"۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے اس آیت کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ آپؐ سے پہلے

نہ بولیں اور جب آپؐ کلام کریں تو سب خاموش ہو کر سُنیں۔

ایک آیتِ قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں۔ اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت، ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے شریک کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا۔ (شفاء)

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دُنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ مَیں آپؐ کی طرف نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے آپؐ کا حُلیہ مبارک دریافت کرے تو مَیں بیان کرنے پر اس لئے قادر نہیں کہ مَیں نے کبھی آپؐ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

عروہ بن مسعود کو اہلِ مکّہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لئے مدینہ بھیجا۔ اس نے صحابہ کرامؓ کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر گرتا اور فدا ہوتا ہُوا دیکھ کر واپسی میں رپورٹ دی کہ مَیں نے کسریٰ اور قیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال مَیں نے اصحابِ محمدؐ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوگے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپؐ گھر میں تشریف فرما ہوتے تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو بُلانا

بے ادبی سمجھتے تھے۔ دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھٹکا اور شور نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجد نبوی میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے۔

اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔ اسی تعظیم و توقیر کی برکت تھی کہ ان حضرات کو کمالاتِ نبوت سے خاص حصہ ملا اور اللہ تعالےٰ نے ان کو انبیاء کے بعد سب سے اونچا مقام عطا فرمایا۔

(معارف القرآن ج ۴ ص۸۸ تا ص۸۹)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس کے خصوصًا اور عام معاشرت کے بعض آداب و احکام

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ لَّا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا ۚ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِينَ يَتَسَلَّلُونَ مِنكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (سورۃ النور آیت ۶۲، ۶۳)

آیاتِ مذکور میں دو حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم لوگوں کو کسی دینی جہاد وغیرہ کے لئے جمع کریں تو مقتضائے ایمان یہ ہے کہ سب جمع

ہو جائیں اور پھر آپؐ کی مجلس سے بغیر آپؐ کی اجازت کے نہ جائیں۔ کوئی ضرورت پیش آئے تو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کرلیں اور اس میں آنحضرتؐ کو یہ ہدایت ہے کہ کوئی خاص حرج اور ضرورت نہ ہو تو اجازت دے دیا کریں۔

اسی ضمن میں ان منافقین کی مذمت ہے جو اس تقاضائے ایمان کے خلاف بدنامی سے بچنے کے لئے حاضر تو ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر کسی کی آڑ لے کر چپکے سے کھسک جاتے ہیں۔

یہ آیت غزوہ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی ہے جبکہ مشرکین عرب اور دوسری جماعتوں کے متحدہ محاذ نے یکبارگی مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بہ مشورہ صحابہ اُن کے حملے سے بچاؤ کے لئے خندق کھودی تھی اس لئے اس جہاد کو غزوۂ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ یہ غزوہ شوال ۵ھ میں ہوا ہے۔ (قرطبی)

بیہقی اور ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس وقت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بذاتِ خود اور تمام صحابہؓ خندق کھودنے میں مصروف کار تھے۔ مگر منافقین اوّل تو آنے میں سستی کرتے اور پھر آکر معمولی سا کام دکھانے کو کرلیتے اور پھر چپکے سے غائب ہو جاتے تھے۔ اس کے خلاف مؤمنین سب کے سب محنت کے ساتھ کام میں لگے رہتے اور کوئی مجبوری اور ضرورت پیش آتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے اجازت لے کر جاتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (مظہری)

ایک سوال کا جواب

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مجلس سے بغیر آپؐ کی اجازت کے چلا جانا حرام ہے۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ کے بے شمار واقعات ہیں جن میں وہ آپؐ کی مجلس میں ہوتے اور پھر جب چاہتے چلے جاتے تھے، اجازت لینا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ جواب یہ ہے کہ یہ عام مجلسوں کا حکم نہیں بلکہ اس وقت کا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ان کو کسی ضرورت سے جمع کیا ہو۔ جیسا کہ

واقعہ خندق میں ہوا تھا۔ اس تخصیص کی طرف خود آیت کے لفظ عَلٰٓی اَمرٍ جامِعٍ میں اشارہ موجود ہے۔

امرِ جامع سے کیا مراد ہے

اس میں اقوال مختلف ہیں۔ مگر واضح بات یہ ہے کہ امرِ جامع سے مراد وہ کام ہے جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم لوگوں کو جمع کرنا ضروری سمجھیں اور کسی خاص کام کے لئے جمع فرمادیں۔ جیسے غزوہ احزاب میں خندق کھودنے کا کام تھا۔ (قرطبی، مظہری)۔

یہ حکم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص ہے یا عام

باتفاق فقہاء چونکہ یہ حکم ایک دینی اور اسلامی ضرورت کے لئے جاری کیا گیا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مجلس کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر امام و امیر جس کے قبضے میں زمامِ حکومت ہو، اس کا اور اس کی ایسی مجلس کا یہی حکم ہے کہ وہ سب کو جمع ہونے کا حکم دیں تو اس کی تعمیل واجب اور واپس جانا بغیر اجازت ناجائز ہے۔ (قرطبی، مظہری، بیان القرآن)

اور یہ ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مجلس کے لئے یہ حکم زیادہ مؤکد اور اس کی مخالفت کھلی شقاوت ہے جیسے منافقین سے صادر ہوئی اور اسلامی آدابِ معاشرت کے لحاظ سے یہ حکم باہمی اجتماعات اور عام مجلسوں سے کم از کم مستحب اور مستحسن ضرور ہے کہ جب مسلمان کسی مجلس میں اجتماعی معاملے میں غور کرنے یا عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہوں تو جب جانا ہو تو امیرِ مجلس سے اجازت لے کر جائیں۔

دوسرا حکم آخری آیت میں یہ دیا گیا ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ۔ اس کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو اوپر خلاصۂ تفسیر میں بیان کی گئی ہے کہ دُعَآ الرسول سے مراد رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا لوگوں کو بلانا ہے (جو نحوی قاعدہ سے

اضافت الی الفاعل ہے۔) اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جب لوگوں کو بلائیں تو اس کو عام لوگوں کے بُلانے کی طرح نہ سمجھو کہ اس میں آنے نہ آنے کا اختیار رہتا ہے۔ بلکہ اس وقت آنا فرض ہو جاتا ہے اور بغیر اجازت جانا حرام ہو جاتا ہے۔ آیت کے سیاق وسباق سے یہ تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اسی لئے مظہری اور بیان القرآن میں اس کو اختیار کیا ہے۔ اس کی دوسری تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن کثیرؒ اور قرطبی نے یہ نقل کیا ہے کہ دعاء الرسول سے مراد لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کسی کام کے لئے پکارنا اور بلانا (جو نحوی ترکیب میں اضافت الی المفعول ہوگی)۔ اسی تفسیر کی بناء پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کسی ضرورت سے بلاؤ تو عام لوگوں کی طرح آپؐ کا نام لے کر یا محمد نہ کہو کہ بے ادبی ہے۔ بلکہ تعظیمی القاب کے ساتھ یا رسول اللہ، یا نبی اللہ وغیرہ کہا کرو۔ اس کا حاصل رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کا مسلمانوں پر واجب ہونا اور ہر ایسی چیز سے بچنا جو ادب کے خلاف ہو یا جس سے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچے۔ یہ حکم ایسا ہوگا جیسے سُورہ حجرات میں اسی طرح کے کئی حکم دیئے گئے ہیں۔

لا تجھروا یعنی جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے بات کرو تو ادب کی رعایت رکھو۔ ضرورت سے زیادہ اُونچی آواز سے باتیں نہ کرو۔ جیسے لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں بلکہ آپؐ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرو۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ وراء الحجرات میں اسی کا بیان ہے۔

تنبیہ اس دوسری تفسیر میں ایک عام ادب بزرگوں اور بڑوں کا بھی معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں بڑوں کو ان کا نام لے کر پکارنا اور بُلانا بے ادبی ہے اس لئے تعظیمی لقب سے مخاطب کرنا چاہیئے۔ (معارف القرآن ج ۶ صفحہ ۴۵۴، ۴۵۵)

روضۂ اقدس کے سامنے بھی بلند آواز سے سلام وکلام کرنا ممنوع ہے

قاضی ابوبکر ابن عربی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعظیم اور ادب

آپؐ کی وفات کے بعد ایسا ہی واجب ہے جیسا حیات میں تھا۔ اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ آپؐ کی قبر شریف کے سامنے بھی نہ زیادہ بلند آواز سے سلام و کلام کرنا ادب کے خلاف ہے۔ اسی طرح جس مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی احادیث پڑھی یا بیان کی جارہی ہوں اس میں بھی شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔ کیونکہ آپؐ کا کلام جس وقت آپؐ کی زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہو اُس وقت سب کے لئے خاموش ہو کر اُس کا سننا واجب و ضروری تھا اسی طرح بعد وفات جب مجلس میں آپؐ کا کلام سُنایا جاتا ہو وہاں شور و شغب کرنا بے ادبی ہے۔

مسئلہ جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء ہونے کے داخل ہیں اس طرح رفع صوت کا بھی یہ حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے اُن کی آواز دب جائے۔ (قرطبی)

(معارف القرآن ج ۸ ص۱۰۱)

آلِ رسولؐ کی تعظیم کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعظیم و محبت کا ساری کائنات سے زائد ہونا جزو ایمان بلکہ مدار ایمان ہے اور اس کے لئے لازم ہے کہ جس کو جس قدر نسبت قریبہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ہے اس کی تعظیم و محبت بھی اسی پیمانے سے واجب و لازم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کہ انسان کی صلبی اولاد کو سب سے زیادہ نسبتِ قُرب حاصل ہے اس لئے ان کی محبت بلاشبہ جزو ایمان ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ازواجِ مطہراتؓ اور دوسرے صحابہ کرام جن کو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ متعدد قسم کی نسبتیں قربت اور قرابت کی حاصل ہیں ان کو فراموش کر دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حُبِ اہلِ بیت و آلِ رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا مسئلہ اُمت میں کبھی زیرِ اختلاف نہیں رہا۔ باجماع و اتفاق اُن کی محبت و عظمت لازم ہے۔

اختلافات وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں دوسروں کی عظمتوں پر حملہ کیا جاتا ہے ورنہ آلِ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے عام سادات خواہ ان کا سلسلۂ نسب کتنا بعید بھی ہو، ان کی محبت وعظمت میں سعادت واجر وثواب ہے اور چونکہ بہت سے لوگ اس میں کوتاہی برتنے لگے۔ اس لئے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے چند اشعار میں اس کی سخت مذمت فرمائی۔ وہ اشعار یہ ہیں اور درحقیقت یہی جمہور اُمت کا مسلک ومذہب ہے۔

یا راکباً قف بالمحصب من منیٰ

واھتف بساکن خیفھا والناھض

سحراً اذا فاض الحجیج الیٰ منیٰ

فیضاً کملتطم الفرات الفائض

ان کان رفضاً حب آل محمدٍ

فلیشھد الثقلان انی رافضی

یعنی اے شہسوار! منیٰ کی وادی محصب کے قریب رک جاؤ اور جب صبح کے وقت عازمین حج کا سیلاب ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح منیٰ کی طرف روانہ ہو تو اس علاقے کے ہر باشندے اور ہر راہرو سے پکار کر یہ کہہ دو کہ اگر صرف آلِ محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی محبت کا نام رفض ہے تو اس کائنات کے تمام جنات و انسان گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔"

(معارف القرآن ج ۷، ص ۶۹۱، ص ۶۹۲)

معذور آدمی سے بے خبری میں آدابِ مجلس کے خلاف ہو جائے تو وہ قابلِ عتاب نہیں

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بعض روسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے۔ بعض روایات میں ان میں سے بعض کے نام بھی آئے ہیں، ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ،

اُبی بن خلف، شیبہ کہ اتنے میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھا۔ یہ قطع کلام ناگوار ہوا اور آپؐ نے اُن کی طرف التفات نہیں کیا اور ناگواری کی وجہ سے آپ چیں بجبیں ہوئے۔

جب اس مجلس سے اُٹھ کر جانے لگے تو وحی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ آیتیں عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۝ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝ نازل ہوئیں۔ اس کے بعد جب وہ آپؐ کے پاس تشریف لاتے آپؐ اُن کی بڑی خاطر کرتے تھے۔ ھٰذہ الروایات کلھا فی الدر المنثور۔

شانِ نزول میں جو واقعہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا صحابیؓ کا نقل کیا گیا ہے اس میں بغوی نے یہ مزید روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نابینا ہونے کے سبب یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ آپؐ کسی دوسرے سے گفتگو میں مشغول ہیں، مجلس میں داخل ہو کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو آواز دینی شروع کی اور بار بار آواز دی (مظہری)۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالےٰ کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ایک آیت قرآن پڑھوانے کا سوال کیا اور اس سوال کے فوری جواب دینے پر اصرار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اس وقت مکّہ کے کفّار سرداروں کو دین کی تبلیغ کرنے اور سمجھانے میں مصروف تھے۔ یہ سردار عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل ابن ہشام اور آنحضرتؐ کے چچا حضرت عباس تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اس موقع پر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا اس طرح خطاب کرنا اور ایک آیت کے الفاظ درست کرنے کے معمولی سوال پر فوری جواب کے لئے اصرار کرنا ناگوار ہوا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ بن ام مکتوم پکّے مسلمان اور ہر وقت کے حاضر رہنے والے تھے۔ دوسرے اوقات میں بھی سوال کر سکتے تھے۔ ان کے جواب کے مؤخر کرنے میں کسی دینی نقصان کا خطرہ نہ تھا، بخلاف رؤسائے قریش کے

کہ نہ یہ لوگ ہر وقت آپؐ کی خدمت میں آتے ہیں اور نہ ہر وقت ان کو اللہ تعالےٰ کا کلام پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ آپؐ کی بات سُن رہے تھے جس سے ان کے ایمان لانے کی توقع کی جا سکتی تھی اور ان کی بات کاٹ دی جاتی تو ایمان ہی سے محرومی ان کی ظاہر تھی۔ ان مجموعہ حالات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ابن ام مکتومؓ سے رُخ پھیر کر اپنی ناگواری کا اظہار فرمایا اور جو گفتگو تبلیغِ حق کی روسائے قریش کے ساتھ جاری تھی اس کو جاری رکھا۔ اس پر مجلس سے فارغ ہونے کے وقت سورۂ عبس کی آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں جس میں آپؐ کے اس طرزِ عمل کو ناپسندیدہ قرار دے کر آپؐ کو ہدایت کی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل اپنے اجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آدابِ مجلس کے خلاف گفتگو اختیار کرے اس کو کچھ تنبیہ ہونی چاہئیے تاکہ وہ آئندہ آدابِ مجلس کی رعایت کرے تو آپؐ نے حضرت ابن ام مکتومؓ سے رُخ پھیر لیا اور دوسری بات یہ تھی کہ بظاہر کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں اُن کے ازالہ کی فکر مقدم ہونا چاہئیے، بمقابلے دین کے فروعی احکام کی تعلیم کے جو عبد اللہ ابن ام مکتومؓ چاہتے تھے۔ مگر حق تعالےٰ جل شانہٗ نے آپؐ کے اس اجتہاد کو درست قرار نہیں دیا اور اس پر متنبہ فرمایا کہ یہاں قابلِ غور بات یہ تھی کہ ایک شخص جو آپؐ سے دینی تعلیم کا طالب ہو کر سوال کر رہا ہے اس کے جواب کا فائدہ تو یقینی ہے اور جو آپؐ کا مخالف ہے آپؐ کی بات سُننا بھی پسند نہیں کرتا اس سے گفتگو کا فائدہ موہوم ہے۔ موہوم کو یقینی پر ترجیح نہ ہونا چاہئیے اور عبد اللہ ابن ام مکتومؓ سے جو آدابِ مجلس کے خلاف بات سرزد ہوئی اُن کا لفظ قرآن نے اعمیٰ کہہ کر بتلا دیا کہ وہ نابینا تھے اس لئے ان کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ آپؐ اس وقت کس شغل میں ہیں کن لوگوں سے گفتگو چل رہی ہے اس لئے وہ معذور تھے مستحق اعتراض نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ کسی معذور آدمی سے بے خبری میں کوئی بات آدابِ مجلس کے خلاف ہو جائے تو وہ قابلِ عتاب نہیں۔ (معارف القرآن ج ۸ ص ۶۷۲، ص ۶۷۳)۔

اتباعِ سُنّت میں سَو شہیدوں کا اَجر

مُقدّمہ

رسُولِ کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی پیشین گوئی کے مطابق آخر زمانہ میں فتنوں کی کثرت ہونے والی تھی وہ ہوئی اور ہوتی چلی گئی۔ ہم جیسے ضعیف القوۃ، ضعیف الہمت، ضعیف الایمان لوگوں کی نوبت اُس دور میں آئی جب کہ پوری دُنیا کو فتنوں نے گھیر لیا ہے روز و شب نئے نئے فتنوں کی بارش ہے۔

لیکن جیسے فتنوں کا زمانہ مشکلات کا خارزار ہے ویسے ہی اس زمانے میں صحیح طریق سُنّت پر قائم رہنے اور دُوسروں کو قائم رکھنے کے خصائل بھی بے حد و بے قیاس ہیں۔ حدیث میں ہے:۔

العبادۃ فی الھرج کھجرۃ الیّ ــ "فتنہ کے زمانے میں عبادت کرنا ایسا ہے جیسے
رواہ مسلم۔ (مشکوۃ) ــ کوئی ہجرت کرکے میرے پاس آجائے"

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فسادِ اُمّت کے زمانہ میں میری سُنّت کو زندہ کرے اُس کے لئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ فتنہ کے زمانے میں سُنّت کے مطابق نیک عمل کرنے والے کا ثواب پچاس آدمیوں کے عمل کے برابر ثواب رکھتا ہے اور وہ پچاس بھی آج کے نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے پچاس آدمی۔

اور جس وقت بدعات و منکرات دُنیا میں پھیل جائیں اُس وقت کے اہلِ علم کے لئے آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ ان کو اُس وقت اپنے علم کا اظہار کرنا چاہیئے اور جو ایسا نہ کرے اُس پر سخت وعید فرمائی ہے:۔

(کما اخرجہ الآجری فی کتاب السنۃ عن معاذ بن جبلؓ و سیأتی تمامہ)

چنانچہ ہر زمانہ اور ہر دَور کے عُلماء نے اپنے زمانہ میں فتنوں کے طوفان میں رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی سُنّت کے صحیح طریقہ کو روشن کیا اور بدعات و محدثات کی تلبیس کو دُور کیا۔

لیکن آج کل جن فتنوں کا طوفان ہے ان میں ایک طرف لادینی، انکارِ خدا، انکارِ رسالتؐ، انکارِ حدیث، انکارِ ختم نبوت کے وہ فتنے ہیں جن کی ضرب براہِ راست اسلام کی بُنیادوں پر پڑتی ہے۔ اس ناکارہ نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے دینی تعلیم و تبلیغ فتویٰ اور تصنیف و تالیف کے مثبت کام کے ساتھ جو کچھ کام ہو سکا وہ انہی فتنوں کے مقابلہ میں کیا جو اعتقادی بدعات ہیں، عملی بدعات و محدثات کے سلسلے میں اب تک کوئی خاص کام نہیں ہو سکا۔ حال ہی میں ایک محترم دوست نے اپنے ماہنامہ کے لئے بدعات کی تعریف اور اس کی خرابیوں پر مشتمل ایک مقالہ لکھنے کے لئے مجھے فرمایا اور خلافِ عادت کچھ ایسے اصرار سے فرمایا کہ اپنی بے شمار ذمّہ داریوں، مصروفیتوں اور اس پر طبعی ضعف کے باوجود وعدہ کر لینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ کچھ لکھنا شروع بھی کیا لیکن صبح سے رات کے بارہ بجے تک تمام اوقات مشغول، وقت کہاں سے لاؤں۔

ایک اتفاقی حادثہ

مگر بحکم قضاء و قدر ۲۳ رجب ۱۳۷۶ھ ۲۴ مارچ ۱۹۵۵ء میں دوپہر کے کھانے کے ساتھ ہڈی کا ایک نوکیلا ریزہ حلق میں اُتر گیا اور احساس اُس وقت ہُوا جب وہ کافی نیچے پہنچ کر حلق میں پھنس گیا، جُوں جُوں اُسے نیچے اُتارنے کی تدبیریں کیں وہ اور حلق کے گوشت میں پیوست ہوتا چلا گیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں انسان کے سارے عزائم، پروگرام اور مشاغل ایک منٹ میں ختم ہو جاتے ہیں۔

کراچی میں حلق کے اسپیشلسٹ ماہر ڈاکٹر شفیع الدین خان صاحب نے خصوصی عنایت و توجہ سے ایکسرے کے بعد جب ہڈی کو حلق میں پیوست دیکھا تو بے ہوش کر کے بغیر اپریشن کے نکال لیا۔ حق تعالےٰ نے دوسری زندگی عطا فرمائی۔ پچھلی زندگی کی بربادی پر

افسوس اور نئی زندگی کو ٹھکانے لگانے کی مِلی جُلی فکریں دل و دماغ پر چھائی ہوئی ادھر دل و دماغ حادثہ کے اثر سے دُکھے ہوئے کسی کام پر اقدام کی اجازت نہیں دیتے۔ ڈاکٹروں اور دوستوں کی بھی یہ تاکید کی چند روز آرام کیا جائے۔ تجویز یہ ہوئی کہ دارالعلوم کراچی کی جدید عمارت جو شہر سے دس بارہ میل دُور شرافی گوٹھ میں بنی ہے چند روز وہاں رہا جائے۔

بالآخر اتوار ۳ر شعبان ۱۳۷۶ھ کو یہاں آگیا۔ یہاں کی صحت بخش آب و ہوا اور کُھلی فضاء کو حق تعالیٰ نے اس نئی زندگی کی غذا بنا دیا اور اب اس فرصت میں طبیعت کچھ کام تلاش کرنے لگی۔ بدعت و سُنّت کا یہ مقالہ جو زیرِ تحریر تھا اور اسی طرح ایک دو اور ضروری مضامین جو زیرِ تحریر تھے ان کی تکمیل کا خیال آیا بنامِ خدا تعالیٰ شروع کیا تو دو روز میں بعونہٖ تعالیٰ یہ زیرِ نظر رسالہ تیار ہو گیا۔

اس پُوری داستان کو سامنے رکھ کر جب ذرا بھی حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو انسانی عزم و ارادہ اور اُس کے سعی و عمل اور اس میں کامیابی و ناکامی کی پوری حقیقت محسوس ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ یہاں کچھ اپنا نہیں ہے۔ ہر حرکت ہر سکون ہر عمل ہر سعی اسی رب العالمین کا کرم ہی کرم ہے۔ انسان کے ہاتھ پاؤں کو اس میں مشغول کر کے اُس کے برائے نام کسب و اختیار کے نام پر اس کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ فللّٰہ الحمد اولہ و اخرہٗ۔

نہ بہ حرف ساختہ سرخوشم نہ بہ نقش بستہ مشوشم
نفسے بیادِ تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

ایک دردمندانہ گزارش

بدعت وسُنّت کی جنگ میں ایک لمحۂ فکریہ

بدعت کی تعریف اور اُس کی خرابیاں از رُوئے قرآن وسُنّت آگئے آتی ہیں لیکن اس جگہ ایک بات ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہے کہ جو شخص سُنّت کے اِتباع اور بدعت کی مخالفت کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا منشاء بجز اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی سچّی محبت اور اُن کے دین کی حفاظت کے اور کچھ نہیں۔

اسی طرح جو شخص کسی بدعت میں مُبتلا ہے۔ منشاء اس کا بھی اللہ تعالےٰ جلّ شانہٗ اور اُس کے رسول صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی محبت اور ان کی رضاء حاصل کرنا ہی ہے اور رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ارشاد کے مطابق بدعت کو وہ بھی گمراہی کہتا اور بُرا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم صحیح نہ ہونے کے سبب وہ کسی بدعت کو بدعت نہیں سمجھتا، بلکہ اُس کو عبادت اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولِ مقبول صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی رضا کا ذریعہ سمجھ کر اسے اختیار کئے ہوئے ہے۔

اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ رسولِ کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ارشاد کے مطابق ہر مُسلمان کی خیر خواہی کو اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے ہمدردی وخیر خواہی کے لہجے میں مسلمانوں کو حقیقتِ امر سے واقف کرایا جائے۔

تشدّد، طعنہ زنی اور الزام تراشی کے طریقوں سے کلّی طور پر اجتناب کیا جائے کہ ان سے کبھی کسی کی اصلاح نہیں ہوتی۔ "بدعتی" اور "وہابی" کے طعن آمیز خطابات سے پرہیز کیا جائے اور کسی کے کلام کو توڑ مروڑ کر اُس کے منشاء ومقصد

کے خلاف اس پر غلط الزام لگانا کھلا بہتان ہے۔ جس کے حرام ہونے میں کسی کو کسی تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ آخرت کے حساب کو سامنے رکھتے ہوئے ان حرکات سے باز رہا جائے۔

اس مختصر گذارش کے بعد اصل مقصد پر آتا ہوں اور چونکہ اصل خرابی ناواقفیت اور بدعت کو بدعت نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے اس لئے پہلے بدعت کی تعریف اور اس کی حقیقت لکھتا ہوں۔

اِنْ اَرَدْتُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ
وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِيْمِ

بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ

بدعت کیا چیز ہے؟

اور اس میں کیا خرابی ہے؟

بدعت کی تعریف

اصل لغت میں بدعت ہر نئی چیز کو کہتے ہیں خواہ عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اور اصطلاح شرع میں ہر ایسے نو ایجاد طریقۂ عبادت کو بدعت کہتے ہیں جو زیادہ ثواب حاصل کرنے کی نیت سے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے بعد اختیار کیا گیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عہد مبارک میں اس کا داعیہ اور سبب موجود ہونے کے باوجود نہ قولاً ثابت ہو نہ فعلاً نہ صراحتہً نہ اشارۃً، بدعت کی یہ تعریف علامہ برکوئی کی کتاب "الطریقۃ المحمدیہ" اور علامہ شاطبی کی کتاب "الاعتصام" سے لی گئی ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہُوا کہ عادات اور دنیوی ضروریات کے لئے جو نئے نئے آلات اور طریقے روزمرہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں ان کا شرعی بدعت سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہ بطور عبادت اور بہ نیتِ ثواب نہیں کئے جاتے یہ سب جائز اور مباح ہیں بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم کے مخالف نہ ہوں۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو عبادات آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے قولاً ثابت ہو یا فعلاً صراحتہً یا اشارۃً وہ بھی بدعت نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس کام کی ضرورت عہدِ رسالت میں موجود نہ تھی بعد میں کسی

دینی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیدا ہوگئی وہ بھی بدعت میں داخل نہیں۔ جیسے مروجہ مدارس اسلامیہ، تعلیمی تبلیغی انجمنیں اور دینی نشر و اشاعت کے ادارے اور قرآن و حدیث سمجھنے کے لئے صرف و نحو اور ادب عربی اور فصاحت و بلاغت کے فنون یا مخالفِ اسلام فرقوں کا رد کرنے کے لئے منطق اور فلسفہ کی کتابیں یا جہاد کے لئے جدید اسلحہ اور جدید طریق جنگ کی تعلیم وغیرہ کو یہ سب چیزیں ایک حیثیت سے عبادت بھی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں۔ مگر پھر بھی ان کو بدعت اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا سبب داعی اور ضرورت اُس عہد مبارک میں موجود نہ تھا بعد میں جیسی جیسی ضرورت پیدا ہوتی گئی علماء اُمت نے اس کو پورا کرنے کے لئے مناسب تدبیریں اور صورتیں اختیار کرلیں۔

اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب چیزیں نہ اپنی ذات میں عبادت ہیں نہ کوئی ان کو اس خیال سے کرتا ہے کہ ان میں زیادہ ثواب ملے گا بلکہ وہ چیزیں عبادت کا ذریعہ اور مقدمہ ہونے کی حیثیت سے عبادت کہلاتی ہیں گویا یہ احداث فی الدین نہیں بلکہ احداث للدین ہے اور احادیث میں ممانعت احداث فی الدین کی آئی ہے۔ احداث للدین کی نہیں۔ یعنی کسی منصوص دینی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بضرورت زمان و مکان کوئی نئی صورت اختیار کرلینا ممنوع نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جن کاموں کی ضرورت عہد رسالت میں اور زمان مابعد میں یکساں ہے اُن میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں اس کو بدعت کہا جائے گا اور یہ از رُوئے قرآن و حدیث ممنوع و ناجائز ہوگا۔

مثلاً درود و سلام کے وقت کھڑے ہوکر پڑھنے کی پابندی، فقراء کو کھانا کھلاکر ایصالِ ثواب کرنے کے لئے کھانے پر مختلف سُورتیں پڑھنے کی پابندی نماز باجماعت کے بعد پوری جماعت کے ساتھ کئی کئی مرتبہ دُعا مانگنے کی پابندی۔ ایصالِ ثواب کے لئے تیجہ، چہلم وغیرہ کی پابندی، رجب و شعبان وغیرہ کی متبرک راتوں میں خود ایجاد قسم کی

نمازیں اوران کے لئے چراغاں وغیرہ اور پھران خود ایجاد چیزوں کو فرض و واجب کی طرح سمجھنا ان میں شریک نہ ہونے والوں پر ملامت اور لعن طعن کرنا وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ درود وسلام، صدقہ خیرات، اموات کو ایصالِ ثواب، متبرک راتوں میں نماز و عبادت، نمازوں کے بعد دُعا یہ سب چیزیں عبادات ہیں ان کی ضرورت جیسے آج ہے ایسے ہی عہدِ صحابہ میں بھی تھی۔ ان کے ذریعہ ثواب آخرت اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذوق وشوق جیسے آج کسی نیک بندے کو ہو سکتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو ان سب سے زائد تھا۔ کون دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اس کو صحابہ کرام سے زائد ذوق عبادت اور شوق رضائے الٰہی حاصل ہے۔

حضرتِ حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کل عبادۃ لم یتعبدها اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فلا تعبدوها فان الاول لم یدع للآخر مقالاً فاتقوا اللہ یا معشر المسلمین وخذوا بطریق من کان قبلکم۔ یعنی صحابہ کرامؓ نے جو عبادت نہیں کی وہ عبادت نہ کرو کیونکہ پہلے لوگوں نے پچھلوں کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کو یہ پورا کریں۔ اے مسلمانو! خدا تعالےٰ سے ڈرو اور پہلے لوگوں کے طریقے کو اختیار کرو اور اسی مضمون کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی منقول ہے۔ (اعتصام للشاطبی ج ۱ صد ۳۱۰)

بِدعت کے نَاجائز و ممنوع ہونے کی وجُوہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ سب کام عہدِ صحابہ کرامؓ میں بھی عبادت کی حیثیت سے جاری تھے تو ان کے ایسے طریقے اختیار کرنا جو رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اختیار نہیں کیے ان کا فلسفہ اور حکمت کیا ہے؟ کیا یہ مقصد ہے کہ ان عبادات کے یہ نئے طریقے معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو معلوم نہ تھے؟ آج ان دعوے داروں پر انکشاف ہوا ہے اس لئے انہوں نے

اختیار نہیں کئے یہ کر رہے ہیں۔

دین میں کوئی بدعت نکالنا رسول اللہ پر خیانت کی تہمت لگانا ہے

اگر کہا جائے کہ ان کو معلوم تھے مگر لوگوں کو نہیں بتلایا تو کیا یہ معاذ اللہ ان حضرات پر دین میں بخل و خیانت اور تبلیغ رسالت کے فرائض میں کوتاہی کا الزام نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کوئی بدعت ایجاد کرتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے معاذ اللہ رسالت میں خیانت کی کہ پوری بات نہیں بتلائی ہے۔

بدعت نکالنا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ دین عہدِ رسالتؐ میں مکمل نہیں ہوا تھا

ایک طرف تو قرآن کریم کا یہ اعلان اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ یعنی میں نے آج تم پر اپنا دین مکمل کر دیا۔ دوسری طرف عبادات کے نئے نئے طریقے نکال کر عملاً یہ دعوےٰ کہ شریعتِ اسلام کی تکمیل آج ہو رہی ہے؟ کیا کوئی مسلمان جان بوجھ کر اس کو قبول کر سکتا ہے۔

اس لئے یقین کیجئے کہ عبادات کا جو طریقہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی دلکش اور بہتر نظر آئے وہ اللہ تعالےٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے نزدیک اچھا نہیں۔ اسی کو حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ مالم یکن یومئذ دینا لا یکون الیوم دینا یعنی جو کام اس دُنیا میں دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے ان طریقوں کو معاذ اللہ نہ تو ناواقفیت کی بناء پر چھوڑا تھا نہ سُستی یا غفلت کی بناء پر بلکہ ان کو غلط اور مُضر سمجھ کر چھوڑا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ جو ثانی فاروق اعظمؓ سمجھے جاتے تھے انہوں نے بھی مضمون اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے۔

آج اگر کوئی شخص نماز تین کے بجائے چار رکعت شام کی اور صبح کی دو کے بجائے

تین یا چار پڑھنے لگے یا روزہ مغرب تک رکھنے کے بجائے عشاء کے بعد تک رکھے تو ہر سمجھ دار مسلمان اس کو بُرا اور غلط اور ناجائز کہے گا۔ حالانکہ اس غریب نے بظاہر کوئی گناہ کا کام نہیں کیا بلکہ کچھ تسبیحات زیادہ پڑھیں، کچھ اللہ تعالےٰ کا نام زیادہ لیا۔ پھر اُس کو باتفاق بُرا اور ناجائز سمجھا۔ کیا صرف اسی لئے نہیں کہ اُس نے آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے بتلائے اور سکھلائے ہوئے طریقہ عبادت پر زیادتی کرکے عبادت کی صُورت بدل ڈالی اور ایک طرح سے اس کا دعوےٰ کیا کہ شریعت کو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے مکمل نہیں کیا تھا بلکہ اس نے کیا ہے یا معاذ اللہ آپؐ نے ادائے امانت میں کوتاہی اور خیانت برتی ہے کہ یہ نئے اور مفید طریقہائے عبادت لوگوں کو نہیں بتلائے۔

اب غور کیجئے کہ نماز کی رکعات تین کے بجائے چار پڑھنے میں اور نمازوں، دعاؤں اور درود وسلام کے ساتھ ایسی شرطیں اور طریقے اضافہ کرنے میں کیا فرق ہے؟ جو آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ سے منقول نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عباداتِ شرعیہ میں اپنی طرف سے قیدوں، شرطوں کا اضافہ شریعتِ محمدیہؐ کی ترمیم اور تحریف ہے اس لئے اس کو شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔

بدعت تحریفِ دین کا راستہ ہے

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر عبادات میں اپنی طرف سے قیدیں شرطیں اور نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی اجازت دے دی جائے تو دین کی تحریف ہو جائے گی۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی پتہ نہ لگے گا کہ اصل عبادت جو رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے بتلائی تھی کیا اور کیسی تھی۔

پچھلی اُمتوں میں تحریفِ دین کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنی کتاب اور اپنے پیغمبر کی بتلائی ہوئی عبادات میں اپنی طرف سے عبادات کے نئے نئے طریقے نکال لئے اور اُن کی رسم چل پڑی۔ کچھ عرصے کے بعد اصل دین اور نوایجاد چیزوں میں کوئی امتیاز نہ رہا۔

شریعتِ اسلام میں نفل کو فرض سے جدا کرنے کا حکم

شریعتِ اسلام نے چونکہ ہر فتنہ کے دروازہ کو بند اور فسادِ دین کے راستہ کو روکا ہے اسی لئے اس کا بھی خاص اہتمام فرمایا کہ فرائض اور نوافل میں پورا امتیاز رہے۔ حقیقت کے اعتبار سے بھی اور صورت کے اعتبار سے بھی۔ نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کا تو یہ معمول رہا کہ مسجد میں صرف فرض نماز جماعت سے ادا فرماتے، باقی نوافل اور سنتیں بھی گھر میں جاکر پڑھتے تھے اور جن نمازوں کے بعد سنت یا نفل نہیں ہے اُن میں اگر نماز کے بعد مسجد میں بیٹھنا اور کوئی وظیفہ پڑھنا ہے تو بصورتِ نماز قبلہ رخ نہیں بیٹھتے بلکہ داہنی یا بائیں جانب پھر کر بیٹھتے ہیں تاکہ دُور ہی سے ہر شخص یہ سمجھ لے کہ نماز فرض ختم ہو چکی ہے۔ اب امام جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ اختیاری چیز ہے۔
اصل سُنت تو یہی ہے کہ نوافل اور نفلی عبادات سب تنہائی میں اپنے گھروں میں ادا کی جائیں اور اگر مسجد میں ہی سنتیں پڑھنا ہو تو بھی مسنون طریقہ یہ ہے کہ جماعت فرض کی ہیئت کو ختم کر دیا جائے، صفیں توڑ دی جائیں اور لوگ آگے پیچھے ہو کر سنتیں پڑھیں۔
اسی طرح روزہ شرعاً صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ لیکن چونکہ رات کو سب لوگ عادۃً سوتے ہیں اور سونے کی حالت میں بھی کھانے پینے سے آدمی ایسا ہی رُکا رہتا ہے جیسا روزہ میں، اس لئے سحری کھانا مسنون قرار دیا گیا تاکہ سونے کے وقت جو صورت روزہ کی ہو گئی تھی اس سے امتیاز ہو جائے اور روزہ ٹھیک صبح صادق کے بعد سے شروع ہو۔ اسی لئے سحری کھانا بالکل آخر وقت میں مستحب ہے۔ اسی طرح غروبِ آفتاب کا یقین ہو جاتے ہی روزہ فوراً افطار کرنا چاہیئے دیر کرنا مکروہ ہے تاکہ روزہ کی عبادت کے ساتھ زائد وقت کا روزہ میں اضافہ نہ ہو جائے۔
آج بھی یہ سب چیزیں بحمد اللہ مسلمانوں میں جاری ہیں مگر جہالت و ناواقفیت سے ان چیزوں کی حقیقت سے بے خبری ہے۔ صبح اور عصر کی نماز کے بعد عام طور پر ائمہ مساجد قبلہ کی جانب سے مُڑ کر تو بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اس پر نظر نہیں کہ یہ مُڑنا

اس غرض سے تھا کہ عملاً اس کا اعلان کر دیں کہ اب فرض ختم ہو چکے ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کرے جہاں چاہے جائے مگر یہاں پوری جماعت کو اس کا پابند کیا ہُوا ہے کہ جب تک تین مرتبہ دُعاء جماعت کے ساتھ نہ کر لیں اس وقت تک سب منتظر رہیں۔ پھر ان دعاؤں میں بھی خاص خاص چیزوں کی ایسی پابندی ہے جیسے کوئی فرض ہو جب تک وہ خاص دُعائیں نہ پڑھی جائیں عوام یوں سمجھتے ہیں کہ نماز کا کوئی جزء رہ گیا۔

یہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعلیمات اور شریعتِ اسلام کی احتیاط کی صریح مخالفت ہے کہ دُعاؤں اور وظیفوں کو نماز فرض کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ یہ وظیفے اور دُعائیں بھی گویا نماز کا جزء ہیں۔ جو امام یہ دعائیں اور وظائف سب مقتدیوں کو ساتھ لے کر نہ پڑھے اُس کی نماز کو مکمل نہیں سمجھا جاتا بلکہ اُس پر طرح طرح کے الزام لگائے جاتے ہیں۔

بدعت حسنہ اور سیّئہ

صحیح حدیث میں ہے کل بدعة ضلالة وكل ضلالة فى النار یعنی ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ اصطلاحِ شرع میں ہر بدعت سیئہ اور گمراہی ہے۔ کسی بدعتِ اصطلاحی کو بدعت حسنہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ لغوی معنی میں ہر نئی چیز کو بدعت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے ایسی چیزوں کو بدعتِ حسنہ کہہ دیتے ہیں جو صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھی۔ بعد میں کسی ضرورت کی بناء پر اُن کو اختیار کیا گیا جیسے آج کل کے مدارس اسلامیہ اور اُن میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون۔ کہ اصل بُنیاد تعلیم اور درس اور مدرسہ کی تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ نے خود فرمایا انما بعثت معلما یعنی میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ لیکن جس طرح کے مدارس کا قیام اور ان میں جس طرح کی تعلیم آج کل بضرورت زمانہ ضروری ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کے عہد

ہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ آج ضرورت پیش آئی تو احیاء سنّت کے لئے اُس کو اختیار کیا گیا۔

جو تعریف بدعت کی اُوپر لکھی جا چکی ہے اُس کی رُو سے ایسے اعمال بدعت میں داخل نہیں لیکن لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی ان کو بدعت کہہ دے تو بدعتِ حسنہ ہی کہا جائے گا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے تراویح کی یک جا جماعت کو دیکھ کر اس معنے کے اعتبار سے فرمایا نعمت البدعۃُ ھذہ یعنی یہ بدعت تو اچھی ہے کیونکہ اُن کو اور سب کو معلوم تھا کہ تراویح رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے خود پڑھی اور پڑھائی اور زبانی اس کی تاکید کی۔ اس لئے حقیقتً اور شرعًا تو اس میں بدعت کا کوئی احتمال نہ تھا۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے عہدِ مبارک میں ایک خاص عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت کا ایسا اہتمام نہ کیا گیا تھا جو بعد میں حضورؐ کی تعلیم ہی کے مطابق کیا گیا۔ اس لئے ظاہری اور لغوی طور پر یہ کام بھی نیا تھا اُس کو نعمت البدعۃ فرمایا۔ بدعت حسنہ کا اس سے زیادہ کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: من ابتدع بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمدًا صلی اللہ علیہ وسلّم خان الرسالۃ لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم اکملت لکم دینکم فما لم یکن یومئذ دینًا لا یکون الیوم دینًا۔ (اعتصام ج ۱ صـ۲۸)

فاروق اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ارشاد یا بعض بزرگوں کے ایسے کلمات کی آڑ لے کر طرح طرح کی بدعتیں بدعتِ حسنہ کے نام سے ایجاد کرنے والوں کے لئے اس میں کوئی وجہ جواز نہیں ہے بلکہ جو چیز اصطلاح شرع میں بدعت ہے وہ مطلقاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ بدعات میں پھر کچھ درجات ہیں بعض سخت حرام قریب شرک کے ہیں۔ بعض مکروہ تحریمی بعض تنزیہی۔

قرآن وحدیث اور آثارِ صحابہ وتابعین و ائمہ دین میں بدعات ومحدثات کی خرابی اور اُن سے اجتناب کی تاکید پر بے شمار آیات و روایات ہیں ان میں سے بعض اس جگہ نقل کی جاتی ہیں۔

بدعت کی مذمت قرآن وحدیث میں

علامہ شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں آیاتِ قرآنیہ کافی تعداد میں اس موضوع پر جمع فرمائی ہیں ان میں سے دو آیتیں اس جگہ لکھی جاتی ہیں :۔

(۱) وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔

"مت ہو مشرکین میں سے جنہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اپنے دین کو اور ہو گئے فرقے اور پارٹیاں ہر ایک پارٹی اپنے طرز پر خوش ہے"۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ اس سے مراد اہلِ بدعت کی پارٹیاں ہیں ۔

(اعتصام ج ۱ ص ۶۵)

(۲) قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔

"آپ فرمائیے کہ کیا میں تمہیں بتلاؤں کہ کون لوگ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ والے ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی وعمل دُنیا کی زندگی میں ضائع اور بیکار ہو گئی اور وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا عمل کر رہے ہیں"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے اَخسَرِینَ اَعمَالاً کی تفسیر اہلِ بدعت سے کی ہے اور بلا شُبہ اس آیت میں اہلِ بدعت کی حالت کا پُورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خود تراشیدہ اعمال کو نیکی سمجھ کر خوش ہیں کہ ہم ذخیرۂ آخرت حاصل کر رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے نزدیک اُن کے اعمال کا نہ کوئی وزن ہے اور نہ ہی ثواب بلکہ اُلٹا گناہ ہے۔

روایاتِ حدیث بدعت کی خرابی اور اُس سے روکنے کے بارے میں بے شمار ہیں۔ ان میں سے بھی چند روایات لکھی جاتی ہیں :۔

(۱) صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالے عنہا سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے فرمایا :-

من احدث فی امرنا ما لیس منہ فھو رد - (اعتصام بحوالہ بخاری)

"جو شخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو دین میں داخل نہیں وہ مردود ہے"

(۲) مسلم نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ اخرجہ مسلم وفی روایۃ للنسائی کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ فی النار - (اعتصام ج ۱ ص۴۶)

"حمد وصلوٰۃ کے بعد سمجھو کہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ اور طرزِ عمل محمد (صلی اللہ تعالے علیہ وسلم) کا طریقہ اور طرزِ عمل ہے اور بد ترین چیز نو ایجاد بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ہر نو ایجاد عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت جہنم میں ہے"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالے عنہ بھی یہی خطبہ دیا کرتے تھے اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اپنے خطبہ میں الفاظِ مذکورہ کے بعد یہ بھی فرماتے تھے :-

انکم ستحدثون ویحدث لکم فکل محدثۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار - (اعتصام ج ۱ ص۴۶)

"تم بھی نئے نئے کام نکالو گے اور لوگ تمہارے لئے نئی نئی صورتیں عبادت کی نکالیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ ہر نیا طریقۂ عبادت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم ہے"

(۳) صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالے عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے فرمایا۔

من دعا الی الھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من یتبعہ لا ینقص ذالک من اجورھم

"جو شخص لوگوں کو صحیح طریق ہدایت کی طرف بلائے تو ان تمام لوگوں کے عمل کا ثواب اس کو ملے گا جو اس کا اتباع کریں بغیر اس کے کہ اُن کے ثواب میں کچھ

شيئاً ومن دعا الى ضلالة كان عليه من الاثم مثل آثام من يتبعه لا ينقص ذالك من آثامهم شيئاً ۔

کمی کی جائے اور جو شخص کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اُس پر اُن سب لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس کا اتباع کریں گے بغیر اس کے کہ اُن کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے "۔

بدعات کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے والے اور اُن کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والے اس کے انجامِ بد پر غور کریں کہ اس کا وبال تنہا اپنے عمل ہی کا نہیں بلکہ جتنے مُسلمان اس سے متاثر ہوں گے اُن سب کا وبال بھی اُن پر ہے ۔

(۴) ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالٰے عنہ سے باسناد صحیح روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے ایک روز ہمیں خُطبہ دیا جس میں نہایت مؤثر اور بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہنے لگیں اور دل ڈر گئے۔ بعض حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! آج کا وعظ تو ایسا ہے جیسے رُخصتی وصیّت ہوتی ہے تو آپؐ ہمیں بتلائیں کہ ہم آئندہ کس طرح زندگی بسر کریں۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا :۔

اوصيكم بتقوى الله والسمع والطاعة لو كانت الامراء ان كان عبدا حبشيا فان من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافاً كثيرا فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ، واياكم ومحدثات الامور فان كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة ۔(اعتصام)

"میں تمہیں وصیّت کرتا ہوں اللہ تعالٰے سے ڈرنے کی اور حُکّامِ اسلام کی اطاعت کرنے کی اگرچہ تمہارا حاکم حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بڑا اختلاف دیکھیں گے، اس لئے تم میری سُنّت اور میرے بعد خلفاء راشدین مہدیین کی سنت کو اختیار کرو اور اُس کو مضبوط پکڑو اور دین میں نو ایجاد طریقوں سے بچو۔ کیونکہ ہر نو ایجاد طرزِ عبادت بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

(۵) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالٰے عنہا نے فرمایا :۔

"جو شخص کسی بدعتی کے پاس گیا اور اس کی تعظیم کی تو گویا اُس نے اسلام کو ڈھانے میں اُس کی مدد کی۔" (اعتصام للشاطبی ج ۱ ص ۸۴)

(۶) اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

"اگر تم چاہتے ہو کہ پل صراط پر تمہیں دیر نہ لگے اور سیدھے جنت میں جاؤ تو اللہ کے دین میں اپنی رائے سے کوئی نیا طریقہ نہ پیدا کرو۔ (اعتصام)

(۷) آجری کی کتاب السنہ میں حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم۔ نے فرمایا۔

اذا احدث فی امتی البدع و شتم اصحابی ، فلیظھر العالم علمہ فمن لم یفعل فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین ۔ (اعتصام ج ۱ ص ۸۵)

"جب میری اُمت میں بدعتیں پیدا ہو جائیں اور میرے صحابہ کو بُرا کہا جائے تو اس وقت کے عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے اور جو ایسا نہ کرے گا تو اُس پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔"

عبداللہ بن حسن نے فرمایا کہ میں نے ولید بن مُسلم سے دریافت کیا کہ حدیث میں اظہار علم سے کیا مراد ہے۔ فرمایا " اظہارِ سُنّت "

(۸) حضرت حُذیفہ ابن یمانؓ نے فرمایا۔

"مسلمانوں کے لئے جن چیزوں کا مجھے خطرہ ہے اُن میں سب سے زیادہ خطرناک دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ جو چیز وہ دیکھیں اُس کو اُس پر ترجیح دینے لگیں جو اُن کو سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے معلوم ہے۔ دُوسرے یہ کہ وہ غیر شعوری طور پر گمراہ ہو جائیں۔"

سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ یہ لوگ صاحبِ بدعت ہیں۔

(۹) اور حضرت حُذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا۔

"خدا کی قسم! آئندہ زمانے میں بدعتیں اس طرح پھیل جائیں گی کہ اگر کوئی شخص

اس بدعت کو ترک کرے گا تو لوگ کہیں گے کہ تم نے سُنّت چھوڑ دی ۔"

(اعتصام ج ۱ ص ۹۰)

(۱۰) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا :۔

" اے لوگو! بدعت اختیار نہ کرو اور عبادت میں مبالغہ اور تعمق نہ کرو اور پرانے طریقوں کو لازم پکڑے رہو۔ اُس چیز کو اختیار کرو جو از رُوئے سُنّت تم جانتے ہو اور جس کو اس طرح نہیں جانتے اُس کو چھوڑ دو ۔"

(۱۱) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ فرماتے ہیں :۔

" آئندہ لوگوں پر کوئی نیا سال نہ آئے گا جس میں وہ کوئی بدعت ایجاد نہ کریں گے اور کسی سُنّت کو مُردہ نہ کر دیں گے ۔ یہاں تک کہ بدعتیں زندہ اور سُنتیں مُردہ ہو جائیں گی ۔" (اعتصام ج ۱ ص ۹۵)

(۱۲) حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا :۔

" بدعت والا آدمی جتنا زیادہ روزہ اور نماز میں مجاہدہ کرتا جاتا ہے وہ اتنا ہی اللہ تعالٰی سے دور ہوتا جاتا ہے ۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ صاحبِ بدعت کے پاس نہ بیٹھو کہ وہ تمہارے دل کو بیمار کر دے گا ۔"

(۱۳) حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا :۔

" کوئی قول بغیر عمل کے مستقیم نہیں اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مستقیم نہیں اور کوئی قول اور عمل اور نیت اُس وقت تک مستقیم نہیں جب تک کہ وہ سُنّت کے مطابق نہ ہو ۔"

(۱۴) ابو عمرو شیبانی فرماتے ہیں :۔

" صاحبِ بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوتی ۔ (کیونکہ وہ تو اپنے گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا تو توبہ کس سے کرے ۔)

(۱۵) حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کا یہ کلام حضرت امام مالکؒ اور

تمام علماء وقت کے نزدیک ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

سن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سننا و ولاۃ الامر من بعدہ سننا الاخذ بہا تصدیق لکتاب اللہ واستکمال لطاعۃ اللہ، وقوۃ علی دین اللہ، لیس لاحد تغییرھا ولا تبدیلھا ولا النظر فی شیئ خالفھا، من عمل بہا مھتد ومن انتصر بہا منصور ومن خالفھا اتبع غیر سبیل المؤمنین، وولاہ اللہ ما تولی واصلاہ جھنم وساءت مصیرا۔

"رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نے کچھ سُنتیں جاری فرمائیں اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے کچھ سُنتیں جاری فرمائیں ان کو اعتبار کرنا کتاب اللہ کی تصدیق اور اطاعتِ الٰہی کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے دین میں قوت حاصل کرنا ہے کسی طرح نہ اُن میں تغیّر کرنا ہی جائز ہے نہ بدلنا اور نہ اُس کے خلاف کسی چیز پر نظر کرنا۔ جو اُن پر عمل کرے گا ہدایت پائے گا اور جو ان سنتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنا چاہے گا اس کی مدد ہو گی اور جو اُن کے خلاف کرے اُس نے مسلمانوں کے راستہ سے مخالف راستہ اختیار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کی تجویز و اختیار پر چھوڑ دے گا اور پھر جہنم میں جلائے گا اور جہنم بُرا ٹھکانہ ہے۔"

بدعات ومحدثات

حضرات صوفیائے کرام کی نظر میں!

بدعات ومحدثات کے ایجاد کرنے والے اور اُن پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ طریقت کی پناہ لیتے ہیں اور اُن ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ "طریقت وشریعت دو متضاد چیزیں ہیں۔ بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں اہلِ طریقت اُن کو جائز قرار دیتے ہیں" اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ اس میں مُبتلا ہونے کے بعد دین وایمان کی خیر نہیں۔ کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے۔ جب اس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے۔

اسی لئے مناسب معلوم ہُوا کہ حضرات صوفیائے کرام اور مشائخِ طریقت کے ارشادات بدعات کی مذمت اور اتباعِ سُنت کی تاکید میں بقدرِ کفایت جمع کئے جاویں تاکہ عوام اس دھوکہ سے بچ جائیں کہ مشائخ طریقت بدعات کو مذموم نہیں سمجھتے یا اتباعِ سنت میں متساہل ہیں۔ اس سلسلے کے لئے علامہ شاطبیؒ نے اپنی کتاب "الاعتصام" جز امیں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس میں صوفیائے متقدمین کے ارشادات دربارۂ مذمت بدعات جمع کئے جاتیں۔ ہمارے لئے ان کا ترجمہ کر دینا کافی ہے۔ وھی ہذا:-

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاضؒ

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے اس کو حکمت نصیب نہیں ہوتی۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ حق تعالےٰ نے قرآن کریم میں دُعا قبول فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ فرمایا اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ مگر ہم بعض کاموں کے لئے زمانہ دراز سے دُعا کررہے ہیں قبول نہیں ہوتی۔ اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمہارے قلوب مرچکے ہیں اور مُردہ دل کی دعا قبول نہیں ہوتی اور موتِ قلوب کے دس سبب ہیں :۔

اوّل یہ کہ تم نے حق تعالےٰ کو پہچانا مگر اس کا حق ادا نہیں کیا۔ دوسرےؔ تم نے کتاب اللہ کو پڑھا اور اس پر عمل نہیں کیا۔ تیسرےؔ تم نے رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی محبّت کا دعویٰ تو کیا مگر آپؐ کی سنت کو چھوڑ بیٹھے۔ چوتھے شیطان کی دشمنی کا دعویٰ کیا مگر اعمال میں اس کی موافقت کی۔ پانچویں تم کہتے ہو کہ ہم جنّت کے طالب ہیں مگر اس کے لئے عمل نہیں کرتے۔ اسی طرح پانچ چیزیں اور شمار کرائیں۔

غرض اس حکایت کے نقل سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ترکِ سُنّت کو موت قلب کا سبب قرار دیتے ہیں۔

حضرت ذوالنون مصریؒ

فرماتے ہیں کہ حق تعالےٰ کی محبّت کی علامت یہ ہے کہ اخلاق و اعمال اور تمام امور اور سنن میں حبیب اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا اتباع کیا جاوے اور فرمایا کہ لوگوں کے فساد کا سبب چھ چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ عمل آخرت کے متعلق اُن کی ہمتیں اور نیتیں ضعیف ہوگئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے اجسام ان کی خواہشات کا گھوارہ بن گئے۔

تیسرےؔ یہ کہ ان پر طولِ امل غالب آگیا۔ یعنی دنیوی سامان میں قرنوں اور زمانوں کے انتظام کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ اُن کی عمر قلیل ہے۔ چوتھے یہ کہ

انہوں نے مخلوق کی رضا کو حق تعالیٰ کی رضا پر ترجیح دے رکھی ہے۔ پانچویں یہ کہ وہ اپنی ایجاد کردہ چیزوں کے تابع ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ بیٹھے۔ چھٹے یہ کہ مشائخ سلف اور بزرگانِ متقدمین میں سے اگر کسی سے کوئی لغزش صادر ہو گئی تو ان لوگوں نے اسی کو اپنا مذہب بنا لیا اور ان کے فعل کو اپنے لئے حجت سمجھا اور اُن کے باقی تمام فضائل و مناقب کو دفن کر دیا۔

ایک شخص کو آپ نے نصیحت فرمائی کہ تمہیں چاہیئے کہ سب سے زیادہ اہتمام اللہ تعالیٰ کے فرائض و واجبات کے سیکھنے اور اُن پر عمل کرنے کا کرو اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں منع کیا ہے ان کے پاس نہ جاؤ۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی عبادت کا وہ طریقہ جو اس نے خود تعلیم فرمایا ہے اس طریقہ سے بہت بہتر ہے جو تم خود اپنے لئے بناتے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے لئے اس میں زیادہ اجر و ثواب ہے۔ جیسے بعض لوگ خلافِ سنّت رہبانیت کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔

بندہ کا فرض یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے آقا کے حکم پر نظر رکھے اور اسی کو اپنے تمام معاملات میں حَکَم بنائے اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے روک دیا ہے بندہ اس سے بچے۔

آج کل لوگوں کو حلاوتِ ایمان اور طہارتِ باطن سے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ وہ فرائض اور واجبات کو معمولی چیز سمجھ کر ان کا اتنا اہتمام نہیں کرتے جتنا کرنا چاہیئے۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اے بشر! تم جانتے ہو کہ تمہیں حق تعالیٰ نے سب اَقران پر فوقیت و فضیلت کس سبب سے دی ہے؟ مَیں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! مَیں واقف نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس فضیلت

کا سبب یہ ہے کہ تم میری سُنت کا اتباع کرتے ہو اور نیک لوگوں کی عزت کرتے ہو۔ اور اپنے بھائیوں کی خیر خواہی کرتے ہو اور میرے صحابہ کرام اور اہلِ بیت کی محبت رکھتے ہو۔

حضرت ابوبکر دقاق رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہٗ جو حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے اَقران میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اس میدان میں سے گزر رہا تھا جہاں چالیس سال تک بنی اسرائیل قدرتی طور پر محصور رہے اور نکل نہ سکتے تھے جس کو وادی تیہہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ علم حقیقت، علم شریعت سے مخالف ہے۔ اچانک مجھے غیبی آواز آئی۔

کل حقیقۃ لا تتبع بالشریعۃ فھی کفر۔

(ترجمہ) جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے۔

حضرت ابوعلی جوازنیؒ

حضرت ابوعلی جوازنیؒ فرماتے ہیں کہ بندہ کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ اس پر خدا تعالےٰ اور رسولؐ کی اطاعت آسان ہو جاتے اور اس کے افعال مطابقِ سنت کے ہو جاویں اور اس کو نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہو جاوے اور اپنے احباب و اخوان کے ساتھ اُس کو حُسن اخلاق کی توفیق ہو اور خلق اللہ کے لئے اُس کا نیک سلوک عام ہو اور مسلمانوں کی غم خواری اس کا شیوہ ہو اور اپنے اوقات کی نگہداشت کرے (یعنی ضائع ہونے سے بچائے)۔

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ اتباعِ سنت کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا کہ بدعات سے اجتناب اور ان عقائد و احکام کا اتباع جن پر علمائے اسلام کے صدر اوّل کا اجماع ہے اور ان کی اقتداء کو لازم سمجھنا۔

حضرت ابوبکر ترمذیؒ

حضرت ابوبکر ترمذی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ کمال ہمت اس کے تمام اوصاف کے ساتھ سوائے اہل محبت کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ درجہ ان کو محض اتباع سنّت اور ترکِ بدعت کی وجہ سے حاصل ہُوا۔ کیونکہ نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم تمام مخلوق سے زیادہ صاحبِ ہمت اور سب سے زیادہ واصل الی اللہ تھے۔

ف ہمت اصطلاحِ صوفیہ میں تصرف اور توجہ کو کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنے تخیّل کی قوت کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کی طرف جمع کرے۔ اس جگہ ممکن ہے کہ یہی مراد ہو۔ مگر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے تصرّف اور ہمت اصطلاحی کے استعمال کا صدور کہیں صراحتًہ ثابت نہیں اس لئے غالبًا اس جگہ ہمت کے لغوی معنی مراد ہیں۔ یعنی دین کے کاموں میں چُستی اور مضبوطی۔ واللہ سبحانہ تعالےٰ اعلم۔

حضرت ابوالحسن وراقؒ

حضرت ابوالحسن وراقؒ فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالےٰ تک صرف اللہ تعالےٰ ہی کی مدد اور اس کے حبیب صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی اقتداء فی الاحکام کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے اور جو شخص وصول الی اللہ کے لئے سوا اقتداء رسول کے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے وہ ہدایت حاصل کرنے کی خاطر گمراہ ہوگیا۔

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ

یہ بزرگ حضرت ابو عبداللہ مغربی اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہما کے اصحاب میں سے ہیں۔ بدعات سے سخت متنفر اور مبتدعین پر سخت رد کرنے والے، کتاب وسُنّت کے طریقے پر مضبوطی سے قائم اور مشائخ ائمہ متقدمین کے طرز کا التزام کرنے والے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن منازل اُن کے

متعلق فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن شیبان رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ تمام فقراء اور اہلِ آداب و معاملات پر خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک حجت ہیں ۔

حضرت ابو عمر زجاجی رح

یہ عُبّاد و زہاد کے مشہور امام حضرت جنید رح اور حضرت سفیان ثوری رح کے اصحاب میں سے ہیں، فرماتے ہیں :-

"زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ ان چیزوں کا اتباع کرتے تھے جن کو ان کی عقلیں مستحسن سمجھتی تھیں ۔ پھر نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے ان کو اتباعِ شریعت کا ارشاد فرمایا۔ پس عقل صحیح وسلیم وہی ہے جو محسنات شرعیہ کو اچھا اور مکروہات شرعیہ کو ناپسند سمجھے "۔

حضرت ابو یزید بسطامی رح

فرماتے ہیں کہ مَیں نے تیس سال مجاہدات کئے۔ مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباع علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہُوا۔ اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوجاتا تو مَیں مصیبت میں پڑ جاتا۔ بلاشُبہ عُلماء کا اختلاف رحمت ہے (مگر وہ اختلاف جو تجرید توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں) اور اتباع صرف اتباع سُنّت کا نام ہے (کیونکہ علم سُنّت کے علاوہ دوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں) ۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ اُن کے وطن میں تشریف لائے۔ شہر میں ان کی ولایت و بزرگی کا چرچا ہُوا۔ حضرت ابو یزید بسطامی رح نے بھی زیارت کا قصد کیا اور اپنے ایک رفیق سے کہا۔ چلو اِن بزرگ کی زیارت کر آئیں ۔

ابو یزید رح اپنے رفیق کے ساتھ اُن کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہ بزرگ گھر سے نماز کے لئے نکلے۔ جب مسجد میں داخل ہُوئے تو جانب قبلہ میں تھوک دیا۔ حضرت ابو یزید یہ حالت دیکھتے ہی واپس ہو گئے اور ان کو سلام بھی نہ کیا اور فرمایا کہ یہ

شخص نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے۔ اس سے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کوئی ولی اللہ ہو۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اس واقعہ کو کتاب الاعتصام میں نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو یزیدؒ کا یہ ارشاد ایک اصل عظیم ہے جس سے معلوم ہوا کہ تارکِ سُنت کو ولایت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ ترک سُنت بوجہ ناواقفیت ہونے کے ہی ہوا ہو۔

اب آپ اندازہ کریں کہ جو علانیہ ترک سُنت اور احداثِ بدعت پر مُصر ہوں ان کو بزرگی اور ولایت سے دُور کا بھی کوئی واسطہ ہو سکتا ہے؟

حضرت ابو محمد بن عبدالوہاب ثقفی رحمہ

آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ صرف وہی اعمال قبول فرماتے ہیں جو صواب اور درست ہوں اور صواب و درست میں بھی صرف وہی اعمال مقبول ہیں جو خالص (اس کے لئے ہوں) اور خالص میں سے بھی وہی اعمال مقبول ہوتے ہیں جو سُنت کے مطابق ہوں)۔

نیز حضرت ابو یزید کا ارشاد ہے:-

"اگر تم کسی شخص کی کھلی کھلی کرامات دیکھو، یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑنے لگے تو اُس سے ہرگز دھوکہ نہ کھاؤ اور اس کی بزرگی و ولایت کے اس وقت تک معتقد نہ ہو جب تک کہ یہ نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور جائز و ناجائز اور حفاظت حدود اور آداب شریعت کے معاملے میں اس کا کیا حال ہے"۔

حضرت سہل تستری رحمہ

حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ جو فعل بغیر اقتداء (رسول) کے کرتا ہے۔ خواہ وہ (خوبصورت) طاعت ہو یا معصیت، وہ عیش نفس ہے اور

جو فعل اقتداء و اتباع سے کرتا ہے وہ نفس پر عتاب اور مشقت ہے۔ کیونکہ نفس کی خواہش کبھی اقتداء و اتباع میں نہیں ہو سکتی اور اصل مقصود ہمارے طریق (یعنی سلوک) کا یہی ہے کہ اتباع ہوا سے بچیں۔ نیز فرمایا کہ ہمارے (صوفیاء کرام کے) سات اصول ہیں۔ ایک کتاب اللہ کے ساتھ تمسک، دوسرے سنتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اقتداء۔ تیسرے اکلِ حلال (یعنی کھانے پینے اور استعمال کرنے میں اس کا لحاظ کہ کوئی چیز حرام و ناجائز نہ ہو) چوتھے لوگوں کو تکلیف سے بچانا، پانچویں گناہوں سے بچنا، چھٹے توبہ اور ساتویں ادائے حقوق۔

نیز ارشاد فرمایا کہ تین چیزوں سے مخلوق مایوس ہوگی۔ توبہ کا التزام اور سنتِ رسول ؐ کا اتباع اور مخلوق کو اپنی ایذا سے بچانا۔ نیز کسی نے آپ سے دریافت فرمایا کہ فتوت (عالی ظرفی) کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ اتباعِ سنت۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رح

فرماتے ہیں کہ بسا اوقات میرے قلب میں معارف و حقائق اور علومِ صوفیاء میں سے کوئی خاص نکتۂ عجیبہ وارد ہوتا ہے اور ایک زمانۂ دراز تک وارد ہوتا رہتا ہے۔ مگر میں اس کو دو عادل گواہوں کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا اور وہ عادل گواہ کتاب و سنت ہیں۔

حضرت ابو حفص حدّاد رح

حضرت ابو حفص حدّاد رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر وقت اپنے افعال و احوال کو کتاب و سنت کی میزان میں وزن نہیں کرتا اور اپنے خواطر (واردات قلبیہ) کو مہتمم (ناقابلِ اطمینان) نہیں سمجھتا اس کو مردانِ راہ تصوف میں شمار نہ کرنا۔ نیز آپ سے بدعت کی حقیقت دریافت کی گئی تو فرمایا کہ احکام میں تعدّی یعنی شرعی حدود سے تجاوز کرنا اور تہاون فی السنن۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی سنتوں میں

سستی کرنا اور اتباع الآراء والاھواء یعنی اپنی خواہشات اور غیر معتبر آراء رجال کی پیروی اور ترک الاتباع والاقتداء یعنی سلف صالح کے اتباع و اقتداء کو چھوڑنا اور کبھی کسی صوفی کو کوئی حالت رفیعہ بغیر امر صحیح کے اتباع کے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

حضرت حمدون قصار رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگوں کے اعمال پر احتساب اور دار و گیر کسی شخص کے لئے کس وقت جائز ہوتی ہے؟ فرمایا کہ جب وہ یہ سمجھے کہ احتساب اور امر بالمعروف مجھ پر فرض ہوگیا ہے (فرض ہونے کی صورت یہ ہے کہ جس کو امر بالمعروف کیا جائے وہ اس کا ماتحت اور تحت القدرت ہو) یا یہ یقین ہو کہ ہماری وہ بات مان لے گا۔ (وغیر ذالک) یا یہ خوف ہو کہ کوئی انسان بدعت میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوجاوے گا اور اس کو یہ گمان ہے کہ ہمارے کہنے سننے سے اُس کو نجات ہوجاوے گی۔

نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص صالح کے احوال پر نظر ڈالتا ہے اس کو اپنا قصور اور مردان راہ خدا کے درجات سے اپنا پیچھے رہنا معلوم ہوجاتا ہے)۔

علامہ شاطبی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ غرض اس کلام کی (واللہ اعلم) یہ ہے کہ لوگوں کو سلف صالح کی اقتداء کی ترغیب دیں۔ کیونکہ یہی حضرات اہلِ سُنّت ہیں۔

حضرت احمد بن ابی الحواری رح

فرماتے ہیں کہ جو شخص کوئی عمل بلا اتباع سُنّت کرتا ہے اُس کا عمل باطل ہے۔

سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

آپ کے سامنے کسی نے ذکر کیا کہ عارفین پر ایک حالت ایسی آتی ہے کہ وہ تمام

حرکات و اعمال چھوڑ کر تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہیں۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اسقاط اعمال کے قائل ہیں۔

فرمایا کہ میں تو اگر ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں تو اپنے اختیار سے اعمال بر (اطاعت و عبادات) میں سے ایک ذرہ بھی کم نہ کروں۔ ہاں مغلوب و مجبور ہو جاؤ تو دوسری بات ہے۔

اور فرمایا کہ وصول الی اللہ کے جتنے راستے عقلاً ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب بجز اتباع آثار رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے تمام مخلوق پر بند کر دیئے گئے۔ یعنی بغیر اقتداء رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے کوئی شخص ہرگز تقرب اللہ حاصل نہیں کر سکتا اور جو دعوے کرے وہ کاذب ہے۔

اور فرمایا کہ ہمارا یہ مذہب کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے۔ نیز ارشاد فرمایا کہ جو شخص قرآن مجید کو حفظ[ل] نہ کرے اور حدیث رسولؐ کو نہ لکھے۔ اس معاملہ (تصوف) میں اس کی اقتداء نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ہمارا علم کتاب و سنت کے ساتھ مقید ہے اور فرمایا کہ حدیث رسول صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابو عثمان جیریؒ

حضرت ابو عثمان جیری رحمۃ اللہ تعالے علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالے کے ساتھ معیت وصحبت تین چیزوں سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک حسن ادب، دوسرے دوام ہیبت، تیسرے مراقبہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے ساتھ صحبت و

ل حفظ قرآن سے غالباً مراد یہ ہے کہ احکام قرآن پر اس کی نظر ہو اور تلاوت کا ورد ہو، اسی طرح کتابتِ حدیث سے ضروری احادیث کے مضامین حفظ ہونا مراد ہے۔ جیسا کہ مشائخ سلف و خلف کے تعامل سے واضح ہے۔ محمد شفیع عفی عنہ

معیت، اتباعِ سنّت اور ظاہر شریعت کے التزام سے حاصل ہوتی ہے، اور اولیاء کی صحبت و معیت ادب و احترام اور خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔

آپ کی وفات کے وقت جب آپ کا حال متغیر ہوا تو صاحبزادہ نے بوجہ شدتِ غم و الم کے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ ابو عثمان نے آنکھ کھولی اور فرمایا۔ بیٹا ظاہر اعمال میں خلافِ سنت کرنا یہ باطن میں ریاء ہونے کی علامت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس پر اپنے قول و فعل میں سنت کو حاکم بنا دے گا وہ حکمت کے ساتھ گویا ہوگا اور جو قول و فعل میں خواہشات و ہوا کو حاکم بنائے گا وہ بدعت کے ساتھ گویا ہوگا۔ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے: وان تطیعوہ تھتدوا۔ یعنی اگر تم نبی کریمؐ کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

حضرت ابوالحسین نوریؒ

فرماتے ہیں جس کو تم دیکھو کہ تقرب الی اللہ میں وہ کسی ایسی حالت کا مدعی ہے جو اس کو علمِ شرعی کی حد سے باہر نکال دے تو تم اس کے پاس نہ جاؤ۔

حضرت محمد بن فضل بلخیؒ

حضرت محمد بن فضل بلخی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلام کا زوال چار چیزوں سے ہے۔ ایکؔ یہ کہ لوگ علم پر عمل نہ کریں۔ دوسرےؔ یہ کہ علم کے خلاف عمل کریں۔ تیسرےؔ یہ کہ جس چیز کا علم ہو اس کو حاصل نہ کریں۔ چوتھےؔ یہ کہ لوگوں کو علم حاصل کرنے سے روکیں۔ علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ توان کا ارشاد ہے اور ہمارے زمانہ کے صوفیوں کا عام طور سے یہی حال ہوگیا۔

اور فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ سب سے زیادہ معرفت رکھنے والا وہ شخص ہے جو اس کے اوامر کے اتباع میں سب سے زیادہ مجاہدہ کرتا ہو اور اس کے رسولؐ کا سب سے زیادہ متبع ہو۔

حضرت شاہ کرمانیؒ

حضرت شاہ کرمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی نظر کو محارم سے محفوظ رکھے اور اپنے نفس کو شبہات سے بچائے اور اپنے باطن کو دوام مراقبہ کے ساتھ معمور کرے اور ظاہر کو اتباعِ سنت سے آراستہ کرے اور اپنے نفس کو اکلِ حلال کی عادت ڈالے تو اس کی فراست میں کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔

حضرت ابو سعید خرّازؒ

حضرت ابو سعید خرّاز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر شریعت جس باطنی حالت کا مخالف ہو وہ باطل ہے۔

حضرت ابو العبّاس ابن عطاءؒ

جو سید الطائفہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے اقران میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے نفس پر آدابِ الٰہیہ کو لازم کرلے، اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو نورِ معرفت سے منور فرما دیتا ہے اور کوئی مقام اس سے اعلیٰ و اشرف نہیں ہے کہ بندہ حبیب اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اوامر اور اخلاق میں ان کا متبع ہو جائے۔

نیز فرمایا کہ سب سے بڑی غفلت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے غافل ہو اور یہ کہ اس کے آداب معاملہ سے غافل ہو۔

حضرت ابراہیم خواصؒ

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ علم کثرت روایات کا نام نہیں بلکہ عالم صرف وہ شخص ہے جو اپنے علم کا متبع ہو اور اس پر عمل کرے اور

سنتِ نبویؐ کی اقتداء کرے اگرچہ اس کا علم تھوڑا ہو۔ کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ عافیت کیا چیز ہے تو فرمایا :-

دین بلا بدعة وعمل بلا آفة وقلب بلا شغل ونفس بلا شهوة ۔	"دین بغیر بدعت کے اور عمل بغیر آفت کے (یعنی بدعات و مخترعات کی آفتیں اس میں شامل نہ ہوں) اور قلب فارغ جس کو (غیر اللہ کا) شغل نہ ہو اور نفس جس میں شہوت (کا غلبہ) نہ ہو۔"

اور فرمایا کہ (حقیقی) صبر یہ ہے کہ احکام کتاب و سنت پر مضبوطی سے قائم رہے ۔

حضرت بنان حمالؒ

آپ سے دریافت کیا گیا کہ احوالِ صُوفیہ کی اصل کیا ہے ؟ فرمایا (چار چیزیں) اوّل جس چیز کا حق تعالےٰ نے خود ذمّہ لے لیا ہے اس میں اس پر اعتماد و توکل کرنا۔ (یعنی رزق) دُوسرے احکامِ الٰہی پر مضبوطی سے قائم رہنا، تیسرے قلب کی حفاظت (لایعنی تفکرات سے) چوتھے کونین سے فارغ ہو کر توجہ محض ذات حق تعالےٰ کی طرف رکھنا۔

حضرت ابو حمزہ بغدادی قدس سرّہٗ

آپ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو حق کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے اس پر چلنا بھی سہل ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ تک پہنچانے والے راستے کے لئے کوئی رہبر و راہنما بجز سنت رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے احوال و افعال و اقوال میں متابعت کے نہیں ہے۔

حضرت ابو اسحاق رقاشی قدس سرّہٗ

حضرت ابو اسحاق رقاشی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ میں حق تعالےٰ کی نظر میں محبوب ہوں یا نہیں ؟ تو علامت اللہ تعالےٰ کی محبت کی یہ ہے کہ

وہ اللہ تعالےٰ کی طاعت اور اُس کے رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی متابعت کو سب کاموں پر ترجیح دے اور دلیل اس کی حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے :۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ۔

حضرت ممشاد دینوری قدس سرہٗ

آپ فرماتے ہیں کہ آدابِ مرید کا خلاصہ یہ ہے کہ مشائخ کے احترام و عظمت کا التزام کرے اور اخوانِ طریقت کی حُرمت کا خیال رکھے اور اسباب کی فکر میں (زیادہ) نہ پڑے اور آداب شریعت کی اپنے نفس پر پوری حفاظت کرے ۔

حضرت ابو علی رودباری رحمۃ اللہ علیہ

آپ سے کسی نے ذکر کیا کہ بعض صوفیاء غناء مزامیر سُنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ میرے لئے حلال ہے۔ کیونکہ میں ایسے درجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھ پر اختلافِ احوال کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ اُس نے یہ تو سچ کہا ہے کہ وہ پہنچ گیا ہے مگر اللہ تعالےٰ تک نہیں جہنم تک ۔

حضرت ابو محمد عبداللہ بن منازل رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابو محمد عبداللہ بن منازل رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص فرائض شرعیہ میں سے کسی فریضے کو ضائع کرتا ہے تو اس کو اللہ تعالےٰ سنن کی اضاعت میں مُبتلا فرما دیتے ہیں ۔

حیلہ مروّجہ کے احکام

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اندریں مسئلہ کہ ہمارے علاقہ میں ایک حیلہ مروج ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ جنازہ کے بعد کچھ لوگ دائرہ باندھتے ہیں اور میّت کے وارث ایک قرآن شریف اور اس کے ساتھ کچھ نقد باندھتے ہیں اور دائرہ میں لاتے ہیں۔ امام مسجد جو دائرہ میں ہوتا ہے وہ لیتا ہے اور یہ الفاظ اس پر پڑھتا ہے:۔

کل حق من حقوق اللہ من الفرائض والواجبات والکفارات والمنذورات بعضها ادیت وبعضها لم تؤد الآن عاجز عن ادائها واعطینا هذه المنحة الشریفة علی هذه النقودات فی حیلة الاسقاط رجاء من اللہ تعالیٰ ان یغفر لہٗ۔

اور ایک دوسرے کی مِلک ہوتا ہے۔ تین دفعہ اس کو پھیرا جاتا ہے۔ بعدہٗ نصف امام کو اور نصف غرباء کو تقسیم کیا جاتا ہے۔

زید ایک امام مسجد ہے، اُس نے اس مروجہ حیلہ کو چھوڑ دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس مروجہ حیلہ کی دلیل وثبوت ادلّہ شرعیہ سے کوئی نہیں۔ لہٰذا یہ بات بدعت ہے۔ زید کے ترک پر زید کو لوگ ملامت کرتے ہیں اور زید باوجود حنفی المذہب ہونے کے اس کو وہابی کہتے ہیں اور اس حیلہ کے جواز پر آباؤ اجداد کی دلیل لاتے ہیں۔

کیا زید حق پر ہے یا باطل پر؟ اس مروجہ حیلہ کے متعلق کیا حکم ہے؟ زید اس رواج اور اس التزام واصرار کو ختم کرنے کا شرعاً حق دار اور مصیب ہوگا یا نہیں؟ نیز بعض صورتوں میں مشترک ترکہ میں سے روپیہ لایا جاتا ہے، جس میں بعض وارث موجود نہیں ہوتے۔ نیز بعض دفعہ یتیم بچے رہ جاتے ہیں۔ کیا یہ مال حیلہ میں لایا جا سکتا ہے یا نہیں اور دائرہ

والے لے سکتے ہیں یا نہیں؟ بینوا بالدلائل الشرعیۃ۔

الجواب

حیلہ اسقاط یا دور بعض فقہائے کرام نے ایسے شخص کے لئے تجویز فرمایا تھا جس کے کچھ نماز، روزہ وغیرہ اتفاقاً فوت ہو گئے، قضا کرنے کا موقع نہیں ملا اور موت کے وقت وصیت کی۔ لیکن اس کے ترکہ میں اتنا مال نہیں جس سے تمام فوت شدہ نماز روزہ وغیرہ کا فدیہ ادا کیا جا سکے۔ یہ نہیں کہ اس کے ترکہ میں مال موجود ہو اس کو تو وارث بانٹ کھائیں اور تھوڑے سے پیسے لے کر یہ حیلہ حوالے کر کے خدا و خلق کو فریب دیں۔ درمختار، شامی وغیرہ کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور ساتھ ہی اس حیلہ کی شرائط میں اس کی تصریحات واضح طور پر فرمائی ہیں کہ جو رقم کسی کو صدقہ کے طور پر دی جائے اس کو اس رقم کا حقیقی طور پر مالک و مختار بنا دیا جائے کہ جو چاہے کرے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں دینے کا محض ایک کھیل کیا جائے۔ جیسا عموماً آج کل اس حیلہ میں کیا جاتا ہے کہ نہ دینے والے کا یہ قصد ہوتا ہے کہ جس کو وہ دے رہے ہیں وہ صحیح معنی میں اس کا مالک و مختار ہے اور نہ لینے والے کو یہ تصور و خیال ہو سکتا ہے کہ جو رقم میرے ہاتھ میں دی گئی ہے میں اس کا مالک و مختار ہوں۔

دو تین آدمی بیٹھتے ہیں اور ایک رقم کو باہمی ہیرا پھیری کا ایک ٹوٹکا سا کر کے اٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے میت کا حق ادا کر دیا اور وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گیا۔ حالانکہ اس لغو حرکت سے میت کو نہ تو کوئی ثواب پہنچا، نہ اس کے فرائض کا کفارہ ادا ہوا، کرنے والے مفت میں گناہ گار ہوئے۔

رسائل ابن عابدین میں اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ "منۃ الجلیل" کے نام سے شامل ہے اس میں تحریر فرمایا ہے:۔

ویجب الاحتراز من ان یدیرها اجنبی الا بوکالۃ کما ذکرنا وان یکون الوصی او الوارث کما علمت، ویجب الاحتراز من ان یلاحظ

الوصی عند دفع الصرۃ للفقیر الهزل او الحیلۃ بل یجب ان یدفعها عازمًا علی تملیکها منه حقیقۃ لا تحیلًا ملاحظا ان الفقیر اذا ابیٰ عن هبتها الی الوصی کان له ذالک ولا یجبر علی الهبۃ ۔

(منۃ الجلیل فی اسقاط ما علی الذمۃ من کثیر وقلیل) جزء رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۲۲۵)

الغرض اس حیلہ کی ابتدائی بنیاد ممکن ہے کچھ صحیح اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو لیکن جس طرح کا رواج اور التزام آج کل چل گیا ہے وہ بلا شبہ ناجائز اور بہت سے مفاسد پر مشتمل قابلِ ترک ہے۔ چند مفاسد اجمالی طور پر لکھے جاتے ہیں:۔

(۱) بہت مواقع میں اس کے لئے جو قرآن مجید اور نقد رکھا جاتا ہے وہ میت کے متروکہ مال میں سے ہوتا ہے اور اس کے حق دار وارث بعض موجود نہیں ہوتے یا نابالغ ہوتے ہیں تو ان کے مشترک سرمایہ کو ان کی اجازت سے اس کام میں استعمال کرنا حرام ہے حدیث میں ہے:

لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه ۔

اور نابالغ تو اگر اجازت بھی دیدے تو وہ شرعًا نامعتبر ہے اور ولی نابالغ کو ایسے تبرعات میں اس کی طرف سے اجازت دینے کا اختیار نہیں بلکہ ایسے کام میں اس مال کا خرچ کرنا حرام ہے۔ بنص قرآن آیت کریمہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ (ترجمہ) جو لوگ یتیموں کے مال ظلمًا خرچ کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں" سے ثابت ہے کہ ایسے اموال کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔

(۲) اگر بالفرض مال مشترک نہ ہو تا سب وارث بالغ ہوں اور سب سے اجازت بھی لی جائے تو تجربہ شاہد ہے کہ ایسے حالات میں یہ معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا کہ سب نے بطیب خاطر اجازت دے دی ہے یا برادری اور کنبہ کے طعنوں کے خوف سے اجازت دی ہے اور اس قسم کی اجازت حسب تصریح حدیث مذکور کالعدم ہے۔

(۳) اور اگر بالفرض یہ سب باتیں بھی نہ ہوں سب بالغ ورثاء نے بالکل خوشدلی

کے ساتھ اجازت دے دی ہو یا کسی ایک ہی شخص وارث یا غیر وارث نے اپنے مِلک خاص سے اس کا انتظام کیا ہے تو مفاسد ذیل سے وہ بھی خالی نہیں مثلاً اس حیلہ کی فقہی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس شخص کو اوّل یہ قرآن اور نقد دیا جاتا ہے اس کی ملک کر دیا جائے اور پوری وضاحت سے اس کو بتلا دیا جائے کہ تم مالک و مختار ہو جو چاہو کرو پھر وہ اپنی خوشی سے بلا کسی رسمی دباؤ یا لحاظ و مروّت کے میّت کی طرف سے کسی دوسرے شخص کو اسی طرح دیدے اور مالک بنا دے اور پھر وہ شخص اسی طرح کسی تیسرے چوتھے کو دیدے لیکن مروجہ رسم میں اس کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ اوّل تو جس کو دیا جاتا ہے، نہ دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مِلک ہو گیا اور وہ اس میں مختار ہے، نہ لینے والے کو اس کا کوئی خطرہ پیدا ہوتا ہے، جس کی کُھلی علامت یہ ہے کہ اگر یہ شخص اس وقت یہ نقد لے کر چل دے اور دوسرے کو نہ دے تو دینے والے حضرات ہرگز اس کو برداشت نہ کریں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں تملیک صحیح نہیں ہوتی اور بدونِ تملیک کے کوئی قضاء یا کفارہ یا فدیہ معاف نہیں ہوتا، اسی لئے یہ حرکت بے کار جاتی ہے۔

(۴) مذکورہ صورت میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس شخص کو مالک بنایا جائے وہ مصرف صدقہ ہو، صاحبِ نصاب نہ ہو مگر عام طور پر اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ عموماً ائمہ مساجد جو صاحبِ نصاب ہوتے ہیں انہی کے ذریعے یہ کام کیا جاتا ہے، اس لئے بھی یہ سارا کاروبار لغو و غلط ہو جاتا ہے، میّت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

(۵) اور اگر بالفرض مصرفِ صدقہ بھی صحیح انتخاب کر لیا جائے اور ان کو پورا مسئلہ بھی معلوم ہو کہ وہ قبضہ کرنے کے بعد اپنے آپ کو مالک و مختار سمجھے۔ پھر میّت کی خیر خواہی کے پیشِ نظر وہ دوسرے کو اور اسی طرح دوسرا تیسرے چوتھے کو دیتا چلا جائے تو آخر میں وہ جس شخص کے پاس پہنچتا ہے وہ اس کا مالک و مختار ہے، اس سے واپس لے کر آدھا امام کو اور آدھا دوسرے فقراء کو تقسیم کرنا ملکِ غیر میں بلا اس کی اجازت کے تصرف کرنا ہے جو ظلم اور حرام ہے حسب تصریح حدیث مذکور۔

(۶) اور بالفرض یہ آخری شخص اس کی تقسیم اور حصّے بخرے لگانے پر آمادہ بھی ہو

جائے اور فرض کرو کہ اس پر دباؤ سے نہیں دل سے ہی راضی ہو جائے تو پھر بھی اس طرح کے حیلہ کا ہر میت کے لئے التزام کرنا اور جیسے تجہیز و تکفین واجبات شرعیہ ہیں، اسی درجہ میں اس کو اعتقاداً ضروری سمجھنا یا عملاً ضروری کے درجہ میں التزام کرنا یہی احداث فی الدین ہے جس کو اصطلاحِ شریعت میں بدعت کہتے ہیں اور جو اپنی معنوی حیثیت سے شریعت میں ترمیم و اضافہ ہے۔ نعوذ باللہ!

نیز اس حیلہ کے التزام سے عوام الناس اور جہلاء کی یہ جرأت بھی بڑھ سکتی ہے کہ تمام عمر بھی نہ نماز پڑھیں، نہ روزہ رکھیں نہ حج کریں نہ زکوٰۃ دیں۔ مرنے کے بعد چند پیسوں کے خرچ سے یہ سارے مفاد حاصل ہو جائیں گے جو سارے دین کی بنیاد منہدم کر دینے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو دین کے صحیح راستہ پر چلنے اور سنتِ رسول ﷺ کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مذکور الصدر اجمالی مفاسد کو دیکھ کر بھی یہ فیصلہ کر لینا کسی مسلمان کے لئے دشوار نہیں کہ یہ حیلے حوالے اور اس کی مروجہ رسوم سب ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ میت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں اور کرنے والے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

۷ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ

مسائل فدیہ نماز و روزہ وغیرہ

مسئلہ جس شخص نے نماز، روزہ یا حج زکوٰۃ وغیرہ کی کوئی وصیت کی تو یہ وصیت اس کے ترکہ کے صرف ایک تہائی حصہ میں جاری کرنا وارثوں پر لازم ہوگا۔

ایک تہائی ترکہ سے زائد کی وصیت ہو تو وہ سب وارثوں کی اجازت و رضامندی پر موقوف ہے۔ اگر وہ سب یا ان میں سے کوئی اجازت نہ دے تو مشترکہ ترکہ سے وصیت پوری نہیں کی جا سکتی اور اگر وارثوں میں کوئی نابالغ ہے تو اس کی اجازت بھی

معتبر نہیں۔ اس کے حصّہ پر ایک تہائی سے زائد کی وصیت کا کوئی اثر نہ پڑنا چاہیئے۔
ہدایہ، عالمگیری، شامی وغیرہ۔

مسئلہ جس شخص نے وصیت کی ہو اور مال بھی اتنا چھوڑا ہو کہ اس کے ایک تہائی میں ساری وصیتیں پوری ہوسکیں تو وصیؔ اور وارثوں کے ذمّہ واجب ہے کہ اس وصیت کو پورا کریں۔ اس میں کوتاہی نہ کریں۔ میّت کا مال موجود ہوتے ہُوئے اُس کی نماز روزے کے فدیہ میں حیلہ حوالہ پر اعتماد کر کے مال کو خود تقسیم کر لیں تو گناہ اُن کے ذمّہ رہے گا۔

مسئلہ وصیت کرنے کی صورت میں واجبات و فرائض کی ادائیگی کی یہ صورت ہوگی:-
(۱) ہر روز کی نمازیں وتر سمیت چھ لگائی جائیں گی اور ہر نماز کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی۔ یعنی ایک دن کی نمازوں کا فدیہ ساڑھے دس سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی۔

(۲) ہر روزہ کا فدیہ پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ہوگی۔ رمضان کے روزوں کے علاوہ اگر کوئی نذر (منت) مانی ہُوئی ہے تو اس کا بھی فدیہ دینا ہوگا۔

(۳) زکوٰۃ جتنے سال کی اور جتنی مقدار مال کی رہی ہے اس کا حساب کر کے ادا کرنا ہوگا۔

(۴) حج فرض اگر ادا نہیں کر سکا تو میّت کے مکان سے کسی کو حج بدل کے لئے بھیجا جائے گا اور اُس کا پُورا کرایہ وغیرہ تمام مصارفِ ضروریہ ادا کرنے ہوں گے۔

(۵) کسی انسان کا قرض ہے تو اُس کو حق کے مطابق ادا کرنا ہوگا۔

(۶) جتنے صدقۃ الفطر رہے ہوں ہر ایک کے پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کی جائے گی۔

(۷) قربانی کوئی رہ گئی ہو تو اِس[1] سال میں ایک بکرے یا ایک حصّہ گائے کی قیمت کا

---

[1] یعنی جس سال کی قربانی رہ گئی ہو اُس سال ایک بکرے یا گائے کے ایک حصّہ کی جو قیمت تھی وہ قیمت صدقہ کی جائے۔ ۱۲ واللہ اعلم (محمد رفیع عثمانی)

اندازہ کر کے صدقہ کیا جائے (نیلتہ الجلیل)۔

(۸) سجدۂ تلاوت رہ گئے ہوں تو احتیاط اس میں ہے کہ ہر سجدہ کے بدلے پونے دو سیر گندم یا اُس کی قیمت کا صدقہ کیا جائے۔

(۹) اگر فوت شُدہ نمازوں یا روزوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو تخمینہ سے حساب کیا جائے گا۔

یہ سب احکام اس صُورت کے ہیں کہ مرنے والے نے وصیّت کر دی ہو اور بقدر وصیّت مال چھوڑا ہو، اور اگر وصیّت ہی نہیں کی یا ادائے وصیّت کے مطابق کافی ترکہ نہیں ہے تو وارثوں پر اس کے فرائض و واجبات کا فدیہ ادا کرنا لازم نہیں۔ ہاں وہ اپنی خوشی سے ہمدردی کرنا چاہیں تو موجبِ ثواب ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ، محرم الحرام کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی ۰

سوال

(۱) عُرس کے لغوی معنی کیا ہیں؟ اور اصطلاح شرح میں عُرس کی کیا تعریف ہے؟ قرون ثلثہ میں اس کا وجود تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تھا تو یہ کب سے ہُوا؟

(۲) آج کل ہندو بنگال کے چند مواضع مثلاً اجمیر، بریلی اور چاٹگام وغیرہ میں ایک تاریخ معین میں کوئی شاہ صاحب کسی مزار پر سجادہ نشین ہو کر بیٹھتے ہیں اور ان کے مریدین و معتقدین کا جمِ غفیر ہوتا ہے اور مزار پر عمدہ سے عمدہ بیش قیمت غلاف چڑھایا جاتا ہے اور اُوپر شامیانے لگائے جاتے ہیں اور مزار پر چراغاں کیا جاتا ہے اور مزار کے گرد لوگ اس مُردہ کی شان میں مضمون نعتیہ گاتے ہیں اور ناچتے کودتے ہیں۔ یہ امور جائز ہیں یا نہیں؟ اس صُورت کے ساتھ عرس کرنے والے اور اس میں شریک ہونے والے بدعتی ہیں یا نہیں؟

(۳) چند پیر بیاں ایسے بھی ہیں جو اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے ہیں۔ بس اس قِسم کے حکم کرنے والے اور اُس کے عاملین مرتد اور بے دین ہیں یا نہیں ؟ اور بعض پیر گو زبان سے حکم نہیں کرتے لیکن مریدین انہیں سجدہ کرتے ہیں اور وہ منع نہیں کرتے ۔ پس ایسے پیر کے لئے کیا حکم ہے ؟ کیا یہ لوگ حسبِ فرمانِ نبویؐ الساکت عن الحق کشیطان الاخرس کے شیطان نہیں ہیں اور یہ مرتکب معصیت کبیرہ ہیں یا نہیں ؟ اور بعض پیر اپنے مُریدوں کو منع کرتے ہیں لیکن مرید نہیں مانتے اور سجدہ کرتے ہیں اُس وقت کبھی منع کرتے ہیں اور کبھی دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی عُرس بند نہیں کرتے کہ جس سے اس شرک و بدعت کا قلع قمع ہو جائے۔ بلکہ عُرس کو باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے ؟ پھر یہ پیر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ مَیں کیا کروں لوگ سجدہ کرتے ہیں منع کرتا ہوں وہ نہیں مانتے مَیں معذور ہوں ۔

(۴) پیر کی کیا تعریف ہے ؟ مرتکب امور بالا کو پیر بنانا اور اُس کا معتقد ہونا جائز ہے یا نہیں ؟

(۵) سجدہ بغیر اللہ مطلقاً حرام ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے۔ بعض لوگ سجدہ تحیہ کو جائز کہتے ہیں اور وہ یہ جاہل پیر لوگ ہیں کیا واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ کوئی ان میں فتویٰ تیسیر کا حوالہ دیتا ہے اور کوئی فتح القدیر کا آیا وہ عبارات صحیح ہیں یا نہیں ؟

(۶) بدعت کی تعریف اور تقسیم مع حوالہ کتب تحریر فرماتے ہوئے یہ بھی تحریر فرمائیے کہ کون سی بدعت معصیت ہے اور کون سی نہیں ؟ اور عرؔس اگر بدعت ہو تو عُرس کرنے والے کو بدعتی کہیں گے اور اُس کے پیچھے نماز کیسی ہو گی ۔ نیز عرس کے بدعت ہونے پر بھی اگر کوئی شخص اُسے نہ چھوڑے بلکہ اُس پر مداومت اور اصرار کرے اور اُسے جائز اور قابلِ ثواب کرنے کے لئے کوشش کرے تو ایسا شخص مُصر علی المعصیت ہے یا نہیں اور اصرار علی المعصیت عمدًا اور باعثِ ثواب سمجھ کر کرنا کیسا ہے ؟

(۷) جن بدبودار چیزوں کو کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت کی گئی ہے اور وہ شخص مسجد میں بسبب اس اختیاری کے نہ آئے اور جماعت میں شامل نہ ہو لیکن نیّت جماعت

کی رکھے تو جماعت کا ثواب اُسے ملے گا یا نہیں ؟ اور جو لوگ اضطراراً معذور ہوں انجر اور اذفر ہوں تو آیا اُن کے لئے بھی لا یقربن مسجدنا کا حکم ہو گا اور اُن کے لئے بھی ممانعت ہو تو انہیں بنا بر نیت حضوری جماعت کے جماعت کا ثواب مل گیا یا نہیں ؟

الجواب عُرس بضم اوّل و بضمتین لغت عرب میں طعام ولیمہ کو نیز نکاح کو کہا جاتا ہے کما صرح بہ القاموس ۔ آج کل ہمارے دیار میں جس کو لوگ عُرس کہتے ہیں ۔ یعنی کسی بزرگ کی تاریخ وفات پر سالانہ اُن کی قبر پر اجتماع اور میلہ قائم کرنا ، یہ فعل بھی بدعت مستحدثہ ہے اور یہ نام بھی اس کے لئے مستحدث ہے ۔ قرون ثلثہ مشہود لہا بالخیر میں کیا قرون ما بعد میں بھی صدیوں تک اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا ۔ بہت آخر زمانہ میں ایجاد ہُوا ہے ۔ مشہور یہ ہے کہ جس طرح اور تمام بدعات کی اصل ابتداءً بُری نہ تھی بعد میں لوگوں کی تعدی نے اُس کو گناہ اور بدعت بنا دیا ۔ اسی طرح اس میں بھی ابتدائی واقعہ یہ ہُوا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سالانہ غیر معین تاریخوں میں پیرانِ کلیر حضرت مخدوم صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے مزار پر حاضر ہوتے تھے اس کی خبر سُن کر آپ کے مُرید بھی آنے لگے ۔ پھر لوگوں نے اس خیال سے کہ حضرت شیخ کے ساتھ حاضری کے شائقین کو دشواری ہوتی ہے کوئی دن بھی متعین کر دیا ۔ یہاں تک بھی منکرات کا ہجوم نہ تھا ۔ پھر بعد میں جہلاء و مبتدعین نے اُس کو اس حد تک طول دے دیا کہ سینکڑوں محرمات اور افعال شرک و کفر کا تماشہ گاہ ہو گیا اور پھر یہ رسم سب جگہ چل پڑی ۔ اب مسئلہ عُرس میں دو حیثیت قابلِ بیان ہیں اوّل نفس عُرس خالی از دیگر منکرات ، دوسرے مع بدعات و منکراتِ مروجہ ۔

سو امر اوّل کا جواب تو یہ ہے کہ اتفاقی طور پر کوئی شخص کسی بزرگ کے مزار پر بلا تعین تاریخ و بلا اہتمام خاص کے اگر ہمیشہ سالانہ بھی جایا کرے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ مستحب اور سُنت ہے بشرطیکہ منکراتِ مروجہ وہاں نہ ہوں ۔ لما اخرج ابن جریر عن محمد بن ابراهیم قال کان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یاتی

قبور الشہداء علیٰ راس کل حول فیقول سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار - وابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ اس قسم کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے مکاتیب میں فرماتے ہیں :-

"کہ روز عرس برائے آنست کہ آں روز مذکور انتقال ایشاں می باشد از وارالعمل بدارالثواب والا ہر روز کہ ایں عمل واقع شود موجب فلاح ونجات است"

(از مجموعہ فتاویٰ صـ ۶۹ ج ۳)

لیکن کسی معین تاریخ کو ضروری سمجھنا یا ایسا عمل کرنا جس سے دیکھنے والوں کو ضروری معلوم ہو اور نہ کرنے والوں پر اعتراض کی صورت پیدا ہو یہ ایک بدعت سئیہ ہے جس کا اصول اسلام میں کہیں نام نہیں۔

امر دوم یعنی عرس مصطلح مع منکراتِ مروجہ جو لوازمِ عرس سے سمجھے جاتے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ ایک تو فی نفسہ بدعت اور پھر اس میں بہت سے مشرکانہ افعال اور بدعات اور امور قبیحہ کا ارتکاب لازم آتا ہے اس لئے بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہو گیا۔ جن میں سے بعض یہ ہیں :-

(۱) چراغ جلانا جو بنص حدیث حرام ہے نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے قبروں پر چراغ جلانے والے پر لعنت فرمائی ہے (مشکوٰۃ)۔

(۲) چادر وغیرہ چڑھانا جس کی حدیث صریح میں مخالفت ہے۔ (بخاری)

(۳) اُن کے نام کی نذر و منت ماننا جو مطلقاً حرام ہے۔

قال فی البحر الرائق الاجماع علی حرمۃ النذر للمخلوق ولا ینعقد ولا یشتغل بہ الذمۃ وانہ حرام بل سحتٌ ولا یجوز لخادم الشیخ اخذہ ولا اکلہ ولا التصرف فیہ بوجہ من الوجوہ۔

(۴) پھر اس نذر کی مٹھائی وغیرہ کو تبرک سمجھ کر کھانا اور تقسیم کرنا حالانکہ اس کا حرام ہونا اوپر کی عبارت بحر سے معلوم ہو گیا اس لئے اس کے حلال و تبرک سمجھنے میں تو اندیشہ کفر کا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

(۵) راگ باجہ وغیرہ جس کی مذمت و ممانعت پر احادیث مذکورہ صراحۃً وارد ہوئی ہیں۔ تفسیر روح المعانی میں آیت لہوالحدیث کے ذیل میں تعداد کثیران روایات کی جمع کی گئی ہے فلیراجع۔ نیز شیخ ابن حجر مکی کا رسالہ کف الرعاع عن محرمات اللھو و السماع بھی اس موضوع میں کافی شافی ہے۔ خود صوفیائے کرام کی ایک جماعت کثیرہ نے بھی اس کو ناجائز فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ حقوق السماع لحکیم الامت حضرت مولانا التھانوی مدظلہٗ۔ (قدس اللہ سرہٗ)

(۶) فاحشہ عورتوں کا گانا اور اجتماع جو بہت سے محرمات کا مجموعہ ہے۔

(۷) عام عورتوں کا قبروں پر جمع ہونا جس پر حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

لعن اللہ زائرات القبور۔

(۸) قبروں کے مجاورین کا بیٹھنا جس کی ممانعت حدیث وفقہ کی معتبر کتب میں منصوص ہے۔

(۹) قبر کا طواف کرنا جو قطعاً حرام ہے۔ ملا علی قاریؒ شرح مناسک باب زیارت روضۃ القدس میں فرماتے ہیں:۔

ولا یطوف ای ولا یدور حول البقعۃ الشریفۃ لان الطواف من مختصات الکعبۃ المنیفۃ فیحرم حول قبور الانبیاء انتھی۔

(۱۰) سجدہ کرنا جو بقصد عبادت ہو کفر صریح ہے اور بلا قصد عبادت انتہائی درجہ کا گناہ کبیرہ ہے۔ کما سیاتی تفصیلہ اگر تتبع کیا جاوے تو اس قسم کے سینکڑوں گناہوں کا مجموعہ ان اعراس میں مشاہد ہو جائے گا۔ و فی ذالک کفایۃ لمن اراد الھدایۃ۔ اسی لئے جس وقت سے اس قسم کے عرس کا رواج ہوا ہے اُسی وقت سے علماءِ اُمت بلکہ خود صوفیائے کرام جو محقق ہوئے ہیں اس سے منع کرتے رہے ہیں۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ جو علاوہ علوم ظاہرہ کے ماہر و علامہ ہونے کے خاندان نقشبندیہ میں حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلفاء میں سے ہیں ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں:۔

"قبور اولیاء بلند کردن و گنبد براں ساختن و عرس و امثال آں چراغاں کردن ہمہ بدعت است بعض ازاں حرام و بعض مکروہ، پیغمبر خدا بر شمع افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ"۔

اور بریقہ شرح طریقہ محمدیہ صد ۱۲۲ ج ۱ میں ہے۔

واقبح البدع عشر ثم وعد منها طعام المیت و ایقاد الشموع علی المقابر والبناء علی القبر و تزیینه والبیتوتة عند ـــــ والتغنی والسماع واتخاذ الطعام للرقص واجتماع النساء لزیارة القبور ـ ـ ـ ـ الخ

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ تعالے علیہ محدث دہلوی "مسائل اربعین" میں فرماتے ہیں :۔

"مقرر ساختن روز عرس جائز نیست در تفسیر مظہری - می نویسد

لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الاولیاء والشهداء من السجود والطواف حولها واتخاذ السراج والمساجد الیها ومن الاجتماع بعد الحول کالاعیاد ویسمونه عرسًا ۔

اصول کی بات وہی ہے جو امام مالکؒ نے فرمائی ہے مالم یکن یومئذٍ دینا لا یکون الیوم دینا ۔ اس لئے جس عبادت کی نبی کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں اصل نہ ہو وہ عبادت نہیں گمراہی ہے ۔ رسالہ قشیریہ میں اکابر اہل طریق کے بہت اقوال اس کی تائید میں لکھے گئے ہیں ۔ فلیراجع ثمه و مثله فی مفتاح السنة للسیوطی ص ۵) ۔

(۲) تفصیل مذکورہ سے ثابت ہوا کہ ایسا کرنے والے بدعتی اور سخت گناہ گار ہیں ۔

(۳) غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگر بہ نیت عبادت ہو تو کفر صریح اور ارتداد محض ہے (نعوذ باللہ منہ) اور اگر بہ نیت عبادت نہ ہو بلکہ قصد تعظیم معروف ہو تو ارتداد و کفر تو نہیں لیکن سخت تر گناہ اور قریب شرک کے ہے ۔ کذا قال ابن حجر المکی فی الاعلام

بقوامع الاسلام علی هامش الزواجر - ج ۲ ص ۳۲ -

وفی المواقف وشرحها من صدق بما جاء به النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ومع ذالک سجد للشمس کان غیر مومن بالاجماع لان سجوده لها یدل بظاهره انه لیس بمصدق ونحن نحکم بالظاهر فلذالک حکمنا بعدم ایمانه لان عدم السجود لغیر اللہ داخل فی حقیقة الایمان حتی لو علم انه لم یسجد لها علی سبیل التعظیم واعتقاد الالوهیة بل سجد لها وقلبه مطمئن بالایمان لم یحکم بکفره فیما بینه و بین اللہ تعالیٰ وان اجری علیه حکم الکافر فی الظاهر انتهی ثم قال نقله عن الروضة ولیس من هذا ما یفعله کثیر من الجهلة الظالمین من السجود بین یدی المشائخ فان ذالک حرام قطعاً بکل حال سواء کان للقبلة او لغیرها وسواء قصد السجود للہ او غفل وفی بعض صوره ما یقتضی الکفر عافانا اللہ تعالیٰ من ذالک انتهی - ففهم انه قد یکون کفراً بان قصد به عبادة مخلوق او التقرب الیه وقد یکون حراماً ان قصد به تعظیمه او الخ -

یہی مضمون حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی نے مائۃ مسائل کے مسئلہ ۳۳ میں ذکر فرمایا ہے اور حلبی نے شرح منیہ کبیر میں کہا ہے:-

حتی لو سجد لغیر اللہ یکفر -

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا انتہائی درجہ کا سخت گناہ ہے اور جو پیر اپنے سامنے اس گناہ کو جاری رکھتے ہیں اگرچہ امر نہ کریں البتہ شریک گناہ ہیں۔ اگر بالغرض لوگ اس کا کہنا نہیں مانتے تو یہ پیر ہی کس کام کا ہے، کم از کم اس کو ان سے علیحدہ ہو جانا فرض ہے۔ الغرض ایسے پیروں سے بیعت کرنا حرام ہے جو حدودِ

شرعیہ کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ جیسا کہ امام غزالیؒ کی اپنی اکثر تصنیفات میں اور رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف وغیرہ میں خود ائمہ تصوف کے اقوال سے بھی اس کو ثابت کیا گیا ہے۔

(۴) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے القول الجمیل میں پیر یعنی کامل شیخ کی چند شرطیں لکھی ہیں۔ جو شخص ان شرائط کے ساتھ موصوف نہ ہو اُس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنا چاہیئے۔ بالخصوص جو شخص مرتکب امور مذکورہ فی السوال ہو اور معاصی کا مرتکب ہو اُس کے ہاتھ پر بیعت کرنا حرام ہے۔ وذالک کلہ ظاہر۔

(۵) سجدہ کے متعلق تفصیل سے جو نمبر ۳ میں مذکور ہو چکی اتنی بات بالاجمال ہے کہ غیر کو سجدہ کرنا حرام ضرور ہے، کفر ہونے میں تفصیل ہے حرمت میں کوئی تفصیل نہیں۔ فتح القدیر کی طرف اباحت کو منسوب کرنا غلط محض ہے۔

(۶) بدعت لغت میں ہر نئے کام کو کہتے ہیں۔ خواہ عادت ہو یا عبادت جن لوگوں نے یہ معنی لئے ہیں انہوں نے بدعت کی تقسیم دو قسمیں کی ہیں۔ سیئۃ اور حسنہ جن فقہاء کے کلام میں بعض بدعت کو حسنہ کہا گیا ہے وہ اسی معنی لغوی کے اعتبار سے بدعت ہیں ورنہ درحقیقت بدعت نہیں اور معنی شرعی بدعت کے یہ ہیں کہ دین میں کسی کام کا زیادہ یا کم کرنا جو قرن صحابہ و تابعین کے بعد ہوا ہو۔ اور نبی کریم سے اُس کے کرنے کی اجازت منقول نہ ہو نہ قولاً نہ فعلاً نہ صراحتہً نہ اشارۃً۔

هذا ملخص ما في الطريقة المحمدية و هو اجمع ما رأيت
من تعريف البدعة و ان اردت التفصيل فراجعه۔
(بريقة شرح الطريقة - ج ۱ ص ۸۳)۔

پھر بدعت میں درجات ہیں، بعض مکروہ کے درجہ میں ہیں، بعض حرام، بعض شرک اور مُصر علی البدعۃ۔ بہرحال فاسق ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہے۔
كما در المختار وغيره وخلف مبتدع ۔ الخ

(۷) جب ان چیزوں کا ترک اُس کے اختیار میں ہے اور ترک نہیں کرتا بلکہ

جماعت کو ترک کر دیتا ہے تو خواہ نیت ہو یا نہ ہو ثوابِ جماعت نہ ہوگا۔ البتہ جو معذور ہوں جیسے المجزوم فرو غیرہ اُن کے لئے بھی مناسب ہے کہ جماعت میں شریک نہ ہوں۔ تاکہ لوگوں کو ایذا نہ پہنچے۔ ایسے لوگوں کو انشاء اللہ تعالے جماعت کا ثواب گھر بیٹھے مل جائے گا۔ کما صرح بہ المفتی والتفصیل فی رسالۃ آداب المساجد۔

بندہ محمد شفیع عفر لہ

۸ ربیع الاوّل ۱۳۵۰ھ

سوال ۲ مسجد میں درگاہ ہے۔ درگاہ پر روزانہ اور جمعرات کو روشنی ہوتی ہے۔ روشنی کے لئے تیل وغیرہ کا انتظام مسجد کی آمدنی سے ہے اور اہلِ محلہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ صرف درگاہ کے لئے تیل اتنی کثیر مقدار میں جمع ہو جاتا ہے کہ تمام درگاہ کی روشنی میں خرچ نہیں ہو سکتا۔ اگر باقیماندہ تیل کو امام مسجد اپنے ذاتی مصارف کتب بینی وغیرہ میں استعمال کرے تو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب قبروں پر چراغ جلانا جائز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے:۔ لعن اللہ زوارات القبور والمتخذین علیہا السرج ۔ اس لئے جو تیل درگاہ کی روشنی کے لئے دیا جاتا ہے اُس کو اصل مزار پر جلانا نہ چاہیئے۔ البتہ اگر مزار کے متعلق حجرے ہوں یا راستہ پر روشنی کی ضرورت ہو وہاں جلایا جا سکتا ہے اسی طرح حجرۂ امام اگر متعلقات درگاہ میں ہو تو اس میں بھی جلا سکتے ہیں۔ ورنہ بلا اجازت مالک دوسری جگہ استعمال کرنا جائز نہیں اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تیل بطور نذر مزار پر چڑھایا ہے تو کسی جگہ بھی اُس کا استعمال جائز نہیں کیونکہ غیر اللہ کے نام کی نذر حرام ہے اور اس چیز کا استعمال بھی حرام ہے جس کی نذر کی گئی ہو۔

صرح بہ فی البحر الرائق من کتاب النذر ۔ فقط

بندہ محمد شفیع عفر لہٗ ۲۹ ربیع الاوّل ۱۳۵۰ھ

سوال ۳ جب کہ مسجد کے اندر حسبِ ضرورت کافی روشنی ہوتی ہے اور درگاہ کی روشنی کوئی فائدہ نہیں رکھتی روشنی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز جمعرات کے دن جو ختم

درگاہ پر ہوتا ہے اس میں شرکت کرنے والا کیا حکم رکھتا ہے ؟

الجواب قبر پر چراغ جلانا حرام ہے کما مر اور ختم قرآن میں اگر دوسری بدعات نہ ہوں تو شرکت میں مضائقہ نہیں۔ لیکن پھر بھی ترک اولیٰ ہے کہ یہ چیزیں اگرچہ بالفعل بدعات نہ ہوں رفتہ رفتہ بدعات سے بھی آگے تجاوز کر جاتی ہیں۔ فقط

بندہ محمد شفیع غفرلہٗ

سوال بزرگانِ دین کے صدہا مزار ہیں جن کی فاتحہ خوانی جائز و ناجائز دونوں طرح ہو رہی ہے۔ فاتحہ خوانی کے لئے مزاروں پر حاضر ہونے کو واجب اور فرض سمجھا جاتا کیسا ہے ؟ ایصالِ ثواب ہر جگہ سے ہو سکتا ہے یا مزاروں پر جانا ضروری ہے۔ نیز اس طریقہ سے دُعا کرنا کہ یا حضرت آپ اللہ کے دوست ہیں اور اس کے مقبول بندے ہیں آپ خدا سے میرے لئے دُعا کیجئے کہ خدا مجھے مقصد میں کامیاب کرے، یہ دُعا جائز ہے یا نہیں ؟

مزاروں پر عُرس ہوتے ہیں اُن میں شرکت کرنا کیسا ہے ؟

الجواب ایصالِ ثواب کے لئے قبر پر جانے کی ضرورت نہیں ہر جگہ سے پہنچتا ہے البتہ قبر پر جانے سے دوسرے فوائد ہیں۔ عامہ مومنین کی قبر پر جانے سے عبرت، اور اعزاء و اقرباء کی قبروں پر عبرت کے ساتھ ادائے حق بھی اور بزرگوں کی قبروں پر اس کے ساتھ برکات بھی۔ دعا میں صاحبِ قبر کو خطاب نہ کرنا چاہیئے بلکہ یوں دُعا کرے تو مضائقہ نہیں کہ یا اللہ! فلاں مقبول بندے کے طفیل سے ہمارا کام کر دے۔

سوال زید سنتا ہے کہ فلاں بزرگ کی درگاہ نہایت عالی شان ہے اس کوشش کر کہ وہ سفر طے کر کے درگاہ کے دیکھنے کو جاتا ہے۔ یہ جانا کیسا ہے ؟

الجواب اگر وہ وہاں جا کر بدعات و منکرات میں مُبتلا نہ ہو جائے تو جائز ہے۔

سوال زید کہتا ہے اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو فلاں بزرگ کی درگاہ پر چادر چڑھاؤں گا۔ اور وہاں بنامِ خدا نیاز کروں گا یہ کیسا ہے ؟ اگر زید کا کام حسبِ منشاء ہو جائے تو چادر چڑھانا اُس پر واجب ہے یا نہیں ؟

الجواب چادر قبر پر چڑھانا خود بھی ناجائز ہے اور نذر اُس کی کرنا دُوسرا گناہ ہے اور یہ نذر صحیح بھی نہیں ہوئی۔

سوال مولود شریف جو مروجہ طریقہ سے ہوتا ہے۔ کیا حکم رکھتا ہے؟ مولود میں قیام جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ناجائز ہے اور اگر بدعات وتعینات مروجہ سے خالی ہو تو جائز ہے۔

سوال شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی گیارہویں ایصالِ ثواب کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ایصالِ ثواب جائز ہے بشرطیکہ گیارہوں کی تخصیص نہ کرے۔

سوال بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے کھانا مزاروں پر بھیجا جاتا ہے جائز ہے یا نہیں؟ اگر مکان میں فاتحہ دلا کر ایصالِ ثواب کر دیا جائے تو کیا ثواب کم ہوتا ہے جیسے اکثر لوگوں کا مقولہ ہے کہ نیاز قبول نہیں ہو سکتی جب تک مزاروں پر نہ بھیجی جائے۔

الجواب مزار پر بھیجنا فضول اور لایعنی حرکت ہے۔ ہر جگہ سے ایصالِ ثواب ہو سکتا ہے۔

سوال حضرت امام حسینؓ کی فاتحہ خوانی جو عشرہ محرم میں ہوتی ہے اس کے لئے کیا حکم ہے؟ نیز ان کا ذکر شہادت پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب ایصالِ ثواب یا ذکرِ شہادت کے لئے عشرۂ محرم کی تخصیص لغو اور بدعت ہے۔ بلا تعین کبھی کسی وقت کرے تو جائز اور ثوابِ عظیم ہے۔ فقط۔

بندہ محمد شفیع غفرلہٗ

۹ ربیع الاولیٰ ۱۳۵۰ھ

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات

واضح ہو کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے احوال کا مشاہدہ کیا اور آپؐ کے اخلاق واحوال اور عادات وخصائل اور مختلف طبقات مخلوق کی سیاست اور ضبط اور مختلف المزاج اقوامِ عالم سے مانوس ہونے اور ان کو اپنی اطاعت کا گرویدہ بنا لینے پر مشتمل احادیث کی طرف توجہ سے کان لگایا اور اس کے ساتھ ان حقائق ومعارف سے واقف ہوا جو مشکل سے مشکل سوالات کے جواب میں زبانِ مبارک سے نکلے اور مصالح خلق کی عجیب وغریب تدبیریں اور ظاہر شرح کی تفصیل میں وہ عمدہ اشارات جن کے ابتدائی علم سے بھی دُنیا کے عقلاء اور فقہاء عاجز رہے، ان پر نظر ڈالی وہ بے شک وشبہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ کمالات کسب وسعی سے حاصل کئے ہوئے نہیں تھے اور نہ قوتِ بشریہ کسی تدبیر سے ایسے کمالات حاصل کر سکتی ہے۔ بلکہ یہ چیز بدون امداد آسمانی اور قوتِ الٰہیہ کے متصور وممکن نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسی قوتِ الٰہیہ اور اس پر مرتب ہونے والے کمالات کسی جھوٹے اور دھوکہ دینے والے کو ہرگز حاصل نہیں ہوسکتے۔

بلکہ آپؐ کے عادات واخلاق آپؐ کی سچائی کے قطعی شاہد ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ٹھیٹھ اعرابی آپؐ کو دیکھتا ہے تو بول اُٹھتا ہے کہ "یہ جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہے"۔ یہ اعرابی آپؐ کے بعض شمائل وخصائل دیکھ کر آپؐ کے صدق کی گواہی دیتا ہے، تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جس نے آپؐ کے اخلاق کا مشاہدہ کیا اور عمر کے مختلف ادوار میں آپؐ کے حالاتِ طیبّہ کا تجزیہ کیا۔

ہم نے اس جگہ آپؐ کے بعض اخلاق مختصر طور پر لکھے ہیں تاکہ محاسن اخلاق کا ایک نمونہ معلوم ہوجائے اور آپؐ کے صدق وسچائی اور بلندی مرتبہ اور عظمت شان عنداللہ کا اندازہ ہوسکے کہ حق تعالےٰ نے آپؐ کو یہ تمام کمالات انتہائی درجہ کے عطا فرمائے۔

حالانکہ آپؐ ایک اَن پڑھ تھے کہیں کسی سے علم نہیں سیکھا اور نہ کتابوں کا مطالعہ کیا اور نہ طلب علم کے لئے کہیں سفر کیا، بلکہ ہمیشہ ایک جاہل دیہاتی طبقہ کے اندر پلے اور بڑھے اور رہے اور وہ بھی اس حال میں کہ آپؐ یتیم تھے شفیق باپ جو تربیت و تہذیب کی کوشش کرتے اُن کا سایہ پہلے ہی اُٹھ چکا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ فقیر و مفلس گھرانہ میں ضعیف و کمزور حالات میں آپؐ کا نشو و نما ہوا۔ پھر یہ تمام محاسن اخلاق اور علوم و معارف ملائکہ اور انبیاء سابقین کے علوم اور انبیاء کی خصوصیات صرف آپؐ ہی کو کہاں سے حاصل ہو گئے۔ اگر صریح وحی نہ ہوتی تو آخر اس کا امکان کیسے سمجھ سکتا ہے اور قوتِ بشریہ ان محیّر العقول کمالات کو اپنی سعی سے حاصل کرنے میں کامیاب ہی کہاں ہو سکتی ہے۔

پس اگر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے کمالات صرف یہی ہوتے اور ایک بھی معجزہ آپؐ سے ظاہر نہ ہوتا تب بھی انسان کے لئے آپؐ کے صدق و سچائی نبیٔ برحق ہونے کی شہادت کے لئے کافی تھے۔ یہ حق تعالےٰ کی مزید رحمت و عنایت ہے کہ ان کمالات ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ آپؐ کے دستِ مبارک پر ایسے کھلے ہوئے معجزات ظاہر فرما دیئے کہ ان کو دیکھ کر کسی غبی سے غبی اور جاہل سے جاہل کو بھی آپؐ کی نبوت و رسالت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

ان معجزات میں سے ہم اس جگہ صرف اُن معجزات کا ذکر کرتے ہیں جو زیادہ مشہور و معروف ہیں اور صحیح و معتبر کُتب حدیث میں مذکور ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) جب قریش نے آپؐ سے آپؐ کی نبوت پر علامت کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے لئے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ (بخاری و مسلم عن ابن مسعود و ابن عباس وانس رضؓ)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے گھر میں تھوڑے سے کھانے سے ایک بہت بڑی جماعت کو شکم سیر فرما دیا۔ (بخاری و مسلم)

(۳) اسی طرح حضرت طلحہؓ کے مکان میں اور غزوۂ خندق میں تھوڑا سا کھانا آپؐ کی برکت سے ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہو گیا۔ (بخاری و مسلم)

(۴) ایک مرتبہ دو سیر سے کم آٹے اور ایک بکری کے بچّہ سے اسّی آدمیوں کو شکم سیر فرما دیا۔ (اسمٰعیلی فی صحیحہ)

اور بیہقی کی دلائل نبوت میں بروایت جابرؓ آٹھ سو آدمیوں کو اور دلائل ابی نعیم میں ایک ہزار آدمیوں کو شکم سیر کرنا منقول ہے۔

(۵) ایک مرتبہ چند روٹیاں جن کو حضرت انسؓ نے ہاتھ میں اُٹھایا ہُوا تھا آپؐ کی برکت سے اسّی آدمیوں کو شکم سیر کرنے کے لئے کافی ہوگئیں۔ (مسلم عن انسؓ)

(۶) ایک مرتبہ تھوڑی سی کھجوریں جن کو بنت بشیر نے اپنے ہاتھ میں اُٹھایا ہوا تھا۔ ایک پورے لشکر کو شکم سیر کرنے کے بعد بھی بچی رہیں۔ (البیھقی فی دلائل النبوۃ)

(۷) آپؐ کی انگشت ہائے مبارک کے درمیان سے پانی بہنے لگا جس سے پیاسے لشکر نے پیٹ بھر کر پانی پیا اور سب نے وضو کرلیا۔ (بخاری و مُسلم عن انسؓ)

(۸) مقام تبوک کا چشمہ خشک ہو گیا تھا۔ آپؐ نے اپنے وضو سے بچا ہُوا پانی اُس میں ڈال دیا تو یہ چشمہ پانی سے اُبلنے لگا۔

اسی طرح ایک مرتبہ حدیبیہ کے خشک کنوئیں میں اپنے وضو سے بچا ہُوا پانی ڈال دیا تو کنواں پانی سے اُبلنے لگا۔ یہاں تک کہ چشمہ تبوک کے پانی سے ہزاروں آدمی اور حدیبیہ کے کنوئیں سے ڈیڑھ ہزار آدمی سیراب ہو گئے۔ (مسلم و بخاری)

(۹) ایک مرتبہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حکم دیا کہ چار سو سواروں کو کھجور سے زادِ راہ دے دیں۔ یہ کھجوریں بہت ہی تھوڑی مقدار میں تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے تقسیم کیں تو سب کو کافی ہو گئیں اور بچ رہیں۔ (مسند احمد عن نعمان بن مقرن)

(۱۰) کفار کے ایک لشکر پر آپؐ نے ایک مُٹھی بھر کر مٹی پھینک دی تو سب کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔ (مسلم)

(۱۱) آپؐ کی ولادت باسعادت سے پہلے دُنیا میں اور خصوصاً عرب میں کہانت کی رسم جاری تھی۔ جس کی صُورت یہ تھی کہ شیاطین آسمان تک پہنچتے تھے وہاں فرشتوں

سے جو آئندہ پیش آنے والے واقعات کا سنتے اس میں بہت سے جھوٹ ملا کران لوگوں کو بتلا دیتے تھے جن کو شیاطین نے دنیا میں اپنا جال بچھانے کے لئے چن رکھا تھا۔ وہ ان شیاطین کو خوش رکھنے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کو کاہن کہا جاتا تھا یہ عوام میں غیب دان مشہور تھے۔ لوگ ان کی عزت و خدمت کیا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی پیدائش سے یہ سارا شیطانی نظام ختم کر دیا گیا۔ شیطانوں کو آسمانوں تک پہنچنے سے روک دیا گیا۔ وہ اس طرف جائیں تو شعلۂ شہاب اُن پر پھینکا جاتا ہے۔ قرآن مجید سورۂ جن میں اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔

(۱۲) آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم منبر بننے سے پہلے خطبہ کے وقت ایک کھجور کی لکڑی پر جو اسی کام کے لئے گاڑی گئی تھی ٹیک لگا لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد منبر بنانے کی تجویز ہوئی۔ آپؐ خطبہ کے لئے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور یہ لکڑی حضورؐ کے دستِ مبارک سے محروم ہوگئی تو اس خشک لکڑی سے رونے کی آواز نکلی جو سب صحابہ کرامؓ سنتے رہے۔ یہاں تک کہ آپؐ منبر سے نیچے تشریف لائے اور اس کو سینۂ مبارک سے لگا لیا۔ تب یہ لکڑی خاموش ہوئی۔ (بخاری عن جابر و سہل بن سعدؓ) سے

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست　　از کجا می آید ایں آواز دوست

(۱۳) یہود مدینہ نے آپؐ کی تصدیق سے انکار اور آپؐ کے دین پر اعتراض کئے اور یہود کے حق پر ہونے کا اعلان اور دعویٰ کیا کہ ساری دنیا میں اللہ کے دوست اور ولی صرف یہودی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے ان کی تکذیب اور رد کے لئے فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ تم اللہ کے اولیاء ہو تو ایک مرتبہ زبان سے موت کی تمنا کرو۔ کیونکہ موت کے بعد ہی تم اس بارگاہ عالی میں باریاب ہو سکتے ہو اور دوست کو دوست سے ملنے کی تمنا کرنا ایک طبعی امر ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ پیشگوئی بھی فرما دی کہ یہود ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ خود بھی اپنے

دعوے میں جھوٹا ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور اگر انہوں نے ایک کلمہ بھی تمنائی موت کا زبان سے نکالا تو اسی وقت مر جائیں گے۔ (بخاری ابن عباس) اس کا مفصل اعلان قرآن کریم کی سورۂ جمعہ میں فرمایا گیا۔ جو عام طور پر مساجد میں اعلانیہ جہراً پڑھی جاتی ہے۔

یہود آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد دو مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے کہ اگر حکم کے موافق تمنائے موت کرتے ہیں تو انہیں بھی اپنے دلوں میں یہ یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سچے نبی ہیں آپ کی بات ٹل نہیں سکتی۔ موت مانگیں گے تو ہم آپ کے فرمانے کے مطابق فوراً مر جائیں گے اور اگر موت کی تمنا نہیں کرتے تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی پیش گوئی اعلانیہ پوری ہوئی۔

(۱۴) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بہت سی غیب کی باتوں کی خبر دی۔ اور وہ ٹھیک اسی طرح پوری ہوئیں جس طرح آپ نے فرمایا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خبر دی تھی کہ ان کو ایک مصیبت میں ابتلاء پیش آئے گا جس کے بعد وہ جنت میں جائیں گے۔ (بخاری ومسلم ابی موسیٰ)

(۱۵) حضرت عمار بن یاسر کو خبر دی تھی کہ ان کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی (بخاری ومسلم) چنانچہ اسی طرح واقعہ ہوا۔

(۱۶) آپ نے خبر دی تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے ذریعے حق تعالےٰ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں اختلافات کے بعد صلح کرا دیں گے۔ (بخاری عن ابی بکرہ) ایسا ہی واقعہ ہوا۔

(۱۷) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ایک غازی کے متعلق جو جہاد میں شریک تھا یہ خبر دی کہ یہ اہلِ جہنم میں سے ہے (حالانکہ اس وقت اس کے اعمال سے اس کا ظہور نہ ہوا تھا) مگر پھر اس طرح ظاہر ہوا کہ اُس نے خودکشی کر لی اور حرام موت مرا۔ (بخاری ومسلم)

یہ تمام حالات و واقعات وہ ہیں جن پر اطلاع پانے کی کوئی سبیل بجز اللہ تعالےٰ کے مطلع کرنے کے نہیں ہے۔ نہ نجوم و رمل وغیرہ سے ایسے حالات معلوم ہوسکتے ہیں نہ کشف اور دوسری تدبیروں سے۔

(۱۸) جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہجرت کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے اور کفار قریش نے آپؐ کو گرفتار کرنے کے لئے چاروں طرف سوار دوڑائے۔ سراقہ ابن مالک اسی طرف چلا جس طرف حضورؐ تشریف لے جا رہے تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر اپنا گھوڑا آپؐ کے پیچھے چھوڑ دیا۔ لیکن جب آپؐ کے قریب پہنچا تو زمین نے اُس کے گھوڑے کے چاروں پاؤں پکڑ لئے اور زمین میں دھنستے چلے گئے اور زمین سے ایک دھواں اُٹھنا شروع ہوا۔ عاجز ہو کر اُس نے حضورؐ سے ہی پناہ مانگی اور دُعا کی درخواست کی۔ رحمت اللعالمین نے اس وقت بھی اس کی درخواست ردّ نہ فرمائی، اس کے لئے دُعا کی تو زمین نے اُس کو چھوڑ دیا۔ گھوڑا باہر نکل آیا۔ (بخاری و مسلم)

(۱۹) اسود عنسی جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپؐ کے مقابلے میں نبوت کا دعوےٰ کیا اور ایک پارٹی بنالی تھی۔ یہ یمن میں تھا۔ رات کو قتل کیا گیا۔ جس رات قتل ہوا اسی وقت آپؐ نے اُس کے قتل ہونے کی خبر اور یہ کہ کس نے قتل کیا ہے لوگوں کو سُنا دی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نہ کوئی تار ٹیلیفون تھا نہ لاسلکی اور ریڈیو کا زمانہ تھا کہ خبر بجز اللہ تعالےٰ کے بتلانے کے آپؐ کو مل سکتی۔

(۲۰) ہجرت کے لئے نکلنے سے پہلے سو قریشی جوانوں کا پہرہ آپؐ کے مکان پر لگا ہوا تھا اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں آپؐ باہر تشریف لائے اور سب کے سروں پر مٹی ڈالی۔ مگر آپؐ کو کسی نے نہ دیکھا۔ (ابن مردویہ عن ابی عباسؓ)

(۲۱) ایک اُونٹ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ کرامؓ کے مجمع میں حاضر ہوا اور اپنے آقا کی شکایت کی کہ وہ اُسے بھوکا رکھتا ہے اور کام زیادہ لیتا ہے۔ (ابوداؤد)

(۲۲) صحابہ کرامؓ کے ایک مجمع میں آپؐ تشریف لائے اور فرمایا تم میں سے ایک آدمی جہنمی ہے۔ اس کی داڑھ جہنم میں مثل اُحد پہاڑ کے ہوگی۔ اس کے بعد یہ صورت پیش آئی کہ یہ سب صحابہؓ ایمان و سلامت و استقامت پر دُنیا سے گزرے مگر ان میں

سے ایک شخص مرتد ہو کر قتل کیا گیا۔ (دار قطنی) اس شخص کا نام رجال بن عنفرہ تھا۔

(۲۳) اسی طرح ایک مجمع صحابہ کو ایک مرتبہ خطاب کر کے فرمایا تم میں سے جس شخص کی موت سب سے آخر میں ہوگی وہ آگ میں جل کر مرے گا۔ چنانچہ ان سب میں آخری مرنے والے ایک کھولتے ہوئے گرم پانی میں گر کر مرے۔ (یہ قصہ طبرانی نے اور بیہقی نے دلائل میں ذکر کیا ہے) اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ آخری مرنے والے حضرت سمرہ ابن جندبؓ ہیں۔ (تخریج احیاء)

(۲۴) آپؐ نے دو متفرق درختوں کو بلایا۔ دونوں چل کر آ گئے۔ یہاں تک کہ بالکل مل گئے۔ پھر حکم دیا کہ اپنی اپنی جگہ چلے جاؤ۔ اسی طرح واپس چلے گئے۔ (مسند احمد عن علی بن مرہ بسند صحیح)

(۲۵) آپؐ کا قد درمیانہ تھا۔ مگر یہ معجزہ تھا کہ جب دراز قد آدمیوں کے ساتھ آپؐ چلتے یا کھڑے ہوتے تو آپؐ اُن سے اُونچے رہتے تھے۔

(۲۶) آپؐ نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی اور یہ بتلا دیا کہ اگر وہ مباہلہ کریں گے تو سب مر جائیں گے اور ان کے مکان وجائداد تباہ ہو جائیں گے۔ نصاریٰ کو آپؐ کے صدقِ قول کا یقین تھا اس لئے اُنہوں نے مباہلہ کی جرأت نہ کی۔ (بخاری عن ابن عباسؓ)۔

(۲۷) دو شخص عامر بن طفیل اور اربد بن قیس جو عرب کے سوار مشہور تھے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے قتل کے ارادے سے آئے۔ آپؐ نے اُن کے لئے بد دُعا کی تو عامر کے ایک گلٹی نکلی جس سے اُس کی موت واقع ہو گئی اور اربد پر ایک بجلی گری جس سے وہ جل کر مر گیا۔ (طبرانی فی الاوسط والکبیر عن ابی عباس)

(۲۸) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے خبر دی کہ اُبی بن خلف جمحی قتل کیا جائے گا۔ چنانچہ غزوۂ احد میں اس کو ایک معمولی خراش آیا اور وہ اسی سے مر گیا۔ (البیہقی فی دلائل النبوۃ)

(۲۹) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو ایک کھانے میں زہر دیا گیا۔ اس

مسموم گوشت نے خود آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو خبر دے دی اور آپؐ یہ زہر کھالینے کے باوجود اس کے اثر سے محفوظ رہے اور آپؐ کے ساتھ ایک صحابی بشر بن براء نے کھانا کھایا تھا وہ انتقال کر گئے۔ (ابوداؤد عن جابر)

(۳۰) غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے مرکر گرنے کی جگہیں متعین کر کے تبلادی تھیں کہ ابوجہل یہاں گرے گا۔ اور فلاں فلاں جگہ۔ چنانچہ ٹھیک اسی طرح واقعہ ہوا۔ ایک بالشت کا بھی فرق نہیں ہوا۔ (مسلم عن عمرؓ)

(۳۱) آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ میری اُمت کی کچھ جماعتیں دریا میں جہاد کریں گی چنانچہ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ (بخاری و مسلم)

(۳۲) پوری زمین کے مشرق و مغرب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے کر دیئے گئے اور آپؐ نے خبر دی کہ میری اُمت کی حکومت و سلطنت اس سب پر حاوی ہوگی۔ (مسلم عن عائشہ فاطمہ)

چنانچہ مُسلمانوں کی حکومت ابتداء مشرق بلاد ترک سے آخر مغرب بحر اندلس تک پہنچی۔ مگر جنوب و شمال میں اتنی وسیع نہیں ہوئی۔ کہ خبر نبویؐ میں مشرق سے مغرب تک کے احاطہ کی پیش گوئی تھی۔ شمال سے جنوب تک احاطہ مذکور نہ تھا۔

(۳۳) اپنی صاحبزادی سیدۃ النساء فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالےٰ عنہا کو آپؐ نے خبر دی تھی کہ آپؐ کے اہل بیت میں سب سے پہلے آپؐ سے وہ ملیں گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (بخاری و مسلم)

(۳۴) آپؐ نے خبر دی تھی کہ آپؐ کی وفات کے بعد ازواجِ مطہراتؓ میں سے جو سب سے زیادہ سخی ہیں وہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ملیں گی۔ چنانچہ حضرت زینب ام المساکین جو سب سے زیادہ صدقات و خیرات میں معروف تھیں، سب ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے پہلے اُن کی وفات ہوئی۔ (مسلم عن عائشہؓ)۔

(۳۵) ایک بکری جس کا دودھ منقطع ہو چکا تھا اور گابھن بھی نہ تھی۔ آپؐ نے اس کے تھنوں کو چھو دیا وہ دودھ دینے لگی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے اسلام لانے کا سبب یہی واقعہ ہوا۔ (مسند احمد ابن مسعودؓ باسناد جید)

(۳۶) ایسا ہی واقعہ ایک مرتبہ ام سعید کے خیمہ میں سفر ہجرت کے وقت پیش آیا تھا۔

(۳۷) غزوۂ بدر یا اُحد میں ایک صحابی کی آنکھ نکل کر زمین پر گر گئی۔ آنحضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے اس کو اٹھا کر اس کی جگہ رکھ دیا۔ یہ بالکل تندرست ہو گئے۔ اور آخر تک اس آنکھ میں کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور اُس کی روشنی دوسری آنکھ سے زیادہ رہی۔ (ابو نعیم والبیہقی فی دلائل النبوۃ)

(۳۸) غزوۂ خیبر میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی آنکھیں آشوب کئے ہوئے تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں پر آبِ دہن ڈال دیا۔ یہ اسی وقت اچھی ہو گئیں اور آپؐ نے علمِ جہاد اُن کے حوالے فرما دیا۔ (بخاری و مسلم عن علیؓ)۔

(۳۹) کھانا جب آپؐ کے سامنے رکھا جاتا تو وہ تسبیح پڑھتا اور صحابہ کرامؓ اپنے کانوں سے سُنتے تھے۔ (بخاری عن ابن مسعودؓ)

(۴۰) ایک صحابی کا پاؤں کٹ گیا۔ آپؐ نے اس پر دست مبارک پھیر دیا۔ وہ فوراً اچھا ہو گیا۔ (بخاری فی قصۃ قتل ابی رافع)

(۴۱) ایک لشکر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ دیکھا تو توشہ کم رہ گیا۔ آپؐ نے جو کچھ باقی تھا سب کو جمع کیا تو بہت تھوڑا سا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس میں برکت کی دُعا کی۔ پھر سارے لشکر کو حکم دیا کہ اپنے اپنے برتن اس سے بھر لو۔ چنانچہ سارے لشکر کے برتنوں میں ایک برتن بھی خالی نہ رہا۔ سب پُر ہو گئے۔ (بخاری و مسلم عن سلمہ بن اکوع)

(۴۲) حکم ابن عاص بن وائل نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی چال کی بطور

استہزاء نقل اُتاری۔ آپؐ نے فرمایا کہ تُو ایسا ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس کے بدن میں رعشہ ہوگیا اور ساری عمر اسی رعشہ میں مُبتلا رہا۔ (البیہقی فی الدلائل)

(۴۳) آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ایک عورت کے نکاح کے لئے پیغام دیا۔ اُس کے باپ نے حیلہ کرنے اور نکاح سے بچنے کے لئے کہہ دیا کہ اس عورت کو برص ہے۔ حالانکہ اس کو برص (سفید داغ) نہیں تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسی ہی ہو جاوے۔ چنانچہ اس کو برص پیدا ہو گیا اور یہ ام شبیب برصاء کے نام سے مشہور ہوئی۔

آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے مُعجزات بہت زیادہ ہیں۔ علماء نے اُن کے لئے مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ہم نے اس جگہ بطور نمونہ صرف چند مشہور معجزات نقل کئے ہیں۔

یہ مُعجزات علیحدہ علیحدہ اگرچہ متواتر نہ ہوں مگر اُن کی مجموعی تعداد ضرور تواتر سے ثابت اور قطعی الثبوت ہے۔ جس میں شک کرنا ایسا ہے جیسے کوئی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت یا حاتم طائی کی سخاوت میں اس لئے شک کرے کہ جو واقعات آپ کی شجاعت و سخاوت کے نقل کئے جاتے ہیں وہ تواتر سے ثابت اور قطعی الثبوت نہیں۔ کیونکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ جُدا جُدا واقعات اگرچہ متواتر نہیں۔ مگر ان کا مجموعہ ضرور متواتر ہے۔

اس کے علاوہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ایک مُعجزہ قرآن ہی ایسا ہے کہ وہ ہر اعتبار سے متواتر اور قطعی بھی ہے اور آپؐ کے بعد بھی قیامت تک باقی رہنے والا اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے دعوے کے صدق کے لئے بُرہانِ قاطع ہے کہ آپ ایک ایسے شہر اور ایسے گھرانہ میں پیدا ہوئے ہیں جہاں نہ کوئی علم کا سلسلہ ہے نہ کوئی مکتب و مدرسہ نہ کوئی عالم نہ کوئی علمی مجلس۔ پھر پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو جاتے ہیں۔ والد مشفق کا انتقال ہو جاتا ہے جس سے ذرائع تربیت و تہذیب اور بھی مفقود ہو جاتے ہیں۔ پھر ساری عمر آپؐ انہی جہلاء کے طبقے میں پلتے اور بڑھتے ہیں۔ کہیں طلبِ علم کے لئے سفر بھی نہیں کرتے۔ اسی حالت میں جوان ہوتے ہیں اور ایک ایسی فصیح و بلیغ کتاب

لوگوں کے سامنے لاتے ہیں کہ اس کے معانی تو معانی، الفاظ کی نقل سے بھی دُنیا عاجز ہے۔

پھر یہی نہیں آپ اس کتاب کو اپنے اور اپنی قوم کے درمیان ایک فیصلہ کن معیار قرار دے کر تمام بلغاء عرب وفصحاء قریش کو للکارتے ہیں کہ اگر تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور اس کتاب کو آسمانی اور خدا کا کلام نہیں جانتے تو آؤ اس کی ایک آیت کے برابر کوئی کلام تم کہہ دو جو فصاحت و بلاغت میں اس کے برابر ہو۔ سارا عرب جو اپنی فصاحت و بلاغت پر نازاں اور اسی ایک ہنر میں سارے عالم سے ممتاز تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک آیت پیش کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے مقابلہ میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو اور کسی چیز کی پرواہ نہ کرتے تھے ایک مختصر سی آیت کے مقابلے میں چند جملے لکھ کر نہ لا سکے اور حیرت یہ ہے کہ مقابلہ درست نہ ہوتا، فصاحت و بلاغت میں برابر نہ ہوتا۔ مگر جھونٹ مونٹ کو چند جملے لکھ کر پیش کر دیتے تو حیلہ گروں کو ایک کہنے کی بات تو ہو جاتی۔ عرب کے سارے فصحاء و بلغاء سے یہ بھی نہ ہو سکا۔

یہ کس قدر کھلی ہوئی نشانی اور معجزہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے صدق و سچائی کا مظہر ہے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ معجزہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی اور حیاتِ طیبہ کے ساتھ محدود ہو۔ قرآن کریم نے قیامت تک کے لئے اس کا اعلان دعوے کے ساتھ کیا اور بار بار کیا۔ منبروں اور مجامع میں کیا۔ پھر وہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک عرب و عجم میں پھیلا۔ لیکن آج تک کوئی اس کی ادنیٰ مثال پیش نہ کر سکا۔

کس قدر غبی اور بدنصیب ہے وہ شخص جو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے احوال و اقوال پھر اخلاق پھر معجزات پھر آپؐ کے اصلاحی کارنامے پھر ساری دُنیا میں آپؐ کی شریعت کی بے مثال ہمہ گیری دیکھتا ہے اور پھر بھی آپؐ پر ایمان نہیں لاتا۔ آپؐ کی تصدیق نہیں کرتا اور کس قدر خوش نصیب توفیق یافتہ ہے وہ شخص جو آپؐ پر ایمان لایا اور جس نے آپؐ کے تمام ارشادات کو صدقِ دل سے تسلیم کیا۔ ہم اللہ تعالےٰ ہی

سے دُعا کرتے ہیں کہ ہم سب کو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع کی توفیق عطا فرماوے۔ آمین !

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ رسولہٖ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

بندہ محمد شفیع دیوبندی عفا اللہ عنہ

۲۳ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ

مُعجزۂ شق القمر

کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے آپؐ کی نبوت و رسالت کے لئے کوئی نشانی مُعجزہ کی طلب کی۔ حق تعالےٰ نے آپؐ کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ مُعجزہ شق القمر ظاہر فرمایا۔ اس مُعجزہ کا ثبوت قرآن کریم کی اس آیت میں بھی موجود ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ٥ (القمر آیت ۱) اور احادیث صحیحہ جو صحابہؓ کی ایک جماعت کی روایت سے آئی ہیں، جن میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، جبیر بن مطعم، ابن عباسؓ، انس بن مالکؓ وغیرہ شامل ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود خود اپنا اس وقت میں موجود ہونا اور مُعجزہ کا مشاہدہ کرنا بھی بیان فرماتے ہیں۔ امام طحاویؒ اور ابن کثیرؒ نے واقعہ شق القمر کی روایات کو متواتر قرار دیا ہے۔ اس لئے اس مُعجزہ نبوی کا وقوع دلائل سے ثابت ہے۔

واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کے مقام منیٰ میں تشریف رکھتے تھے۔ مشرکین مکہ نے آپؐ سے نبوت کی نشانی طلب کی۔ یہ واقعہ ایک چاندنی رات کا ہے۔ حق تعالےٰ نے یہ کھلا ہوا مُعجزہ دکھلادیا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوکر ایک مشرق کی طرف دوسرا مغرب کی طرف چلا گیا اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان میں پہاڑ حائل نظر آنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے سب

حاضرین سے فرمایا کہ "دیکھو اور شہادت دو۔"

جب سب لوگوں نے صاف طور پر یہ معجزہ دیکھ لیا تو یہ دونوں ٹکڑے پھر آپس میں مل گئے۔ اس کھلے ہوئے معجزہ کا انکار تو کسی آنکھوں والے سے ممکن نہ تھا مگر مشرکین کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ تعالے علیہ وسلم) سارے جہان پر جادو نہیں کر سکتے۔ اطرافِ ملک سے آنے والے لوگوں کا انتظار کرو، وہ کیا کہتے ہیں؟ بیہقی اور ابوداؤد طیالسی کی روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہے کہ بعد میں تمام اطراف سے آنے والے مسافروں سے ان لوگوں نے تحقیق کی تو سب نے چاند کے دو ٹکڑے دیکھنے کا اعتراف کیا۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ معجزہ شق القمر مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ پیش آیا مگر روایات صحیحہ سے ایک ہی مرتبہ کا ثبوت ملتا ہے (بیان القرآن) اس معاملہ سے متعلق چند روایات حدیث ہیں (جو تفسیر ابن کثیرؒ سے لی گئی ہیں)۔

(۱) صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالے عنہ کی روایات سے نقل کیا ہے کہ: "اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اپنی نبوت کے لئے کوئی نشانی (معجزہ) دکھلائیں تو اللہ تعالے نے اُن کو چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھلا دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے جبلِ حراء کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا۔"

(۲) صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالے عنہ سے روایت ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں چاند شق ہوا اور دو ٹکڑے ہو گئے جس کو سب نے صاف طور سے دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو اور شہادت دو۔"

اور ابن جریرؒ نے بھی اپنی سند سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالے عنہ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے کہ اچانک چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "گواہی دو، گواہی دو۔"

مسافروں سے تحقیق کی تو سب نے اعتراف کیا کہ ہم نے بھی یہ دو ٹکڑے دیکھے ہیں۔

شق القمر کے واقعہ پر کچھ شبہات اور جواب

اس پر ایک شبہ تو یونانی فلسفہ کے اصول کی بناء پر کیا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آسمان اور سیارات میں خرق والتیام (یعنی شق ہونا اور جڑنا) ممکن نہیں مگر یہ محض اُن کا دعوےٰ ہے اس پر جتنے دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ سب لچر اور بے بنیاد ہیں اُن کا لغو اور باطل ہونا متکلمین اسلام نے بہت واضح کر دیا ہے اور آج تک کسی عقلی دلیل سے شق القمر کا محال اور ناممکن ہونا ثابت نہیں ہو سکا۔ ہاں ناواقف عوام ہر مستبعد چیز کو ناممکن کہنے لگتے ہیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ معجزہ تو نام ہی اس فعل کا ہے جو عام عادت کے خلاف اور عام لوگوں کی قدرت سے خارج حیرت انگیز و مستبعد ہو ورنہ معمولی کام جو ہر وقت ہو سکے اُسے کون معجزہ کہے گا۔

دوسرا عامیانہ شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہوتا تو پوری دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ مکہ معظمہ میں رات کے وقت پیش آیا ہے۔ اس وقت بہت سے ممالک میں تو دن ہوگا۔ وہاں اس واقعہ کے نمایاں اور ظاہر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا اور بعض ممالک میں نصف شب اور آخر شب میں ہوگا۔ جس وقت عام دُنیا سوتی ہے اور جاگنے والے بھی تو ہر وقت چاند کو نہیں رہتے۔ زمین پر پھیلی ہوئی چاندنی میں اس کے دو ٹکڑے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا جس کی وجہ سے کسی کو اس طرف توجہ ہوتی۔ پھر یہ تھوڑی دیر کا قصہ تھا روزمرّہ دیکھا جاتا ہے کہ کسی مُلک میں چاند گرہن ہوتا ہے اور آج کل تو پہلے سے اس کے اعلانات بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہزاروں لاکھوں آدمی اس سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا تو کیا اس کی یہ دلیل بنائی جاسکتی ہے کہ چاند گرہن ہوا ہی نہیں۔ اس لئے دُنیا

کی عام تاریخوں میں مذکور نہ ہونے سے اس واقعہ کی تکذیب نہیں ہوسکتی۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی مشہور و مستند "تاریخ فرشتہ" میں اس کا ذکر بھی موجود ہے کہ ہندوستان میں مہاراجہ مالیبار نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا اور اپنے روزنامچہ میں لکھوایا اور یہی واقعہ اُن کے مسلمان ہونے کا سبب بنا۔ اور اُوپر ابو داؤد طیالسی اور بیہقی کی روایات سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ خود مشرکینِ مکّہ نے بھی باہر کے لوگوں سے اس کی تحقیق کی تھی اور مختلف اطراف سے آنے والوں نے یہ واقعہ دیکھنے کی تصدیق کی تھی۔ واللہ سبحانہٗ وتعالےٰ اعلم۔

(معارف القرآن ج ۸ صـــ۲۲۵ تا صـــ۲۲۷)

اہلِ مکّہ پر قحط کا عذاب اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دُعا سے اُس کا دفع ہونا

رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اہلِ مکّہ پر قحط کا عذاب مسلّط ہونے کی دُعا کی تھی اس کی وجہ سے یہ سخت قحط میں مُبتلا ہُوئے اور مُردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے یہ دیکھ کر ابوسفیان رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں مدینہ طیّبہ حاضر ہُوئے اور کہنے لگے کہ مَیں آپؐ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں اور صلۂ رحمی کی، کیا آپؐ نے یہ نہیں کہا کہ مَیں اہلِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا بے شک کہا ہے اور واقعہ بھی یوں ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ آپؐ نے اپنی قوم کے بڑوں کو تو بدر کے معرکہ میں تلوار سے قتل کر دیا اور جو اَب رہ گئے اُن کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں۔ دُعا کیجئے کہ یہ عذاب ہم سے ہٹ جائے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دُعا فرمائی اور یہ عذاب اسی وقت ختم ہوگیا اور یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

(معارف القرآن ج ۶ صـــ۳۳۲)

ابُوجہل اور ولید بن مغیرہ کا مُکالمہ

اور

آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی حقانیّت پر دونوں کا اتفاق

ابوجہل ولید بن مغیرہ کے پاس غمگین صُورت بنا کر پہنچا اور قصدًا ایسی بات بنائی جس پر ولید کو غصّہ آجائے۔ ولید نے اُس سے پُوچھا کہ کیا بات ہے؟ تم غمگین نظر آتے ہو؟ ابوجہل نے کہا کہ غمگین کیسے نہ ہوں، یہ سارے باہم چندہ کر کے تجھے مال دیتے ہیں کہ تُو اب بوڑھا ہوگیا ہے تیری مدد کرنا چاہیئے۔ مگر اب اُن کو یہ معلوم ہُوا ہے کہ تم محمّد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) اور ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) کے پاس اس لئے جاتے ہو کہ تمہیں کچھ کھانے پینے کو مل جائے اور ان کی خوشامد میں اُن کے کلام کی تحسین وتعریف کرتے ہو (ظاہر یہ ہے کہ قریش کا چندہ کرکے ولید کو مال دینا بھی جھوٹ تھا جو صرف اُس کو غصّہ دلانے کے لئے بولا گیا تھا اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے کھانے کی چیزیں لینا تو جھوٹ تھا ہی) اس پر ولید بن مغیرہ کے غصّہ کی انتہا نہ رہی اور اس کے نتیجہ میں اُس پر تعلّی و تکبّر کا جنون سوار ہوگیا۔ کہنے لگا کہ مَیں محمّدؐ اور اُن کے ساتھیوں کے ٹکڑوں کا محتاج ہوں؟ کیا تم کو میرے مال و دولت کی کثرت معلوم نہیں۔ قسم ہے لات اور عزیٰ کی (دو بُتوں کے نام ہیں) مَیں اس کا ہرگز محتاج نہیں۔ البتہ تم لوگ جو یہ کہتے ہو کہ محمّد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) مجنون ہیں۔ یہ بات ایسی غلط ہے کہ اس کا کوئی یقین نہیں کر سکتا۔ کیا تم میں سے کسی نے اُن کو کوئی مجنونانہ کام کرتے دیکھا ہے؟

ابوجہل نے اقرار کیا کہ لا واللہ! یعنی واللہ ہم نے کوئی ایسا کام ان کا نہیں دیکھا۔ پھر ولید نے کہا۔ تم لوگ ان کو شاعر کہتے ہو؟ کیا تم نے اُن کو کبھی شعر کہتے ہُوئے

سُنا ہے (ایسی غلط بات کہنا اپنے آپ کو رسوا کرنا ہے) ابو جہل نے اس پر بھی یہی کہا لا واللہ! پھر ولید نے کہا کہ تم لوگ اُن کو کذاب کہتے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے عمر بھر میں کبھی ان کی کسی بات کو جھوٹا پایا ہے؟ اس پر بھی ابو جہل کو یہی اقرار کرنا پڑا کہ لا واللہ!

پھر ولید نے کہا تم لوگ اُن کو کاہن کہتے ہو، تو کیا تم نے کبھی اُن کے ایسے حالات اور کلمات دیکھے سُنے ہیں جو کاہنوں کے ہُوا کرتے ہیں۔ ہم کاہنوں کی باتوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں ان کا کلام کہانت نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی ابو جہل کو یہی اقرار کرنا پڑا کہ واللہ۔ اور پورے قریش میں رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم صادق امین کے نام سے معروف تھے۔ اب ابو جہل اپنے ان سب بُہتانوں سے تو دستبردار ہو گیا۔ فکر یہ پڑی کہ آخر پھر کیا کہہ کر لوگوں کو اسلام سے روکا جائے۔ اس لئے خود ولید ہی کو خطاب کر کے کہا پھر تم ہی بتلاؤ کہ ان کو کیا کہا جائے؟

اس پر اُس نے تو پہلے اپنے دل میں سوچا پھر ابو جہل کی طرف نظر اٹھائی۔ پھر مُنہ بسورا جس سے نفرت کا اظہار ہو اور آخر میں کہنے لگا کہ ان کو یعنی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مجنون، شاعر، کاہن، کذّاب تو کچھ نہیں کہا جا سکتا ہاں ان کو ساحر کہو تو بات چل جائے گی۔ یہ کم بخت خوب جانتا تھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم ساحر بھی نہیں اور نہ آپؐ کے کلام کو ساحر کا کلام کہا جا سکتا ہے۔ مگر اُس نے بات بنانے کی یہ صورت تجویز کی کہ آپؐ کے کلام کے آثار بھی ایسے ہوتے ہیں جیسے ساحروں کے کیونکہ جیسے جادوگر اپنے عمل سے میاں بیوی، بھائی بھائی میں تفرقہ اور نفرت ڈال دیتے تھے (معاذ اللہ) آپؐ کے کلام کا بھی یہی اثر ہے کہ جو ایمان لے آتا ہے اپنے کافر ماں باپ اور عزیزوں سے متنفر ہو جاتا ہے۔ اس کے اس واقعہ کے آخری اجزاء کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۔

اس میں قدّر تقدیر سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی تجویز کرنے کے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اس کمبخت نے حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے نبوت ورسالت پر کامل یقین ہو جانے کے باوجود غصّہ اور غیرت سے مغلوب ہو کر مخالفت کرنا تو طے کر لیا مگر صاف جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتا تھا کہ اپنی رسوائی نہ ہو۔ اس لئے بہت غور وفکر کر کے یہ تجویز نکالی کہ ساحر اس بنا پر کہو کہ آپؐ کے کلام اور تلقین سے باپ بیٹے بھائی بھائی میں تفریق ہو جاتی ہے جیسے جادو سے ہوتی ہے۔ اسی تقدیر وتجویز پر حق تعالےٰ نے اُس پر مکرّر لعنت فرمائی:۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ ۶۱۳، صـ ۶۱۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اسبابِ طبعیہ کا اثر

مسند احمد میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا جس کے اثر سے آپؐ بیمار ہو گئے۔ جبرائیل امین نے آکر آپؐ کو اطلاع کی کہ آپؐ پر ایک یہودی نے جادو کر دیا ہے اور جادو کا عمل جس چیز میں کیا گیا ہے وہ فلاں کنوئیں کے اندر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے وہاں آدمی بھیجے۔ وہ یہ جادو کی چیز کنوئیں سے نکال لائے۔ اس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے ان گرہوں کو کھول دیا۔ اسی وقت آپؐ بالکل تندرست ہو کر کھڑے ہو گئے اور اگرچہ جبرائیل علیہ السّلام نے آپؐ کو اس یہودی کا نام بتلا دیا تھا اور آپؐ اس کو جانتے تھے مگر اپنے نفس کے معاملے میں کسی سے انتقام لینا آپؐ کی عادت نہ تھی اس لئے عمر بھر یہودی سے کچھ نہیں کہا اور نہ کبھی اس کی موجودگی میں آپؐ کے چہرہ مبارک سے کسی شکایت کے آثار پائے گئے (وہ یہودی منافق ہونے کی وجہ سے حاضر باش تھا)۔

اور صحیح بخاری کی روایت حضرت عائشہ رضؓ سے یہ ہے کہ آپؐ پر ایک یہودی نے سحر کیا تو اس کا اثر آپؐ پر یہ تھا کہ بعض اوقات آپؐ محسوس کرتے تھے کہ فلاں کام

کر لیا ہے مگر وہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ پھر ایک روز آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے بتلا دیا ہے کہ میری بیماری کیا ہے؟ اور فرمایا کہ (خواب میں) دو شخص آئے۔ ایک میرے سرہانے بیٹھ گیا۔ ایک پاؤں کی طرف۔ سرہانے والے نے دوسرے سے کہا کہ ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا کہ یہ مسحور ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ سحر ان پر کس نے کیا ہے؟ تو اُس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جو یہودیوں کا حلیف منافق ہے۔ اُس نے پوچھا کہ کس چیز میں جادو کیا ہے؟ اُس نے بتلایا کہ ایک کنگھے اور اُس کے دندانوں میں۔ پھر اُس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ تو اُس نے بتلایا کہ کھجور کے اُس غلاف میں جس میں کھجور کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ بئر ذروان (ایک کنوئیں کا نام ہے) میں ایک پتھر کے نیچے مدفون ہے۔ آپؐ اس کنوئیں پر تشریف لے گئے اور اس کو نکال لیا اور یہ فرمایا کہ مجھے خواب میں یہی کنواں دکھلایا گیا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے فرمایا۔ آپؐ نے اس کا اعلان کیوں نہ کر دیا کہ فلاں شخص نے یہ حرکت کی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے شفاء دے دی ہے اور مجھے یہ پسند نہیں کہ مَیں کسی شخص کے لئے کسی تکلیف کا سبب بنوں (مطلب یہ تھا کہ اس کا اعلان ہوتا تو لوگ اس کو قتل کر دیتے یا تکلیف پہنچاتے)۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ کا یہ مرض چھ مہینے تک رہا اور بعض روایتوں میں ہے کہ جن صحابہ کرامؓ کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کام لبید بن اعصم نے کیا ہے' انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم خبیث کو کیوں قتل نہ کر دیں۔ آپؐ نے ان کو وہی جواب دیا جو حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آپؐ نے دیا تھا۔

امام ثعلبیؒ کی روایت میں ہے کہ ایک لڑکا آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا۔ اس منافق یہودی نے ان کو بہلا پھسلا کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کنگھا اور اُس کے کچھ دندانے حاصل کر لئے اور ایک تانت کے تار میں

گیارہ گرہیں لگائیں۔ ہر گرہ میں ایک سُوئی لگائی۔ کنگھے کے ساتھ اس کو کھجور کے پھل کے غلاف میں رکھ کر ایک کنوئیں میں پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اللہ تعالےٰ نے یہ دو سُورتیں (سورۃ الفلق اور سورۃ النّاس) نازل فرمائیں جن میں گیارہ آیتیں ہیں۔ آپؐ ہر گرہ پہ ایک ایک آیت پڑھ کر ایک ایک کھولتے رہے۔ یہاں تک کہ سب گرہیں کُھل گئیں اور آپؐ سے اچانک ایک بوجھ سا اُتر گیا۔[۱]

سحر کے اثر سے متاثر ہوجانا

جو لوگ سحر کی حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر جادو کا اثر کیسے ہوسکتا ہے۔ سحر کی حقیقت اور اُس کے مفہوم و احکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۃ بقرہ کی تفسیر معارف القرآن جلد اوّل ص۲۱۷ تا ص۲۲۳ میں بیان کئے جاچکے ہیں وہاں دیکھ لئے جائیں۔ خلاصہ اس کا جاننا یہاں ضروری ہے۔ یعنی سحر کا اثر بھی اسبابِ طبیعہ کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا، بعض اسبابِ طبیعہ سے بخار آجانا یا مختلف قسم کے درد و امراض کا پیدا ہوجانا ایک امرِ طبعی ہے جس سے پیغمبر و انبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اسی طرح سحر و جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لئے کوئی بعید نہیں ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص۸۴۷)

یٰٓاَیُّہَا الْمُزَّمِّلُ

مُزَّمِّل کے لفظی معنی اپنے اُوپر کپڑے لپیٹنے والا۔ تقریبًا اسی کا ہم معنی لفظ مُدَّثِّر ہے جو اگلی سُورت میں آرہا ہے۔ ان دونوں سُورتوں میں رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو ایک وقتی حالت اور مخصوص صفت کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے کیونکہ اس

---

[۱] یہ سب روایتیں تفسیر ابن کثیرؒ سے لی گئی ہیں۔

وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم شدت خوف و فزع کے سبب سخت سردی محسوس کر رہے تھے۔ اس لئے اپنے اُوپر کپڑے ڈالنے کے لئے فرمایا۔ یہ کپڑے ڈال دیئے گئے تو آپؐ ان میں لپٹ گئے۔

واقعہ اس کا صحیحین بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فترتِ[1] وحی کے زمانے کا ذکر فرما رہے تھے۔

واقعہ اس کا یہ پیش آیا تھا کہ سب سے پہلے غارِ حرا میں نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر جبرائیل امین نازل ہوئے اور سورہ اقراء کی ابتدائی آیتیں آپؐ کو سُنائیں۔ یہ فرشتے کا نزول اور وحی کی شدت پہلے پہل تھی جس کا اثر طبعی طور پر ہُوا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم، ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ آپؐ سخت سردی محسوس کر رہے تھے اس لئے فرمایا زملونی! زملونی! یعنی ڈھانپو! مجھے ڈھانپو!

اس کا مفصل اور طویل واقعہ صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں مذکور ہے۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک یہ سلسلہ وحی کا بند رہا۔ اس زمانے کو جس میں سلسلۂ وحی بند رہا۔ فترت الوحی کہا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس زمانہ فترت کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا۔

"ایک روز مَیں چل رہا تھا کہ اچانک مَیں نے آواز سُنی تو نظر آسمان کی طرف اٹھائی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک معلق کرسی پر بیٹھا ہُوا ہے مجھے اُن کو اس ہیئت میں دیکھ کر پھر وہی رعب و ہیبت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جو پہلی مُلاقات کے وقت ہو چکی تھی۔ مَیں واپس اپنے گھر چلا آیا

---

[1] فترت کے لفظی معنی سُست یا پابند ہو جانے کے ہیں۔

اور گھر والوں سے کہا کہ مجھے ڈھانپ دو۔"

اس پر یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ اس حدیث میں آیت مدثر کے نزول کا ذکر ہے۔

ہو سکتا ہے کہ اسی حالت کو بیان کرنے کے لئے یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ کا خطاب بھی آیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مزمل کے لقب کا واقعہ الگ ہو جو خلاصہ تفسیر میں بیان ہوا ہے۔

اس عنوان سے خطاب کرنے میں ایک خاص لطف وعنایت کی طرف اشارہ ہے جیسے محبت وشفقت میں کسی کو اس کی وقتی حالت کے عنوان سے محض تلطف کے لئے خطاب کیا جاتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ ۵۸۸، صـ ۵۸۹)

تین انعاماتِ الٰہیہ

سُورۃ الانشراح میں تین نعمتوں کا ذکر ہے۔ شرح صدر، وضع وزر، رفع ذکر۔

شرح صدر (یعنی اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝) شرح کے معنی کھولنے کے ہیں۔ اور سینہ کو کھول دینا، اس کو علوم و معارف اور اخلاقِ حسنہ کے لئے وسیع کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے :-

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو حق تعالےٰ نے علوم و معارف اور اخلاقِ کریمہ کے لئے ایسا وسیع بنا دیا تھا کہ آپ کے علم و حکمت کو بڑے بڑے عقلاء بھی نہ پا سکے اور بعض احادیث صحیحہ میں یہ آیا ہے کہ فرشتوں نے بحکمِ الٰہی آپ کا سینۂ مبارک ظاہری طور پر بھی چاک کر کے صاف کیا۔ بعض حضرات مفسرین نے شرح صدر سے اس جگہ وہی شق صدر کا معجزہ مراد لیا ہے۔ (کما فی ابن کثیرؒ وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ ۝ الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ ۝۔ وزر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں اور نقض ظہر کے لفظی معنی کمر توڑ دینے یعنی کمر کو جھکا دینے کے ہیں۔ جیسے کوئی بڑا بوجھ انسان پر لاد دیا جائے، ہم نے اس کو آپ سے ہٹا دیا۔ وہ بوجھ کیا تھا ؟ اس کی ایک تفسیر تو خلاصۂ تفسیر میں آچکی ہے کہ اس سے وہ جائز اور مباح کام ہیں جن کو بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے قرینِ حکمت و مصلحت سمجھ کر اختیار کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مصلحت کے خلاف یا خلافِ اولیٰ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اپنی علوشان اور تقرب الٰہی میں خاص مقام حاصل ہونے کی بناء پر ایسی چیزوں پر بھی سخت رنج و ملال اور صدمہ ہوتا تھا۔ حق تعالےٰ نے اس آیت میں بشارت سُنا کر وہ بوجھ ہٹا دیا کہ

ایسی چیزوں پر آپ سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔

بعض حضرات مفسرین نے وزر یعنی بوجھ کی مراد اس جگہ یہ لکھی ہے کہ ابتداء نبوت میں وحی کا اثر بھی آپ پر شدید ہوتا تھا اور اس میں آپ پر جو ذمہ داری ساری دنیا میں کلمۂ حق پھیلانے اور کفر و شرک کو مٹا کر خلق خدا کو توحید پر جمع کرنے کی ڈالی گئی تھی اور اس سب کام میں حکم یہ تھا کہ فاستقم کما امرت یعنی آپ امرِ الٰہی کے مطابق استقامت پر رہیں جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو، اس کا بارِ عظیم رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم محسوس فرماتے تھے اور بعض روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال آ گئے تو آپ نے فرمایا کہ اس آیت فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ نے بوڑھا کر دیا۔

یہ وہ بوجھ تھا جس کو آپ کے قلب سے ہٹا دینے کی بشارت اس آیت میں دی گئی ہے اور اس کے ہٹا دینے کی صورت اگلی آیات میں یہ آئی ہے کہ آپ کی ہر مشکل کے بعد آسانی ہونے والی ہے۔ حق تعالےٰ نے شرح صدر کے ذریعے آپ کا حوصلہ اتنا بلند فرما دیا کہ سب مشکلات آسان نظر آنے لگیں اور وہ بوجھ نہ رہا۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا رفع ذکر یہ ہے کہ تمام اسلامی شعائر میں آپ کا نام مبارک اللہ تعالےٰ کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے جو ساری دنیا میں میناروں اور منبروں پر اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اشہد ان محمدا الرسول اللہ پکارا جاتا ہے۔ اور دنیا میں کوئی سمجھدار انسان آپ کا نام بغیر تعظیم کے نہیں لیتا اگرچہ وہ مسلمان بھی نہ ہو۔

(معارف القرآن ج ۸ ص۷۹۴، ص۷۹۵)

عبرت اب غور کیجئے کہ رسول مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ذکر کو حق تعالےٰ نے کیسی رفعت اور عظمت عطا فرمائی کہ آپ کے عہدِ مبارک سے آج تک پوری دنیا کے چپہ چپہ پر آپ کا نام مبارک پانچ وقت اللہ کے نام کے ساتھ

میناروں پر پکارا جاتا ہے اور آخرت میں آپؐ کو شفاعتِ کبریٰ کا مقامِ محمود حاصل ہوگا۔ اس کے بالمقابل دُنیا کی تاریخ سے پوچھئے کہ عاص بن وائل، عُقبہ، کعب کی اولاد کہاں اور اُن کا خاندان کہاں ہُوا؟ خود اُن کا نام بھی اسلامی روایات سے تفسیر آیات کے ذیل میں محفوظ ہوگیا۔ ورنہ دُنیا میں آج اُن کا نام لینے والا کوئی باقی نہ رہا۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۸۳۱)

آپؐ کی مرغوب چیزیں

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝ (سورۃ الضحیٰ) یعنی آپؐ کا رب آپؐ کو اتنا دے گا کہ آپؐ راضی ہو جائیں"۔ اس میں حق تعالےٰ نے یہ متعین کرکے نہیں بتلایا کہ کیا دیں گے؟ اس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ آپؐ کی ہر مرغوب چیز آپؐ کو اتنی دیں گے کہ آپؐ راضی ہو جائیں۔ آپؐ کی مرغوب چیزوں میں دینِ اسلام کی ترقی، دینِ اسلام کا عام طور پر دُنیا میں پھیلنا، پھر اُمت کی ہر ضرورت اور خود آپؐ کا دشمنوں پر غالب آنا۔ اُن کے مُلک میں اللہ تعالےٰ کا کلمہ بلند کرنا اور دینِ حق پھیلانا سب داخل ہیں۔

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا اِذًا لَّا اَرْضٰى وَوَاحِدٌ مِّنْ اُمَّتِيْ فِي النَّارِ۔ یعنی جب یہ بات ہے تو میں اس وقت تک راضی نہ ہوں گا جب تک میری اُمت میں سے ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا۔ (قرطبی)

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ میری اُمت کے بارے میں میری شفاعت قبول فرمائیں گے۔ یہاں تک کہ حق تعالےٰ فرمائیں گے رضیت یا محمد! اے محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اب بھی

آپ راضی ہیں، تو میں عرض کروں گا یَا رَبِّ رَضِیْتُ ۔ یعنی اے پروردگار! میں راضی ہوں ۔

صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے وہ آیت تلاوت فرمائی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے ۔

پھر دوسری آیت تلاوت فرمائی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ پھر آپ نے دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھائے اور گریہ وزاری شروع کی اور بار بار فرماتے تھے : اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ ۔

حق تعالیٰ نے جبرائیل امینؑ کو بھیجا کہ آپ سے دریافت کریں کہ آپ کیوں روتے ہیں ؟ (اور یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ ہمیں سب معلوم ہے) جبرائیل امین آئے اور سوال کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت کی مغفرت چاہتا ہوں ۔

حق تعالیٰ نے جبرائیل امین سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتے ہیں کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہ کریں گے ۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ۷۶۶ ، صـ۷۶۷)

آپ کو خیرِ کثیر عطا ہونا

جس وقت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحبزادے قاسم و ابراہیم کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تو کفارِ مکہ آپ کو ابتر کہہ کر طعنہ دینے لگے ۔ ایسا کہنے والوں میں عاص بن وائل کا نام خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے ۔ اس کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو کہتا تھا کہ ان کی بات کو چھوڑو ، یہ

کچھ فکر کرنے کی چیز نہیں۔ کیونکہ وہ ابتر (مقطوع النسل ہیں) جب ان کا انتقال ہو جائے گا ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا۔ اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (رواہ البغوی ابن کثیرؒ و مظہری)۔

اور بعض روایات میں ہے کہ کعب بن اشرف یہودی ایک مرتبہ مکہ مکرمہ آیا تو قریشِ مکہ اُس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو کہتا ہے کہ ہم سب سے (دین کے اعتبار سے) بہتر ہیں، حالانکہ ہم حجاج کی خدمت کرنے والے اور بیت اللہ کی حفاظت کرنے والے اور لوگوں کو پانی پلانے والے ہیں۔ کعب نے یہ سُن کر کہا کہ نہیں! تم لوگ اس سے بہتر ہو۔ اس پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ (ذکرہ ابن کثیر عن البزار باسناد صحیح وقد رواہ مسلم قالہ مظہری)۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پسری اولاد نہ رہنے کے سبب ابتر ہونے کے طعنے دیتے تھے یا دوسری وجوہ سے آپؐ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ اس کے جواب میں سُورۂ کوثر نازل ہوئی ہے، جس میں ان کے طعنوں کا جواب بھی ہے کہ صرف اولادِ نرینہ کے نہ رہنے سے آپؐ کو مقطوع النسل یا مقطوع الذکر کہنے والے حقائق سے بے خبر ہیں۔ آپؐ کی نسل نسبی بھی انشاء اللہ تعالےٰ دُنیا میں تا قیامت باقی رہے گی اگرچہ دُختری اولاد سے ہو اور نسل معنوی یعنی آپؐ پر ایمان لانے والے مُسلمان جو درحقیقت نبی کی اولاد معنوی ہوتے ہیں، وہ تو اس کثرت سے ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السّلام کی اُمتوں سے بھی بڑھ جائیں گے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اللہ تعالےٰ کے نزدیک مقبول اور مکرم و معظم ہونا بھی مذکور ہے، جس سے کعب بن اشرف کے قول کی تردید ہوتی ہے۔ یہ سب مضمون سورت کی تیسری آیت میں آیا ہے۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے اس کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:۔ "کوثر وہ خیرِ کثیر ہے جو اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو عطا فرمائی ہے"۔

ابن عباسؓ کے خاص شاگرد سعید ابن جبیرؒ سے کسی نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوثر جنّت کی ایک نہر کا نام ہے تو سعید بن جبیرؒ نے جواب دیا کہ (ابن عباسؓ کا قول اس کے منافی نہیں بلکہ) وہ نہر جس کا نام کوثر ہے وہ بھی اس خیر کثیر میں داخل ہے۔ اسی لئے امامِ تفسیر مجاہد نے کوثر کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی خیر کثیر ہے۔ اس میں جنّت کی خاص نہر کوثر بھی داخل ہے۔

حوضِ کوثر

بخاری، مسلم، ابو داؤد اور نسائی نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ مسلم کے الفاظ یہ ہیں :-

"ایک روز جب کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم مسجد میں ہمارے درمیان تھے۔ اچانک آپؐ پر ایک قسم کی نیند یا بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ پھر ہنستے ہوئے آپؐ نے سر مبارک اُٹھایا۔ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ کے ہنسنے کا سبب کیا ہے؟ تو فرمایا مجھ پر اسی وقت ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپؐ نے بسم اللہ کے ساتھ سورہ کوثر پڑھی پھر فرمایا کہ جانتے ہو کوثر کیا چیز ہے؟ ہم نے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلم۔ آپؐ نے فرمایا یہ ایک نہر جنّت ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ جس میں خیر کثیر ہے اور وہ حوض ہے جس پر میری اُمّت قیامت کے روز پانی پینے کے لئے آئے گی۔ اس کے پانی پینے کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے۔ اس وقت بعض لوگوں کو فرشتے حوض سے ہٹا دینگے تو مَیں کہوں گا کہ میرے پروردگار! یہ تو میری اُمّت میں ہے۔ اللہ تعالےٰ فرمائے گا کہ آپؐ نہیں جانتے کہ اس نے آپؐ کے بعد کیا دینا دین اختیار کیا ہے۔"

ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے مزید لکھا ہے :-

"حوض کی صفت میں روایاتِ حدیث میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے گریں گے جو نہر کوثر کے پانی سے حوض کو بھر دیں گے۔ اس کے برتن آسمان کے ستاروں کی تعداد میں ہوں گے"

اس حدیث سے سورۂ کوثر کا سبب نزول بھی معلوم ہوا اور لفظِ کوثر کی صحیح تفسیر بھی۔ یعنی خیر کثیر۔ اور یہ بھی کہ اس خیر کثیر میں وہ حوض کوثر بھی شامل ہے جو قیامت میں اُمتِ محمدیہ کو سیراب کرے گی۔

نیز اس روایت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اصل نہر کوثر جنّت میں ہے اور یہ حوضِ کوثر میدانِ حشر میں ہوگی۔ اس میں دو پرنالوں کے ذریعہ نہر کوثر کا پانی ڈالا جائے گا۔ اس میں ان روایات کی بھی تطبیق ہو گئی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حوضِ کوثر پر اُمت کا ورود دخول جنت سے پہلے ہو گا۔ اس حدیث میں جو بعض لوگوں کو حوضِ کوثر سے ہٹا دینے کا ذکر ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو بعد میں اسلام سے پھر گئے یا پہلے ہی سے مسلمان نہیں تھے مگر منافقانہ اظہارِ اسلام کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اُن کا نفاق کھُل گیا۔ واللہ اعلم

احادیثِ صحیحہ میں حوضِ کوثر کے پانی کی صفائی اور شیرینی اور اُس کے کناروں کا جواہرات سے مرصّع ہونے کے متعلق ایسے اوصاف مذکور ہیں کہ دُنیا میں اُن کا کسی چیز پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس سورت کا نزول اگر کفار کے طعنوں کے دفاع میں ہوا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ آپؐ کی اولادِ نرینہ فوت ہو جانے کی وجہ سے آپؐ کو ابتر مقطوع النسل قرار دے کر کہا کرتے تھے کہ ان کا کام چند روزہ ہے، پھر کوئی نام لینے والا بھی نہ رہے گا تو اس سورت میں آپؐ کو کوثر عطا فرمانے کا ذکر جس میں حوضِ کوثر بھی شامل ہے۔ ان طعنہ زنیوں کی مکمل تردید ہے کہ ان کی نسل و نسب صرف یہی نہیں کہ دُنیا کی عمر تک چلے گی، بلکہ ان کی روحانی اولاد کا رشتہ محشر میں بھی محسوس ہو گا جہاں وہ تعداد میں بھی دُوسری اُمتوں سے زیادہ ہوں گے اور ان کا اعزاز و اکرام بھی سب سے زیادہ ہو گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند اہم خصوصیات

ابن کثیرؒ نے بحوالہ مسند احمد سند قوی کے ساتھ روایت کیا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نماز تہجد میں مشغول تھے۔ صحابہ کرامؓ کو خوف ہُوا کہ کوئی دشمن حملہ نہ کر دے اس لئے آپؐ کے گرد جمع ہو گئے۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ آج کی رات مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی و رسول کو نہیں ملیں۔

اوّل یہ کہ میری رسالت و نبوت کو ساری دُنیا کی کُل اقوام کے لئے عام کیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء آئے اُن کی دعوت و بعثت صرف اپنی ہی قوم کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔

دوسری بات یہ کہ مجھے میرے دُشمن کے مقابلہ میں ایسا رُعب عطا کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینہ کی مسافت پر ہو تو میرا رُعب اس پر چھا جاتا ہے۔

تیسری یہ کہ میرے لئے کفار سے حاصل شدہ مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا حالانکہ پچھلی اُمتوں کے لئے حلال نہ تھا بلکہ اس کا استعمال کرنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مالِ غنیمت کا صرف یہ مصرف تھا کہ آسمان سے ایک بجلی آئے اور اُس کو جلا کر خاک کر دے۔

چوتھی یہ کہ میرے لئے زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا کہ ہماری نماز زمین پر ہر جگہ ہو جاتی ہے۔ مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بخلاف پہلی اُمتوں کے کہ اُن کی عبادت صرف اُن کے عبادت خانوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ اپنے گھروں یا جنگل وغیرہ میں ان کی نماز و عبادت نہ ہوتی تھی۔ نیز یہ کہ جب پانی کے استعمال پر قُدرت نہ ہو، خواہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے یا کسی بیماری کے سبب تو وضو کی بجائے مٹی سے تیمم کرنا اس اُمت کے لئے طہارت و وضو کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں وہ خود ہی اپنی نظیر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے ہر رسول کو ایک دُعا کی قبولیت ایسی عطا فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور ہر رسول و نبی نے اپنی اپنی دُعا کو اپنے خاص خاص مقصدوں کے لئے استعمال کر لیا۔ وہ مقصد حاصل ہو گئے۔ مجھ سے بھی کہا گیا کہ آپ کوئی دُعا کریں۔ مَیں نے اپنی دُعا کو آخرت کے لئے مخصوص کرا دیا وہ دُعا تمہارے اور قیامت تک جو شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت دینے والا ہوگا اُس کے کام آئے گی۔

نیز امام احمدؒ کی ایک روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو شخص میرا مبعوث ہونا سُنے خواہ وہ میری اُمت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو جہنم میں جائے گا۔

اور صحیح بخاری میں اسی آیت کے تحت بروایت ابو دردؓا نقل کیا ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہُوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ بھی اُن کو منانے کے لئے چلے مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نہ مانے۔ یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا۔ مجبوراً صدیق اکبرؓ واپس ہُوئے اور آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور یہ بھی اپنے گھر سے نکل کر آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور اپنا واقعہ عرض کیا۔

ابو الدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا بیان ہے کہ اس پر رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم ناراض ہو گئے۔ جب صدیق اکبرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پر عتاب ہونے لگا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! زیادہ قصور میرا ہی تھا۔ رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے فرمایا۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنے ایذاؤں سے چھوڑ دو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جب مَیں نے باذنِ خداوندی یہ کہا کہ یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ

رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا ۝ تو تم سب نے مجھے جھٹلایا، صرف ابوبکرؓ ہی تھے، جنہوں نے پہلی بار میری تصدیق کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا تمام موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے اور ہر ملک ہر خطّہ کے باشندوں کے لئے اور ہر قوم و برادری کے لئے رسولِ عام ہونا ثابت ہُوا اور یہ کہ آپؐ کی بعثت کے بعد جو شخص آپؐ پر ایمان نہیں لایا وہ اگرچہ کسی سابق شریعت و کتاب کا یا کسی اور مذہب و ملّت کا پورا پورا اتباع تقویٰ و احتیاط کے ساتھ بھی کر رہا ہو وہ ہرگز نجات نہیں پائے گا۔

آخر آیت میں بتلایا کہ میں اس ذات پاک کی طرف سے رسول ہوں جس کی مِلک میں ہیں تمام آسمان و زمین، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم تمام اقوامِ عالم کے لئے رسول و نبی ہیں ان کے اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو ضروری ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر جو خود بھی اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا اتباع کرو تاکہ تم صحیح راستہ پر قائم رہو۔

اللہ کے کلمات سے مراد اللہ تعالےٰ کی کتابیں توراۃ، انجیل اور قرآن وغیرہ ہیں۔ ایمان کے حکم کے بعد پھر اتباع کا مزید حکم دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ محض ایمان لانا یا زبانی تصدیق کرنا آپؐ کی شریعت کا اتباع کرنے کے بغیر ہدایت کے لئے کافی نہیں ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچنے کے کُل راستے بند ہیں بجز اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے بتلایا ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۹۱ تا ص ۹۳)

توراۃ وانجیل میں

رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی صفات اور علامات

موجودہ توراۃ وانجیل بے شمار تحریفات اور تغیر وتبدل ہو جانے کے سبب قابلِ اعتماد نہیں رہی۔ اس کے باوجود اب بھی ان میں ایسے کلمات موجود ہیں جو رسول کریم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا پتہ دیتے ہیں اور اتنی بات بالکل واضح ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ اعلان کیا کہ خاتم الانبیاء کی صفات وعلامات توراۃ وانجیل میں لکھی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بات واقعہ کے خلاف ہوتی تو اس زمانے کے یہود ونصاریٰ کے لئے تو اسلام کے خلاف ایک بہت بڑا ہتھیار ہاتھ آجاتا کہ اس کے ذریعے قرآن کی تکذیب کر سکتے تھے کہ توراۃ وانجیل میں کہیں نبی اُمّی کے حالات کا ذکر نہیں۔ لیکن اس وقت کے یہود ونصاریٰ نے اس کے خلاف کوئی اعلان نہیں کیا۔ یہ خود اس پر شاہد ہے کہ اس وقت توراۃ وانجیل میں رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی صفات وعلامات واضح طور پر موجود تھیں جس نے ان لوگوں کی زبانوں پر مہر لگادی۔

خاتم الانبیاء صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی جو صفات توراۃ وانجیل میں لکھی تھیں اُن کا کچھ بیان تو قرآن کریم میں بحوالہ توراۃ وانجیل آیا ہے اور کچھ روایات حدیث میں ان حضرات سے منقول ہے جنہوں نے اصلی توراۃ وانجیل کو دیکھا اور ان میں آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا ذکر مبارک پڑھ کر وہ مسلمان ہوئے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ اتفاقاً بیمار ہوگیا تو آپ اس کی بیمار پُرسی کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اُس کا باپ اُس کے سرہانے کھڑا ہوا توراۃ پڑھ رہا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم

بیٹے اس سے کہا اے یہودی! میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے۔ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا۔ یارسول اللہؐ! یہ غلط کہتا ہے تورات میں ہم آپؐ کا ذکر اور آپؐ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں۔ آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین مسلمان کریں۔ باپ کے حوالہ نہ کریں۔ (مظہری)

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا۔ اُس نے آکر اپنا قرض مانگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، کچھ مہلت دو۔ یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپؐ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرا قرض ادا نہ کر دو۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تمہیں اختیار ہے۔ میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی۔ صحابہ کرامؓ یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضب ناک ہو رہے تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو چھوڑ دے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہؓ سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انہوں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپؐ کو قید کرے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد وغیرہ پر ظلم کروں۔

یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سُن رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا:۔

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس طرح مشرف باسلام ہو کر اس نے کہا کہ یارسول اللہ! میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں

دے دیا اور قسم ہے خدا تعالےٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپؐ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپؐ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں ؟ میں نے تورات میں آپؐ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں :۔

"محمد بن عبداللہ، ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا، نہ وہ سخت مزاج ہوں گے، نہ سخت بات کرنے والے، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، فحش اور بے حیائی سے دُور ہوں گے"۔

اب میں نے تمام صفات کا امتحان کر کے آپؐ کو صحیح پایا، اس لئے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ تعالےٰ کے رسول ہیں۔ اور یہ میرا آدھا مال ہے، آپؐ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں اور یہ یہودی بہت مالدار تھا۔ آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی۔ اس روایت کو تفسیر مظہری میں بحوالہ دلائل النبوۃ بیہقی نے نقل فرمایا ہے۔

امام بغویؒ نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے کہ :

"محمد اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں، نہ سخت مزاج ہیں نہ بے ہودہ گو نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے، بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔ ملک آپؐ کا شام ہوگا اور اُمت آپؐ کی حماد دین ہوگی یعنی راحت و کلفت، دونوں حالتوں میں اللہ تعالےٰ کی حمد و شکر ادا کرے گی۔ ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی۔ وہ آفتاب کے سایوں پہ نظر رکھے گی تاکہ اُس کے ذریعے اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے وقت میں پڑھا کریں۔ وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے۔ ان کا اذان دینے والا فضاء میں آواز بلند کرے گا

جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز جماعت میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے۔" (مظہری)

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولیٰ خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی یہ صفات پڑھی ہیں :۔

"وہ نہ پست قد ہوں گے، نہ بہت دراز قد، سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے۔ ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہو گی، صدقہ قبول نہ کریں گے، حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے۔ بکریوں کا دودھ خود دوھ لیا کریں گے، پیوند زدہ کرتہ استعمال فرمائیں گے۔ اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے، وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہو گا۔"

ابن سعد نے طبقات میں، دارمی نے اپنے مسند میں، بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت نقل کی ہے جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں :۔

"اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا، برے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور اُمیّین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک

اُن کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دیں، یہاں تک کہ وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں اور بہرے کانوں کو سُننے کے قابل بنا دیں اور بند ھے ہُوئے دلوں کو کھول دیں "

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے بھی مذکور ہے اور کتبِ سابقہ کے ایک بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے :-

" اللہ تعالےٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام پر طرف وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہو گا، مَیں اُن پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور مَیں نے اُن کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں۔ ان کی اُمت امتِ مرحومہ ہے، مَیں نے اُن کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاءؑ کو عطا کی تھیں اور اُن پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نُور کے مانند ہو گا۔ اے داؤدؑ! مَیں نے محمد اور اُن کی اُمت کو تمام اُمتوں پر فضیلت دی ہے۔ مَیں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری اُمتوں کو نہیں دی گئیں۔ اوّل یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہو گا، جو گناہ اُن سے بغیر قصد صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو مَیں معاف کر دوں گا اور وہ جو مال اللہ تعالےٰ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو مَیں دُنیا ہی میں ان کو اس سے زیادہ دے دوں گا اور جب اُن پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہیں تو مَیں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ و رحمت اور جنّت کی طرف ہدایت بنا دوں گا، وہ جو دُعاء

کریں گے میں قبول کروں گا۔ کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے اُن کی آخرت کا سامان بنا دوں"۔

(رُوح المعانی)

سینکڑوں میں سے یہ چند روایات تورات، انجیل اور زبور کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں۔ پوری روایات کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

تورات و انجیل میں خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کی اُمّتِ مرحومہ کے خاص فضائل و صفات اور علامات کی تفصیل پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ اس آخری دَور میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی نے اپنی کتاب اظہار حق میں اس کو بڑے شرح و بسط اور تفصیل و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ اس موجودہ زمانے کی تورات و انجیل جس میں بے انتہا تحریفات ہو چکی ہیں ان میں بھی بہت سی صفات و فضائل کا ذکر موجود ہونا ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ[1] حال میں شائع ہو چکا ہے جو قابلِ دید ہے۔

(معارف القرآن ج ۴ ص ۸۰ تا ص ۸۳)

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ط

(سورۃ الصف آیت ۶)

"اور اسی طرح وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب کہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے جو پہلے تورات آچکی ہے میں اُس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد ایک رسول آئیں گے جن کا نام (مبارک) احمد ہو گا"۔

---

[1] ملنے کا پتہ:- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ - انارکلی لاہور۔

اس میں آنے والے رسول کا نام احمد بتلایا گیا ہے۔ ہمارے نبی خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نام محمد بھی تھا اور احمد بھی۔ اور بھی متعدد نام تھے مگر انجیل میں آپ کا نام احمد بتلانے میں شاید یہ مصلحت ہو کہ محمد نام رکھنے کا عرب میں قدیم سے دستور تھا اس لئے اس نام کے دوسرے آدمی بھی عرب میں تھے بخلاف احمد کے یہ نام عرب میں معروف نہیں تھا وہ آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا۔

انجیل میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشارت

یہ سب کو معلوم ہے اور خود یہود و نصاریٰ کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا ہے کہ تورات و انجیل میں تحریف ہوئی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں میں تحریف اتنی ہوئی ہے کہ ان دونوں کتابوں کا اصل کلام پہچاننا بھی آسان نہیں رہا۔ موجودہ تحریف شدہ انجیل[1] کی بناء پر آج کل کے عیسائی قرآن کی اس خبر کو تسلیم نہیں کرتے کہ انجیل میں کہیں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نام احمد لے کر خوشخبری دی گئی ہو۔ اس کا مختصر جواب وہ کافی ہے جو خلاصہ تفسیر میں آچکا ہے اور مفصل جواب کے

[1] حسب تحقیق علماء محققین اناجیل کے نسخے محفوظ نہیں رہے مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اسی قسم کا مضمون موجود ہے۔ چنانچہ یوحنا کی انجیل مترجمہ عربی مطبوعہ لندن ۱۸۳۱ء و ۱۸۴۴ء کے چودھویں باب میں ہے کہ "تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے۔ پس اگر میں جاؤں تو اسکو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ فارقلیط ترجمہ احمد کا ہے۔ اہل کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد فرمایا تھا۔ جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو بیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد یعنی بہت سراہا گیا بہت حمد کرنیوالا بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک احمد موجود ہے۔ دیکھو پادری پارکرست کی یہ عبارت دیباد حمد خل ہکوتیم از حمایت الاسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء ص ۸۱ ۸۴ ترجمہ اپالوجی گاڈ فری ہیگنس مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء اور اس فارقلیط کی نسبت اس انجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں "وہ تمہیں سب چیزیں سکھا دیگا۔" "اس جہان کا سردار آتا ہے۔" "وہ آکر دنیا کو گناہ پر اور راستی اور عدالت (کے خلاف) پر سزا دے گا۔" یہ ہیں وہ الفاظ جو نبی مستقل ہونے پر دال ہیں اور پوری بحث اس مقام کی تفسیر حقانی میں ہے۔
(معارف القرآن ج ۸ صـ۴۲۲)

لئے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی کتاب "اظہار الحق" کا مطالعہ کیا جائے جو مذہب عیسائیت کی حقیقت اور انجیل میں تحریفات اور باوجود تحریفات کے اس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بشارتیں موجود ہونے کے متعلق بے نظیر کتاب ہے۔ خود بڑے بڑے عیسائیوں کے مقولے چھپے ہوتے ہیں کہ

"اگر دنیا میں یہ کتاب شائع ہوتی رہی تو عیسائیت کو کبھی بھی فروغ نہیں ہو سکتا۔"

یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی۔ پھر ترکی، انگریزی میں اس کے ترجمے چھپے۔ اس کے شواہد موجود ہیں کہ عیسائی مشن نے اس کتاب کو گم کر دینے میں اپنی پوری کوشش صرف کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ اب تک نہیں ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ "دارالعلوم" کراچی کے مدرس مولانا اکبر علی صاحب (مرحوم) نے اور تحقیقاتِ جدیدہ مفیدہ موجودہ زمانے کی انجیلوں سے مولانا محمد تقی صاحب عثمانی استاذ "دارالعلوم" نے لکھی ہیں جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کی تیسری جلد صہ ۱۸۳ تا صہ ۳۶۲ تک ان ہی بشارتوں کی تفصیل موجودہ انجیلوں کے حوالہ سے اور شبہات کے جوابات مذکور ہیں۔

(معارف القرآن ج ۸ صہ ۴۲۶)

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کمالات

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

(سورۃ المائدہ آیت ۱۹)

"اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آپہنچے جو کہ تم کو صاف صاف بتلاتے ہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا۔ تاکہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بشیر اور نذیر آیا، لو تمہارے پاس بشیر اور نذیر آچکے ہیں اور اللہ تعالےٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں"۔

اس آیت میں اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ ہمارے رسول محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ایک طویل فترت[1] کے بعد آئے ہیں۔ اس میں ایک اشارہ

---

[1] حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک ہزار سات سو سال کا زمانہ ہے۔ اس تمام مدت میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس میں فترت نہیں ہوئی۔ صرف بنی اسرائیل میں سے ایک ہزار انبیاء اس عرصے میں مبعوث ہوئے اور غیر بنی اسرائیل میں سے جو انبیاء ہوئے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان صرف پانچ سو سال کا عرصہ ہے اس میں سلسلۂ انبیاء بند رہا اسی لئے اس زمانہ کو زمانۂ فترت کہا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اتنا زمانہ انبیاء کی بعثت سے خالی نہیں رہا۔ (قرطبی مع ایضاح)

(معارف القرآن ج ۳ ص ۹۰)

اس طرف بھی ہے کہ تم لوگوں کو چاہئیے کہ آپؐ کے وجود کو غنیمتِ کبریٰ اور بڑی نعمت سمجھیں کیونکہ مدّت دراز سے یہ سلسلہ بند تھا اب تمہارے لئے پھر کھولا گیا ہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپؐ کا تشریف لانا ایسے زمانے اور ایسے مقام میں ہُوا جہاں علم اور دین کی کوئی روشنی موجود نہ تھی۔ مخلوقِ خدا، خدا تعالےٰ سے نا آشنا ہو کر بُت پرستی میں لگ گئی تھی۔ ایسے زمانہ میں ایسی قوم کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایسے جاہلیت کے زمانے میں ایسی بگڑی ہُوئی قوم آپؐ کے حوالے ہوئی۔ آپؐ کے فیضِ صحبت اور نورِ نبوّت سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ قوم ساری دُنیا کے لئے علم، عمل، اخلاق، معاملاتِ معاشرت اور تمام زندگی کے شعبوں میں استاد اور قابلِ تقلید قرار دی گئی جس سے رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی نبوّت و رسالت اور آپؐ کی پیغمبرانہ تعلیم کا تمام انبیاء سابقین میں افضل و اعلےٰ ہونا مشاہدہ سے ثابت ہو گیا۔

جو ڈاکٹر کسی مایوس العلاج مریض کا علاج کرے اور ایسی جگہ میں کرے جہاں طبّی آلات اور دوائیں مفقود ہوں اور پھر وہ اس کے علاج میں کامیاب ہو کہ یہ لب دم مریض میں نہ صرف یہ کہ تندرست ہو جائے بلکہ ایک حاذق اور ماہر ڈاکٹر بھی بن جائے تو اُس ڈاکٹر کے کمال میں کسی کو کیا شُبہ رہ سکتا ہے۔

اس طرح طویل فترت کے بعد جب کہ ہر طرف کفر و معصیت کی ظلمت ہی ظلمت چھائی ہوئی تھی، آپؐ کی تعلیمات اور تربیت نے ایسا اُجالا کر دیا کہ اس کی نظیر کسی پچھلے دَور میں نظر نہیں آئی۔

سارے مُعجزات ایک طرف، تنہا یہ مُعجزہ ہی انسان کو آپؐ پر ایمان لانے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۳ صـ۹۲ ، صـ۹۳)

❁

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ وَّ
دَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝

اس میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا:۔ شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج منیر۔

شاہد سے مراد یہ ہے کہ آپؐ قیامت کے روز اُمت کے لئے شہادت دیں گے۔ جیسا کہ صحیح بخاری، نسائی، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک طویل حدیث روایت ہے۔ جس کے بعض جملے یہ ہیں کہ قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام پیش ہوں گے تو ان سے سوال کیا جائے گا کہ کیا آپ نے ہمارا پیغام اپنی اُمت کو پہنچایا؟ تو وہ عرض کریں گے کہ میں نے پہنچا دیا۔ پھر ان کی اُمت پیش ہو گی۔ وہ اس سے انکار کرے گی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچا ہو۔ اس وقت حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ آپ جو پیغامِ حق پہنچانے کا دعوےٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا کوئی شاہد بھی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ان کی اُمت گواہ ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ وہ گواہی میں اُمتِ محمدیہ کو پیش کریں گے۔ یہ اُمت اُن کے حق میں گواہی دے گی تو اُمتِ نوح علیہ السلام ان پر یہ جرح کرے گی کہ یہ ہمارے معاملے میں کیسے گواہی دے سکتے ہیں۔ یہ تو اُس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بلکہ ہمارے زمانے سے بہت طویل زمانے کے بعد پیدا ہوئے۔ اس جرح کا جواب اُمتِ محمدیہ سے پوچھا جائے گا۔

وہ یہ جواب دے گی کہ بے شک ہم اس وقت موجود نہیں تھے۔ مگر ہم نے اس کی خبر اپنے رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے سُنی تھی جس پر ہمارا ایمان و اعتقاد ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے آپؐ کی اُمت کے اس قول کی تصدیق کے لئے شہادت لی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اپنی شہادت کے ذریعہ

اپنی اُمت کی تصدیق وتوثیق فرمائیں گے کہ بے شک میں نے اُن کو یہ اطلاع دی تھی۔
اور اُمت پر شاہد ہونے کا ایک مفہوم عام یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی اُمت کے سب افراد کے اچھے بُرے اعمال کی شہادت دیں گے اور یہ شہادت اس بناء پر ہو گی کہ اُمت کے اعمال رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے ہر روز صبح و شام اور بعض روایات میں ہے کہ ہفتہ میں ایک روز پیش ہوتے ہیں اور آپؐ اُمت کے ایک ایک فرد کو اس کے اعمال کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے روز آپؐ اُمت کے شاہد بنائے جائیں گے۔ (رواہ ابن المبارک عن سعید بن المسیب' مظہری)

"مبشر" کے معنی بشارت دینے والا۔ مُراد یہ ہے کہ آپؐ اپنی اُمت کے نیک باشرع لوگوں کو جنّت کی خوشخبری سنانے والے ہیں۔

"نذیر" کے معنی ڈرانے والا۔ مراد یہ ہے کہ آپؐ اُمت کے لوگوں کو درصُورت خلاف ورزی و نافرمانی کے عذاب سے ڈرانے والے بھی ہیں۔

"داعی الی اللہ" سے مُراد یہ ہے کہ آپؐ اُمت کو اللہ تعالےٰ کے وجود اور توحید و اطاعت کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔

داعیاً الی اللہ کو باذنہٖ کے ساتھ مشروط فرمایا کہ آپؐ لوگوں کو اللہ تعالےٰ کی طرف دعوت دینے والے اور بلانے والے اللہ تعالےٰ ہی کے اذن و اجازت سے ہیں۔ اس قید و شرط کا اضافہ اس اشارہ کے لئے ہے کہ تبلیغ و دعوت کی خدمت سخت دشوار ہے، وہ اللہ تعالےٰ کے اذن اور اعانت کے بغیر انسان کے بس میں نہیں آسکتی۔

"سراج" کے معنی چراغ اور "منیر" کے معنی روشن کرنے والا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی پانچویں صفت اس میں یہ بیان فرمائی گئی کہ آپؐ روشن کرنے والے چراغ ہیں اور بعض حضرات نے سراج منیر سے مُراد قرآن لیا ہے مگر نسق کلام سے قریب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی صفت

ہے۔ بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ آپؐ کی صفت داعی الی اللہ تو ظاہر اور زبان کے اعتبار سے ہے اور سراج منیر آپؐ کی صفت آپؐ کے قلب مبارک کے اعتبار سے ہے کہ جس طرح سارا عالم آفتاب سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح تمام مؤمنین کے قلوب آپؐ کے نورِ قلب سے منور ہوتے ہیں۔ اسی لئے صحابہ کرامؓ جنھوں نے اس عالم میں آپؐ کی صحبت پائی وہ ساری اُمت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے کیونکہ اُن کے قلوب نے قلب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بلاواسطہ عیاناً فیض اور نور حاصل کیا۔ باقی اُمت کو یہ نور صحابہ کرامؓ کے واسطے سے واسطہ در واسطہ ہو کر پہنچا۔ (انتہی الکلامہ)

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء خصوصاً رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس دُنیا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ان کی یہ حیاتِ برزخی عام لوگوں کی حیاتِ برزخی سے بدرجہا زیادہ فائق و ممتاز ہوتی ہے جس کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

بہرحال اس حیات کی وجہ سے قیامت تک مؤمنین کے قلوب آپؐ کے قلب مبارک سے استفاضہ نور کرتے رہیں گے اور جو جتنی محبت و تعظیم اور درود شریف کا زیادہ اہتمام کرے گا اس نور کا زیادہ حصہ پائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی گئی حالانکہ آپؐ کا نورِ باطن آفتاب کے نور سے کہیں زیادہ ہے۔ آفتاب سے صرف دُنیا کا ظاہر روشن ہوتا ہے۔ لیکن آپؐ کے قلبِ مبارک سے سارے جہان کا باطن اور مؤمنین کے قلوب روشن ہوتے ہیں۔ وجہ اس تشبیہ کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ چراغ کی روشنی سے استفادہ اختیاری ہے اور ہر وقت کر سکتے ہیں۔ اس تک رسائی بھی آسان ہے، اس کا حاصل کرنا بھی آسان ہے۔ بخلاف آفتاب کے کہ وہاں تک رسائی بھی مشکل ہے اور اس سے استفادہ ہر وقت نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ صفات جیسے قرآن حکیم میں آئی ہیں، قرآن

سے پہلے توراۃ میں بھی مذکور ہیں۔ جیسا کہ امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے ملا تو اُن سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تورات میں آئی ہیں وہ مجھے بتلا دیجئے۔ انہوں نے فرمایا بے شک میں بتلاتا ہوں۔ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعض صفات جو قرآن میں مذکور ہیں وہ تورات میں بھی موجود ہیں اور فرمایا:-

إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْأُمِّيِّيْنَ أَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ وَلٰكِنْ يَّعْفُوْ وَيَغْفِرُ لَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَّقُوْلُوْا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَيَفْتَحُ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيًا وَّآذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا -

"اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو بھیجا ہے شاہد بنا کر اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور پناہ و حفاظت اُمیّین یعنی عرب کی، آپؐ میرے بندے اور رسول ہیں۔ میں نے آپؐ کا نام متوکل (یعنی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا) رکھا ہے۔ آپؐ نہ تُندخو ہیں نہ سخت مزاج ہیں۔ اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے اور آپؐ بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور آپؐ کو اللہ تعالیٰ دُنیا سے اس وقت تک نہیں واپس لائیں گے جب تک کہ آپؐ کے ذریعہ ٹیڑھی اُمّت کو سیدھا نہ کریں کہ وہ لا إلٰہ إلّا اللہ کہنے لگیں۔ آپؐ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھولے گا"

(معارف القرآن ج ۷ ص ۱۷۶ تا ص ۱۷۹)

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوتِ عامہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْہَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشّٰہِدِیْنَ ۝ (آل عمران آیت ۸۱)

"اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا انبیاء سے کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے، تم ضرور اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اُس کی طرف داری بھی کرنا۔ فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا عہد قبول کیا۔ وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔ ارشاد فرمایا۔ تو گواہ رہنا، اور میں اس پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔"

اِن آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائے اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرے۔ قرآن کے اس قاعدہ کلیہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں اس طرح کا عہد انبیاء سے لیا ہوگا۔ جیسا کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے رسالہ "التعظیم والمنۃ فی لتؤمنن بہ ولتنصرنہ"، میں فرماتے ہیں کہ آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی ذات والا صفات

کے بارہ میں تائید و نصرت اور آپؐ پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو اور کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے اپنی اُمت کو آپؐ پر ایمان لانے اور تائید و نصرت کی وصیت نہ کی ہو اور اگر حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپؐ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپؐ کی اُمت میں شمار ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپؐ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی ہی کے احکام پر عمل کریں گے۔

(تفسیر ابن کثیرؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی نبوت عامہ اور شاملہ ہے اور آپؐ کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں۔ اور اس بیان سے آپؐ کے ارشاد بعثت اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپؐ کی نبوت آپؐ کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے صحیح نہیں بلکہ آپؐ کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں:۔

کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ۔

"محشر میں شفاعتِ کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا، اور تمام بنی آدمؑ کا آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شبِ معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اسی سیادتِ عامہ اور امامتِ عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۱۰۰، ص ۱۰۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات سے زائد ہے

قولہ تعالیٰ :۔ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ۔

عَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ سے ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے برابر تمام کائنات کا علم محیط نہ تھا جیسے بعض جاہل کہتے ہیں، بلکہ جتنا علم حق تعالیٰ عطا فرماتے تھے وہ مل جاتا تھا۔ ہاں اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت ؐ کو جو علم عطا ہوا وہ ساری مخلوقات کے علم سے زائد ہے ۔

(معارف القرآن ج ۲ ص ۵۴۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علمِ غیب کے متعلق تقاضائے ادب

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علمِ غیب کے متعلق تقاضائے ادب یہ ہے کہ یوں نہ کہا جائے کہ آپؐ غیب نہیں جانتے تھے، بلکہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو امورِ غیب کا بہت بڑا علم دیا تھا جو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی دوسرے کو نہیں ملا ۔

(معارف القرآن ج ۷ ص ۶۹۶)

علمِ غیب اور غیبی خبروں میں فرق

بعض ناواقف غیب اور انباء الغیب میں فرق نہیں سمجھتے اس لئے وہ انبیاء اور خصوصًا خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے علمِ غیب کُلّی ثابت کرتے ہیں اور بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ہر ذرہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کُھلا ہُوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، نعوذ باللہ منہ ۔

اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلادے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دُنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلادینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا، خوب سمجھ لیا جائے۔

جاہل عوام جو ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے، جب اُن کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم عالم الغیب نہیں اور اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپؐ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دُنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایسا ہونے سے خود نبوت و رسالت کی نفی ہو جاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۵۸۲، ص ۵۸۳)

شعر و شاعری سے نفی

حق سبحانہ وتعالٰی نے ارشاد فرمایا :۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِىْ لَهٗ ؕ ۔ (سورۃ یٰسین آیت ۶۹)

حق تعالٰی نے آیت مذکورہ میں فرمایا ہے کہ ہم نے نبی کو شعر و شاعری نہیں سکھلائی اور نہ آن کی شان کے مناسب تھی۔ آپؐ کو شاعر کہنا باطل اور غلط ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرب تو وہ قوم ہے جس کی فطرت میں شعر و شاعری پڑی ہوئی ہے۔ عورتیں، بچے بے ساختہ شعر کہتے ہیں وہ شعر کی پوری حقیقت سے واقف ہیں۔ انہوں نے قرآن پاک کو شعر اور رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کو شاعر کس اعتبار سے کہا؟ کیونکہ قرآن پاک نہ تو وزن شعری کا پابند ہے نہ کہیں ردیف قافیہ کا۔ اس کو تو جاہل شعر و شاعری سے ناواقف بھی شعر نہیں کہہ سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر دراصل خیالی خود ساختہ مضامین کو کہا جاتا ہے خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں۔ ان کا مقصد قرآن کو شعر اور آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم

کو شاعر کہنے سے یہ تھا کہ آپؐ جو کلام لاتے ہیں وہ محض خیالی افسانے ہیں یا پھر شعر کے معنی معروف کے اعتبار سے شاعر کہا تو اس سے مناسبت سے کہ جس طرح نظم اور شعر خاص اثر رکھتا ہے اس کا اثر بھی ایسا ہی ہے۔

امام جصاص رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے کسی نے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کبھی شعر پڑھتے تھے تو آپ نے کہا کہ نہیں! البتہ ایک شعر ابن طرفہ کا آپؐ نے پڑھا تھا ؎

ستبدی لک الایام ما کنت جاھلاً
ویأتیک بالاخبار من لم تزود

اس کو آپؐ نے وزن شعری کو توڑ کر من لم تزود بالاخبار پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عرض کیا کہ یہ شعر اس طرح نہیں ہے، تو آپؐ نے فرمایا کہ مَیں شاعر نہیں اور نہ میرے لئے شعر و شاعری مناسب ہے۔

یہ روایت ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے اور ترمذی، نسائی اور امام احمدؒ نے بھی اس کو روایت کیا۔

اس سے معلوم ہُوا کہ خود کوئی شعر تصنیف کرنا تو کیا آپؐ دوسروں کے اشعار بھی پڑھنے کو اپنے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے اور بعض روایات ہیں جو خود حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے وزن شعری کے مطابق کچھ کلمات منقول ہیں، وہ بقصد شعر نہیں اتفاقی ہیں اور ایسے اتفاقی کوئی ایک دو شعر موزوں ہو جانے سے کوئی آدمی شاعر نہیں کہلا سکتا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے اس فطری حال سے جو بڑی حکمتوں پر مبنی تھا یہ لازم نہیں آتا ہے کہ مطلقاً شعر گوئی مذموم ہے۔

(معارف القرآن ج ۷ ص ۴۰۰، ص ۴۰۸)

٭

باوجود عصمتِ انبیاء کے استغفار کا حکم

قولہ تعالےٰ :- فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ۝

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی قابلِ عبادت نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو ہر مومن مسلمان کو بھی حاصل ہے، سید الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کیوں حاصل نہ ہوتا۔ پھر اس علم کے حاصل کرنے کا حکم دے دینا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے یا اس کے مقتضیات پر عمل کرنا مراد ہے۔ جیسا کہ قرطبی نے فرمایا ہے۔

اس کے بعد وَاسْتَغْفِرْ کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے بوجہ عصمتِ نبوّت کے اس کے خلاف کرنے کا اگرچہ احتمال نہیں تھا مگر انبیاء علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہو جاتی ہے۔ اور اجتہادی خطا قانونِ شرع میں گناہ نہیں بلکہ اس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کو اس خطاء پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے اور اُن کی شانِ عالی کے اعتبار سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ سورۂ عبس میں جو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر ایک قسم کا عتاب ہُوا تھا وہ اسی اجتہادی خطاء کی ایک مثال تھی کہ وہ اجتہادی خطاء اگرچہ گناہ نہ تھا بلکہ ایک اجر اس پر بھی ملنے کا وعدہ تھا مگر آپ کی شانِ عالی کے لئے اس کو پسند نہیں کیا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ آیت مذکورہ میں اسی طرح کا ذنب مُراد ہو سکتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ صہ ۳۶)

٭

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وصیت نامہ

تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپؐ کی مُہر لگی ہوئی ہو وہ ان آیاتؔ کو پڑھ لے۔ ان میں وہ وصیت موجود ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی اُمت کو دی ہے اور حاکم نے بروایت حضرت عبادہ بن صامت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

لہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ج وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ج وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ج وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ج لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ج وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ج وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(الانعام آیت ۱۵۱ تا ۱۵۳)

نے صحابہ کرامؓ کو خطاب کر کے فرمایا :۔

"کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے۔ پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس بیعت کو پورا کرے گا اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے ہو گا"

(معارف القرآن ج ۳ صہ۴۸۰)

وہ دس چیزیں جن کی حرمت کا بیان ان آیات میں آیا ہے۔ یہ ہیں :۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت و اطاعت میں کسی کو ساجھی ٹھہرانا۔

(۲) والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا۔

(۳) فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا۔

(۴) بے حیائی کے کام کرنا۔

(۵) کسی کو ناحق قتل کرنا۔

(۶) یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا۔

(۷) ناپ تول میں کمی کرنا۔

(۸) شہادت یا فیصلہ یا دوسرے کلام میں بے انصافی کرنا۔

(۹) اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا۔

(معارف القرآن ج ۳ صہ۴۷۹)

باسمہ سبحانہ

درود پاک پڑھنے کا حکم

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؕ

(الاحزاب آیت ۵۶)

"بے شک اللہ تعالےٰ اور اُس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم) پر۔ اے ایمان والو! تم بھی آپؐ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو۔"

صلوٰۃ وسلام کے معنی

لفظ صلوٰۃ عربی زبان میں چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رحمت[1]، دعا[2]، مدح و ثناء[3]۔ آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالےٰ کی طرف جو نسبت صلوٰۃ کی ہے اس سے مراد رحمت نازل کرنا ہے اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ، اُن کا آپؐ کے لئے دُعا کرنا ہے اور عام مؤمنین کی طرف سے صلوٰۃ کا مفہوم دُعا اور مدح و ثناء کا مجموعہ ہے۔ عامۂ مفسرین نے یہی معنی لکھے ہیں۔

امام بخاریؒ نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی صلوٰۃ سے مُراد آپؐ کی تعظیم اور فرشتوں کی مدح و ثناء ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپؐ کی تعظیم دُنیا میں تو یہ ہے کہ آپؐ کو بلند مرتبہ عطا فرمایا کہ اکثر اذان و اقامت وغیرہ میں اللہ تعالےٰ کے ذکر کے ساتھ آپؐ کا ذکر شامل کر دیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دین کو دُنیا بھر میں پھیلا دیا اور غالب کیا اور آپؐ کی شریعت پر عمل قیامت تک جاری رکھا۔ اس کے ساتھ آپؐ کی شریعت کو محفوظ رکھنے کا ذمہ حق تعالےٰ نے خود لے لیا اور آخرت میں آپؐ کی تعظیم یہ ہے کہ آپؐ کا مقام تمام خلائق

سے بلند و بالا کیا اور جس وقت کسی پیغمبر اور فرشتے کو شفاعت کی مجال نہ تھی۔ اس حال میں آپؐ کو مقامِ شفاعت عطا فرمایا جس کو مقامِ محمود کہا جاتا ہے۔

اس معنی پر جو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ صلوٰۃ و سلام میں تو روایاتِ حدیث کے مطابق آپؐ کے ساتھ آپؐ کے آل و اصحاب کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی تعظیم اور مدح و ثناء میں آپؐ کے سوا کسی کو شریک کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب روح المعانی وغیرہ میں دیا گیا ہے کہ تعظیم اور مدح و ثناء وغیرہ کے درجات بہت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اس کا اعلیٰ درجہ حاصل ہے اور ایک درجہ میں آل و اصحاب اور عام مؤمنین شامل ہیں۔

ایک شُبہ کا جواب

اور ایک لفظ صلوٰۃ سے بیک وقت متعدد معنی رحمت، دُعا، تعظیم و ثناء مُراد لینا جو اصطلاح میں عموم مشترک کہلاتا ہے اور بعض حضرات کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ اس لئے اس کی یہ توجیہہ ہو سکتی ہے کہ لفظ صلواۃ کے اس جگہ ایک ہی معنی لئے جائیں۔ یعنی آپؐ کی تعظیم اور مدح و ثناء اور خیر خواہی۔ پھر یہ معنی جب اللہ تعالےٰ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا حاصل رحمت ہو گا اور فرشتوں کی طرف منسوب ہوں تو دُعا و استغفار ہو گا۔ عام مؤمنین کی طرف منسوب کیا جائے تو دُعا اور مدح ثناء و تعظیم کا مجموعہ ہو گا۔

اور لفظ سلام مصدر بمعنی سلامت مستعمل ہوتا ہے اور مراد اس سے ہوتا ہے۔ اور مراد اس سے نقائص و عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا ہے اور اَلسَّلامُ عَلَیکَ کے معنی یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے اور عربی زبان کے قاعدہ سے یہاں حرف علیٰ کا موقع نہیں۔ مگر چونکہ لفظ سلام معنی ثناء کو متضمن ہے اس لئے حرف علیٰ کے ساتھ علیک یا علیکم کہا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے یہاں لفظ سلام سے مُراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے

کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے تو مراد السّلامُ علیکَ کی یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی حفاظت و رعایت پر متولی اور خود کفیل ہے۔

صلوٰۃ وسلام کا طریقہ

صحیح بخاری و مسلم وغیرہ سب کتب حدیث میں یہ حدیث آئی ہے کہ حضرت کعب بن عجرہؓ نے فرمایا کہ (جب یہ آیت نازل ہوئی) ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا (کہ آیت میں ہمیں دو چیزوں کا حکم ہے صلوٰۃ اور سلام) سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے (کہ السّلامُ علیکَ اَیُّھا النَّبیُّ کہتے ہیں) صلوٰۃ کا طریقہ بھی بتلا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ الفاظ کہا کرو :-

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ

دُوسری روایات میں اس میں کچھ کلمات اور بھی منقول ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے سوال کرنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کو سلام کرنے کا طریقہ تو تشہد (التحیات) میں پہلے سکھایا جا چکا تھا کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ کہا جائے۔ اس لئے لفظ صلوٰۃ میں انہوں نے اپنی طرف سے الفاظ مقرر کرنا پسند نہیں کیا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کر کے الفاظ صلوٰۃ متعین کرالئے۔ اس لئے نماز میں عام طور پر انہی الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ کو اختیار کیا گیا ہے۔

مگر یہ کوئی ایسی تعیین نہیں جس میں تبدیلی ممنوع ہو۔ کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلوٰۃ یعنی درود شریف کے بہت سے صیغے منقول و ماثور ہیں۔ صلوٰۃ وسلام کے حکم کی تعمیل ہر اس صیغہ سے ہو سکتی ہے جس میں صلوٰۃ و سلام کے الفاظ ہوں۔

اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بعینہٖ منقول بھی ہوں بلکہ جس عبارت سے بھی صلوٰۃ وسلام کے الفاظ ادا کئے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل اور درود شریف کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے منقول ہیں وہ زیادہ بابرکت اور زیادہ ثواب کے موجب ہیں۔ اسی لئے صحابہ کرام رضؓ نے الفاظ صلواۃ آپ سے متعین کرانے کا سوال فرمایا تھا۔

مسئلہ قعدہ نماز میں تو قیامت تک الفاظ صلوٰۃ وسلام اسی طرح کہنا مسنون ہے جس طرح اُوپر منقول ہوئے ہیں اور خارج نماز میں جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم خود مخاطب ہوں۔ جیسا کہ آپؐ کے عہد مبارک میں وہاں تو وہی الفاظ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ کے اختیار کئے جائیں۔ آپؐ کی وفات کے بعد روضۂ اقدس کے سامنے جب سلام عرض کیا جائے تو اس میں بھی صیغہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ کا اختیار کرنا مسنون ہے۔ اس کے علاوہ جہاں غائبانہ صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے تو صحابہ و تابعین اور ائمہ اُمت سے صیغہ غائب کا استعمال کرنا منقول ہے۔ مثلاً "صلی اللہ علیہ وسلم" جیسا کہ عام محدثین کی کتابیں اس سے لبریز ہیں۔

صلوٰۃ وسلام کے مذکورہ طریقہ کی حکمت

جو طریقہ صلوٰۃ وسلام کا رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور آپؐ کے عمل سے ثابت ہوا اُس کا حاصل یہ ہے کہ ہم سب مُسلمان اللہ تعالےٰ سے آپؐ کے لئے رحمت وسلامتی کی دُعا کریں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقصود آیت کا تو یہ تھا کہ ہم آپؐ کی تعظیم وتکریم کا حق خود ادا کریں۔ مگر طریقہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالےٰ سے دُعا کریں۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا حق تعظیم و اطاعت پورا ادا

کرنا ہمارے کسی کے بس میں نہیں۔ اس لئے ہم پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالٰے سے دُعا کریں۔ (روح)

صلوٰۃ وسلام کے احکام

نماز کے قعدہ اخیرہ میں صلوٰۃ (درود شریف) سنت مؤکدہ تو سب کے نزدیک ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالٰے علیہم اجمعین کے نزدیک واجب ہے جس کے ترک سے نماز واجب اعادہ ہو جاتی ہے۔

مسئلہ اس پر بھی جمہور کا اتفاق ہے کہ جب کوئی آنحضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کا ذکر کرے یا سُنے تو اُس پر درود شریف واجب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث آپؐ کے ذکر مبارک کے وقت درود شریف نہ پڑھنے پر وعید آئی ہے جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم نے فرمایا:

رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ ۔

"ذلیل ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے"۔

(قال الترمذی حدیث حسن ورواہ ابن السنی باسناد جید)

اور ایک حدیث میں ارشاد ہے :۔

اَلْبَخِيْلُ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ ۔

"یعنی بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے"۔

(رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

مسئلہ اگر ایک مجلس میں آپؐ کا ذکر بار بار آئے تو وہ صرف ایک مرتبہ درود پڑھنے سے واجب ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکر مبارک خود کرے یا کسی سے سُنے ہر مرتبہ درود شریف پڑھے۔ حضرات محدثین سے زیادہ کون آپؐ کا ذکر کر سکتا ہے کہ اُن کا ہر وقت کا مشغلہ یہی حدیث رسولؐ ہے

جس میں ہر وقت بار بار آپؐ کا ذکر آتا ہے۔ تمام ائمہ حدیث کا دستور یہی رہا ہے کہ ہر مرتبہ درود و سلام پڑھتے اور لکھتے ہیں تمام کتب حدیث اس پر شاہد ہیں۔ انہوں نے اس کی بھی پرواہ نہیں کی کہ اس تکرار صلوٰۃ و سلام سے کتاب کی ضخامت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اکثر تو چھوٹی چھوٹی حدیثیں آتی ہیں جن میں ایک دو سطر کے بعد نام مبارک آتا ہے اور بعض جگہ تو ایک سطر میں ایک سے زیادہ مرتبہ نام مبارک مذکور ہوتا ہے لیکن حضرات محدثین کہیں صلوٰۃ و سلام ترک نہیں کرتے۔

مسئلہ جس طرح زبان سے ذکر مبارک کرتے وقت زبانی صلوٰۃ و سلام واجب ہے اسی طرح قلم سے لکھنے کے وقت صلوٰۃ و سلام کا قلم سے لکھنا بھی واجب ہے اور اس میں جو لوگ حروف کا اختصار کر کے صلعم لکھ دیتے ہیں یہ کافی نہیں بلکہ پورا صلوٰۃ و سلام لکھنا چاہیئے۔

مسئلہ ذکر مبارک کے وقت افضل و اعلیٰ اور مستحب تو یہی ہے کہ صلوٰۃ و سلام دونوں پڑھے اور لکھے جائیں۔ لیکن کوئی شخص اگر ان میں سے صرف ایک یعنی صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفاء کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔ شیخ الاسلام نوویؒ وغیرہ نے دونوں میں سے صرف ایک پر اکتفاء کرنا مکروہ فرمایا ہے۔ ابن حجر ہیثمیؒ نے فرمایا کہ ان کی مراد کراہت سے خلاف اولیٰ ہونا ہے جس کو اصطلاح میں مکروہ تنزیہی کہا جاتا ہے اور علماء امت کا مسلسل عمل اس پر شاہد ہے کہ وہ دونوں ہی کو جمع کرتے ہیں اور بعض اوقات ایک پر بھی اکتفاء کر لیتے ہیں۔

مسئلہ لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی کے لئے استعمال کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں۔ امام بیہقیؒ نے اپنے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ فتوےٰ نقل کیا ہے:۔

لَا یُصَلّٰی عَلٰی احد الا علی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لکن یدعی للمسلمین والمسلمات بالاستغفار۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے نزدیک غیر نبی کے لئے صلوٰۃ کا استعمال مستقلاً مکروہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ البتہ تبعاً جائز ہے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام کے ساتھ آل و اصحاب یا تمام مؤمنین کو شریک کرلے اس میں مضائقہ نہیں۔

امام جوینی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ جو حکم لفظ صلوٰۃ کا ہے، وہی لفظ سلام کا بھی ہے کہ غیر نبی کے لئے اس کا استعمال درست نہیں۔ بجز اس کے کہ کسی کو خطاب کرنے کے وقت بطور تحیۃ کے السلام علیکم کہے، یہ جائز و مسنون ہے مگر کسی غائب کے نام کے ساتھ علیہ السلام کہنا اور لکھنا غیر نبی کے لئے درست نہیں۔

(خصائص کبریٰ)

علامہ لقانی نے فرمایا کہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے فرمایا ہے کہ محققین علماءِ اُمت اس طرف گئے ہیں اور میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے اور اسی کو امام مالک، سفیان اور بہت سے فقہاء متکلمین نے اختیار کیا ہے کہ صلوٰۃ وسلام نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے لئے مخصوص غیر نبی کے لئے جائز نہیں۔ جیسے لفظ سبحانہٗ اور تعالیٰ، اللہ جل شانہٗ کے لئے مخصوص ہے، انبیاء کے سوا عام مسلمانوں کے لئے مغفرت اور رضا کی دُعا ہونی چاہیئے۔ جیسے قرآن میں حضرات صحابہؓ کے لئے آیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ (روح المعانی)

(معارف القرآن ج ۷، ص ۲۲۱ تا ص ۲۲۶)

درود شریف کے فضائل و مسائل

درود شریف کے فضائل اور اُس سے متعلقہ احکام پر بڑے بڑے علماء متقدمین و متاخرین نے مفصّل کتابیں لکھی ہیں۔ اس رسالہ میں انہی کا ایک حصّہ عام مُسلمانوں کے فائدہ کے لئے آسان زبان میں لکھا جاتا ہے۔

درود شریف کے معاملہ میں سب سے اہم قرآن مجید کی یہ آیت ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہ

یعنی اللہ تعالےٰ کے نزدیک ہمارے رسولِ کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی قدر و منزلت اور عظمتِ شان کا خاص مظہر ہے۔ جس میں اوّل یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ اور اُس کے فرشتے رسولِ کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر ہمیشہ درود بھیجتے رہتے ہیں اور پھر عام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر درود و سلام بھیجا کریں۔

اس میں صلوٰۃ (درود) کی نسبت جو حق تعالیٰ کی طرف ہے اس کے معنی رحمت و شفقت کے ساتھ اعزاز[1] و اکرام ہے اور فرشتوں کے درود کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بھی رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے لئے مزید رحمت و برکت کی دُعا کرتے ہیں اور مُسلمانوں کو صلوٰۃ بھیجنے کا ارشاد کا بھی یہی مفہوم ہے کہ وہ بھی اللہ تعالےٰ سے مزید رحمت و اعزاز کی دُعا کرتے رہیں۔

اس دُعا کا طریقہ صحابۂ کرامؓ نے خود رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم سے دریافت کر لیا تھا کہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے ہمیں دو چیزوں کا حکم دیا ہے۔ ایک صلوٰۃ

---

[1] بخاری عن ابی العالیہ ۱۲

دوسرے سلام۔ سلام کا طریقہ تو التحیات (نماز) میں ہمیں بتلا دیا ہے: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّہَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔ لیکن صلوٰۃ کا طریقہ ہمیں معلوم نہیں، وہ بتلا دیجئے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلوٰۃ کے لئے یہ الفاظ پڑھا کرو:۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۰ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ٥

اسی لئے التحیات کے بعد نماز میں اسی درود شریف کا پڑھنا سُنت قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں پر رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے احسانات عظیمہ کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمان اپنی طرف سے اس احسانِ عظیم کا کوئی بدلہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کرتے۔ لیکن اس درود شریف میں جو الفاظ مُسلمانوں کو تلقین کئے گئے ہیں اُن کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان اپنی طرف سے حضور کو کوئی تحفہ پیش کرنے کے بجائے اللہ جلّ شانہٗ سے دُعا و درخواست کریں کہ وہی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید رحمت نازل فرمائیں۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا مقام اتنا بلند ہے کہ تمام اُمت مل کر بھی آپؐ کے شایانِ شان کوئی تحفہ پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتی جو آپؐ کے احسانات کا کچھ بدل ہوسکے۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے درخواست اور دُعا کریں کہ وہی اپنی شان کے مطابق مزید رحمت و لطف و کرم کا معاملہ ہمارے محسنِ اعظم رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ساتھ فرمائیں۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ہماری اس درخواست و دُعا کی حاجت نہیں، بلکہ اس کا سارا فائدہ بھی ہمیں ہی پہنچتا ہے جس کا ذکر روایاتِ حدیث میں آگے آنے والا ہے۔

درود شریف رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خصوصی اعزاز ہے

رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود و سلام کا تاکیدی حکم اور اس کے فضائل و برکات جس طرح قرآن اور شریعتِ اسلام میں آئے ہیں، یہ پچھلی کسی اُمت و شریعت میں نہیں ہیں۔ یہ حکم ہمارے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تمام انبیاء میں امتیازِ خاص عطا فرمایا ہے۔

درود شریف کس وقت فرض و واجب ہو جاتا ہے؟

امتِ مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس طرح کلمۂ توحید کا کم از کم ایک مرتبہ زبان سے ادا کرنا فرض ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف بھی فرض ہے۔ اور جس وقت رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام مبارک لیا جائے تو بولنے والے اور سُننے والے ہر شخص پر درود شریف پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔

حدیث :۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"ذلیل و خوار ہو وہ آدمی جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔" (ترمذی وقال حدیث حسن)

حدیث :۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا :

"بخیل وہ شخص ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔" (ترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

اور نماز میں التحیات کے بعد درود شریف پڑھنا سُنّتِ مؤکدہ ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔

وہ خاص اوقات جن میں درود شریف مُستحب ہے

جب انسان کسی مجلس میں بیٹھے تو درود شریف پڑھنا چاہیئے (حصن حصین) ہر دُعا کے

اوّل و آخر میں بھی درود شریف پڑھنا مستحب اور دُعا کی مقبولیت کے لئے مؤثر ہے۔ (حصن حصین)

- مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت بھی درود شریف مستحب ہے۔
- اذان کے بعد بھی درود شریف پڑھنا چاہیئے۔ (مسلم و ترمذی)
- وضو کے وقت بھی درود شریف پڑھنا مستحب ہے۔
- ہر کتاب اور تحریر کے شروع میں بسم اللہ اور الحمد کے بعد درود شریف سُنت ہے۔
- تہجد کے لئے نیند سے اُٹھنے کے وقت بھی درود شریف سُنت ہے۔
- مصائب اور آفات کے وقت بھی درود شریف مسنون اور سب مشکلات کا حل ہے۔ (زادالسعید)۔

درُود شریف کے الفاظ

اُوپر حدیث گزر چکی ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ جب قرآن میں مسلمانوں کو درود شریف کا حکم دیا گیا تو صحابہ کرامؓ نے خود اپنی رائے سے اس کے کلمات تجویز نہیں کئے، بلکہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کئے اور آپؐ نے مخصوص کلمات کی تلقین فرمائی۔

اس کے علاوہ دوسری احادیث میں کچھ دوسرے الفاظ بھی حضور صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے تعلیم فرمائے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو الفاظ خود رسول اللہ صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے تعلیم فرمائے ہیں اُن کی خاص اہمیت ہے۔ اس لئے بہتر اور افضل یہی ہے کہ خارج نماز بھی جو درود شریف پڑھا جائے اس میں رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم ہی کے بتلائے ہُوئے الفاظ کو اختیار کیا جائے۔ لیکن اپنی طرف سے بھی اگر ان الفاظ کے ساتھ رسول مقبول صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی کچھ صفات وغیرہ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں جیسا کہ سلف صالحین اور اولیاءِ اُمت سے بہت سے کلمات منقول ہیں۔ لیکن اتنی بات بہرحال ثابت ہے کہ رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر درود و سلام کے معاملہ میں خاص احتیاط لازم ہے۔ اپنی طرف سے ایسے طریقے اور ایسے الفاظ اختیار کرنا جو نہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہیں نہ صحابہ کرامؓ سے ایک غلط طریقہ ہے جس میں بسا اوقات نیکی برباد گناہ لازم ہوجاتا ہے۔

فضائل درُود شریف

حدیث ۔ صحیح مسلم وابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا۔ اللہ تعالےٰ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل فرمائیں گے ۔

حدیث ۔ عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درُود بھیجتا ہے اللہ تعالےٰ اُس پر دس مرتبہ دُرود بھیجتا ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے کہ کم بھیجو یا زیادہ ۔ (علامہ سخاوی)

بعض عُلماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص گناہوں میں یا دُنیوی آفتوں میں مُبتلا ہو اور کوئی تدبیر وعلاج کارگر نہ ہو اُس کو چاہیئے کہ درود شریف کا وِرد کثرت سے کرے۔ کیونکہ حدیث مذکور کے وعدہ کے مطابق ایک دُرود پر اللہ تعالےٰ کی دس رحمتیں نازل ہوں گی۔ تو جو شخص کثرت سے درود شریف پڑھے گا اس پر اسی کثرت سے اللہ تعالےٰ کی رحمتیں متوجّہ ہوں گی، ناممکن ہے کہ اتنی رحمتوں کے سایہ میں اس کی مشکلات دُور نہ ہوں۔

حدیث ۔ حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اس کو چاہیئے کہ مجھ پر درود بھیجے۔ اور جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالےٰ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل فرمائے گا اور اُس کے دس گناہ معاف فرمائے گا اور اُس کے دس درجے بلند فرمائے گا۔ (مسند احمد، نسائی، از ترغیب)

حدیث ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجنے والا ہے ۔ (ترمذی، ابن حبان، من القول البدیع للسخاوی)

علامہ سخاویؒ نے ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد

نقل کیا ہے کہ تین آدمی قیامت کے دن اللہ تعالےٰ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے، جس دن اُس کے سایہ کے سوا کسی کا سایہ نہ ہو گا۔ ایک وہ شخص جو کسی مصیبت زدہ کی مصیبت ہٹادے۔ دُوسرے وہ جو میری سُنّت کو زندہ کرے۔ تیسرے وہ جو میرے اُوپر کثرت سے درود بھیجے۔

علامہ سخاویؒ نے "قوت القلوب" سے نقل کیا ہے کہ کثرت کی کم مقدار تین سو مرتبہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا ذکریا صاحب مدظلہ دامت برکاتہم نے اپنی کتاب "فضائل درود شریف" میں نقل کیا ہے کہ حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ بھی اپنے مریدین کو تین سو مرتبہ درود شریف بتایا کرتے تھے۔

علماء نے حدیثِ مذکورہ کی بناء پر فرمایا ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نزدیک تر حضرات محدّثین ہوں گے۔ کیونکہ ان کا دن رات کا شغل ہی حدیثِ رسول بیان کرنا اور لکھنا ہے جس میں بار بار حضورؐ کا نام مبارک آتا ہے اور ہر مرتبہ نامِ مبارک کے ساتھ درود شریف پڑھتے اور لکھتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے "زادالسعید" میں بروایت طبرانی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص مجھ پر درود بھیجے کسی کتاب میں (یعنی لکھے) ہمیشہ فرشتے اس پر درود شریف بھیجتے رہیں گے جب تک میرا نام اس کتاب میں رہے گا۔

حدیث۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو زمین میں پھرتے رہتے ہیں اور میری اُمت کی طرف سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں۔ (نسائی، ابن حبان، احمد، حاکم وقال الحاکم صحیح الاسناد)

حضرت حسن رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو مجھ پر درود پڑھتے رہا کرو۔ بے شک تمہارا درود میرے پاس پہنچتا رہتا ہے اور مَیں اس کے بدلہ میں تم پر درود بھیجتا ہوں اور اس کے علاوہ اس کے لئے دس نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں۔

حدیث۔ علامہ سخاویؒ نے "القول البدیع" میں بروایت شعب الایمان، بیہقی یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر کے پاس آکر مجھ پر درود پڑھتا ہے میں خود اُس کا درود سنتا ہوں اور جو شخص دُور سے مجھ سے دُرود بھیجتا ہے وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ درود بھیجنے والے کا نام مع ولدیت آپؐ کے پاس پہنچایا جاتا ہے کہ فلاں بن فلاں آپؐ پر درود بھیج رہا ہے۔

اور دوسری روایاتِ حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔

ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ کون سی عزت عظمت ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اُس کے سلام کا جواب دیں۔

بعض بزرگوں کے واقعات میں تو یہ بھی منقول ہے کہ اپنے سلام کا جواب اُنہوں نے خود اپنے کانوں سے سُن لیا۔

علاقہ کابل کے ایک مشہور بزرگ بناء پاکستان کی ابتداء میں کراچی تشریف لے آئے تھے۔ مجھ پر بڑا کرم فرماتے تھے۔ انہوں نے ذکر کیا کہ ایک مرتبہ میں مسجد نبویؐ میں معتکف تھا۔ میں نے دیکھا کہ نصف شب کے بعد ایک شخص تکمرونی آئے اور روضۂ اقدس کے سامنے پہنچ کر سلام عرض کیا تو روضۂ اقدس کے اندر سے جوابِ سلام کی آواز آئی جس کو میں نے اپنے کانوں سے سُنا اور ہر رات یہی سلسلہ میں دیکھتا رہا۔

حدیث۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ! میں آپؐ پر کثرت سے درود شریف بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو اس کی مقدار اپنے اوقاتِ دُعا میں سے کتنی مقرر کردوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنا تم چاہو کر سکتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ اوقاتِ دُعا میں سے ایک چوتھائی درود شریف کے لئے مقرر کر لوں تو کیسا ہے؟ فرمایا کہ چوتھائی بھی کافی ہے اور زیادہ کرلو تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ نصف؟ آپؐ

نے فرمایا کہ اختیار ہے۔ مگر زیادہ کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا کہ دو تہائی وقت درود شریف میں صرف کردوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے اور اگر زیادہ کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا۔ تو اب میں اپنی دعا اور وظیفہ کا پورا وقت درود شریف میں صرف کروں گا۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
"اگر تم نے ایسا کرلیا تو اللہ تعالےٰ تمہارے سب کاموں کا کفیل ہوجائے گا اور تمہارے گناہوں کا کفارہ کردیا جائے گا۔" (ترمذی)

حدیث: حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح کو دس مرتبہ اور شام کو دس مرتبہ مجھ پر درود بھیجے گا وہ قیامت کے روز میری شفاعت پائے گا۔

(طبرانی باسناد جید از القول البدیع)

حدیث۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس صدقہ خیرات کرنے کے لئے مال نہ ہو اُس کو چاہیئے کہ اپنی دعا میں یہ درود شریف پڑھا کرے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ وَصَلِّ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ط

ترجمہ:۔ یا اللہ! رحمت بھیجئے اپنے بندے اور رسول محمدؐ پر اور رحمت بھیجئے تمام ایمان والے مردوں اور عورتوں پر اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر۔"

ارشاد فرمایا کہ یہ درود شریف اس کے لئے صدقہ خیرات کے قائم مقام ہوجائے گا۔ (ابن حبان فی صحیحہ از القول البدیع)۔

دُرود شریف کے بعض خواص

سیدی حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب "زاد السعید" میں

درود شریف کی بعض خصوصیات اور دینی و دنیوی مقاصد کے حصول میں اس کی برکات مستند روایات سے نقل فرمائی ہیں۔ جو یہ ہیں :۔

قبولیتِ دُعا

(۱) حضرت علی مرتضےٰ رضؓ فرماتے ہیں کہ تمام دُعائیں رُکی رہتی ہیں جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی آل پر درود نہ پڑھو۔ (معجم، اوسط، طبرانی)

(۲) حضرت فاروق اعظم رضؓ فرماتے ہیں کہ دُعا آسمان و زمین کے درمیان معلق رہتی ہے اوپر نہیں جاتی جب تک اپنے نبی پر دُرود نہ پڑھو۔ (ترمذی)

مال میں برکت و زیادتی

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جس شخص کو یہ منظور ہو کہ میرا مال بڑھ جائے تو اُس کو چاہیئے کہ ان الفاظ کے ساتھ درود پڑھا کرے۔

اللّٰھم صل علٰی محمد عبدک و رسولک وصل علی المؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات ۔

پاؤں سو جانے کا علاج

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے پاس ایک شخص بیٹھا ہُوا تھا اُس کا پاؤں سو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص تجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہو اس کا نام لے لو۔ اُس نے کہا " محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم "۔ اُسی وقت سُن اُتر گئی۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا پاؤں سو گیا۔ اُنہوں نے بھی یہی عمل کیا۔ فوراً اس سُن اُتر گئی۔

(حاشیہ حصن حصین)

بھُولی ہوئی چیز یاد آجانا

ابو موسیٰ مدینی نے بسند ضعیف روایت کیا ہے کہ ارشاد فرمایا رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کہ جب تم کسی چیز کو بھُول جاؤ مجھ پر درود بھیجو، وہ چیز یاد آجائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
(فضائل درود و سلام)

خواب میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی زیارت

درود شریف کی سب سے زیادہ لذیذ اور شیریں تر خاصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی زیارت خواب میں نصیب ہوتی ہے۔ درود شریف کی کثرت سے عموماً یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے اور بعض درودوں کو بالخصوص بزرگوں نے آزمایا ہے۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلوی نے کتاب "ترغیب اہل السعادات" میں لکھا ہے کہ شب جمعہ میں دو رکعت نماز نفل پڑھے اور ہر رکعت میں گیارہ بار آیۃ الکرسی اور گیارہ مرتبہ قل ہو اللہ اور بعد سلام سو بار یہ درود شریف پڑھے۔ انشاء اللہ تعالےٰ تین جمعے نہ گزرنے پاویں گے کہ زیارت نصیب ہوگی۔ وہ درود شریف یہ ہے :-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَسَلِّمْ ۔

نیز شیخ موصوف نے لکھا ہے کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں بعد الحمد کے ۲۵ بار قل ہو اللہ اور بعد سلام ایک ہزار مرتبہ یہ درود شریف پڑھے۔ دولتِ زیارت نصیب ہوگی۔ وہ درود یہ ہے :-

صَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ۔

تنبیہ ضروری مگر اس دولت کے حاصل ہونے کی بڑی شرط قلب کا شوق سے پُر ہونا اور ظاہری و باطنی گناہوں سے بچنا ہے (فضائل درود و سلام)۔

نماز روزے وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنے والے اور حرام و ناجائز کے معاملہ میں بے پرواہی کرنے والوں کو صرف الفاظ پڑھنے سے یہ دولت حاصل نہیں ہو گی۔ الا ماشاء اللہ

عالمِ بیداری میں زیارت

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے چند بزرگوں کی حکایات لکھی ہیں کہ اُن کو بارہا رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت بیداری میں کھلی آنکھوں ہوئی ہے۔ شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو زیارت بیداری میں ۳۵ مرتبہ یہ دولتِ عظمیٰ نصیب ہوئی ہے۔ ان بزرگوں سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے بتلایا کہ درود شریف کی کثرت اس کا سبب ہے۔ (انتہیٰ)

مگر یہ ظاہر ہے کہ اس مقام بلند تک پہنچنے کے لئے بڑا زبانی جمع خرچ کافی نہیں۔ دل میں رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پوری محبت اور زیارت کا شوق ہونا اور ظاہری و باطنی گناہوں سے بچنا ضروری ہے، جیسا کہ ان حضرات کا حال تھا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے فضل سے بطفیل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نصیب فرمائیں۔ (آمین)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

برکت اسمِ محمد ﷺ

اس وقت کتاب کا حوالہ یاد نہیں، مگر متقدمین علماء میں سے کسی نے لکھا ہے اور میرا تجربہ ہے کہ جب بچہ پیٹ میں ہو اس وقت اس کا نام "محمد" رکھ دیا جائے تو وہ بچہ لڑکا ہو گا۔

۱۲ نعمانی

صلوٰۃ وسلام کا مروّجہ طریقہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ :

(الف) بعض مساجد میں کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جمعہ کی نماز یا دوسری نمازوں کے بعد التزام کے ساتھ جماعت بنا کر اور کھڑے ہو کر باآواز بلند بالفاظ ذیل سلام پڑھتے ہیں : یَا رَسُوْل سَلَامٌ عَلَیْكَ یَا نَبِیْ سَلَامٌ عَلَیْكَ

ان میں بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں یا ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اس لئے یہ سلام خود سُنتے اور جواب دیتے ہیں۔ جو لوگ ان کے اس عمل میں شریک نہیں ہوتے اُن کو مطعون کرتے اور طرح طرح سے بدنام کرتے ہیں، جس کے نتیجہ میں عموماً مسجدوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس طرح کا سلام پڑھنا مسجدوں میں جائز ہے؟ اور متولیانِ مساجد کو اُس کی اجازت دینا چاہیئے یا نہیں ؟

(ب) جہاں مذکورہ طریقہ پر صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے وہاں :-

(۱) رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس محفل میں تشریف لاتے ہیں یا

(۲) بغیر تشریف لائے ہُوئے سلام کو خود سُنتے ہیں۔ یا

(۳) اس طرح کے صلوٰۃ وسلام کو فرشتے آپؐ تک پہنچا دیتے ہیں۔

ان میں سے کون سی بات صحیح ہے۔

(ج) طریقہ مندرجہ بالا پر صلوٰۃ وسلام پڑھنا قیام کے بغیر کیسا ہے؟ اور قیام کے ساتھ ہو تو اس کا کیا حکم ہے ؟

(د) اندرون مسجد یہ صلوٰۃ وسلام کیا حکم رکھتا ہے؟ اور مسجد کے باہر

اس کا کیا حکم ہے ؟

جواب باصواب تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں ۔ والسلام

⁂

۷۸۶

الجواب

سوالات کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام میں تمام عبادات نماز، روزہ ذکر اللہ، تلاوتِ قرآن وغیرہ سب کے لئے کچھ آداب و شرائط اور حدود و قیود ہیں جن کی رعایت کے ساتھ یہ عبادات ادا کی جائیں تو بہت بڑا ثواب اور فلاح دُنیا و آخرت ہے اور اُن حدود و قیود سے ہٹ کر کوئی دوسری صُورت اختیار کی جائے تو ثواب کے بجائے عذاب اور گُناہ ہے ۔

نماز تمام عبادات میں افضل ہے لیکن طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنا حرام ہے مقررکردہ رکعات میں کوئی رکعت زائد کر دے تو حرام ہے ۔ جماعت کی نماز سُنت موکدہ ہے اور اس سے نماز کے ثواب میں ستائیس گُنا اضافہ ہوتا ہے لیکن کوئی نفل نماز کی جماعت کرنے لگے تو ممنوع اور گناہ ہے ۔

روزہ کتنی بڑی عظیم عبادت ہے اور اس کا ثواب کتنا بڑا ہے مگر عیدین اور ایام نحرمیں روزہ رکھنا حرام ہے ۔ قرآن مجید کی تلاوت بہترین عبادت ہے ۔ لیکن رکوع وسجدہ کی حالت میں تلاوت ممنوع ہے اور ایسے مقامات پر جہاں لوگ سُننے کی طرف متوجہ نہ ہوں بلند آواز سے تلاوت ناجائز ہے ۔

اسی طرح آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر درود و سلام افضل عبادات و موجبِ برکات اور سعادت دُنیا و آخرت ہے ۔ مگر دوسری سب عبادات کی طرح اس کے بھی آداب و شرائط ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے سے ثواب کے بجائے گُناہ لازم آتا ہے ۔

الف ۔ جس ہئیت سے مساجد میں بطرزِ مذکورہ اجتماع اور التزام کے ساتھ درود وسلام کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے اس کو درود وسلام کی نمائش تو کہا جا سکتا ہے درود وسلام کہنا اُس کو صحیح نہیں ۔ کیونکہ وہ بہت سے مفاسد کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے ۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسجد پوری مُسلمان قوم کی مشترک عبادت گاہ ہے اُس میں کسی فرد یا جماعت کو فرائض واجبات کے علاوہ کسی ایسے عمل کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی جو دوسرے لوگوں کی انفرادی عبادت نماز، تسبیح، درود، تلاوتِ قرآن وغیرہ میں خلل انداز ہو ۔ اگرچہ وہ عمل سب کے نزدیک بالکل جائز اور مستحسن ہی کیوں نہ ہو ۔ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ مسجد میں بآواز بلند تلاوتِ قرآن یا ذکر جہری جس سے دوسرے لوگوں کی نماز یا تسبیح یا تلاوت میں خلل آتا ہو ناجائز ہے (شامی) خلاصۃ الفتاوی) ظاہر ہے کہ جب قرآن اور ذکر اللہ کو بآواز بلند مسجد میں پڑھنے کی اجازت نہیں تو درود وسلام کے لئے کیسے اجازت ہو سکتی ہے ۔

(۲) کسی نماز کے بعد اجتماع والتزام کے ساتھ بلند آواز سے درود وسلام پڑھنا نہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے نہ صحابہ وتابعین سے اور نہ ائمہ مجتہدین اور علماءِ سلف میں کسی سے ۔ اگر یہ عمل اللہ اور رسولؐ کے نزدیک محمود ومستحسن ہوتا تو صحابہ وتابعین اور ائمہ دین اس کو پوری پابندی کے ساتھ کرتے ۔ حالانکہ ان کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا منقول نہیں ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ درود وسلام کے لئے ایسے اجتماع اور التزام کو یہ حضرات بدعت وناجائز سمجھتے تھے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ارشاد صحیح بخاری ومسلم میں بروایت صدیقہ عائشہؓ منقول ہے :۔

"من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد ۔"

یعنی جس شخص نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں داخل نہ تھی تو وہ مردود ہے" اور صحیح مسلم میں بروایت حضرت جابرؓ وارد ہے :۔ وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ ۔ یعنی بدترین عمل وہ نئی چیزیں ہیں جو خود ایجاد کی جائیں اور ہر

نو ایجاد عبادت گمراہی ہے۔ عبادت کے نام پر دین میں کسی نئی چیز کا اضافہ تعلیمات رسولؐ کو ناقص قرار دینے کا مرادف اور بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریف دین کا راستہ ہے۔ اسی لئے حضرت صحابہ و تابعین نے اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا:

کل عبادۃ لم یتعبد ھا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فلا تعبدوھا (الے) وخذوا الطریق من کان قبلکم ....

"یعنی جس طرح کی عبادت صحابہ کرام نے نہیں کی تھی تم بھی اس کو عبادت نہ سمجھو بلکہ اپنے اسلاف صحابہ کا طریق اختیار کرو۔ (کتاب الاعتصام للشاطبی ص۳۱۱ ج ۲)۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

اتبعوا آثارنا ولا تبتدعوا فقد کفیتم۔

یعنی تم لوگ (صحابۂ کرامؓ کے) آثار کا اتباع کرو اور نئی نئی عبادتیں نہ گھڑو کیونکہ تم سے پہلے عبادات کا تعین ہو چکا ہے۔

البحر الرائق میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے سنا کہ فلاں مسجد میں کچھ لوگ جمع ہوتے اور ذکر لا الٰہ الا اللہ اور درود شریف بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ یہ سن کر اس مسجد میں خود پہنچے اور ان لوگوں سے فرمایا۔

ما عھدنا ذالک فی عھدہ صلی اللہ علیہ وسلم وما اراکم الا مبتدعین۔

یعنی ہم نے یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں پایا میں تو تم کو اس عمل کی وجہ سے بدعتی سمجھتا ہوں۔

تنبیہ | یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سب کلام انفرادی درود و سلام کے بارے میں نہیں۔ کیونکہ انفرادی طور پر درود کی کثرت کے فضائل حدیث و قرآن میں مذکور اور صحابہ و تابعین کا معمول ہے۔ نہ اس کے لئے کوئی وقت مقرر ہے نہ تعداد، جتنا کسی سے ہوسکے اختیار کرے اور سعادت دارین حاصل کرے۔ کلام صرف اس کی مروجہ اجتماعی صورت میں ہے۔

اسلام میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں مگر اُس کی بھی نفلوں کی جماعت کو باتفاق فقہاء و ائمہ مکروہ کہا گیا ہے تو کسی دوسری چیز کی جماعت بنا کر دوام و التزام سے کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، خصوصًا جب کہ کرنے والوں کو اُس پر ایسا اصرار ہو جیسے فرض و واجب پر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہاں تک کہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوں اُن پر طعن و تشنیع کی جائے جو کسی حال میں جائز نہیں۔ کیونکہ اگر بالفرض یہ عمل بدعت بھی نہ ہوتا تب بھی زیادہ سے زیادہ ایک نفلی عمل ہوتا جس پر فرض و واجب کی طرح اصرار کرنے اور دوسروں کو مجبور کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

جس کام پر اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے کسی کو مجبور نہیں کیا کسی دوسرے کو اس پر مجبور کرنے کا کیا حق ہے اور نہ کرنے کی صورت میں اُس پر طعن و تشنیع کرنا ایک مستقل کبیرہ گناہ ہے جس میں یہ حضرات ناواقفیت سے مُبتلا ہوتے ہیں اور غور نہیں کرتے کہ خود ان کے نزدیک بھی یہ عمل زیادہ سے زیادہ مستحب اور نفل ہے۔ ایک نفل کی خاطر کبیرہ گناہ میں مُبتلا ہونا کون سی دانشمندی ہے۔

(۳) خطاب کے الفاظ یا رسول یا نبی اگر اس عقیدہ سے ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر زمان و مکان میں موجود اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، کائنات کی ہر آواز کو سُنتا اور حرکت کو دیکھتا ہے۔ اسی طرح (معاذ اللہ) رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم بھی ان خدائی صفات میں شریک ہیں تو کُھلا ہُوا شرک اور نصاریٰ کی طرح رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے اور اگر یہ عقیدہ ہو کہ رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اس مجلس میں تشریف لاتے ہیں تو گو بصورت مُعجزہ ایسا ہونا ممکن ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن یا حدیث سے اس کا ثبوت ہو۔ حالانکہ کسی آیت یا حدیث میں قطعًا اس کا کوئی ذکر نہیں اور بغیر ثبوت و دلیل کے اپنی طرف سے کوئی معجزہ گھڑ لینا رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم پر افتراء ہے جس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا ہے :-

من كذب علىّ متعمدًا فليتبوء مقعده من النار -

یعنی جو شخص میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے اُس کو چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ

جہنم میں سمجھ لے۔ اور اگر اس طرح کوئی بھی غلط عقیدہ نہ ہو تب بھی موہم الفاظ ہیں جن میں اس عقیدۂ فاسدہ کو راہ ملتی ہے اس لئے بھی ان سے اجتناب ضروری ہے۔ جیسا کہ صحیح مُسلم کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اپنے غلام کو یا عبدی کہہ کر پکارنے سے اسی لئے منع فرمایا کہ یہ الفاظ خطاب کے ساتھ موہم شرک ہیں۔ البتہ روضۂ اقدس کے سامنے الفاظ خطاب کے ساتھ سلام پڑھنا سُنت سے ثابت اور مستحب ہے۔ کیونکہ وہاں براہِ راست حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا سلام سُننا اور جواب دینا روایتِ حدیث سے ثابت ہے۔

الغرض روضۂ اقدس کے علاوہ دوسرے مقامات میں اگر ان الفاظ خطاب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ ہے تو کھلا ہُوا شرک ہے اور مجلس میں تشریف لانے کا عقیدہ ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر افتراء اور بہتان ہے اور اگر دونوں میں سے کوئی غلط عقیدہ نہیں تو بھی موہم شرک ہونے کی وجہ سے ایسے الفاظ ممنوع ہیں پھر اس ناجائز عمل پر اصرار کرنا دُوسرا گناہ ہے اور فرض و واجب کی طرح اس کو ضروری سمجھنا تیسرا گناہ ہے اور اُس میں شریک نہ ہونے والے بے گناہ مُسلمانوں کو بُرا بھلا کہنا اور مطعون کرنا چوتھا گناہ ہے اور مساجد میں بآواز بلند کہہ کر دوسرے مشغول لوگوں کے شغل میں خلل انداز ہونا پانچواں گناہ ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:۔

ما یفعل عقیب الصلوٰۃ مکروھۃ لان الجھال یعتقدونہ سنۃ او واجبۃ۔

یعنی جو لوگ نماز کے بعد ذکر یا درود و سلام وغیرہ بآواز بلند کرتے ہیں یہ مکروہ ہے۔ کیونکہ ناواقف لوگ اس کو سُنت یا واجب سمجھتے ہیں۔

افسوس ہے کہ بہت سے نیک دل مسلمان قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سے ناواقف ہونے کے سبب اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی محبت و عظمت کا نشان سمجھ کر اس میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ محبت و عظمت

بلاشبہ قابلِ قدر و مبارک باد ہے۔ مگر اس کا بے جا استعمال ایسا ہی ہے جیسے کوئی اللہ تعالےٰ کی محبت میں مغرب کی نماز تین کے بجائے چار رکعت پڑھے اور اپنے دل میں یہ حساب لگائے کہ ایک رکعت زیادہ پڑھی ہے تو مجھے ثواب اوروں سے زیادہ ملیگا، حالانکہ وہ کم بخت اپنی تین رکعتوں کا ثواب بھی کھو بیٹھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتماع اور التزام کے ساتھ کھڑے ہوکر باآواز بلند مسجدوں میں درود وسلام پڑھنے کا مروجہ طریقہ سراسر خلافِ شرع اور باہم نزاع و جدال اور مسجدوں کو اختلافات کا مرکز بنانے کا سبب ہے اس لئے متولیانِ مسجد اور اربابِ حکومت پر لازم ہے کہ مسجدوں میں اس کی ہرگز اجازت نہ دیں۔ اگر کسی کو کرنا ہے تو اپنے گھر میں کرے تاکہ کم از کم مسجدیں تو شور و شغب اور نزاع و جدال سے محفوظ رہیں۔

(ب) سوال الف کے جواب میں واضح ہو چکا ہے کہ اس مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا کسی دلیلِ شرعی سے ثابت نہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بہتان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا فیصلہ خود ایک حدیث میں اس طرح فرمایا ہے:۔ من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا ابلغتہ۔ (مشکوٰۃ از بیہقی)۔

یعنی جو شخص میری قبر کے پاس درود وسلام پڑھتا ہے اُس کو مَیں خود سُنتا ہوں اور جو درود وسلام دُور سے بھیجتا ہے وہ (فرشتوں کے ذریعے) مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

(ج) جس طرح "ذکر اللہ" اور "تلاوتِ قرآن" کھڑے ہوکر بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر بھی ہر طرح جائز ہے۔ اسی طرح درود شریف بھی ہر طرح جائز ہے۔ ہاں اگر کوئی کھڑے ہوکر پڑھنے کو ضروری اور اُس کے خلاف کو بے ادبی سمجھے تو یہ ایک غیر واجب کو اپنی طرف سے واجب قرار دینے کی وجہ سے ناجائز ہے خصوصاً جبکہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے درود شریف کو بیٹھ کر پڑھنے کی سُنّت جاری فرمائی ہے تو بیٹھ کر درود وسلام پڑھنے کو خلافِ ادب کہنا اس حکمِ ربّانی اور تعلیمِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مخالفت ہے۔ جیسے کوئی یہ کہے کہ قرآن کو صرف کھڑے ہوکر پڑھنا چاہیئے بیٹھ کر پڑھنا بے ادبی ہے۔

(د) جواب الف میں واضح ہو چکا ہے کہ بطرز مذکور سلام پڑھنے کے لئے اجتماع والتزام تو بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے جو مسجد میں بھی ناجائز ہے اور مسجد سے باہر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسجد میں اگر کوئی بیٹھ کر مسنون درود و سلام کے الفاظ کو بھی بآواز بلند اس طرح پڑھے جس سے دوسرے حاضرینِ مسجد کے شغل میں خلل آتا ہو تو وہ بھی ناجائز ہے اور مسجد سے باہر اس کی گنجائش ہے۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ہمدردانہ مشورہ

ہر شخص کو اپنی قبر میں سونا اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ ان معاملات میں جتھہ بندی اور قدیم آبائی رسوم پر ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھنا چاہیئے اور یہ غور کرنا چاہیئے کہ دُنیا کے تو تمام معاملات میں ہمارے جھگڑے چلتے ہی رہتے ہیں، کم از کم اللہ تعالےٰ کے گھر اور عبادتِ نماز ہی کو ہر طرح کے جھگڑے فساد سے محفوظ رکھا جائے۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

نصیحت عارف باللہ حضرت اقدس حاجی محمد شریف صاحب قدس اللہ سرہٗ نواں شہر ملتان

چلتے پھرتے یہ کہہ لیا کریں :-

"اے نفس! دُنیا فانی ایک ایک سانس بے بہا گوہر، فرصت کو غنیمت جان اور ابدی سعادت کا سامان کر لے، ورنہ انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں"

بعثتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تین مقاصد

سُورۃ البقرہ کی آیت ۱۲۹ میں اور سُورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ کی آیت ۲ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق ایک ہی مضمون ایک ہی طرح کے الفاظ میں آیا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس دُنیا میں تشریف لانے کے مقاصد یا آپؐ کے عہدۂ نبوت و رسالت کے فرائض منصبی تین بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تلاوت آیات، دوسرے تعلیم کتاب و حکمت، تیسرے لوگوں کا تزکیۂ اخلاق وغیرہ۔

لہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت یہ ہے :-

(۱) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (البقرہ آیت ۱۲۹)

(۲) لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

(آلِ عمران آیت ۱۶۴)

(۳) هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

(الجمعہ آیت ۲)

پہلا مقصد تلاوت آیات

یہاں پہلی بات قابلِ غور ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے۔ یہاں تلاوت وتعلیم کو الگ الگ بیان کرنے سے یہ حاصل ہُوا کہ قرآن کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اس کے الفاظ بھی مستقل مقصود ہیں۔ ان کی تلاوت وحفاظت فرض اور اہم عبادت ہے اور یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے بلاواسطہ شاگرد اور مخاطب خاص وہ حضرات تھے جو عربی زبان کے نہ صرف جاننے والے بلکہ اس کے فصیح وبلیغ خطیب اور شاعر تھے۔ ان کے سامنے قرآن عربی کا پڑھ دینا بھی بظاہر ان کی تعلیم کے لئے کافی تھا ان کو الگ سے ترجمہ وتفسیر کی ضرورت نہ تھی تو پھر تلاوتِ آیات کو ایک علیحدہ مقصد اور تعلیم کتاب کو جُدا گانہ دوسرا مقصدِ رسالت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ عمل کے اعتبار سے یہ دونوں مقصد ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اس میں غور کیا جائے تو دو اہم نتیجے آپ کے سامنے آئیں گے۔

اوّل یہ کہ قرآن حکیم دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب نہیں جس میں صرف معانی مقصود ہوتے ہیں۔ الفاظ ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اگر معمولی تغیّر اور تبدّل بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے الفاظ بغیر معنی سمجھے ہُوئے پڑھتے رہنا بالکل لغو وفضول ہے بلکہ جس طرح قرآن کریم کے معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں اور الفاظ قرآن کے ساتھ خاص خاص احکامِ شرعیہ بھی متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصولِ فقہ میں قرآن کریم کی یہ تعریف کی گئی ہے ھو النظم والمعنی جمیعا۔ یعنی قرآن نام ہے الفاظ اور معنی دونوں کا۔ جس سے معلوم ہُوا کہ اگر معانی قرآن کو الفاظ قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ یا دوسری زبان میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔ اگرچہ مضامین بالکل صحیح ودرست ہی ہوں۔ ان مضامینِ قرآن کو بدلے ہُوئے الفاظ پر مرتب نہیں ہوگا اور اسی لئے فقہائے اُمّت نے قرآن کریم کا صرف ترجمہ بلامتن قرآن کے لکھنے اور چھاپنے کو ممنوع فرمایا ہے جس کو عُرف

میں اُردو کا قرآن یا انگریزی کا قرآن کہہ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت جو قرآن اُردو یا انگریزی میں نقل کیا گیا وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب سے علیحدہ تلاوتِ آیات کو جُدا گانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ قرآن کریم میں جس طرح اس کے معانی مقصود ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں کیونکہ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے معانی کی نہیں۔ اسی لئے جس طرح رسول کے فرائض میں معانی کی تعلیم داخل ہے۔ اسی طرح الفاظ کی تلاوت اور حفاظت بھی ایک مستقل فرض ہے اس میں شُبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد اس کے بتائے ہُوئے نظامِ زندگی پر عمل کرنا اور اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ محض اس کے الفاظ رٹ لینے پر قناعت کر کے بیٹھ جانا قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری اور اس کی بے قدری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ جب تک قرآن کریم کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے، طوطے کی طرح اس کے الفاظ پڑھنا فضول ہے۔

یہ مَیں اس لئے واضح کر رہا ہوں کہ آج کل بہت سے حضرات قرآن کریم کو دوسری کتابوں پر قیاس کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کسی کتاب کے معنی نہ سمجھیں اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر قرآن کریم میں ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن الفاظ اور معانی دونوں کا نام ہے۔ جس طرح ان کے معانی کا سمجھنا اور ان کے دیئے ہُوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلیٰ عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت اور ثوابِ عظیم ہے۔

دوسرا مقصد تعلیم کتاب

یہی وجہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جو معانی قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے اور سمجھنے والے تھے انہوں نے محض معنی سمجھ لینے اور عمل کر لینے کو کافی نہ سمجھا، سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے تو ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی

ہوتا۔ انہوں نے ساری عمر تلاوتِ قرآن مجید کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ بعض صحابہ کرامؓ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے۔ بعض دو دن میں اور اکثر حضرات تین دفعہ دن میں ختم قرآن کریم کے عادی تھے اور ہر ہفتہ میں قرآن ختم کرنے کا پوری امت کا معمول رہا ہے۔ قرآن کریم کی سات منزلیں اسی ہفتہ واری معمول کی علامت ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ عمل بتلا رہا ہے کہ جس طرح قرآن کے معانی کا سمجھنا اور عمل کرنا اصلی عبادت ہے اسی طرح اُس کے الفاظ کی تلاوت بھی بجائے خود ایک اعلیٰ عبادت اور موجب انوار و برکات اور سرمایہ سعادت و نجات ہے۔ اس لئے رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل حیثیت دی گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان فی الحال معانی قرآن کو نہیں سمجھتے وہ اس بدنصیبی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ الفاظ کو فضول سمجھ کر اس سے بھی محروم ہو جائیں۔ کوشش کرتے رہنا ضروری ہے کہ وہ قرآن کے معانی کو سمجھیں تاکہ قرآن کریم کے حقیقی انوار و برکات کا مشاہدہ کریں اور نزولِ قرآن کا اصلی مقصد پورا ہو۔ قرآن کو (معاذ اللہ) جنتر منتر کی طرح صرف جھاڑ پھونک میں استعمال کی چیز نہ بنائیں اور بقول اقبال مرحوم سورۂ یٰسین کو صرف اس کام کے لئے نہ سمجھیں کہ اس کے پڑھنے سے مرنے والے کی جان سہولت سے نکل جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں فرائض رسول بیان کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو مستقل فرض کی حیثیت دے کر اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کی تلاوت اور اُن کی حفاظت اور ان کو ٹھیک اس لب و لہجہ میں پڑھنا جس پر وہ نازل ہوئے ہیں ایک مستقل فرض ہے۔ اسی طرح تلاوتِ آیات کے فرض کے ساتھ تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دینے سے ایک دوسرا اہم نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فہمی کے لئے صرف عربی زبان کا جان لینا کافی نہیں بلکہ تعلیم رسولؐ کی ضرورت ہے۔ جیسے کہ تمام علوم و فنون میں یہ بات معلوم و مشاہد ہے کہ کسی فن کی کتاب کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا زبان جاننا بلکہ زبان کا ماہر ہونا بھی کافی نہیں جب تک

کہ اس فن کو کسی ماہر اُستاد سے حاصل نہ کیا جائے۔ مثلاً آج کل ڈاکٹری، ہومیوپیتھک اور ایلوپیتھک کی کتابیں عموماً انگریزی زبان میں ہیں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ محض انگریزی زبان میں مہارت پیدا کر لینے اور ڈاکٹری کی کتابوں کا مطالعہ کر لینے سے کوئی شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا۔ انجینیرنگ کی کتابیں پڑھنے سے کوئی انجینیر نہیں بن سکتا۔ بڑے فنون تو اپنی جگہ پر ہیں معمولی روزمرہ کے کام محض کتاب کے مطالعہ سے بغیر اُستاد سے سیکھے ہوئے حاصل نہیں ہو سکتے۔

آج تو ہر صنعت و حرفت پر سینکڑوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں، فوٹو دے کر کام سکھانے کے طریقے بتائے ہیں۔ لیکن ان کتابوں کو دیکھ کر نہ تو کوئی درزی بنتا ہے نہ باورچی یا لوہار۔ اگر محض زبان جان لینا کسی فن کے حاصل کرنے اور اس کی کتاب سمجھنے کے لئے کافی ہوتا تو دُنیا کے سب فنون اس شخص کو حاصل ہو جاتے جو اِن کتابوں کی زبان کو جانتا ہے۔ اب ہر شخص غور کر سکتا ہے کہ معمولی فنون اور اُن کے سمجھنے کے لئے جب محض زبان دانی کافی نہیں، تعلیمِ اُستاد کی ضرورت ہے تو مضامینِ قرآن جو علومِ الٰہیہ سے لے کر طبعیات و فلسفہ تک گہرے دقیق علوم پر مشتمل ہے وہ محض عربی زبان جان لینے سے کیسے حاصل ہو سکتے ہیں؟ اور اگر یہی ہوتا تو جو شخص عربی زبان سیکھ لے وہ معارف القرآن کا ماہر سمجھا جائے تو آج بھی ہزاروں یہودی اور نصرانی عرب ممالک میں عربی زبان کے بڑے ماہر ادیب ہیں وہ سب سے بڑے مفسرِ قرآن مانے جاتے اور عہدِ رسالت میں ابوجہل و ابولہب قرآن کے ماہر سمجھے جاتے۔

غرض یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک طرف تو رسول کے فرائض میں تلاوتِ آیات کو ایک مستقل فرض قرار دیا۔ دوسری طرف تعلیم کتاب کو جداگانہ فرض قرار دے کر بتلا دیا کہ محض تلاوتِ آیات کا سُن لینا فہمِ قرآن کے لئے عربی زبان جاننے والوں کے لئے کافی نہیں بلکہ تعلیمِ رسول ہی کے ذریعے قرآنی تعلیم کا صحیح علم ہو سکتا ہے۔ قرآن کو تعلیماتِ رسولؐ سے جُدا کر کے خود سمجھنے کی فکر خود فریبی کے سِوا کچھ نہیں۔ اگر مضامین قرآنی کو بتلانے سکھلانے کی ضرورت نہ ہوتی تو رسول کو بھیجنے ہی کی کوئی حاجت نہ

تھی۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کسی دوسری طرح بھی انسانوں تک پہنچائی جا سکتی تھی مگر اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مضامینِ قرآنی کی تعلیم و تفہیم کے لئے دُنیا کے دُوسرے علوم و فنون سے زیادہ تعلیم اُستاد کی ضرورت ہے اور یہاں پر عام اُستاد بھی کافی نہیں، بلکہ ان مضامین کا اُستاد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ سے بذریعہ وحی شرفِ ہم کلامی حاصل ہو جس کو اسلام کی اصطلاح میں نبی و رسول کہا جاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دُنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ قرار دیا کہ وہ قرآن کے معانی و احکام کی شرح کر کے بیان فرمائیں۔ ارشادِ حق تعالیٰ ہے :۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔

"یعنی ہم نے آپؐ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپؐ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات کے مطالب بیان فرمائیں۔"

تعلیم کتاب کے ساتھ آپؐ کے فرائض میں دوسری چیز تعلیم حکمت بھی رکھی گئی ہے اور مَیں نے اُوپر بتلایا ہے کہ حکمت کے عربی زبان کے اعتبار سے اگرچہ کئی معنی ہو سکتے ہیں لیکن اس آیت میں اور اس کے ہم معنی دوسری آیات میں صحابہ و تابعین نے حکمت کی تفسیر سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کی ہے جس سے واضح ہُوا کہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذمّہ جس طرح معانی قرآن کا سمجھانا بتلانا فرض ہے اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے اصول و آداب جن کا نام سُنّت ہے اُن کی تعلیم بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں داخل ہے اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا ۔ "مَیں تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں"

اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپؐ کا مقصد وجود معلّم ہونا ہے تو آپؐ کی اُمّت کا مقصد وجود متعلّم اور طالب علم ہونا لازم ہو گیا۔ اس لئے ہر مسلمان مرد و عورت بحیثیت مُسلمان ہونے کے ایک طالب علم ہونا چاہیئے جس کو تعلیمات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن ہو۔ اگر علوم قرآن و سنّت کی مکمل تحصیل اور اس میں مہارت کے لئے ہمت و فرصت نہیں تو کم از کم بقدرِ ضرورت علم حاصل کرنے کی فکر چاہیئے۔

تیسرا مقصد تزکیہ

تیسرا مقصد آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں تزکیہ ہے جس کے معنی ہیں ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا۔ ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں۔ باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقاد فاسد نیز تکبر و حسد، بغض حب دنیا وغیرہ ہیں۔ اگرچہ علمی طور پر قرآن و سنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے۔ لیکن تزکیہ کو آپؐ کا جدا گانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح نظری و علمی طور پر فن حاصل ہو جانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کر کے عادت نہ ڈالے۔ سلوک و تصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو عملی طور پر بتلایا گیا ہے اُن کی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔

ہدایت و اصلاح کے دو طریقے، کتاب اللہ اور رجال اللہ

اب اس سلسلے کی دو باتیں اور قابل نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ جل شانہٗ نے ابتداء آفرینش سے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے ہمیشہ ہر زمانہ میں خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تک دو سلسلے جاری رکھے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کی اس عادت اور قرآن کریم کی شہادت نے قوموں کی صلاح و فلاح کے لئے ان دونوں سلسلوں کو یکساں طور پر جاری فرما کر ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا کہ انسان کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف کتاب کافی ہے نہ کوئی مربی انسان۔ بلکہ ایک طرف آسمانی ہدایات سے روشناس کر کے انکا خوگر بنائے کیونکہ انسان کا اصلی معلم انسان ہی ہو سکتا ہے، کتاب معلم یا مربی نہیں ہو سکتی۔ ہاں تعلیم و تربیت میں مددگار و معین ضرور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتداء ایک کتاب اور ایک رسول سے ہوئی

اوران دونوں کے امتزاج نے ایک صحیح اور اعلیٰ مثالی معاشرہ دُنیا میں پیدا کر دیا۔ اسی طرح آگے آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایک طرف شریعت مطہرہ اور دوسری طرف رجال اللہ کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ اس کی ہدایتیں دی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہُوا۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ ط

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو"

دوسری جگہ صادقین کی تعریف اور اوصاف بیان کر کے فرمایا:۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ط

"اور یہی لوگ سچے ہیں اور یہی ہیں پرہیزگار"

پُورے قرآن کا خلاصہ سورہ فاتحہ ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ صراط مستقیم کی ہدایت ہے۔ یہاں بھی صراط مستقیم کا پتہ دینے کے لئے بجائے اس کے کہ صراط القرآن یا صراط الرسول یا صراط السنّت فرمایا جاتا، کچھ اللہ والے لوگوں کا پتہ دیا گیا کہ ان سے صراط مستقیم حاصل کی جائے۔ ارشاد ہُوا۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

یعنی صراط مستقیم اُن لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ تعالےٰ کا انعام ہُوا ہے نہ کہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہُوئے ہیں"

دُوسری جگہ اُن کی مزید تعیین اور توضیح قرآن میں وارد ہوئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۔

اسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اپنے بعد کے لئے کچھ حضرات کے نام متعین کر کے دینی معاملات میں آپؐ کا اتباع کرنے کی ہدایت فرمائی۔

ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے :-

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنْ اَخَذْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ ۔

"اے لوگو! میں تمہارے لئے اپنے بعد میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہنا تو تم گمراہ نہ ہوگے۔ ایک کتاب اللہ، دوسری میری اولاد، اور اہلِ بیت"

اور صحیح بخاری کی حدیث میں ہے :-

اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ ۔

"یعنی میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کا اتباع کرو"

اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :-

عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ ۔

"میرے طریقہ کو اختیار کرو اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی ان ہدایات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ قوموں کی اصلاح و تربیت کے لئے ہر قرن اور ہر زمانے میں دو چیزیں ضروری ہیں۔ قرآنی ہدایات اور اُن کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا طریقہ حاصل کرنے کے لئے ماہرین شریعت اور اللہ والوں کی تعلیم و تربیت اور اگر مختلف علوم و فنون اور اُن کے سیکھنے سکھانے کے طریقوں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصول تعلیم و تربیت کچھ دین اور دینیات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ تمام علوم و فنون کی صحیح تحصیل اسی پر دائر ہے کہ ایک طرف ہر فن کی بہترین کتابیں ہوں تو دوسری طرف ماہرین کی تعلیم و تربیت، ہر علم و فن کی ترقی و تکمیل کے یہی دو بازو ہیں۔ لیکن دین اور دینیات میں ان دونوں بازوؤں سے فائدہ اُٹھانے میں بہت سے لوگ افراط و تفریط کا غلط روش میں پڑجاتے ہیں جس کا نتیجہ بجائے فائدہ اُٹھانے کے نقصان اور بجائے

اصلاح کے فساد ہوتا ہے۔

بعض لوگ کتاب اللہ کو نظر انداز کر کے صرف علماء و مشائخ ہی کو قبلۂ مقصود بنا لیتے ہیں اور اُن کے متبع شریعت ہونے کی تحقیق نہیں کرتے اور یہ اصلی مرض یہود و نصاریٰ کا ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یعنی ان لوگوں نے اپنے عُلماء و مشائخ کو اللہ تعالےٰ کے سِوا اپنا معبود اور قبلۂ مقصود بنا لیا ؎ ظاہر ہے کہ یہ راستہ شرک اور کُفر کا ہے اور لاکھوں انسان اس راستہ میں برباد ہُوئے اور ہو رہے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ بھی ہیں جو علوم قرآن وحدیث کے حاصل کرنے میں کسی معلّم و مربّی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ تعالےٰ کی کتاب کافی ہے۔ نہ ماہر علماء کی ضرورت نہ تربیت یافتہ مشائخ کی حاجت۔ یہ دوسری گمراہی ہے جس کا نتیجہ دین و ملّت سے نکل کر نفسانی اغراض کا شکار کرنا ہے۔ کیونکہ ماہرین کی امداد و اعانت کے بغیر کسی فن کا صحیح حاصل ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ ایسا کرنے والا یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ غلط فہمی بعض اوقات اس کو دین و ملّت سے باہر نکال دیتی ہے۔

اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ان دو چیزوں کو اپنے اپنے مقامات اور حدود میں رکھ کر اُن سے فائدہ اٹھایا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حکم اصلی صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہ کا ہے اور اطاعت اصل میں اُسی کی ہے اور رسولؐ بھی اس پر عمل کرنے اور کرانے کا ایک ذریعہ ہے۔ رسول کی اطاعت بھی محض اسی نظر سے کی جاتی ہے کہ وہ بعینہٖ اللہ جلّ شانہٗ کی اطاعت ہے۔ ہاں اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے سمجھنے میں اور اُن کے احکام پر عمل کرنے میں جو علمی یا عملی مشکلات سامنے آئیں اس کے لئے ماہرین کے قول و فعل سے امداد لینے کو سرمایہ سعادت و نجات سمجھنا ضروری ہے۔

آیت مذکورہ میں رسول مقبول صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے فرائض منصبی میں تعلیم کتاب

کو داخل فرمانے سے ایک دُوسرا فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ جب قرآن فہمی کے لئے تعلیم رسول ضروری ہے اور اس کے بغیر قرآن پر صحیح عمل ناممکن ہے۔ تو جس طرح قرآن قیامت تک محفوظ ہے اس کا ایک ایک زیر و زبر بھی ضروری ہے۔ ضروری ہے کہ تعلیماتِ رسول بھی مجموعی حیثیت سے قیامت تک باقی اور محفوظ رہیں۔ ورنہ محض الفاظِ قرآن کے محفوظ رہنے سے نزول قرآن کا اصلی مقصد پُورا نہ ہو گا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ تعلیمات رسول صلی اللہ علیہ وسلم وہی ہیں جس کو سُنت یا حدیثِ رسول کہا جاتا ہے۔ اس کی حفاظت کا وعدہ اللہ جل شانہٗ کی طرف سے اگرچہ اس درجہ میں نہیں ہے جس درجہ کی حفاظت قرآن کریم کے لئے موعود ہے :۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔

"ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ الفاظ اور زیر و زبر تک بالکل محفوظ چلے آئے ہیں اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہیں گے۔ سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے الفاظ اگرچہ اس طرح محفوظ نہیں لیکن مجموعی حیثیت سے آپؐ کی تعلیمات کا محفوظ رہنا آیت مذکورہ کی رُو سے لازمی ہے اور بحمد اللہ آج تک وہ محفوظ چلی آتی ہیں۔ جب کسی طرف سے اس میں رخنہ اندازی یا غلط روایات کی آمیزش کی گئی ماہرینِ سُنت نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نکھار کر رکھ دیا اور قیامت تک یہ سلسلہ بھی اسی طرح رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت میں قیامت تک ایسی جماعت اہلِ حق اور اہلِ علم قائم رہے گی جو قرآن و حدیث کو صحیح طور پر محفوظ رکھے گی اور ان میں ڈالے گئے ہر رخنہ کی اصلاح کرتی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب قرآن پر عمل کرنے کے لئے تعلیم رسولؐ ضروری ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پر عمل قیامت تک فرض ہے تو لازم ہے کہ قیامت تک تعلیمات رسولؐ باقی اور محفوظ رہیں۔ اس لئے آیت میں تعلیماتِ رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے قیامت تک باقی اور محفوظ رہنے کی بھی پیشین گوئی موجود ہے جس کو اللہ تعالےٰ

نے صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک علم حدیث کے ماہر علماء اور مستند کتابوں کے ذریعہ محفوظ رکھا ہے اس سے اس دجل والحاح کی حقیقت کھل جاتی ہے جو آج کل لوگوں نے احکام اسلام سے جان بچانے کے لئے یہ بہانہ تراشا ہے کہ موجودہ ذخیرۂ حدیث محفوظ اور قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ذخیرۂ حدیث سے اعتماد اُٹھ جائے تو قرآن پر بھی اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔

آیت مذکورہ میں رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا تیسرا فرض منصبی تزکیہ قرار دیا ہے۔ تزکیہ کے معنی باطنی نجاسات اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ یعنی شرک و کفر اور عقائد فاسدہ سے، نیز بُرے اخلاق، تکبّر، حرص و طمع، بُغض و حسد، حُبِّ مال وجاہ وغیرہ سے پاک کرنا۔

اصلاح انسان کے لئے اخلاقی تربیت بھی ضروری ہے

تزکیہ کو تعلیم سے جُدا کر کے مستقل مقصدِ رسالت اور رسول کا فرض منصبی قرار دینے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعلیم کتنی ہی صحیح ہو، محض تعلیم سے عادتاً اخلاق نہیں ہوتی جب تک کسی تربیت یافتہ مربّی کے زیرِ نظر عملی تربیت حاصل نہ کرے کیونکہ تعلیم کا کام درحقیقت سیدھا اور صحیح راستہ دکھلا دینا ہے مگر ظاہر ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں، جب تک ہمت کر کے قدم نہ اُٹھائے اور راستہ نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہلِ ہمت کی صحبت اور اطاعت کے کچھ نہیں ورنہ سب کچھ جاننے سمجھنے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا، اسی کا نام تزکیہ ہے۔ قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصدِ رسالت میں ایک مستقل

مقصد قرار دے کر تعلیماتِ اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے کہ محض تعلیم اور ظاہری تہذیب تو ہر قوم اور ہر ملت اور ہر سوسائٹی میں اس کو انسانی ضروریات میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے صحیح اور مکمل تعلیم پیش کی جو انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر عائلی پھر قبائلی زندگی اور اس سے آگے بڑھ کر سیاسی و ملکی زندگی پر حاوی اور بہترین نظام کی حامل ہے جس کی نظیر دوسری اقوام و ملل میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے ساتھ تزکیہ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں۔ انہی ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے۔ اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

جو خوش نصیب حضرات رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے زیر تعلیم رہے۔ تعلیم کے ساتھ ان کا باطنی تزکیہ بھی ہوتا گیا اور جو جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین آپؐ کی زیر تربیت تیار ہوئی۔ ایک طرف اُن کی عقل و دانش اور علم و حکمت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ساری دُنیا کے فلسفے اس کے سامنے گرد ہو گئے تو دوسری طرف اُن کے تزکیہ باطنی اور تعلق مع اللہ اور اعتماد علی اللہ کا یہ درجہ تھا جو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا :-

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؕ

"اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحمدل ہیں۔ تم انہیں رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھو گے۔ وہ اللہ تعالےٰ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف چلتے تھے، فتح و نصرت اُن کے قدم لیتی تھی، تائید ربانی اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ ان کے محیر العقول کارنامے جو آج بھی ہر قوم و ملت کے ذہنوں

کو مرعوب کئے ہوئے ہیں۔ وہ اسی تعلیم و تزکیہ کے اعلیٰ نتائج ہیں۔

آج دنیا میں تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تبدیلی و ترمیم پر تو سب لوگ غور کرتے ہیں۔ لیکن تعلیم کی روح کو درست کرنے کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی کہ مدرس اور معلم کی اخلاقی حالت اور معلمانہ تربیت کو دیکھا جائے، اس پر زور دیا جائے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہزار کوششوں کے بعد بھی ایسے مکمل انسان پیدا نہیں ہوتے جن کے عمدہ اخلاق دوسروں پر اثر انداز ہوں اور دوسروں کی تربیت کر سکیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اساتذہ جس علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مالک ہوں گے، اُن سے پڑھنے والے طلباء زیادہ سے زیادہ اُنہی جیسے پیدا ہو سکیں گے۔ اس لئے تعلیم کو مفید اور بہتر بنانے کے لئے نصابوں کی تدوین و ترمیم سے زیادہ اس نصاب کے پڑھانے والوں کی علمی و اخلاقی حالات پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔

یہاں تک رسالت و نبوت کے تین مقاصد کا بیان تھا۔ آخر میں مختصر طور پر یہ بھی سُن لیجئے کہ سردارِ دو عالم رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کو جو تین فرائض منصبی سپرد کئے گئے ان کو آپؐ نے کس حد تک پورا فرمایا۔ آپؐ کو اُن کے پورا کرنے میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ اس کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے اس دُنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے پہلے تلاوت آیات کا یہ درجہ ہو گیا تھا کہ تقریباً پورے جزیرۃ العرب میں قرآن کریم پڑھا جا رہا تھا۔ ہزاروں اس کے حافظ تھے۔ سینکڑوں ایسے حضرات تھے جو روزانہ یا تیسرے روز پورا قرآن ختم کرتے تھے۔ تعلیم کتاب و حکمت کا یہ مقام تھا ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانہ چند ملت بشست

دُنیا کے سارے فلسفے قرآن کے سامنے ماند ہو چکے تھے، توریت و انجیل کے تحریف شدہ صحائف افسانہ بن چکے تھے۔ قرآنی اصول کو عزت و شرف کا معیار

مانا جاتا تھا۔ تزکیہ کا یہ عالم تھا کہ ساری بداخلاقیوں کے مرتکب افراد تہذیب اخلاق کے معلم بن گئے۔ بداخلاقیوں کے مریض نہ صرف صحت یاب بلکہ کامیاب معالج اور مسیحا بن گئے جو رہزن تھے رہبر بن گئے۔ غرض بت پرست لوگ ایثار و ہمدردی کے مجسمے بن گئے۔ تند خوئی اور جنگ جوئی کی وجہ سے نرمی اور صلح جوئی نظر آنے لگی۔ چور اور ڈاکو لوگوں کے اموال کے محافظ بن گئے۔

الغرض حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جن مقاصد کے لئے دعا فرمائی اور رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو ان کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تینوں مقصد آپؐ کے عہد مبارک ہی میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے۔ پھر آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے ان مقاصد کو مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک ساری دنیا میں عام کر دیا۔

فصلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین وسلم تسلیماً کثیرا بعدد من صلی وصام وقعد وقام۔ (معارف القرآن ج ۱ ص ۳۳۱ تا ص ۳۴۲)

سورت الجمعہ میں بعثت نبوی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے مقاصد کی ترتیب یوں ہے :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بظاہر ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ تلاوت کے بعد تعلیم کا ذکر کیا جاتا، اس کے بعد تزکیہ کا۔ کیونکہ ان تینوں وظائف کی ترتیب طبعی ہے کہ پہلے تلاوت یعنی تعلیم الفاظ پھر تعلیم معانی اور ان دونوں کے نتیجے میں اعمال و اخلاق کی درستی جو تزکیہ کا مفہوم ہے مگر قرآن کریم میں یہ آیت کئی جگہ آئی ہے۔ اکثر جگہوں میں ترتیب بدل کر تلاوت اور تعلیم کے درمیان تزکیہ کا ذکر فرمایا ہے۔

روح المعانی میں اس کی یہ کیفیت بتلائی ہے کہ اگر ترتیب طبعی کے مطابق رکھا جاتا تو یہ تینوں چیزیں مل کر ایک ہی چیز ہوتی جیسے معالجات کے نسخوں میں کئی دوائیں مل کر مجموعہ ایک ہی دوا کہلاتی ہے۔

اور یہاں بھی اسی حقیقت کو واضح کرنا مطلوب ہے کہ یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل نعمتِ خداوندی ہیں اور تینوں کو الگ الگ فرائضِ رسالت قرار دیا گیا ہے۔ اس ترتیب کے بدلنے سے اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ ص ۴۳۴ تا ص ۴۳۵)

رسولِ کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا وجود باجود

پُوری انسانیّت پر بڑا احسان ہے

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (آلِ عمران)

یعنی رسول اللہ صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو دُنیا میں مبعوث فرماکر حق تعالےٰ نے مؤمنین پر بڑا احسان فرمایا ہے ۔

اس کے متعلق پہلی بات تو یہ قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم رحمت اللعالمین ہیں اور پُورے عالم کے لئے آپؐ کا وجود نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہے ۔ اس جگہ کو صرف مؤمنین کے لئے فرمانا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ فرمانا کہ قرآن کریم کا سارے عالم کے لئے ہدایت ہونا دوسری آیات سے ثابت ہے ۔ مگر بعض جگہ اس کو متقین کے ساتھ مخصوص کرکے بیان فرمایا ۔ اس کی وجہ دونوں جگہ مشترک طور پر ایک ہی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وجود باجود سارے عالم اور ہر مومن و کافر کے لئے نعمتِ کبریٰ اور احسان عظیم ہے ۔ اسی طرح قرآن کریم سارے عالم انسانیت کے لئے صحیفہ ہدایت ہے مگر چونکہ اس نعمت و ہدایت کا نفع صرف مومنین اور متقین نے حاصل کیا اس لئے کسی جگہ اس کو اُن کے ساتھ مخصوص کرکے بھی بیان کر دیا گیا ۔

دوسری بات رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کو مؤمنین کے لئے یا پورے عالم کے لئے نعمت کبریٰ اور احسانِ عظیم ہونے کی توضیح و تشریح ہے ۔

یہ بات ایسی ہے کہ اگر آج کل کا انسان روحانیت فراموش اور مادّیت کا پرستار نہ ہوتا تو یہ مضمون کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں تھا ۔ عقل سے کام لینے والا

ہر انسان اس احسانِ عظیم کی حقیقت سے خود واقف ہوتا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج کا انسان دُنیا کے جانوروں میں ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔ اُس کو احسان و انعام وہ چیز نظر آتی ہے جو اُس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے۔ اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اُس کی روح ہے اس کی خوبی و خرابی سے وہ یکسر غافل ہوگیا ہے۔ اس لئے اس کی تشریح کی ضرورت ہوئی کہ انسان کو پہلے یہ بتلایا جائے کہ اس کی حقیقت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ حقیقت انسان وہ روح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے۔ جب تک یہ روح اُس کے بدن میں ہے اس وقت تک انسان انسان ہے۔ اُس کے حقوقِ انسانیت قائم ہیں خواہ وہ کتنا ہی کمزور وضعیف لبِ دم کیوں نہ ہو کسی کی مجال نہیں کہ اس کی جائداد اور اموال پر قبضہ کر سکے، یا اُس کے حقوق سلب کر سکے۔ لیکن جس وقت یہ روح اُس کے بدن سے الگ ہوگئی تو خواہ وہ کتنا ہی قوی اور پہلوان ہو اور اُس کے اعضاء سب اپنی اصلی ہیئت میں ہوں اُس کا کوئی حق خود اپنی جائداد اور اموال میں باقی نہیں رہا۔

انبیاء کرام علیہم السلام دُنیا میں آتے ہیں اس لئے کہ وہ انسانی روح کی صحیح تربیت کر کے انسان کو حقیقی انسان بنائیں تاکہ اُس کے بدن سے جو اعمال و افعال صادر ہوں وہ انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں۔ وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دوسرے انسانوں کو ایذا اور تکلیف دیتا نہ پھرے اور خود اپنے بھی انجام کو سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے۔

ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو جیسے زمرۂ انبیاء میں امامت و سیادت کا منصب حاصل ہے انسان کو صحیح انسان بنانے میں بھی آپؐ کی شان تمام انبیاء علیہم السّلام سے ممتاز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنی مکّی زندگی میں صرف یہی کام افراد سازی کا انجام دیا اور انسانوں کا ایک ایسا معاشرہ تیار کر ایا جس کا مقام فرشتوں کی صفوف سے آگے ہے اور زمین و آسمان

نے اس سے پہلے انسان نہیں دیکھے ان میں ایک ایک رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ نظر آتا ہے۔ اُن کے بعد کے لئے بھی آپؐ نے جو تعلیمات اور اُن کے رواج دینے کے طریقے چھوڑے ہیں اُس پر پُورا عمل کرنے والے اسی مقام کو پا سکتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین نے فرمایا ہے۔ یہ تعلیمات سارے عالم کے لئے ہیں۔ اس لئے آپؐ کا وجود باجود پُورے عالم انسان کے لئے احسانِ عظیم ہے۔ گو اس سے پُورا نفع مؤمنین نے اُٹھایا ہے۔

(معارف القرآن ج ۲ ص۲۳۴، ص۲۳۵)

بعثت نبویؐ
اور
عظمتِ شان نبویؐ

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝

(البینہ آیت ۱ تا ۲)

پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دُنیا میں کُفر و شرک اور جہالت کے انتہائی عموم اور غلبہ کو ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ کفر و شرک کی ایسی عالمگیر ظُلمت کو دُور کرنے کے لئے رب العالمین کی حکمت و رحمت کا تقاضا یہ ہُوا کہ جیسے ان کا مرض شدید اور وباء عالمگیر ہے

اُس کے علاج کے لئے بھی سب سے بڑا ماہر حاذق معالج بھیجنا چاہیئے۔ اس کے بغیر وہ اس مرض سے نجات نہ پاسکیں گے۔

آگے اس حاذق و ماہر حکیم کی صفت بیان کی کہ اس کا وجود ایک بینہ یعنی حجت واضحہ ہو۔ شرک و کفر کے ابطال کے لئے آگے فرمایا کہ مراد اس معالج سے اللہ تعالیٰ کا وہ رسولِ اعظم ہے جو قرآن کریم کی حجت واضح لے کر ان کے پاس آئے۔

اس مجموعہ میں بعثت نبویؐ سے پہلے زمانے کے فسادِ عظیم اور ہر طرف جہالت اور ظُلمت ہونا بھی معلوم ہُوا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کا بھی بیان ہُوا ہے۔

(معارف القرآن ج ۸ صـ۷۹۶)

حرمِ نبویؐ میں داخلے کے وقت چند اشعار

۱۳۸۴ھ میں سفرِ حج و زیارت سے پہلے میرے محترم دوست مولانا عبدالعزیز صاحب شرقی نے ایک ملاقات میں اپنے بہت سے مشتاقانہ اشعار سُنائے۔ اُن کے ایک مصرع نے مجھے بھی شعر گوئی کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ مصرع یہ تھا ؎ "یہ انکا کرم انکا کرم انکا کرم ہے" اور حاضری کے وقت چند اشعار موزوں ہو گئے۔

(بندہ محمد شفیع)

پھر پیشِ نظر گنبدِ خضرا ہے حرم ہے — پھر نامِ خدا روضۂ جنت میں قدم ہے
پھر شکرِ خدا سامنے محرابِ نبی ہے — پھر سر ہے مرا اور ترا نقشِ قدم ہے
محرابِ نبی ہے کہ کوئی طورِ تجلّی — دل شوق سے لبریز ہے اور آنکھ بھی نم ہے
پھر منتِ دربان کا اعزاز ملا ہے — اب ڈر ہے کسی کا نہ کسی چیز کا غم ہے
پھر بارگہِ سیدِ کونین میں پہنچا — یہ اُن کا کرم اُن کا کرم اُن کا کرم ہے
یہ ذرّۂ ناچیز ہے خورشید بداماں — دیکھ اُنکے غلاموں کا بھی کیا جاہ و حشم ہے
ہر موئے بدن بھی جو زباں بن کے کرے شکر — کم ہے بخدا ان کی عنایات سے کم ہے
رگ رگ میں محبت ہو رسولِ عربیؐ کی — جنت کے خزائن کی یہی بیعِ سلَم ہے
وہ رحمتِ عالمؐ ہے شہِ اسود و احمر — وہ سیدِ کونین ہے آقائے اُمم ہے
وہ عالمِ توحید کا مظہر ہے کہ جس میں — مشرق ہے نہ مغرب ہے عرب ہے نہ عجم ہے

دل نعتِ رسولِ عربیؐ کہنے کو بے چین
عالم ہے تحیّر کا زباں ہے نہ قلم ہے

(کشکول)

چند اشعار نعتیہ

جو رجب ۱۳۹۵ھ میں شعر و شاعری کا سب ذوق ختم ہونے کے بعد اچانک لکھے گئے۔

(بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ)

وہ حضرت سرورِ کونین فخرِ نوعِ انسانی
رسولِ انس و جنّ آئینۂ اخلاقِ ربّانی

فرشتوں پر شرف جس کے سبب سے ابن آدم کو
ہوا جس کے سبب رشکِ جناں یہ عالمِ فانی

وہ جس نے نوعِ انساں کو فرشتوں پر شرف بخشا
ہوا جس سے منوّر عالمِ ناسوت ظلمانی

وہ جس نے اُمّیوں کو علم و حکمت کی امامت دی
سکھائے جس نے چرواہوں کو آدابِ جہانبانی

نظر وہ کیمیا کایا پلٹ دی جس نے قوموں کی
ہوئے شیر و شکر جو کل تک تھے آگ اور پانی

قبائل اوس و خزرج کے جو صدیوں سے محارب تھے
ہوئے سب بھائی بھائی تھے جو کل تک دشمنِ جانی

لقب اُمّی علومِ اوّلین و آخریں در دِل
امامِ انبیاء و مرسلین از فضلِ یزدانی

(کشکول ص ۲۵۴)

تمنّائے حرم

ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ اس وقت جب کہ مسلسل بیماریوں کے سبب چند قدم کے فاصلہ پر مسجد تک جانا دشوار تھا۔

اے کاش پھر مدینہ[1] میں اپنا قیام ہو — دن رات پھر لبوں پہ درود و سلام ہو
پھر ذکر لا الٰہ میرا حرزِ جان ہو — اور وقتِ واپسیں یہی میرا کلام ہو
محرابِ مصطفےٰ میں ہو معراجِ سر نصیب — پھر سامنے وہ روضۂ خیر الانام ہو
پھر بھی مواجہہ میں درود و سلام کا — پُر کیف وہ نظارہ ہر خاص و عام ہو
پھر کاش میں مکین حرمِ مصطفےٰ میں ہوں — فضلِ خدا سے روضۂ جنّت مقام ہو
پھر ذکر لا الٰہ بنے حرزِ جاں مرا — دوزخ کی آنچ مجھ پر الٰہی حرام ہو

کتنا بلند اس عجمی کا مقام ہے
جس کو وہ خود کہدیں کہ میرا غلام ہے

(کشکول صـ ۲۵۶)

---

[1] الحمد للہ کہ حق تعالےٰ نے اپنے فضل سے یہ دُعا قبول فرمائی اور مسلسل بیماری اور کمزوری اور ہزاروں موانع رفع فرما کر ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ میں عمرہ رمضان اور زیارت روضۂ اقدس نصیب فرمائی۔

فریادِ اُمّت

بحضور سیّد الکونین صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم

(یہ نظم برخوردار عزیز مولوی محمد زکی مرحوم نے لکھی ہے، ناظرین کی دلچسپی کیلئے شائع کی جاتی ہے۔)

اے شفیع المذنبیں اے باعثِ کون و مکاں
اے سراجِ بزمِ وحدت اے پناہِ بےکساں

اے مبشر اے مزمّل صادق الوعد و امیں
سیّدِ اولادِ آدم رحمۃ للعالمیں

اے امام الانبیاء خیر البشر فخرِ انام
آفتابِ علم و حکمت دین کے ماہِ تمام

بیکس و بےبس کے وارث نامرادوں کی مراد
دوست دشمن کو ترے وعدہ پہ یکساں اعتماد

اے کہ تیری ذات سے قائم نظامِ زندگی
بادشاہی میں فقیری اور شانِ بندگی

پادشاہا یک نظر بر مسلم ہندی فگن !
کز زمیں تا آسماں بینی نفیر مرد و زن

تنگ ہوتی جا رہی ہے اب مسلماں پر زمیں
ظلم کے پنجوں میں ہیں یہ امنِ عالم کے امیں

تیری اُمّت اور ایسی خستہ حال و خستہ تن
جن کی لاشیں ڈھونڈتی پھرتی ہوں دو گز کا کفن

تیری اُمّت اور ہو یوں بیکس و مجبور و زار
دیو استبداد کے پنجہ میں ہو اور ذوالفقار

جن کے قدموں کے لئے تھے قیصر و کسریٰ کے تاج
ٹھوکریں کھاتے ہوئے فاقہ زدہ پھرتے ہیں آج

جو جہاں میں عام کرنے آئے تھے لطف و کرم
وائے حیرت وہ بنیں یوں تختۂ مشقِ ستم

جس نے بخشے عورتوں کو عصمت و عفت کے ہار
سامنے اُن کے ہو ماں بہنوں کی عصمت تار تار

جو مساواتِ بنی آدم کا لائے تھے پیام
وائے نکبت بن رہے ہیں وہ غلاموں کے غلام

زیر دستوں کو دلانے آئے تھے جو تخت و تاج
ہوں وہی مجبور و بیکس اور پابندِ خراج

یہ غریبوں کے سہارے بیکسوں کے دادرس
ڈھونڈتے ہیں پر نہیں پاتے کوئی فریاد رس

ہم سراپا جرم و عصیاں بدعمل بدکار ہیں
نام لیوا آپ کے ہیں گر چہ بدکردار ہیں

یک نظر اے رحمتِ عالم بحالِ زارِ ما
تا بر آید باز از لطفِ عمیمت کارِ ما

آئی گنبد سے ندا اب ختم کر فریاد کو
جنتِ ارضی بنانے دے ذرا شداد کو

پنجۂ ظلم و ستم کو تیز تر ہونے تو دے
طفلکِ معصوم کو ماں باپ پر رونے تو دے

اور بڑھنے دے جہاں میں کفر کی تاریکیاں
اور ہونے دے نمایاں ظلم کی باریکیاں

فاش ہونے دے سیہ بختوں کی تیرہ بختیاں
عام ہونے دے مسلمانوں پہ پیہم سختیاں

چرخ تکنے دے مسلمانوں کو فرطِ یاس سے
عرش کو ہلنے دے کچھ دم شدتِ احساس سے

شانِ قہاری خدا کی جوش میں آنے کو ہے
زلزلہ اس محفلِ حق پوش میں آنے کو ہے

نخوت و ناز و تکبر کے علم گر جائیں گے
پھر وہی دیرینہ اسلامی علم لہرائیں گے

سنگِ راہ آخر کو اک دن ہو رہے گا سنگِ میل
یعنی پھر فرعونیت ہو کر رہے گی غرقِ نیل

ٹوٹ جائیں گے جہانِ کفر کے جام و سبو
ایک دن سر پر چڑھے گا بے گناہوں کا لہو

خونِ انسانی سے کشتِ ظلم پھل سکتی نہیں
کاغذی کشتی ہے یہ ڈوبے گی چل سکتی نہیں

ختم ہو جائے گا کیفی یہ بھی وقتِ ناسعید
رات کی ظلمت سے پیدا ہوگی آخر صبحِ عید

باش اے گردوں کہ پھر اک انقلاب آنیکو ہے
دیکھ پھر مسلم کا دورِ کامیاب آنے کو ہے

مروّجہ سیرت کمیٹی اور اُس کی شرعی حیثیّت

دارُالعلوم دیوبند کا فتوےٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

سوال کیا فرماتے ہیں عُلمائے دین اس بارہ میں کہ آج کل مُلک کے اندر سیرت کمیٹی اور یوم النبیؐ کے نام سے ماہِ ربیع الاوّل میں جو مجالس منعقد کی جاتی ہیں، جس میں بہت سے امور شرعی حدود سے متجاوز اور منکر بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ روایات کی نقل میں معتبر اور غیر معتبر کا کوئی معیار قائم نہیں رکھا جاتا۔

نیز سال بھر کے بارہ[۱۲] مہینوں میں محض ربیع الاوّل اور مہینے کے تیس دنوں میں سے صرف بارہ[۱۲] تاریخ خصوصیّت سے اس کے لئے رکھی گئی ہے۔

نیز بعض ذرائع سے معلوم ہُوا ہے کہ اس سیرت کمیٹی کے پردہ میں قادیانی اثرات اور اس کی تحریک کی تبلیغ واشاعت کی جاتی ہے اور مقصد بھی اس تحریک سے اشاعت مذہب قادیان ہے۔

لہٰذا عرض ہے کہ ان قیودات مروجہ اور تحقیقات کے ساتھ ان سیرت کمیٹیوں کا انعقاد از رُوئے شرع شریف کیا حیثیت رکھتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب سیرت کمیٹی کی تحریک ابتداء میں سخت تلبیس کے ساتھ اُٹھائی گئی اُس کو منکرات اور رسوم بدعیہ سے پاک دکھلایا گیا اور ایسے دلفریب مقاصد و قواعد سطح پر رکھے گئے جن کو دیکھ کر ہر شخص موافقت پر مجبور ہو۔ کیونکہ بلاشُبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی سیرت مبارکہ اور آپؐ کے حالات و مقالات کا مسلمانوں تک اور خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً صحیح صورت میں شائع کر دینا اسلام اور مسلمانوں کا اہم ترین فریضہ ہے اور تمام مدارس و مکاتب اور تبلیغ و تعلیم کی رُوح یہی ہے۔ اس کی ضرورت کا احساس قلوب میں پہلے ہی سے تھا۔ اس تحریک سے اس کو عملی صورت میں آتے ہوئے دیکھ کر عام مسلمانوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ لیکن اہلِ علم و فراست کو پہلے ہی سے یہ خطرہ تھا کہ مبادا یہ تحریک کوئی بدعت و ضلالت کی صورت اختیار کر لے اور اگرچہ اس وقت اس کو سادہ رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ لیکن عوام کی آمیزشِ خیال سے کچھ عرصہ کے بعد اس میں بھی وہی رسوم بدعات و خرافات شامل ہو جائیں جو عید میلاد وغیرہ کی قدیم رسوم میں ہیں اس لئے علماء کرام کی بہت بڑی جماعت نے تو اسی وقت سے اُس کی موافقت کسی عنوان سے نہیں کی اور بعض مقتدر حضرات علماء نے موافقت کی بھی تو ایسی قیود و شرائط لگا کر کہ جن کی وجہ سے کوئی بدعت اس میں شامل نہ ہو سکے۔

لیکن افسوس کہ بانیانِ تحریک نے اس میں خیانت سے کام لیا اور اُن کی تحریرات میں سے قیود و شرائط کو علیحدہ کر کے مطلقاً اپنی موافقت شائع کر دی۔ جس کا راز یہ تھا کہ ان کو ان قیودات و شرائط کا خلاف کرنا اور اس تحریک کو مجموعہ بدعات بنانا تھا۔ چنانچہ تین سال کے قلیل عرصہ میں اس کی حقیقت کھل گئی اور یہ تحریک اصلی صورت میں دُنیا کے سامنے آگئی۔ تو معلوم ہوا کہ یہ وہی مشہور بدعت ہے جس کو پہلے "عید میلاد" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور و معروف امام حدیث و تفسیر علامہ شاطبی اپنی کتاب "الاعتصام" میں تحریر فرماتے ہیں :-

واما غير العالم وهو الواضع لها يعني البدعة فانه لا يمكن ان يعتقدها بدعة بل هي عنده مما يلحق بالمشروعات كقول[1] من جعل يوم الاثنين

---

[1] بدعات غیر مشروعہ کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں جیسے اس شخص کا قول جو یوں کہے کہ پیر کے لئے روزہ رکھنا اس لئے ثواب ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش کا دن ہے اور ۱۲ ربیع الاوّل کو عیدین کے ساتھ ملحق کر دے کہ اس لئے کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پیدا ہوئے ہیں :- ۱۲

یصام لانه یوم مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجعل الثانی عشر من ربیع الاول ملحقا بایام الاعیاد لانہ علیہ السلام ولد فیہ۔ الخ

(اعتصام ج ۲ ص ۲۱۴)

اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور و معروف بزرگ علامہ ابن الحاج رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی کتاب "مدخل" میں اس بحث کو مستقل فصل میں بیان فرمایا جس کے متفرق جملے درج ذیل ہیں :۔

ومن جملۃ[1] ما احدثوہ من البدع مع اعتقادھم ان ذلک من اکبر العبادات واظھار الشعائر ما یفعلونہ فی شھر ربیع الاول من المولد وقد احتوی علی بدع ومحرمات ۔۔ الخ (مدخل ج ا ص ۳۶۱)

باقی رہے وہ موہوم منافع جن کو اس تحریر کا سنگِ بُنیاد بتلایا جاتا ہے۔ اول تو ان محرمات و منکرات کے ساتھ جو ان جلسوں میں مشاہد ہو رہے ہیں ان کا حصول ہی متصور نہیں اگر بالفرض وہ منافع حاصل بھی ہوں مگر ایک مستقل بدعت و ضلالت اور بہت سے معاصی کا نتیجہ ہو کر حاصل ہو تو کیا کوئی عاقل ان منافع کی وجہ سے اس مجموعہ منکرات کو جائز کہہ سکتا ہے اور اگر اس کو جائز کہا گیا تو پھر دنیا میں کوئی گناہ، گناہ نہیں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی بُرے سے بُرا کام اور سخت سے سخت گناہ ایسا نہیں جس میں کچھ نہ کچھ منافع و فوائد نہ ہوں اور ظاہر ہے اگر منافع نہ ہوں تو اُن کے پاس ہی کون جائے۔ لیکن ان منافع کے موجود ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود قرآن کریم کا فیصلہ ایسے امور میں یہی ہے کہ اثمھما اکبر من نفعھما۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے اور صرف سطحی اور وقتی چیزوں سے گزر کر اسلامی تاریخ کے مجموعی حالات پر نظر ڈالی جائے تو بلاشبہ ہر آنکھوں والے

---

[1] منجملہ ان بدعات کے جو لوگوں نے گھڑلی ہیں اور ان کے ساتھ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ سب سے بڑی عبادت اور دین کی نشر و اشاعت ہے وہ بدعات ہیں جو ماہ ربیع الاول میں مجلس مولد کے نام سے کی جاتی ہے حالانکہ یہ مجلس بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے۔ ۱۲ (مدخل)

پر یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کسی وقت اور کسی حال میں وہ طریقہ نافع نہیں ہو سکتا جو نبی کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور صحابہؓ کی سنت سنیّہ سے جدا ہو۔

مسلمانوں کی دینی ترقیات و منافع تو اتباع پر موقوف ہیں ہی لیکن ساڑھے تیرہ سو برس کی اسلامی تاریخ کا تجربہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام دنیوی ترقیات بھی بحیثیت مجموعی آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت کے اتباع پر موقوف ہیں اور اس کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ اس موجودہ تنزل و انحطاط کے بعد بھی اگر اس امت مرحومہ کے لئے کوئی ذریعہ سنبھلنے کا ہے تو وہی اور صرف وہی ذریعہ ہے جس نے ان کو اوّل مرتبہ تمام گمراہیوں اور ذلتوں کے اندھیروں سے نکالا تھا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی سنت کا اتباع امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے :۔

لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا ما صلح بہ اولھا ۔

"اس امت کی اصلاح وہی طریقہ کر سکتا ہے جس نے اس امت کے متقدمین اور سلف کی اصلاح کی تھی"

اور ارشاد فرمایا ہے :۔

ما لم یکن یومئذٍ دینا لا یکون الیوم دینا ۔ (اعتصام)

"اور جو چیز اس وقت یعنی آنحضرتؐ اور صحابہ کے زمانے میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔ ۱۲

اور مسلمانوں کی اصلاح یا اسلام و تعلیمات اسلام کی اشاعت و تقویت کے لئے نئے نئے طریقے اور رسوم بدعت ایجاد کرنے کی ممانعت جو بے شمار آیات و احادیث میں وارد ہے اس کا راز بھی امام مالکؒ نے خوب فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

من ابتدع فی الاسلام بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمدًا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خان الرسالۃ لان اللہ تعالیٰ یقول الیوم اکملت

"جو شخص اسلام میں کوئی بدعت ایجاد کرے جس کو وہ نیکی سمجھتا ہے گویا وہ اس کا مدعی ہے کہ آنحضرت نے اللہ تعالےٰ کے احکام امت کو پہنچانے میں خیانت کی (کہ یہ نیکی ان کو نہیں بتلائی) کیونکہ حق تعالےٰ کا

لکم دینکم فما لم یکن یومئذ دینا لایکون الیوم دینا۔ (اعتصام للشاطبی ج ۱ ص ۴۹)

ارشاد ہے کہ میں نے آج تمہارا دین کامل کردیا ہے تو جو چیز اس دن دین میں داخل نہ تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔"

خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ سیرت کمیٹی کی موجودہ تحریک ان موجودہ تعینات وتشخصات کے ساتھ خود بھی ایک بدعت سیئہ ہے جو اگر دوسرے منکرات پر مشتمل نہ ہو اس وقت بھی گناہ ہے اور بالخصوص اب تو اطراف ہندوستان سے ان جلسوں کی جو کیفیات موصول ہو رہی ہیں وہ ایک خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور ذکر سیرت کی آڑ میں محرمات لہوولعب اور تماشے کئے جاتے ہیں جن کے مقابلے میں نصاریٰ کی رسم "کرسمس ڈے" بھی گرد ہوگئی۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس تحریک کی ابتدائی تلبیس کی وجہ سے جن حضرات علماء نے قیود وشرائط مناسبہ کے ساتھ اس میں شرکت کی اجازت دی تھی ان سے مکرر استفتاء کیا جائے۔ چنانچہ نائب الشیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کا فتوے اس بارہ میں درج ذیل ہے جو کہ سکرٹری "خلافت کمیٹی کاندھلہ" کے استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔

نائب شیخ الہند حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہم صدر مدرس دارالعلوم کا مکتوب گرامی

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

والانامہ باعث سرفرازی ہوا۔ یادآوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سیرت کمیٹیوں کا انشاء اور اختراع قادیانیوں کی طرف سے تو نہیں ہوا مگر بعض اوقات میں اس سے قادیانیوں نے فائدہ ضرور اٹھانا چاہا اور اٹھایا۔ اس کا بیڑہ اٹھانے والے شیخ عبدالمجید صاحب قریشی ساکن پٹی لاہور ہیں۔ قریشی صاحب نے ابتداء میں اس کے متعلق مختلف مقامات سے رائے لی۔ چنانچہ میرے پاس اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے پاس بھی ان کے خطوط آئے تھے۔ ہم دونوں کے جوابات تقریباً متفق تھے۔ خلاصہ یہ تھا کہ یہ امر نہایت مستحسن ہے بشرطیکہ اس کے لئے کوئی تاریخ اور مہینہ متعین نہ ہو۔ کبھی صفر میں ہو تو کبھی جمادی الاولیٰ میں، کبھی ربیع الاول میں ہو تو کبھی رجب

ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ بارہ یا پندرہ کی ہمیشہ کے لئے تعین نہ ہوا کرے۔ نیز سال میں صرف ایک دفعہ نہ ہوا کرے بلکہ دوسرے تیسرے مہینہ اور اگر اس سے زائد ممکن ہو تو زیادہ تر ہوا کرے۔ نیز سیرت کے متعلق بیان کرنے والے کوئی واقف کار شخص ہوں جو کہ صحیح اور قوی روایتیں بیان کریں اور عوام کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اصل زندگی سے آگاہ کرتے رہیں۔ جب تک اس قسم کے بیانات عوام تک لگاتار اور کثرت سے نہ پہنچائے جائیں گے کما ینبغی فائدہ نہ ہوگا۔ معترضین علی الاسلام کے زہر آلود پروپیگنڈوں سے عوام کو اسی طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قریشی صاحب نے ہماری عبارت میں کانٹ چھانٹ کی اور اپنے مدعا کے موافق جملوں کو لے کر شائع کرایا اور باقی کو حذف کر دیا۔ ہم نے اس کے بعد اسی زمانہ میں اخباروں میں اپنی تراشیدہ عبارت کو پھر چھپوایا مگر وہ اپنے پراپیگنڈے سے باز نہیں آئے اور اب انہوں نے سالانہ ربیع الاول کو اس کی تحریک شروع کر دی اور اس کے استحسان میں ہمارے نام شائع کرا رہے ہیں۔ ہم ہرگز تعیین تاریخ و ماہ سالانہ ایک جلسہ کو شرعی اور ملکی نقطۂ نظر سے نہ مفید اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ مثل عمل نصاریٰ (بڑے دن) یوم پیدائش اور اس کی رسوم کے ایک رسم ہو رہی ہے۔ کیونکہ عیسائی یوم ولادت علیہ السلام مناتے ہیں اس کو دیکھ کر مصر وغیرہ کے لوگ بھی اس قسم کی تابعداری کرنے کے لئے آمادہ ہو رہے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے احوال اور اخلاق اور سیرت لوگوں کو کانوں تک پہنچانے نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہیں۔ اگر مذکورہ بالا طریق پر ہو تو مفید اور بہترین چیز ہے ورنہ اجتناب چاہیئے۔ افسوس کہ سیرت کمیٹی اور اس کے علمبرداروں نے تمام امور مشروطہ کو ترک کر دیا۔ ۲

والسلام۔ از دار العلوم دیوبند ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

اس مفصل تحریر کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ عمل کرنے والوں کے لئے مسئلہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے گا اور معاندین کی بحث کا خاتمہ کسی حجت و دلیل سے غیر ممکن ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ ولی التوفیق وعلیہ التکلان۔

کتبہ احقر محمد شفیع عفرلہ خادم دار الافتاء دار العلوم دیوبند ۳۰ صفر ۱۳۵۱ھ

الجواب صحیح

ننگ اسلاف حسین احمد، صدر مدرس دار العلوم دیوبند

شمالی افریقہ میں نُورِ نبوّت کی پہلی کِرن

صحابۂ کرامؓ شاہِ حبشہ کے دربار میں

حضرت مولانا مُفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مسّودات کے فائل سے یہ غیر مطبوعہ مضمون جو ۷۸ھ/۵۸ء میں لکھا گیا۔ پیشِ خدمت ہے۔

نبی کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی عمر شریف کا چالیسواں سال اور عطائے نبوّت کا چھٹا سال، اللہ تعالےٰ کا نام لینے والے مُٹھی بھر اُمّتِ مسلمہ کے لئے ایک عجیب ابتلاء و امتحان اور انتہائی مصائب و آلام کا دَور تھا، عرب کے سارے قبائل نے اس پر حلف اور معاہدہ کر لیا تھا کہ رسول اکرم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور اُن پر ایمان لانے والے گِنے چُنے مُسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کر کے اُن کو مجبور کر دیا جائے کہ یا وہ اپنے دین کو چھوڑ کر پھر اُن میں شامل ہو جائیں یا بھُوک پیاس سے مر جائیں اور آپؐ کے خاندان میں سے جو لوگ آپؐ کی کچھ بھی حمایت کریں ان کا بھی اسی طرح مقاطعہ کر دیا جائے جس کے نتیجہ میں ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو المطلب کے پُورے خاندان اس مکمل بائیکاٹ کے عذاب میں مُبتلا ہُوئے۔ مکّہ کے بازاروں میں ان لوگوں کو ایک دانہ نہ ملتا تھا۔ ان کے بھُوکے بچّوں کے بلبلانے پر بھی کسی کو رحم نہ آتا تھا۔ جنگل کی گھاس اور پتّے ان کی غذا رہ گئے تھے۔

اس وقت رحمت للعالمین نے سب مُسلمانوں کو حکم دیا کہ اب اس زمین کو چھوڑ کر متفرق ہو جاؤ۔ اللہ تعالےٰ تمہیں پھر جمع فرما دیں گے۔ صحابہ کرامؓ نے پُوچھا کہاں جائیں تو حبشہ کیطرف اشارہ فرمایا۔ ان حضرات نے جن کے مردوں کی تعداد تراسی اور عورتوں کی اٹھارہ تھی۔ اس ارشاد کے مطابق حبشہ کا قصد کر لیا اور متفرق طور پر خفیہ خفیہ اُس طرف چلنا شروع ہُوئے

یہاں تک کہ ساحل سمندر پر سب جمع ہو گئے۔ اللہ تعالے نے یہ غیبی مدد فرمائی کہ اسی وقت دو تجارتی جہاز حبشہ کی طرف جانے والے مل گئے اور ان سب کو آدھا دینار کرایہ لے کر سوار کر لیا۔ ان حضرات نے حبشہ کی زمین پر اُتر کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔

ادھر قریش مکہ کو ان کی کینہ پروری اور جوش غیظ و غضب نے اس پر بھی نہ رہنے دیا کہ یہ لوگ اپنا وطن اور گھر بار چھوڑ کر نکل گئے اس لئے اپنے دو سردار عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو اُن کے پیچھے حبشہ روانہ کیا اور شاہ حبشہ کو کچھ تحفے بھیجے اور اس کے ساتھ یہ درخواست بھیجی کہ یہ لوگ ہمارے خاندان کے افراد ہیں، ہمارے دین سے نکل گئے اور آپ کے دین یعنی عیسائیت میں داخل نہیں ہوئے ان کو ہمارے حوالے کر کے مکہ بھیج دیا جائے۔

عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید نے بھی یہ ہوشیاری کی کہ شاہ حبشہ کے لئے تو تحفے لے ہی گئے تھے اُن کی سلطنت کے امراء و وزراء اور علماء سب کے لئے علیحدہ تحفے لے گئے تا کہ وہ سب ان کی حمایت کریں اور شاہ کے پاس جانے سے پہلے یہ تحفے وزراء و امراء میں تقسیم کر کے ان کی ہمدردی اپنے ساتھ کر لیں۔ اور پھر شاہ حبشہ کے پاس پہنچ کر بتلایا کہ یہ لوگ ہمارے دین آبائی سے نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک نیا دین اُنہوں نے گھڑا ہے جو ہمارے اور تمہارے دونوں مذہبوں کے خلاف ہے اور ہم میں سے چند بے وقوف لوگوں کے سوا کسی نے اس دین کو قبول نہیں کیا۔ چونکہ شاہ حبشہ اس وقت عیسائی تھا۔ اُس سے یہ بھی کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریمؑ کی توہین کرتے ہیں اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ان کو آپ فوری طور پر اپنے مُلک سے نکل جانے کا حکم دے دیں اور ہمارے ساتھ بھیج دیں۔

شاہ حبشہ نے اپنے ارکانِ دولت سے مشورہ کیا، وہ پہلے ہی ہموار ہو چکے تھے سب نے یہی مشورہ دیا کہ ہم تو ان لوگوں کے حالات سے واقف نہیں اور آنے والا وفد اور ان کی قوم ان کے حالات سے پوری طرح واقف ہے، ہمیں چاہیئے کہ بغیر کسی تفتیش اور تحقیق کے ان لوگوں کو آنے والے وفد کے حوالے کر کے اپنے ملک سے نکال دیں۔

نجاشیؔ شاہ حبشہ تورات و انجیل کا عالم اور مذہب کا پابند تھا۔ اس نے کہا کہ واللہ

میں ہرگز ایسا نہ کروں گا کہ یک طرفہ بیان سن کر کوئی فیصلہ کروں، بلکہ ان لوگوں کو بلا کر خود ان سے حالات دریافت کروں گا۔ پھر جو کچھ صحیح معلوم ہوگا اُس پر عمل کروں گا۔ اسی قرارداد کے مطابق شاہی فرمان ان مسافروں کے پاس بھیج دیا۔

حضرات صحابہؓ کو جب یہ قصہ معلوم ہُوا تو سہم گئے اور آپس میں گفتگو ہیں لگی کہ شاہ حبشہ سے کس قسم کی گفتگو کی جائے اور کون کرے؟ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے خود بڑھ کر فرمایا کہ میں گفتگو کروں گا، آپ سب خاموش رہیں۔ ان حضرات نے سوال کیا کہ آپ کیا گفتگو کریں گے؟ حضرت جعفرؓ نے اس وقت بھی جو بات کہی وہ ہر مسلمان کو یاد رکھنے اور حرزِ جان بنانے کی چیز ہے۔ فرمایا :-

"میرے نزدیک یہ کوئی فکر کی چیز نہیں، ہمیں جو کچھ معلوم ہے اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے بغیر کسی جھجک یا ملمع سازی کے صاف صاف وہی بیان کریں گے، انجام کچھ بھی ہو"

سب نے اس پر اتفاق کیا۔ شاہی دربار میں حاضر ہُوئے۔

حق و باطل کا یہ ہنگامہ بھی قابلِ دید تھا کہ ایک طرف مدّوسا دِ قریش کا بھیجا ہُوا وفد بڑی عزت و شان کے ساتھ شاہی دربار میں موجود ہے اور اس نے پہلے ہی تحفہ تحائف کے ذریعہ امراءِ سلطنت کی ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔ پھر ایک خالی الذہن مختارِ مطلق بادشاہ کے کان اپنے حریف کی بُرائیوں سے بھر دیئے ہیں اور بادشاہ کو یہ بھی بتلا دیا ہے کہ یہ لوگ نہ بادشاہ کو سجدہ کریں گے نہ شاہی آداب بجا لائیں گے۔ متکبّر سرکش لوگ ہیں اور دوسری طرف چند بے کس مسافر ہیں جن کا امراء دولت میں نہ کوئی تعارف ہے نہ سہارا۔

مگر یہ حق کے پرستار قرآنی آیات سے سرشار شاہی دربار میں اجازت لے کر داخل ہوتے ہیں تو خالص اسلامی طرز کی رسمِ اسلام ادا کر کے بیٹھ جاتے ہیں، نہ درباری سلام نہ رکوع نہ سجدہ۔

شاہ حبشہ نے سوال کیا کہ آپ لوگ شاہی آداب کیوں بجا نہیں لائے نہ سجدہ

کیا اور نہ درباری رسم کے مطابق سلامی دی۔

حضرت جعفرؓ نے فرمایا کہ ہم اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ نجاشی حبشہ نے سوال کیا کہ تم نے اپنے آباو اجداد کا دین چھوڑا ہے اور ہمارے دین یعنی عیسائیت میں بھی داخل نہیں ہوئے تو وہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے ؟

اس وقت حضرت جعفر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جو دینِ اسلام کی ترجمانی کی ہے وہ آبِ زر سے لکھنے اور ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے اس کو ان ہی کے متبرک الفاظ میں مع ترجمہ کے لکھتا ہوں۔

ایہا الملک کنا قوما اھل جاھلیة نعبد الاصنام و ناکل المیتة و نأتی الفواحش و نقطع الارحام ونسئی الجوار و یاکل القوی الضعیف - فکنا علیٰ ذالک حتی یبعث اللہ لنا رسولا کما بعث الرسل الی من قبلنا وذلک الرسول منا نعلم نسبه و صدقه و امانته و عفافه فدعا الی اللہ تعالیٰ لنوحدہ و نعبدہ و نخلع ما کان یعبد آباء نا من دونه من الحجارة والاوثان وامرنا ان نعبد اللہ تعالےٰ وحدہ وامرنا بالصلوٰة والزکوٰة والصیام وامرنا بصدق الحدیث واداء الامانة وصلة الارحام وحسن الجوار والکف عن المحارم والدماء ونھانا عن الفواحش وقول الزور واکل مال الیتیم و قذف المحصنة فصدقناہ وآمنا به۔ (سیرت حلبیہ ص : ۳۲۴ ج ۱)

"ترجمہ : اے بادشاہ ! ہم ایک جاہلیت والی قوم تھے بُتوں کی پُوجا پاٹ کرتے اور مردار جانور کھاتے اور بے حیائی کے سارے کام کرتے تھے۔ عزیزوں سے قطع تعلق، ہمسایوں کے ساتھ بدسلوکی ہمارا شیوہ تھا، ہمارا قوی ہمارے ضعیف کو کھا جاتا تھا۔ ہم اس تاریکی اور گمراہی میں ڈوبے ہُوئے تھے کہ اللہ تعالےٰ نے ہم میں اپنا ایک رسول بھیجا جیسا کہ ہم سے پہلے لوگوں

میں بھی اللہ تعالےٰ کا یہ دستور رہا ہے۔ آپؐ نے ہمیں اللہ تعالےٰ کی طرف دعوت دی کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کی عبادت ہم اور ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں اُن سب کو چھوڑ دیں اور ہمیں نماز، صدقہ اور روزہ کا حکم دیا اور سچ بولنے اور امانت ادا کرنے اور عزیزوں کے حقوق ادا کرنے کا پابند کیا۔ پڑوسیوں سے اچھا سلوک سکھایا اور حرام چیزوں سے، خون ریزی سے بچنے کی ہدایت فرمائی اور بیحیائی کے کاموں سے منع فرمایا۔ جھوٹ بولنے اور یتیموں کا مال کھانے اور عفیف پاکدامن عورت پر تہمت لگانے سے سختی کے ساتھ روکا۔ ہم نے آپؐ کی تصدیق کی اور آپؐ پر ایمان لائے۔"

حضرت جعفر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے یہ اصولِ اسلام اور تعلیماتِ رسول ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ہم نے اللہ تعالےٰ کے رسول پر ایمان اور اُن کی پیروی اختیار کر لی تو ہماری قوم قریش نے ہم پر ظلم و تعدی شروع کی تاکہ وہ پھر ہمیں بُت پرستی اور گندی چیزوں میں مُبتلا کر دیں۔ جب کہ ان کا ظلم و جور حد سے گزر گیا اور زندگی ہم پر تلخ ہو گئی تو ہم نے آپؐ کے مُلک کا رُخ کیا اور دوسرے ملکوں سے اس کو اس لئے ترجیح دی کہ ہمارا گمان آپؐ کے متعلق یہ تھا کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور ہم پر ظلم نہ ہو گا۔

نجاشی ملکِ حبشہ اور اُس کے اُمراء و وزراء حضرت جعفر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے بیان اور اسلامی تعلیمات کی خُوبی و ہمہ گیری سے متاثر ہو چکے تھے۔ نجاشی نے جعفرؓ سے کہا کہ جو کتاب آپ کے رسول پر نازل ہوئی ہے اس کا کچھ حصّہ تمہارے پاس ہے؟ حضرت جعفرؓ نے عرض کیا کہ صرف پاس نہیں بلکہ سینوں میں محفوظ ہے۔ نجاشی نے اُس کے سُننے کی درخواست کی تو حضرت جعفرؓ نے سُورۂ مریم کی چند آیات پڑھ کر سُنائیں اور بعض روایات میں ہے کہ سورۂ عنکبوت اور روم کی آیات سُنائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یکے بعد دیگرے ان کی درخواست پر سب سُنائی ہوں۔

آیاتِ قرآنی سُننے کا یہ اثر سب لوگوں نے کھُلی آنکھوں دیکھا کہ شاہ حبشہ نجاشی اور اُس کے امراء وزراء سب پر گریہ طاری تھا، آنسو بہہ رہے تھے۔

نجاشی چونکہ تورات و انجیل کا عالم تھا اور کچھ عرصہ عرب میں رہ کر عربی زبان سے بھی کافی واقفیت حاصل کئے ہوئے تھا۔ یہ آیات سُن کر بول اُٹھا:۔

ان ھٰذا والذی جاء بہ موسیٰ لیخرج من مشکوٰۃ واحدۃ۔" (سیرت حلبیہ)

یعنی: یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰ علیہ السلام یا بعض روایات میں عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں ایک ہی مرکزِ نور سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

اس وقت شاہِ حبشہ اور اُس کا پورا دربار کلامِ ربانی کے اثرات سے لبریز اور جعفرؓ کے بیان سے متاثر تھا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ اب ذرا ان لوگوں سے بھی تو پوچھئے کہ اُنہوں نے ہمارا تعاقب کیوں کیا؟ اور کیوں ہمیں اپنی حراست میں مکہ لے جانا چاہتے ہیں؟ ان سے دریافت کیجئے کہ ہم آزاد ہیں یا ان کے غلام ہیں؟ اور بھاگ کر آگئے ہیں۔ اگر ہم ان کے بھاگے ہوئے غلام ہیں تو بے شک ان کا مطالبہ کا حق حاصل ہے اور آپ کو چاہیئے کہ ہمیں ان کے حوالہ کر دیں۔

نجاشی نے اُن سے سوال کیا تو عمرو بن عاص کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ صحیح بات کا اقرار کرے کہ یہ لوگ غلام نہیں بلکہ آزاد ہیں۔ اس کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا کہ شاہا! ان سے دریافت کیجئے کہ ہم نے کوئی خون کیا ہے یا اُن کے کسی آدمی کو قتل کیا ہے جو یہ ہم سے قصاص لینے کے لئے، یا ہم نے ان کا کچھ مال لیا ہے جس کو وصول کرنے کے لئے انہوں نے ہمارا پیچھا کیا ہے؟

عمرو بن عاص نے ان دونوں سوالوں کے جوابات میں بھی اس کا اقرار کیا کہ نہ انہوں نے کسی کو قتل کیا نہ کسی کا مال لیا۔

اب نجاشی نے خود ایک سوال کیا کہ کیا پھر ان لوگوں کے ذمہ آپ کا کچھ قرض ہے؟ عمرو بن عاص نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔

اب تو نجاشی شاہ حبشہ پر حقیقتِ حال پوری طرح روشن ہو گئی تو فرمایا۔ خدا کی قسم!

اگر تم لوگ ایک پہاڑ سونے کا مجھے دے دو تب بھی میں ان کو تمہارے حوالہ ہرگز نہ کروں گا۔ اور حکم دیا کہ یہ لوگ جو ہدیہ تحفہ لے کر آئے ہیں وہ واپس کر دیا جائے اور ان کو یہاں سے واپس بھیج دیا جائے۔

حضرات صحابہ حبشہ میں کسی تبلیغ و دعوت کی نیت سے نہیں بلکہ صرف اپنی حفاظت اور امن کی خاطر داخل ہوئے تھے۔ مگر دشمنوں کے تعاقب نے اُن کو اور اُن کے دینِ حق کو حبشہ کے سرکاری حلقوں اور عوام میں اس طرح روشناس کرا دیا کہ سب کے سب اسلام کی حقانیت سے متاثر ہو گئے اور اُن میں سے بہت سے مسلمان بھی ہو گئے۔ خود نجاشی شاہ حبشہ نے بھی بالآخر اسلام قبول کیا۔

یہ ہے اشاعتِ اسلام اور اُس کے عالمگیر اثرات کا نمونہ کہ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے اخلاق و معاملات خود ایک جادو کی تاثیر رکھتے تھے۔ جس جگہ پہنچ گئے ملکوں اور قوموں کی کایا پلٹ دی۔ حضرت جعفر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا جو بیان میں نے اُن کے عربی الفاظ میں نقل کیا ہے یہ تعلیماتِ اسلام کا ایک بہترین اجمال ہے۔ جس سے اس کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے عالمِ انسانیت پر کتنا بڑا احسان فرمایا کہ کفر و شرک، ظلم و جور، گندگی و ناپاکی اور حق ناشناسی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دُنیا کو ایک بقعہ نور میں لے آئے۔ انسان جو چوپایوں اور وحشی درندوں کی صف میں بلکہ اس سے بھی نیچے گر چکا تھا اُس کو اس قعرِ مذلت سے نکالا اور ایک صحیح مقام پر پہنچا دیا۔

رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حقانیت پر کائناتِ عالم کی شہادتیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

سرورِ کائنات فخرِ موجودات رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت اور فوق العادت، اخلاق واعمال، آپؐ کا صدق واخلاص، امانت ودیانت، حقانیت وربانیت ان چیزوں میں ہیں جس کو عقل وبصیرت بلکہ بصارت کا کوئی حصہ ملا ہے وہ اس کے روشن آفتاب سے نظر نہیں چرا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے عُقلاء وحکماء عوام وخواص سب ہی نے آپؐ کے قدموں میں پناہ لی ہے۔ ہر قوم وجماعت کے اعلیٰ طبقہ نے آپؐ کی حقانیت کی شہادت واقرار اور اپنی غلامی کے اختیار کو مایۂ افتخار سمجھا ہے جس سے تاریخ عالم کے صفحات لبریز ہیں۔ لیکن ان میں ممکن ہے کہ شپرہ چشم مخالفین یہ کہہ دیں کہ یہ اُن کی رائے کی غلطی ہے، ہم تسلیم نہیں کرتے۔ مگر حق تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور حقانیت کی شہادتیں فقط انہی عقلاء اور افرادِ انسانی پر منحصر نہیں رکھی بلکہ بہت سی ایسی چیزوں سے اس کی شہادتیں عالمِ انسان پر واضح فرما دی ہیں جن کو انسان غیر ذی شعور اور لایعقل کہتا ہے۔ یہ شہادات درحقیقت عالمِ غیب کی شہادات

ہیں۔ ان کو رائے کی غلطی کہہ کر بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا۔ اس وقت اس مضمون میں انہی شہادات کے چند نمونے نقل کئے جاتے ہیں۔

تنبیہ یہ واقعات تاریخ و سیر کی معتبر کتابوں سے منقول ہیں اخباری افسانے نہیں بلکہ ایسے ثقہ لوگوں کی روایات ہیں کہ اس کا اعتبار نہ کیا جاوے تو گزشتہ زمانہ کی تاریخ اور واقعاتِ ماضیہ کے صحیح ماننے کا پھر کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔

الات گمراہی (بتوں) کی زبانوں پر کلمۂ اسلام
شان ہے تیری کبریائی کی ؎ بت حمایت کریں سچائی کی

حضرت عباس رضؓ بن مرداس کے اسلام کا عجیب واقعہ

حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ تعالےٰ عنہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب کے عام لوگوں کی طرح یہ بھی بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ان کا ایک مخصوص بت تھا جس کا نام ضمار پکارا جاتا تھا اور یہ ان کا خاندانی اور جدی معبود تھا۔ ان کے والد مرداس جب مرنے لگے تو صاحبزادہ عباس کو وصیت کی کہ بیٹا ضمار کی پرستش (پوجا) کرتے رہنا، اس میں غفلت نہ ہو۔ کیونکہ تمہارے نفع نقصان کا وہی مالک ہے۔

عباس رضؓ اپنے والد کی وصیت کے مطابق اس کو پوجا کرنے لگے۔ ایک روز حسبِ عادت اس کی پرستش میں مشغول تھے کہ یکایک ضمار کے اندر سے آواز سنائی دی۔ کان لگایا تو یہ شعر پڑھ رہا تھا ؎

من للقبائل من سلیمٍ کلّہا — اودی ضمار و عاش اھل المسجد
اب بنی سلیم کے قبائل کا کون مددگار ہو گا — ضمار ہلاک ہو چکا اور اہل مسجد باقی رہے

انّ الّذی ورث النبوۃ والھدیٰ — بعد ابن مریم من قریشٍ مھتدٖ
بیشک ہدایت پر وہی ذات مقدس ہے جو حضرت عیسیٰ بن مریم کے بعد نبوت و ہدایت کے وارث ہوئی ہے۔

اودی ضمار و کان یعبد مدّۃ — قبل الکتاب الی النّبیّ محمّدٖ
ضمار کی حکومت ختم ہوئی حالانکہ نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کتاب نازل ہونے سے پہلے ایک مدت تک اسکی پرستش ہوتی رہی۔

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس حیرت انگیز واقعہ نے میرے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا ولولہ پیدا کر دیا۔ میں نے اپنی قوم بنی حارثہ کی ایک جماعت کے ساتھ مدینہ منورہ کا قصد کیا۔ مدینہ پہنچ کر جب ہم مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے مجھے دُور سے دیکھتے ہی تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ "عباس تم مسلمان ہونے کے لئے کیسے آ گئے؟" میں نے سارا قصہ سُنایا۔ آپؐ نے فرمایا کہ صحیح کہتے ہو۔ اس کے بعد ہی میں اور میری ساری قوم مشرف بہ اسلام ہو گئی۔

(سیرت حلبیہ ج ۱ ص ۱۹۳)

مازنؓ بن غضوبہ کا اسلام اور اُس کا حیرت انگیز قصہ

حضرت مازنؓ بن غضوبہ ایک بلند پایہ صحابی ہیں۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ عمان کے قریب ایک بستی سمائل کے نام سے مشہور تھی وہاں ایک مشہور بُت تھا جس کو "باجر" کہا جاتا تھا۔ میں بھی اُس کی پوجا کے لئے جایا کرتا تھا اور اس کی نذر کے لئے بکرے وغیرہ ذبح کیا کرتا تھا۔ ایک روز میں وہاں پہنچا اور اس کے پاس جا کر ایک بکرا بطور نذر کے ذبح کیا۔ میں ابھی اس سے فارغ بھی نہ ہُوا تھا کہ اچانک بُت کے اندر سے آواز آئی۔ سُنا گیا تو یہ کلمات کہہ رہا ہے۔

اسمع تسر۔ ظهر خير وبطن	"سنو! خوش ہو گے ایک خیر عظیم ظاہر ہو گئی
بعث نبی من مضر بدين	اور شر چھپ گیا۔ قبیلہ مضر میں سے ایک نبی اللہ تعالےٰ
الله اكبر فدع نحيتا من	کے سچے دین کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں سو اُن
حجر تسلم من حر	پتھر کے تراشے ہوئے بُت کو چھوڑ دو تاکہ جہنم کے
سقر۔	عذاب سے محفوظ رہو۔"

حضرت مازنؓ فرماتے ہیں کہ اس حیرت انگیز آواز سے میں تعجب میں ضرور پڑ گیا۔ مگر میں نے اپنے آبائی دین کو ترک نہ کیا اور برابر اس بُت کی پرستش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پھر ایک روز میں نے اُس کے نذرانہ کے لئے ایک بکرا ذبح کیا تو پھر اس کے اندر آواز پیدا

ہُوئی۔ سُنا تو یہ رجز کے اشعار پڑھ رہا تھا ؎

اقبل الی اقبل: تسمع مالا تجہل   ھذا نبی مرسل جاء بحق منزل

میری طرف اچھی طرح متوجہ ہو جاؤ تاکہ وہ بات سُنو جس کو تم جہل کی بات نہ کہہ سکو گے۔ یہ نبی مُرسل ہیں جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے نازل شدہ دینِ حق لے کر آئے ہیں۔

آمن بہ کے تعدل عن حر نار تشعل   وقودھا بالجندل !!!

تم ان پر ایمان لے آؤ تاکہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ سے نجات پاؤ جس کے انگارے پتھر کے ہیں۔

حضرت مازن فرماتے ہیں کہ اب تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور مَیں نے سمجھ لیا کہ حق تعالےٰ مجھے کسی صحیح راستہ کی طرف ہدایت کرنا چاہتے ہیں۔ اتفاقاً انہی ایام میں ایک شخص اہل حجاز میں سے ہماری بستی میں پہنچ گیا۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ اپنے اطراف کی خبریں سناؤ۔ اُس نے نقل کیا کہ ہمارے بلاد میں ایک شخص پیدا ہُوا ہے جس کا نام احمد ہے جو کوئی اُس کے پاس جاتا ہے اس سے کہتا ہے (اجیبوا داعی اللہ) یعنی خدا کے داعی کی بات مانو۔

حضرت مازنؓ فرماتے ہیں کہ مَیں نے سمجھ لیا کہ جو کلمات کان میں خرقِ عادت کے طور پر ڈالے گئے تھے ان کا مصداق یہی شخص ہے۔ مَیں اُٹھا اور پہلے اس بُت کو توڑ ڈالا اور سواری کر کے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حق تعالےٰ نے اسلام کی حقانیت پر میرا شرح صدر اور اطمینان کامل کر دیا۔ مَیں مشرف باسلام ہو گیا اور یہ اشعار اُسی وقت کہے ؎

کسرت بادر اجذاذا وکان لنا   ربا نطیف بہ ضلا بتضلال !

مَیں نے بادر نامی (بُت) کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ حالانکہ پہلے وہ ہمارا معبود تھا۔ ہم گمراہی در گمراہی کی وجہ سے طواف کیا کرتے تھے۔

بالہاشمی ھدانا من ضلالتنا   ولم یکن دینہ شیئا علی بال

حق تعالےٰ نے مجھے بنی ہاشمیؐ کے ذریعے میری گمراہی سے نجات دی حالانکہ ان کا مذہب کبھی میرے خیال میں بھی نہ آیا تھا ؛

صحبت رسولؐ کا کیمیاوی اثر!

حضرت مازنؓ کے اخلاق و اعمال پر

حضرت مازنؓ فرماتے ہیں کہ مشرف باسلام ہوتے ہی مجھے اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کی فکر ہوئی اور عُرفی حیاء کو بالائے طاق رکھ کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں تین سخت گناہوں کا عادی ہوں۔ ایک گانا بجانا۔ دوسرے شراب خوری تیسرے فاحشہ عورتوں سے تعلق۔ آپؐ حق تعالے سے فرما دیجئے کہ بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ جائیں۔ مجھ میں سچی حیاء اور عفت پیدا ہو جاوے اور میرے کوئی لڑکا پیدا ہو جاوے۔

رسول مقبول صلّی اللہ تعالے علیہ وسلم نے دُعا فرمائی کہ یا اللہ! ان کو گانے بجانے کے بجائے تلاوتِ قرآن کی اور حرام کے بجائے حلال کی اور شراب کے بجائے ایک شربت کی عادت ڈال دے، جس میں کوئی گناہ نہ ہو اور ان کو زنا کے بجائے عفت کی توفیق دے اور ولد صالح عطا فرما۔

حضرت مازنؓ فرماتے ہیں کہ اس دُعا کی مقبولیت چند ہی روز میں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی کہ میں نے نصف قرآن حفظ کر لیا اور تمام ناپاک عادتیں مجھ سے چھوٹ گئیں۔ ہماری بستی قحط زدہ تھی، سرسبز ہوگئی اور میں نے چار عورتوں سے نکاح کیا اور حق تعالے نے مجھے حیآن (جیسا صالح) لڑکا عطا فرمایا۔ اس کی خوشی میں حضرت مازنؓ نے ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

الیک رسول اللہ حنّت مطیّتی تجوب الفیافی من عمان الی العرج

یارسول اللہؐ! میری سواری نے آپؐ ہی کی طرف اس طرح مشتاقانہ رُخ کیا کہ عمان سے عرج تک جنگلوں کو قطع کرتی ہوئی چلی آئی۔

لتشفع لی یا خیر من وطی الحصا فیغفر لی ذنبی وارجع بالفلج

اے سب زمین پر چلنے والوں میں بہترین ہستی! تاکہ آپؐ میری شفاعت فرمائیں تو میرے گناہ معاف ہو جائیں اور میں کامیابی کے ساتھ واپس ہوں۔"

الی معشرٍ خالفت فی اللہ دینھم ولا رائیھم رایی ولا شرجھم شرجی

ایک ایسی قوم کی طرف کہ میں نے محض اللہ کے لئے ان کے مذہب کی مخالفت اختیار کر لی ہے اور اب نہ میری رائے ان کے موافق ہے اور نہ میرا طریقہ اُن کے طریقہ کے مطابق۔

وکنت امرًا بالعھر والخمر مولعًا شبابی حتی اذن الجسم بالنھج

اور میں تمام زمانہ شباب میں زنا و شراب کا سخت عادی اور حریص آدمی تھا یہاں تک کہ جسم بالکل لاغر اور ضعیف ہو گیا۔

فبدلنی بالخمر خوفًا وخشیۃً وبالعھر احصانًا فحصن لی فرجی

مجھے اللہ تعالیٰ نے شراب کے بجائے خوف و خشیت اور زناکاری کے بجائے عفت فرج عطا فرما دے۔

فاصبحت ھمی فی الجھاد و نیتی فللّٰہ ما صومی وللّٰہ ما حجّی

پس میں نے اپنے ارادہ اور نیت کو جہاد میں صرف کر دیا پس اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے میرا روزہ اور حج۔

حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی برکاتِ عامہ کا عجیب مظہر ہے کہ بُت ہدایت کا سبب بن رہے ہیں ؎

ع مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن دریا میں

قبیلہ خثعم کا ایک بُت

اسی قسم کا ایک واقعہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے قبیلہ خثعم کا منقول ہے کہ وہ اپنے بُت کے پاس پرستش میں مشغول تھے اُس کے اندر سے آواز سُنی جس میں چند اشعار میں آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم اور اسلام کی طرف متوجہ

کیا گیا تھا (یہ اشعار بوجہ اختصار کے اس جگہ نقل نہیں کیئے) یہ لوگ حیرت میں رہے کہ محمد (صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم) کون ہیں اور اسلام کیا چیز ہے؟ یہاں تک کہ دو تین ہی روز کے بعد آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے حالات اور دعوتِ اسلام کی کیفیت کچھ آنے والوں سے پہنچی۔ یہ لوگ ابتداءً اس واقعہ کو محض وہم و خیال سمجھتے رہے۔ یہاں تک کہ پیہم اسی قسم کی آوازیں اپنے بتوں سے سُنتے رہے۔ بالآخر آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کی حقیقت دریافت کی رحق تعالےٰ نے ان کا شرح صدر فرمادیا اور سارا قبیلہ بیک وقت داخلِ اسلام ہو گیا۔

بنی عذرہ کے بُت خمام کی زبان پر کلمۂ اسلام

قبیلہ بنی عذرہ ایک بُت کی پرستش کرتے تھے جس کا نام انہوں نے خمام رکھا ہوا تھا۔ جب آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا ظہور ہوا تو اس بُت نے اپنے خاص پجاری طارق نامی کو خطاب کر کے بولنا شروع کیا اور کہا۔

یا بنی ھند بن حرام ظھر الحق	"اے قبیلہ بنی ہند بن حرام! حق ظاہر ہو گیا
و اودی خمام و دفع الشرک	اور خمام ہلاک ہو گیا اور اسلام نے
الاسلام۔ (حلبیہ ص۱۹۵)	شرک کو مٹا دیا"

اس حیرت انگیز آواز کو ابتداءً ان لوگوں نے بھی محض وہم و خیال سمجھا مگر پھر ایک روز اس میں آواز پیدا ہوئی اور کہا۔

یا طارق یا طارق! بعث	"اے طارق اے طارق! سچے نبی وحی ناطق کیساتھ
النبی الصادق بوحی ناطق	پیدا ہو گئے اور مکہ مکرمہ کی زمین میں ایک
صدع صدعۃ بارض تھامۃ	دعوت عام دیدی، اب انہی کے مددگاروں کے
لناصریہ السلامۃ و لخاذلیہ	لئے سلامتی ہے اور ان سے علیٰحدہ رہنے والوں
الندامۃ ھذا الوداع منی	کی رسوائی ہے اور بس اب قیامت تک کے لئے
الی یوم القیامۃ۔ (حلبیہ ج۱ ص۱۹۵)	میں تم سے رخصت ہوتا ہوں"

وہ بُت (حمام) یہ کلام کہتے ہی سر کے بل زمین پر گر پڑا۔

اس واقعہ عجیبہ نے بنی عذرا اور اُن کے رئیس حضرت زمل بن عمر کو اس پر مجبور کر دیا کہ فوراً آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا قصد کیا اور پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

نتائج خدا تعالےٰ کی قدرتِ کاملہ کا تماشہ دیکھئے کہ وہ بُت جو گمراہی کے ٹھیکیدار اور عالمِ انسان کو کفر و شرک میں مُبتلا کرنے کے لئے مخصوص آلات ہیں اور انھن اضللن کثیراً کے مصداق ہیں آج رحمۃ للعالمین فخر الاولین والاٰخرین حبیب اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کس شان سے استقبال کرتے ہیں کہ خود ہی لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کر رہے ہیں۔

؎ کنی آشنائے زبیگانہ   خلیلے برآری زبتخانہ

حق یہی ہے کہ مخلوقات کا ہر ذرّہ تکوینی مشین کا ایک پرزہ ہے اس کی ہر حرکت وسکون مشین کے چلانے والے کے تابع ہے۔ وہ جس سے جس وقت چاہے جو چاہے کام لے سکتا ہے۔

؎ ذرہ ذرہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے   زندگی کے خواب کی جامی یہی تعبیر ہے

یہ واقعہ عجیبہ جس طرح حق سبحانہٗ و تعالےٰ کی قدرت کاملہ کے عجیب نمونے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے شانِ عالی کے مظاہر ہیں اسی طرح ان شپرہ چشم مخالفین اسلام کے لئے بھی آخری پیغامِ الٰہی اور اتمامِ حجت ہیں، جو حقانیتِ اسلام پر پردہ ڈالنے کی فکر میں رہتے ہیں کہ اشاعتِ اسلام بزور تلوار کی گئی ہے۔ وہ آئیں اور عباس بن مُرداس اور ان کے قبیلہ سے، نیز قبیلہ مازن وخثعم سے اور قبیلہ بنی عذرہ کے عقلاء سے دریافت کریں کہ اُن پر کس نے تلوار چلائی تھی کہ اپنے آبائی مذہب و ملت کو چھوڑ چھاڑ کر بلادِ بعیدہ سے جنگلوں اور پہاڑوں کو طے کرتے ہوئے نبی اُمّی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے قبائل کی سیادت و ریاست کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی غلامی کو اپنا تاج سلطنت سمجھا۔ حضورؐ کے ادنیٰ اشارے

پر اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے میدان میں کھڑے ہوئے نظر آنے لگے۔ اگر یہ سوال کرنے کی ہمت کر جائیں تو عجب نہیں کہ آج بھی ان بزرگوں کے مزارات سے بزبان حال یہ جواب ملے ؎

درونِ سینۂ من زخم بے نشان زدہ　　بحیرتم کہ عجب تیرِ بے کمان زدہ

اور ؎

خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند　　غلام نرگس مستِ تو تاجدار انند

ایک درخت کی آواز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے بعض لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا اسلام لانے سے پہلے آپ نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا مشاہدہ کیا تھا۔ فرمایا ہاں! میں ایک روز ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک اس کی ایک شاخ نیچے جھکی اور میرے سر سے مل گئی۔ میں تعجب سے اس کو دیکھنے لگا تو اس میں سے ایک آواز آئی۔

هٰذا النبی یخرج فی وقت کذا وکذا انکن انت من اسعد الناس بہ۔

"یہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فلاں وقت ظاہر ہوں گے۔ آپ سب سے پہلے ان کی تصدیق کی سعادت حاصل کریں"۔

درختوں کے پتوں اور پھولوں پر کلمۂ شہادت

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جب ہم جہاد کے لئے ہندوستان گئے تو اتفاقاً ایک بن میں گزر ہوا۔ وہاں عجائبِ قدرت کا ایک نیا تماشہ دیکھا کہ ایک درخت کے سب پتے نہایت سُرخ رنگ کے تھے اور ہر پتے پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سفید حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

اسی طرح بعض دوسرے حضرات کا بیان ہے کہ ہم ایک جزیرہ میں پہنچے وہاں

ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے ہر پتہ پر قلمِ قدرت نے نہایت واضح وخوشخط یہ کلمہ تین سطروں میں لکھا ہُوا تھا۔ پہلی سطر میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور دوسری سطر میں مُحَمَّد رسول اللّٰہ اور تیسری سطر میں ان الدین عند اللّٰہ الاسلام۔

اور بعض حضرات نے بیان کیا کہ ہم ہندوستان میں داخل ہوئے تو ایک گاؤں میں ایک گلاب کا درخت دیکھا جس کے پھُول سیاہ رنگ مگر نہایت خوشبودار تھے۔ اس کے پھول کی ہر پنکھڑی پر سفید حرفوں میں لکھا ہُوا تھا۔ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ابو بکر الصدیق۔ (حلبیہ ص۲۱۲ ج ۱)

یہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شبہ ہُوا کہ یہ کلمہ کسی نے ان پھولوں میں لکھ دیا ہے میں نے بغرض تحقیق اس کے ایک غنچہ ناشگفتہ کا توڑا۔ دیکھا تو اس کے اندر سے بھی پھُول کی ہر پتی پر یہی کلمہ صاف لکھا ہُوا نکلا۔ پھر میں نے تحقیق کی تو معلوم ہُوا کہ اس قسم کے پھُول بکثرت ہیں۔ اور عبرت کی یہ چیز ہے کہ ساری بستی پتھروں کی پرستش میں مُبتلا تھی۔

اور ابن مرزوقؒ نے شرح بُردہ میں اسی قسم کا واقعہ ایک درخت کے پھُول کا نقل کیا ہے۔ جس میں یہ الفاظ لکھے ہُوئے تھے:۔ براءۃ من الرحمن الرحیم الی جنات النعیم۔ لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔

اسی طرح بعض مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ ہم نے بلادِ ہندوستان میں ایک درخت دیکھا جس کا پھل بادام کے برابر تھا اور اس پر دو چھلکے تھے۔ اُوپر کا چھلکا اُتارنے کے بعد اندر سے ایک سبز پتہ لپٹا ہُوا نکلتا تھا جس پر سُرخ رنگ میں نہایت خوشخط اور صاف طور پر کلمہ لکھا ہُوا تھا لا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ۔ اور اس بستی کے لوگ اس درخت کو متبرک سمجھتے تھے۔ اگر قحط پڑ جاتا تھا تو اس کے طفیل سے بارش طلب کیا کرتے تھے۔

اور ۸۰۹ھ میں ایک انگور کا دانہ پایا گیا جس کو بے شمار لوگوں نے دیکھا کہ اس پر قلمِ قدرت کے واضح لفظوں میں محمد لکھا ہُوا تھا۔

اسی طرح ایک شخص نے ایک مچھلی پکڑی جس کے بازو پر لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پر محمد رسول اللہ لکھا ہُوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے تعظیماً اس کو قید کرنا پسند نہ کیا اور پھر دریا میں چھوڑ دیا۔

اسی طرح بحر مغرب سے بعض لوگوں نے ایسی ہی مچھلی شکار کی اور پھر تعظیماً دریا میں چھوڑ دیا۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک ایک پرندہ جانور آیا۔ جس کی چونچ میں ایک بادام تھا۔ وہ اس نے مجلس میں ڈال دیا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اُس کو اٹھالیا۔ اس میں ایک سبز رنگ کا کپڑا نکلا جس پر زرد رنگ سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا ہُوا تھا۔ (سیرت حلبیہ ج اوّل)

طبرستان کے ایک بادل پر کلمۂ شہادت

بعض مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ طبرستان کے بعض گاؤں میں ایک قوم آباد تھی جو لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہٗ کی قائل تھی مگر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے نبوّت کی قائل نہ تھی۔ اتفاقاً ایک سخت گرمی کے دن میں یہ عجیب واقعہ پیش آیا کہ دفعتہً ایک گہرا بادل اُٹھا اور تمام بستی اور اُس کے اطراف میں چھا گیا۔ بادل نہایت سفید تھا۔ یہ بادل صبح سے چھایا ہُوا تھا۔ جب ظہر کا وقت ہُوا تو اس میں دفعتہً نہایت جلی حرفوں میں یہ کلمہ لکھا ہُوا ہر خاص و عام نے دیکھا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور پھر قلم قدرت کا نوشتہ اسی طرح برابر عصر کے وقت تک باقی رہا۔ یہ غیبی ہدایت نامہ پڑھ کر وہ لوگ سب مسلمان ہو گئے۔ اور اکثر اس بستی کے رہنے والے یہود و نصاریٰ اور اہلِ علم تھے۔

ایک بچّہ کے مونڈھوں پر کلمۂ شہادت

بعض مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بلادِ خراسان میں ایک بچّہ دیکھا جس کی

ایک کروٹ میں قدرتی طور پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور دوسری پر مُحَمَّدٌ رسول اللہ لکھا ہُوا اوّل ولادت سے دیکھا۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ۴۶۲ھ ہجری میں میرے گھر میں ایک بکری کے بچہ پیدا ہُوا جس کی پیشانی پر ایک دائرہ سفیدی کا تھا اور اس کے اندر نہایت خوشخط اور صاف (محمّد) لکھا ہُوا تھا۔

اسی طرح بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ ہم نے افریقہ میں ایک شخص دیکھا جس کی آنکھ کی سفیدی کے نیچے کی سُرخ حرفوں میں نہایت خوشخط یہ کلمہ لکھا ہُوا تھا۔ (محمّد رسول اللہ)۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنی کتاب "لواقع الانوار" باب قواعد السادۃ الصوفیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ جس روز میں اس باب کی تحریر پر پہنچا ہوں تو علاماتِ نبوّت میں سے ایک عجیب چیز کا مشاہدہ کیا کہ ایک شخص میرے پاس ایک بکری کے بچّہ کا سر لے کر آیا، جس کا گوشت بھُون کر وہ کھا چکا تھا اور اس کی پیشانی پر قلمِ قدرت کا یہ نوشتہ موجود تھا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمّد رسول اللہ ارسلہ بالھدی ودین الحق بالھدی بہ من یشاء یھدی بہ من یشاء۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اس قصّہ کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اس نوشتہ قدرت میں جو یھدی بہ یھدی بہ دو مرتبہ لکھا ہے تو یہ کسی خاص حکمت پر مبنی ہے۔ کیونکہ یہاں سہو کا تو احتمال نہیں اور ممکن ہے کہ حکمت اس کی غایت تاکید ہو۔

امام المحدثین زہری رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ فرماتے ہیں کہ مَیں ہشام بن عبدالملک کے پاس جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ جب بلقاء میں پہنچا تو ایک پتھر دیکھا جس پر عبرانی زبان میں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

مَیں نے اُس کو اٹھا لیا اور ایک عبرانی جاننے والے بزرگ سے اُس کے پڑھنے کے لئے عرض کیا۔ جب اُس نے پڑھا تو ہنسنے لگا اور کہا کہ عجیب بات ہے

اس پر لکھا ہُوا ہے :-

باسمک اللھم جاء الحق	"یا اللہ! تیرے نام سے شروع کرتا ہوں
من ربک بلسان عربی	حق آپ کے رب کی طرف سے عربی
مبین لا الٰہ الا اللہ محمد	فصیح زبان میں آگیا لا الٰہ الا اللہ
رسول اللہ کتبہ -	محمد رسول اللہ - لکھا ہے اس کو
(موسیٰ بن عمران)	موسیٰ بن عمران نے) -

ف یہ کائنات عالم کی ہر نوع حیوانات و نباتات وجمادات ہیں کہ اپنی زبان بے زبانی کے ساتھ حقانیت اسلام اور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی شہادت دے رہی ہیں۔ افسوس کہ بہت سے بدبخت اور غافل انسان ان کو دیکھ کر اور سُن کر بھی متنبہ نہیں ہوتے ؎

گفتم ایں شرط آدمیت نیست
مُرغ تسبیح خواں و تُو خاموش

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
مدرس دارالعلوم دیوبند
۵ ربیع الاوّل ۵۶ھ

اضافہ از مجدد الملت حکیم الامت قطب عالم حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

احقر نے اپنا مضمون مذکور اپنے آقا حضرت مولانا موصوف کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت والا نے از راہِ شفقت پسند فرما کر اس کا نام "ذکر العبد المشفیع فی ذکر السید الشفیع" تجویز فرمایا اور اپنے مضمون مندرجہ ذیل کے اس کے ساتھ الحاق کا مشورہ دیا، جو الحمد للہ کہ "رسالۃ النور" ماہ شوال ۱۳۴۵ھ میں مطبوعہ مل گیا۔ اس کو بھی اتمامِ فائدہ کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔

بندہ محمد شفیع عفا عنہ

آیۃ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ

کا

ایک تازہ اور شان دار ظہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زاں کہ بودش بادشاہاں از ہولست	بار نامہ انبیأ با کبریاست
از درمہا نام شاہاں برکنند	نام احمد تا قیامت مے زنند
نام احمد چوں حصارے شد حصین	تا چہ باشد ذاتِ آں روح الامین

سوال حضرت مخدومنا ومعظمنا ومقتدانا مدظلہ العالی! بعد سلام مسنون و اشتیاق قدم بوسی عارض مدعا ہوں۔ ۲ر فروری ۲۶ء کو جسے دو مہینے چھ روز ہوئے ہیں، الہ آباد میں تھے۔ وہاں یہ خبر مشہور ہوئی کہ دیہات کے کچھ لوگوں نے شہر میں، بعد مغرب کے آسمان پر پچھم جانب لفظ محمد لکھا ہوا دیکھا۔ یہ خبر اس قدر مشہور ہوئی کہ اخبار والوں نے اکثر پرچوں میں شائع کر دیا۔ مجھے اس خبر کے صحیح ہونے کا نہ تو پورے طور سے یقین ہوا نہ قطعاً دل میں انکار رہا۔ اس لئے کہ زمانہ کی جو حالت ہے ظاہر ہے۔ چار پانچ روز ہوئے موضع ستنا سے ایک شخص آئے اور انھوں نے خود مجھ سے اس واقعہ کا تذکرہ اس صراحت سے کیا کہ تاریخ مذکورہ بالا کو بعد غروب آفتاب آسمان پر ایک سیدھا خط چمکتا ہوا نہایت تیزی کے ساتھ مثل بجلی کے ظاہر ہوا۔ اس کے بعد اس میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس حرکت کے پہلے میم، اس کے بعد ح اس کے بعد پھر میم دال کا مقصد پیدا ہو کر بخط عربی محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا پورا نام مبارک نقش ہو گیا۔ قریب دس، پندرہ منٹ کے یہ صورت قائم رہی۔ مواضع منگواں، ستنا، جبلپور، کٹنی، مرواڑہ وغیرہ میں ہندو، مسلمان، عیسائی، آتش پرست، غرضیکہ ہر قوم کے لوگوں نے اس کثرت سے دیکھا کہ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں، لہٰذا امیدوار ہوں کہ اس معاملہ کے متعلق حضور کو جو تحقیق ہو اس سے مطلع فرمایا جاؤں تاکہ قلب کو اطمینان ہو جائے اور نیز ان لوگوں کو بھی اس سے مطلع کر دوں۔ چونکہ یہ واقعہ ایک نہایت عظیم الشان اور بالکل نیا ہے اس لئے لوگ اپنے اپنے خیالات کے موافق چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔

خادم محمد عمر از چائل ضلع الہ آباد

الجواب

بشریٰ فقد انجز الاقبال ما وعدا ۔۔۔ وکوکب المجد من افق العلیٰ صعدا

ایسے واقعات کی دلالت کسی خاص معنی پر کسی دلیل شرعی صریح سے تو ثابت نہیں

اس لئے کسی خاص مدلول پر استدلال جاذب نہیں کیا جا سکتا لقولہ تعالیٰ ولا تقف ما لیس لک بہ علمٌ۔

لیکن قرائن اور اشاراتِ واردہ فی النصوص سے اس کی دلالت علوشان و رفعت مکان حالاً یا مآلاً پر مظنون ضرور ہے۔ بعض نصوص مذکورہ فی المواہب نشر الطیب سے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) حاکم سے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک عرش پر لکھا دیکھا اور اللہ تعالےٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا۔

(۲) حضرت عمرؓ بن الخطاب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام سے خطاء کا ارتکاب ہو گیا تو انہوں نے باری تعالےٰ سے عرض کیا کہ اے پروردگار! میں آپ سے بواسطہ محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے درخواست کرتا ہوں کہ میری مغفرت ہی کر دیجئے۔ سو حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدمؑ! تم نے محمد صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو کیسے پہچانا؟ حالانکہ ہنوز میں نے ان کو پیدا بھی نہیں کیا۔ عرض کیا کہ اے رب! میں نے اس طرح پہچانا کہ جب آپ نے مجھ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی (شرف دی ہوئی) روح میرے اندر پھونکی تو عرش کے پایوں پر یہ لکھا ہوا دیکھا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔

روایت کیا اس کو بیہقی نے اپنے دلائل میں، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی روایت سے اور کہا کہ اس کے ساتھ عبدالرحمٰن متفرد ہیں۔ اور روایت کیا اس کو حاکم نے اور اس کی تصحیح کی۔ اور طبرانی نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ (فصل دوم)

اور فضائے آسمان گو درجہ میں عرش کے برابر نہیں مگر جرمِ علوی ہونے میں باہم متشارک ہیں تو اس فضاء میں ظاہر ہونا حضور کے نام مبارک کا دلالت مذکورہ میں اگر مماثل نہیں تو متقارب ضرور ہے اور اس سے اخفٰ آثار کو مخالفین تک نے دلالت میں کافی سمجھا ہے۔ چنانچہ نشر الطیب میں مواہب سے بروایت بیہقی و ابو نعیم حضرت حسان

بن ثابتؓ سے نقل کیا ہے کہ شب ولادت شریفہ کی صبح کو ایک یہودی نے چلانا شروع کیا لوگوں نے کہا کہ تجھ کو کیا ہوا ؟ کہنے لگا کہ احمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہ ستارہ آج شب میں طلوع ہو گیا جس کی ساعت میں آپ پیدا ہونے والے تھے۔ (فصل ششم)

اسی طرح بعض واقعات کو آپؐ کے اعداء کی پستی وفناء کی طرف اشارہ سب منافقین ومخالفین نے سمجھا ہے۔ چنانچہ کسریٰ کے ایوان کا زلزلہ اور چودہ کنگروں کا گر پڑنا اور بحیرہ طبریہ کا دفعتًا خشک ہو جانا اور آتش کدۂ فارس کا بجھ جانا، (کما رواہ البیہقی وابو نعیم والخرائطی وابن عساکر فی المواھب ۔) زوالِ سلطنت فارس وروم کی طرف اشارہ سمجھا گیا ۔ (فصل ششم نشر الطیب)

پس اصول مذکورہ پر مظنون بظن قوی یہ ہے کہ یہ اشارہ ہو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کے ظہور علو کی طرف اور غالب یہی ہے کہ مقصود اس نشان سے حضورؐ ہی کا نام مبارک ہے اور اس صورت میں بجائے آسمانی نام احمدؐ کے ارضی نام محمدؐ کا (کما ورد فی الحدیث) ظاہر ہونا ، علو فی الارض کی طرف اشارہ ہو گا اور احتمال مرجوح یہ بھی ہے کہ اس سے امام مہدی علیہ السّلام کا نام مراد ہو ۔ کما فی الحدیث یواطی اسمہ اسمی واللہ اعلم باسرارہٖ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔

(۱۱ر شوال ۴۵ ۱۳ ھ)

تصدیق مزید وتوثیق اکید واقعہ مذکورہ سوال بالا

از خط مولوی حکیم محمد مصطفٰے صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمد وصلوٰۃ احقر محمد مصطفٰی[1] بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی عرض رسا ہے کہ فروری ۱۹۲۷ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مختلف مقامات پر بعد مغرب آسمان پہ حضور سرور عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا نام مبارک نہایت صاف الفاظ میں دکھائی دیا اور جملہ اخبارات میں یہ خبر اس طرح شائع ہوئی کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی طرح سے یہ واقعہ دیکھا گیا۔ یہ واقعہ ۸ر فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۵ر شعبان ۱۳۴۵ھ بعد مغرب کا ہے۔ سب اخباروں نے قریب قریب متفق اللفظ روایت کیا ہے (ان اخبارات کے نام ونمبر وپتہ سب آگے لکھے جاویں گے) یہاں ہم وہ تحریر شائع کرتے ہیں جو ہم کو ایک نہایت معتبر ذریعے سے پہنچی ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے جن کو میں عرصہ سے جانتا ہوں اور برابر اُن سے خط وکتابت رہتی ہے خود اپنا چشم دید واقعہ مجھ کو لکھا۔ بجواب اُس کے میں نے اُن کو یہ لکھا کہ یہ واقعہ ایسا نہیں ہے کہ تنہا آپ نے دیکھا ہو، آسمانی شہادت ہے اس کو صدہا آدمیوں نے اور

---

[1] جناب مولانا حکیم محمد مصطفٰی صاحبؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں اور نہایت متبع سنت بزرگ تھے۔ حضرت تھانویؒ کی کئی کتب کی شرح بھی حضرت کی اجازت سے لکھی ہیں۔ قیام پاکستان سے کافی زمانہ قبل میرٹھ میں انتقال ہوا۔ ۱۲ محمد زکی

ہندوؤں اور مسلمانوں اور ہر قوم نے دیکھا ہوگا۔ براہ مہربانی جس قدر آدمی دیکھنے والے آپ کے علم میں ہوں اُن کے دستخط اور نشان انگوٹھا لگوا کر بھیجیے۔ چنانچہ انہوں نے ۵۴ دیکھنے والوں کی تصدیق مع نام ولدیت و سکونت ثبت کر کے بھیجے، وہ سب ہدیۂ ناظرین ہے۔ ان مخلص دوست کا نام و پتہ یہ ہے:۔

"غلام مرتضیٰ ولد محمد علی صاحب مستاجر موضع مرہٹی تحصیل دیوری گورنمنٹ بھوپال"

یہ صاحب نہایت دیانت دار اور ذاکر، شاغل آدمی ہیں۔ ان اخبارات کے نام اخیر میں لکھے جائیں گے۔

نقل خط

محمد مصطفیٰ، مورخہ ۱۵ شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۲۷ء روز دوشنبہ، واقع ۵ شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ۔ یوم سہ شنبہ یعنی منگل مطابق ۸ ماہ فروری ۱۹۲۷ء ۲۲ ماہ ماگھ ۱۳۳۴ فصلی کو بعد نماز مغرب ہم لوگوں نے جنگل موضع پراسیہ پرگنہ جھاری تحصیل دیوری گورنمنٹ بھوپال میں یہ واقعہ دیکھا کہ مغرب یعنی پچھم کی طرف جہاں ایک چمکدار ستارہ شام سے نکلتا ہے۔ اس ستارہ کے قریب سے ایک بہت روشن ستارہ ٹوٹا اور جہاں تک جا کر غائب ہوا تھا، ایک روشن لکیر پہلے بنی مثل سانپ کے پھر رفتہ رفتہ وہ لکیر موٹی ہو کر نام مبارک محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قریب قریب اسی صورت کا جیسا کہ میں نے بنایا ہے بن گیا، وہ بہت بڑا تھا کاغذ میں چھوٹا بنایا گیا ہے۔ اور محمد کے میم سے ایک بہت باریک لکیر اس مقام تک گئی تھی جہاں سے ستارہ ٹوٹا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹہ یعنی ۳۰ منٹ تک یہ نام مبارک قائم رہا۔ پھر کم ہوتے ہوتے غائب ہوگیا اور جن حضرات نے یہ واقعہ ظہور نور مبارک حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دیکھا ہو تو ذیل کے نقشہ میں اپنے تصدیقی دستخط کر دیں تاکہ دوسرے مقامات پہ اطلاع دی جاوے۔

فقط المرقوم یکم ماہ رمضان المبارک ۱۳۴۵ھ یوم یک شنبہ

راقم غلام مرتضیٰ مستاجر موضع مرہٹی تحصیل دیوری گورنمنٹ بھوپال

(اس کے بعد نقشہ تھا جس میں دیکھنے والوں کا نام و ولدیت و سکونت اور دستخط تصدیقی درج تھا۔ اختصار کے لئے بجائے نقشہ کے فہرست مسلسل عبارت میں لکھ دی گئی وہ فہرست[1] یہ ہے۔ (مدیر)

۱۔ غلام مرتضیٰ ولد محمد علی متاجر موضع مرہٹی تحصیل دیوری۔ نمبردار۔

۲۔ نظر محمد ولد شیخ نیھتے پٹواری موضع پرتاپ گڑھ۔ (دستخط ہندی میں)

۳۔ سید ناظم حسین ولد سید شاہ فدا حسین صاحب پرتاپ گڑھ تحصیل دیوری۔

۴۔ صبیح الدین ولد مسیح الدین شیخ صدیقی موضع مرہٹی تحصیل دیوری بھوپال (دستخط طغرا میں۔

۵۔ محمد مصطفیٰ ولد غلام مرتضیٰ شیخ صدیقی موضع مرہٹی تحصیل دیوری بھوپال۔

۶۔ سعید محمد ولد نظر محمد موضع پرتاپ گڑھ تحصیل دیوری بھوپال۔

۷۔ مظفر علی پنشنر واصل باقی نویس ولد اصغر علی مرہٹی تحصیل دیوری بھوپال۔

۸۔ محمد زمان خاں صاحب ولد دھومن خاں پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال (دستخط در انگریزی)

۹۔ حسن یار خاں صاحب ولد محمد یار خاں ناکیدار سائر پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

۱۰۔ پنڈت رگو نندن پرشاد صاحب ولد اجودھیا شاد نائب مدرس، مدرسہ پرتاپ گڑھ مرہٹی دیوری بھوپال۔ (دستخط انگریزی)

۱۱۔ کنھیدی لعل ولد چھٹکے قوم بقال مرہٹی دیوری بھوپال۔ (دستخط انگریزی)

۱۲۔ عبد العلیم ولد عبد الکریم پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

۱۳۔ کنھیدی لعل عبد ولد ماٹھیا قوم کنوار چوکیدار مرہٹی دیوری بھوپال (نشان انگوٹھا)

۱۴۔ محمد بشیر ولد محمد اسماعیل طالبعلم درجہ ششم پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

۱۵۔ نتھو ولد کرن سنگھ چوکیدار موضع پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال (دستخط ہندی)

۱۶۔ احسان علی صاحب ولد یٰسین سپاہی سائر متعینہ پرتاپ گڑھ دیوری علاقہ بھوپال

۱۷۔ جگت عبد الحمید خان صاحب ولد علی داد خاں ماست کار متعینہ پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

---

[1] ان دستخط کرنے والوں کے علاوہ بعض دیکھنے والے صاحبوں سے ملاقاتوں بھی ہوئی جنہوں نے اپنا دیکھنا بھی مفصل بیان کیا ۱۲ اشرف علی۔

۱۸۔ جگت سنگھ ولد جگرام سنگھ مستاجر یعنی نمبردار، موضع پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔ (دستخط ہندی)

۱۹۔ محمد اسماعیل ولد شیخ امیر پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔ (نشان انگوٹھا)

۲۰۔ سید حامد حسین صاحب ولد سید شاہ حسین کاشتکار پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

۲۱۔ امراؤ ولد نند رام قوم لوہار مرہٹی دیوری بھوپال (نشان انگوٹھا)

۲۲۔ کاشی ولد بھورا قوم کمہار مرہٹی دیوری بھوپال (نشان انگوٹھا)

۲۳۔ ہیرا لعل ولد اندر قوم لوہار مرہٹی دیوری بھوپال۔ (نشان انگوٹھا)

۲۴۔ شیخ کلو ولد شیخ امیر پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال

۲۵۔ ستیل پرشاد ولد منجی قوم بقال مرہٹی دیوری بھوپال۔ (دستخط ہندی میں)

۲۶۔ سکندر ولد کلا سنگھ موضع پرتاپ گڑھ تحصیل دیوری بھوپال شہر ساگر۔ سی پی علاقہ انگریزی

(نشان انگوٹھا اور دستخط)

۲۷۔ منشی احمد حسین صاحب ولد سید شاہ فدا حسین محرر انسپکٹری سائر دیو لاپور سکنہ پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال۔

۲۸۔ عبدالشکور ولد امام بخش سکنہ موضع پرتاپ گڑھ دیوری بھوپال موضع دیوری تحصیل کیسلی ضلع ساگر علاقہ انگریزی۔

۲۹۔ جمن ولد امام بخش سکنہ ساگر علاقہ انگریزی وارد حال پرتاپ گڑھ تحصیل دیوری علاقہ بھوپال موضع نبرہ متصل شہر ساگر۔ علاقہ انگریزی۔ (دستخط ہندی)

۳۰۔ منور ولد پیر بخش سکنہ موضع پرتاپ، گڑھ بھوپال مرہٹی دیوری بھوپال۔

۳۱۔ محب اللہ خاں ولد عبداللہ خاں مستاجر موضع نگورہ تحصیل دیوری بھوپال۔

۳۲۔ شیو بخش صاحب ولد صاحب سنگھ مستاجر بیکلپور تحصیل دیوری بھوپال (دستخط ہندی)

۳۳۔ سلیمان خاں پوسٹ ماسٹر ولد مصاحب خاں سکنہ جبتھاری۔

۳۴۔ عبدالجبار مدرس اوّل سکنہ جبتھاری۔

۳۵۔ شیخ دھنو ولد شیخ کالے کاشت کار جبتھاری۔

۳۶۔ عبدالرحیم خاں ولد مصطفیٰ خاں کاشت کار، جبتھاری۔

۳۷۔ منشی اکرام الدین ولد محمد عبدالباقی سکنہ بھوپال حال چھتاری۔

۳۸۔ اسمٰعیل خان ولد رسول خان مؤذن مسجد جھتاری۔ (نشان انگوٹھا)

۳۹۔ محمد شکور خان ولد نور خان سکنہ جھتاری۔

۴۰۔ شہزاد علی ولد اکبر علی سکنہ جھتاری۔

۴۱۔ زین الدین ولد منو کاشت کار جھتاری۔

۴۲۔ شیخ جان محمد ولد شیخ ابو نابینا جھتاری۔ (نشان انگوٹھا)

۴۳۔ رادھے لعل بلب بقال سکنہ جھتاری۔ (دستخط ہندی میں)

۴۴۔ پیارے لعل خاں سکنہ جھتاری۔ (دستخط ہندی میں)

۴۵۔ نرندا پرشاد ولد منشی گیا پرشاد قوم کالیستھ سکنہ چیونٹیا مستقر جاگیر۔

مَیں بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ مضمون حسب مندرجہ بالا بالکل صحیح ہے مَیں نے بھی بروز مقرّرہ بالا چشم خود دیکھا ہے بلکہ از ابتداء آغاز علامات فلکی سے تا انتہا بغور دیکھتا رہا۔ جو علامت اسم مبارک (آنحضرت) بتلائی گئی ہے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک حروف نمایاں شدہ خود بخود پڑھے گئے۔ اس کی جو شکل پیدا ہو گئی تھی وہ یہ تھی (محمد) مَیں نے اپنے قرآئن عقلی سے اسے محشر پڑھا ہے۔ گو (ش) کے نقطے نہ ہونے سے دوسرا لفظ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر با معنی لفظ اس سے بہتر اور کوئی میرے خیالِ ناقص میں نہیں آیا۔ اب ناظرین والا تمکین اگر کوئی لفظ با معنی تصوّر کر سکیں تو انسب ہے۔ خاکسار نے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے جس سے جو کچھ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے وہ ذی فہم اصحاب اخذ فرمالیں۔ فقط

۱۳ر مارچ ۱۹۲۷ء

(نوٹ:۔ اگر ایسا ہُوا تو ظاہر تو یہی ہے کہ بتدریج غائب ہونے کے لئے ایسے تغیّرات لازم ہیں لیکن اگر اس ہیئت کو مقصود بھی سمجھا جاوے تو یہ محسر ہے سین مہملہ سے تحسیر بمعنی الایقاع فی الحسرۃ سے سو اشارہ ہو سکتا ہے کہ اسطرف سے یہ نشان آپکے بدخواہوں کو حسرت میں واقع کریگا ۱۲)

اخبارات اس واقعہ کی خبریں "آئینہ" اخبار میرٹھ ۲۴ر فروری ۱۹۲۷ء میں کسی قدر جمع کر کے چھاپی گئی ہیں۔ شہر جبلپور کی خبر بحوالہ سیٹھ احمد علی، رجب علی جنرل مرچنٹ کمانیہ گیٹ جبلپور ہے۔ اور بریلی کی بحوالہ منظور حسین اسپیشل ماسٹر بریلی اور ساگر

سے بحوالہ محمد عباس خاں، محمد ابراہیم خاں، مہتاب خاں وفعدار صاحب، فیاض خاں، محمد شکور خاں، عبدالحکیم صاحب، محمد اسحاق، عبداللہ خاں۔ نیز ساگرہ سے بحوالہ ساکنان موضع کھوئی دراحت گڑھ ومینا جنگش ودموہ ومختلف اقوام سکھ وہندو اور رائے پور سے بحوالہ نور محمد، عبدالشکور اسٹیٹ کنورہ ضلع رائے پور سی پی۔ اور بھوپال سے بحوالہ محمد لطیف کریم میڈیکل افسر رائسین گورنمنٹ بھوپال۔ انہوں نے بذریعہ موٹر خود جاکر بیس تیس میل تک تحقیق کیا۔ نیز ساگرہ سے بحوالہ خورشید علی صاحب نقل کیا ہے۔ اخبار مدینہ بجنور میں ۱۳ر فروری ۱۹۳۷ء کے پرچہ میں خبر چھپی ہے اور بکثرت اخبارات میں جن کے نام اس وقت محفوظ نہیں یہ واقعہ موجود ہے۔ (مضمون تصدیقی ختم ہوا)

ضمیمہ تقریباً دس سال ہوئے کہ ایک مقام پر ایک مچھلی شکار کی گئی تھی، اس کے پچھلے حصہ پر ایک جانب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ اور دوسری جانب شان اللہ منقوش تھا۔ اس کا مفصل واقعہ حسن العزیز جلد چہارم کے حصہ مکتوبات کے نمبر ۲، ۴ مرقومہ ۱۲ر محرم ۱۳۳۶ھ میں شائع ہو چکا ہے جس میں شان اللہ کی کوئی توجیہہ مذکور نہیں ہوئی۔ اس وقت ذہن میں آتا ہے کہ عجیب نہیں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا لقب ہو بایں معنی کہ شان بمعنی قصد مصدر بمعنی اسم مفعول یعنی مقصود ہو آپ کا مقصود حق سب سے اور ہونا ثابت ہے۔ تو واقعہ قدیمہ بھی اس واقعہ جدیدہ کا اس اعتبار سے نظیر ہے کہ دونوں نقش میں صنع عمد کا کوئی دخل نہیں اور اس واقعہ سمک کے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ ایک بیضہ پر اسم مبارک محمدی کے انتقاش کا بطور ضمیمہ کے نیز رسالہ مذکورہ میں شائع ہوا ہے۔

فسبحان الذی اقام الحجج التکوینیۃ مع الحجج التشریعیۃ من اٰیاتہ علی توحید ذاتہ ورسالۃ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مظہر صفاتہ واللہ اعلم ؎

لہ یہ جواب بعد تسلیم ہے ورنہ خبر واحد بمقابلہ کثرت متواترہ کے خود غیر مسلم ہے ؎

رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

پیغمبر امن وسلامت کی حیثیت سے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی والسلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصاً علی سیدنا

محمد المصطفی ومن بہدیہ اہتدی

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ جس کے سننے سنانے کے لئے یہ مجلس منعقد کی گئی ہے درحقیقت شریعتِ اسلام اور قرآن کریم کی عملی تصویر کا دوسرا نام ہے۔ جو اپنے دامن میں انسانی زندگی کے ہر دور اور ہر گوشہ کے لئے ایسی اہم ہدایات رکھتی ہے کہ ان کے بغیر کسی نظریہ اور کسی نظام میں انسان کی فلاح وبہبود ناممکن اور اس کو مکمل طور پر اختیار کرنے میں دین ودنیا کی مکمل فلاح وکامیابی یقینی ہے۔ ہر شعبہ زندگی اور اس کی متعلقہ ہدایات کے اعتبار سے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مختلف صفات وحیثیات ہیں اور ہر صفت کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی کو اپنی تحریر وتقریر کا موضوع بنایا جائے ؂

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی ایک مجلس میں یا ایک مقالہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی کسی ایک صفت یا ایک حیثیت کو بھی پورا بیان کر دینا کسی کے بس میں نہیں۔ اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس کا کوئی اجمالی خاکہ پیش کر دیا جائے۔ احقر نے اپنے مقالہ کا عنوان "امن عالم کی حیثیت" کو قرار دیا ہے۔ اسی کے متعلق اپنی قدرت وبصیرت

کی حد تک کچھ عرض کر رہا ہوں جس کو اقبال مرحوم نے اپنے ایک شعر میں بڑی بلاغت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

فرد کی ہو کہ فرنگی ہوس خام میں ہے　　　امن عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

اس دنیا میں انسانوں کے مختلف طبقات ہیں چھوٹے سے لے کر بڑے تک، بچہ سے لے کر بوڑھے تک، ان پڑھ جاہل سے لے کر ایک ماہر عالم اور بڑے سے بڑے فلاسفر تک ہر شخص کی جدّوجہد اور محنت و کوشش میں اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو ثابت ہو گا کہ اگرچہ محنت اور کوشش کی راہیں مختلف ہیں مگر آخری مقصد سب کا ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ ہے "امن و سکون کی زندگی"۔

کسی نظریہ کی صحت یا غلطی اور نظام کی خوبی یا خرابی کو جانچنے کا سیدھا سادہ سا راستہ بھی یہی ہے کہ اصل مقصد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے کہ یہ نظریہ اور نظام ہمیں اس مقصد تک پہنچاتا ہے یا نہیں اور پہنچاتا ہے تو مکمل یا ادھورا؟ جو نظریہ اور نظام کامل طور پر اس مقصد تک پہنچانے میں کامیاب ہے وہ صحیح اور صراطِ مستقیم ہے اور جو مقصد تک پہنچانے میں ناکامیاب یا مقصد سے دور کرنے والا ہے وہ باطل اور گمراہی ہے اور جو کسی درجہ میں مقصد سے قریب کرتا ہے، وہ ناقص اور ادھورا ہے۔

اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد آئیے اور دنیا کے قدیم و جدید نظریات اور نظاموں پر نظر ڈالئے اور پھر رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عملی زندگی اور آپ کی تعلیمات کا مطالعہ کیجئے اور سب کو اس نظر سے دیکھئے کہ ان میں سے کون سا نظریہ اور نظام ایسا ہے جو پوری دنیا اور تمام اولاد آدم کو مکمل امن و سلامتی اور سکون و اطمینان بخشنے میں کامیاب ہے۔

اس نظریاتی مقابلہ میں اگر آپ نے اپنے ذہن کو گردوپیش کے تاثرات اور گروہی عصبیتوں سے آزاد رکھ کر غور کیا تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ آپ کو اس کا ایک ہی جواب ملے گا کہ امن عالم کا ضامن نظریہ اور نظام صرف رسول کریمؐ کے

اسوۂ حسنہ اور آپؐ کی تعلیمات میں منحصر ہے۔

اس معاملہ کی تفصیل اور تجزیہ میں جانے سے پہلے اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ کسی قاتل کو قتل کرنا یا کسی چور کو سزا دینا یا کسی بدمعاش کو مار پیٹ کرنا، ڈاکوؤں کے منظم گروہ سے جنگ کر کے ان کو جرم سے روکنا یا ختم کرنا اگرچہ بظاہر کچھ انسانوں کو تکلیف میں ڈالنا یا ضائع کر دینا ہے۔ مگر یہ کسی سمجھ دار انسان کے نزدیک عام دُنیا کے امن وسلامتی کے منافی نہیں بلکہ عام انسانوں کے امن وسکون اور سلامت و اطمینان کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر چند جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دے کر تکلیف میں نہ ڈالا جائے تو پوری انسانیت کا امن وسکون برباد ہو جاتا ہے اور پوری دنیا بدامنی اور بے چینی میں مُبتلا ہو جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے جہاد وغزوات اور آپ کی قائم کردہ حدود وتعزیرات سب، اسی حقیقت، پر مبنی ہیں جو اصلاح حال کی ساری تدبیروں سے مایوس ہو جانے کے بعد آخری علاج کے طور پر عمل میں لائی گئی ہیں۔

اب اصل مسئلہ کی تفتیح کے لئے آگے بڑھئے!

مَیں نے اس جگہ دو لفظ استعمال کئے ہیں ایک نظریہ اور دوسرا نظام۔ نظریہ سے مراد وہ عقیدہ ہے جس کو انسان صحیح اور حق سمجھتا اور مقصود زندگی بنا کر اپنی عملی زندگی کو اس کے تابع چلاتا ہے اور نظام سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے کسی مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔

انہی دونوں چیزوں کے بگاڑ اور سنوار پر دُنیا کی پوری قوموں کا بگاڑ اور سنوار موقوف ہے۔ جس کا نظریہ اور عقیدہ ہی غلط ہو گیا اور اُس نے اپنا مقصد زندگی ہی کسی غلط چیز کو بنا لیا، اس کا نظام کارکتنا ہی مستحکم اور معقول ہو وہ کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا اور جس کا نظریہ اور مقصد تو صحیح مگر نظام کار غلط یا ناہموار ہے وہ بھی اپنی اس بے عملی سے اس نتیجہ کو حاصل نہیں کر سکتا جو صحیح عقیدہ اور نظریہ پر مرتب ہونا چاہیئے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو دُنیا کی امن وسلامتی کی ضمانت لے کر

تشریف لائے ہیں۔ آپؐ نے اس دنیا کو نظریہ بھی وہ دیا جو عقل و فطرت کے رو سے بالکل حق و صحیح ہے اور نظام بھی وہ عطا فرمایا جو ہر شعبہ زندگی میں نہایت معتدل، آسان اور فطری اور سو فیصدی کامیاب ہے۔

اسلامی نظریہ جس کو لے کر رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور وہ تین اصولوں پر مبنی ہے:۔

توحید[1]، رسالت[2] اور آخرت[3]

توحید کا حاصل یہ ہے کہ ساری کائنات کا خالق و مالک اور حاجت روا صرف اللہ تعالےٰ کو مانا جائے۔ اس کی مخصوص صفات کمال علم، قدرت، خلق، تقدیر وغیرہ میں اس کے سوا کسی مخلوق کو شریک یا برابر نہ ٹھہرائیں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ اس جہان میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے اذن و مشیت سے ہوتا ہے اس کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ نہیں ہل سکتا۔ سارا جہان اسی کی ملک اور مملکت ہے۔ اس میں صرف اسی کا حکم اور قانون چلنا چاہیئے۔ اس کے مخالف کوئی حکم اور قانون قابلِ عمل نہیں بلکہ قابلِ رد ہے۔ ہاں! اس نے اپنے کرم سے مباحات کا ایک بہت بڑا وسیع دائرہ رکھا ہے جس میں انسانوں کو اپنے اپنے زمانہ اور اپنے مقام کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کا حق دیا ہے۔

جب عقیدۂ توحید نے انسان کو یہ بتلایا کہ سارے جہان کا مالک اور مختار ایک ہے اسی کا حکم ماننا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا انسانیت کے خلاف ہے تو یہیں سے عقیدۂ رسالت خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہٗ کی بلکہ دنیا میں کسی انسان کی بھی پسند و ناپسند کو کوئی انسان محض اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا جب تک اس کی طرف سے اس کا علم نہ ہو اور احکام الٰہیہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی کے بتلانے سے معلوم ہو سکتے ہیں اور ہر انسان اس کا اہل نہیں ہو سکتا کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ اس کو خطاب فرمائیں اس لئے رسول کا واسطہ ضروری ہوا جو اللہ تعالےٰ کے احکام اور اُن پر عمل کے ایسے طریقے بتلائے جو اللہ تعالےٰ کی پسند کے موافق ہوں اور

اُس کا ہر قول و فعل احکامِ الٰہیہ کا ترجمان ہو۔

جب پہلے دو عقیدوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کی اطاعت رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے بتلائے ہوئے طریقوں کے مطابق کرنا فرض ہے اور اس کی خلاف ورزی جرم ہے تو یہیں سے تیسرا عقیدہ آخرت کا پیدا ہو گیا۔ جس میں انسان کے بھلے بُرے اعمال کا حساب اور ان کی جزاء اور سزا کا ہونا عقلاً ضروری ہو گیا ورنہ احکام اور رسولؑ کا بھیجنا بے کار ٹھہرتا ہے۔

غرض یہ تین اصولی عقیدے ایک دوسرے پر مرتب ہیں اور ان سب کی بھی اصل بنیاد توحید ہے اور وہی درحقیقت انسان کی اصلاح و فلاح اور امن و سلامتی، سکون و اطمینان کا سرچشمہ ہے جس کی تشریح عنقریب آ جائے گی۔ اسلامی عقائد کی تفصیل و تشریح کا یہ مقام نہیں۔ اجمالاً اتنا کافی ہے۔

نظامِ زندگی جو رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے دُنیا کو عطا فرمایا ظاہر ہے کہ اس کا رشتہ اسی نظریہ توحید و خدا پرستی کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ اس کی وسعت میں وہ تمام اسباب معاش بھی آنے چاہیئں جو ایک انسان کو دنیا میں عافیت و اطمینان کے ساتھ باعزت زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں۔ گویا اسلامی نظام ایک سلسلہ ہے جس کا ایک سرا خالقِ کائنات سے ملتا ہے اور دوسرا مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی رشتہ اور سلسلہ کو عرف میں دین یا مذہب کہا جاتا ہے۔ دین فطرت اور صحیح مذہب وہی ہو سکتا ہے جو خالق و مخلوق دونوں کے حقوق کو اپنی اپنی حد میں پورا کرے اور جس کے ذریعے ایک انسان بیک وقت اللہ تعالےٰ سے بھی پورا تعلق قائم رکھے اور تمام مخلوقات سے بھی اپنے نفس اور اہل و عیال اور سب متعلقین کی ضرورتیں بھی پوری کرے اور اپنے مالک و خالق کو بھی ہر قدم پر راضی رکھے۔

حضرت آدم علیہ السّلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم تک تمام انبیاء و رُسل کے آنے کا مقصدِ وحید خالق و مخلوق میں اسی رابطہ کو مستحکم و مضبوط بنانا اور خلق خدا کو اس نظام کا پابند بنانا ہے۔ تمام آسمانی کتابیں اسی نظام کی تشریح و تکمیل

کے لئے نازل ہوئی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ کوئی آسمانی شریعت و مذہب ایسا نہیں جس میں خدا تعالےٰ و خلق دونوں کے حقوق کی ادائیگی اور تعلق مع الخلق کی ہمواری کا اہتمام نہ کیا گیا ہو جس کو دوسرے لفظوں میں معاش (یعنی دنیوی زندگی) اور معاد (یعنی اخروی زندگی) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اپنے اپنے زمانے میں ہر رسول و نبی معاش و معاد دونوں کی اصلاح و فلاح کا ضامن ہو کر آتا رہا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ معاد یعنی اخروی زندگی سے قطع نظر کر لی جائے تو معاش یعنی دنیوی زندگی بھی ہموار اور پر لطف نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح معاش سے قطع نظر کر کے معاد کی فکر بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نصاریٰ کے دین میں جو رہبانیت (یعنی ترکِ دُنیا) کی تعلیم بتائی جاتی ہے وہ بھی عیسائیوں کا اپنا اختراع ہے۔ نہ خدا تعالےٰ نے اس کا حکم دیا ہے نہ ان کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہی بتلایا۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح کر دیا :۔

ورہبانیۃ ابتدعوھا "یعنی انہوں نے رہبانیت کی بدعت خود نکالی ہے
ماکتبناھا علیھم - ہم نے ان کو حکم نہیں دیا۔

غرض نہ معاد کے بغیر معاش درست ہو سکتا ہے اور نہ معاش کے بغیر عام لوگوں میں معاد کی فکر کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور ہر آنے والا رسول چونکہ خدا و خلق کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کا اصل فریضہ یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان کے معاد کے ساتھ معاش کو بھی درست کرے۔ اور معاد کی اہمیت اور اولیت کو ان کے ذہنوں سے غائب نہ ہونے دے۔ وہ جس قدر اس فریضہ کی ادائیگی میں کامیاب ہوتا ہے اسی قدر اللہ تعالےٰ کے نزدیک اس کا درجہ بلند ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض۔ یعنی ہم نے ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے" انہی درجاتِ کامیابی کا نتیجہ ہے۔

ہمارے آقا سردار دو عالم رسول اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سید الرسل اور امام الانبیاء قرار دینے کی بڑی وجہ بھی اصلاحِ خلق کے بارہ میں آپ کی وہ حیرت انگیز کامیابی ہے جو

تمام انبیاء سابقین کے مقابلہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

میدانِ حشر میں حسبِ تصریحات حدیثِ نبوی، آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی اُمّت تمام انبیاء سابقین کی اُمتوں سے زیادہ بھی ہوگی اور فائق بھی۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کا زمانہ وہ انتہائی ظلمت و گمراہی کا زمانہ تھا جس میں تقریباً عالم انسانیت مشرق سے لے کر مغرب تک خدا تعالےٰ سے اپنا رشتہ یکسر توڑ چکا تھا۔ انسان خدا تعالےٰ اور آخرت کو بھلا کر دُنیا کے عام جانوروں کی طرح صرف پیٹ بھرنے اور چندروزہ راحت ولذت کے حاصل کر لینے کو ہی اپنی معراجِ کمال سمجھ بیٹھا تھا۔ قرآن کریم نے اس کے اسی حال کو بیان فرمایا:

وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا	یعنی یہ لوگ صرف دُنیا کی زندگی پر مطمئن ہو گئے
وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا۔	اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔

حقیقت شناس اہلِ بصیرت کے نزدیک ان کی مثال اس وقت اس بچہ کی سی تھی جو ایک کروڑ روپے کے چیک کو پھینک کر ایک جھنجھنے پر راضی ہو جائے۔ حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں صرف دنیا پر مٹنے والے لوگ سب کے سب نابالغ بچے ہیں جو حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ مولانا روم نے خوب فرمایا ہے ؎

ماخلق اطفال الا جز مردِ خدا   نیست بالغ جز رھیدہ از ھویٰ

دُنیا کی رنگینیوں میں مست ہو کر خدا تعالےٰ و آخرت کو بھلا دینے والا درحقیقت رنگین پردوں کو اپنا محبوب سمجھ بیٹھا۔ یہاں ضرورت ہوتی ہے کسی حقیقت آگاہ صاحبِ بصیرت کی جو ان کی نگاہ کو ان پردوں سے آگے بڑھا کر مقصودِ اعلیٰ تک پہنچا دے۔ مولانا جامیؒ نے فرمایا ؎

ہمہ اندر زمن ترا زمن است   کہ تو طفلی و خانہ رنگیں است

اور جب کوئی ان رنگین پردوں کا فریب خوردہ حقیقت سے روشناس ہو جاتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی!   مرا با جان جان ہمراز کردی

اس وقت اس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ مَیں نے جس چیز کو اپنا محبوب بنایا ہُوا تھا وہ محض ایک فریب تھا ؎

کچھ بھی مجنوں جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے
تُو نے پہلے جسے سمجھا تھا وہ محمل ہو جائے

غرض خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کا زمانۂ بعثت وہ زمانہ ہے جب تقریباً ساری دُنیا خدا و آخرت اور معاد کا سبق قطعاً بھلا کر صرف معاش کے پیچھے پڑی ہوئی تھی انسان اپنی اصلی حیثیت کو بُھلا کر زیادہ سے زیادہ ایک ہوشیار جانور بن کر رہ گیا تھا جو اپنی ہوشیاری سے دوسرے جانوروں پر حکومت کر رہا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے آئینۂ حقیقت دکھلا کہ ان کو ان کی اصلی صورت و شکل اور اُس کے تقاضوں سے آگاہ کیا جس کا حاصل خدا شناسی اور خدا پرستی ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تصوّرِ معاد کے بغیر معاش بھی کبھی ہموار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُن کے معاش میں بھی طرح طرح کی ناہمواریاں، ظلم و جور، چوری، ڈاکہ، بدمعاشی، عیاشی، بے حیائی بُری طرح چھاگئی تھی۔ یہ وہ سنگلاخ زمین اور ظلم و ظلمت سے لبریز فضا تھی جو سیّد الرسل فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اصلاح کے لئے عطا ہوئی۔

پھر اس وقت کی دنیا اگرچہ خدا و آخرت کو ساری ہی بھلا چکی تھی مگر انسانی معاشرت تہذیب اور تعلیم کے اعتبار سے اس کے خطّوں میں خاصا تفاوت تھا۔ مصر و شام، ہندو چین معاشی علوم و فنون اور اس کی وجہ کچھ انبیاء سابقین کی لائی ہوئی تہذیب لئے ہوئے تھے آثار میں دوسرے ملکوں اور خطّوں سے ممتاز تھے۔ خصوصاً ملک شام میں انبیاء بنی اسرائیل اس کثرت سے مبعوث ہُوئے تھے کہ مٹتے مٹتے بھی ان کی تعلیم کے آثار وہاں قائم تھے۔

مگر ربّ العزّت نے اپنے آخری رسول کی پیدائش اور بعثت کے لئے ان سب مہذب اور تعلیم یافتہ ممالک سے ہٹ کر اس خطہ کا انتخاب فرمایا جو نہ زراعتی ملک ہے نہ تجارتی، نہ صنعتی اور تعلیمی۔ بلکہ اس ملک کے باشندوں کا امتیاز ہی یہ ہے کہ اُمّیین

(یعنی ان پڑھ) کہلاتے ہیں، ان ہی میں آپؐ پیدا ہوئے، ان ہی میں جوان ہوئے ان ہی میں مبعوث ہوئے۔ اہلِ عرب عموماً جاہل تھے۔ بجز اُن چند افراد کے جو ملک شام وغیرہ میں جاکر کچھ تعلیم حاصل کر آئے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بھی کہیں موقع نہیں ملا کہ کسی تعلیمی جگہ پر چند روز قیام کر کے وہیں سے کچھ سیکھ لیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا بھی اعلیٰ وصف اُمّی ہونا تھا۔ یہ یاد رہے کہ اُمّی کے معنے اَن پڑھ کے ہیں یعنی جس نے کسی انسان سے نہ پڑھا ہو۔ اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بے علم ہو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت میں اقرأ میں یہ بتلادیا ہے کہ علم حاصل ہونے کی جیسے ایک صورت معروف ومشہور یہ ہے کہ علم استاد کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ اسی طرح ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی کو بدون ان واسطوں کے براہِ راست علم عطا فرمادے۔ اسی لئے سورت مذکورہ میں عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کے بعد عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ فرماکر اس دوسری قسم کی طرف اشارہ فرمادیا۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم بلا شبہ اُمّی تھے آپؐ نے کسی معلم یا استاد سے کچھ نہیں سیکھا مگر حق تعالےٰ نے آپؐ کی تعلیم کا خود تکفل فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو تمام علوم اوّلین و آخرین کے تمام خزانے عطا فرمائے ؎

اُمّی لوح خوان ما لاحی   نقد یثرب سُلالہ بطحیٰ

آپؐ کی زبان مبارک پر وہ راز کھلے کہ جن کو سن کر دنیا کے عقلاء وفلاسفر حیران رہ گئے۔ آپؐ کی ہدایات اور تعلیمات خود ہی معجزہ اور بہت بڑا معجزہ بن کر لوگوں کے سامنے آئی کہ ان کو سننے والا یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں بلکہ علیم وخبیر کی دی ہوئی ہدایات ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو نہ صرف علم کے خزانے عطا فرمائے بلکہ تعلیم و تربیت کے وہ انداز بھی آپؐ کو سکھلا دیئے کہ جن سے کام لے کر آپؐ نے ان جاہل، ناسمجھ، خود رائی، مغلوب الغضب، جنگجو لوگوں کو انسان کامل کا پیکر بنادیا۔ اور یہ

قریب الموت مریض نہ صرف شفایاب ہوئے بلکہ دنیا کے لئے مسیحا ثابت ہوئے۔ دُنیا کے انصاف پسند غیر مسلم بھی آج تک ابو بکرؓ، عمرؓ کی سیاست اور عدل و انصاف کا لوہا ماننے پر مجبور ہیں۔ مسٹر گاندھی کا وہ ہدایت نامہ ابھی تک بہت سے لوگوں کو یاد ہو گا جو اُنہوں نے اپنے کانگرسی وزراء کا لکھا تھا جس میں یہ ہدایت درج تھی کہ ابو بکر و عمر جیسی حکومت کرو۔ اور جب اس پر اُن کے ہم مذہب بعض ہندوؤں نے غیرتِ عصبیت کی بناء پر یہ اعتراض کیا کہ آپ نے ہندو مصلحین میں سے کسی کا نام کیوں نہ لیا تو مسٹر گاندھی نے اس کا جواب بھی اپنی انصاف پسندی سے یہ دیا کہ ہندو مصلحین کی حکایات زمانہ قبل از تاریخ کی کہانیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ زمانۂ تاریخ میں مجھے ابو بکر و عمر سے بہتر حکومت کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

یہ ابو بکر و عمر بھی اسی قوم امیین کے افراد تھے۔ کیا یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ان کے یہ علمی اور عملی اخلاقی کمالات کہاں سے آئے؟ یہ نہ کسی تعلیم گاہ کے فاضل تھے نہ کسی آکسفورڈ یونیورسٹی کے سند یافتہ۔ انہوں نے نہ صرف نبی الانبیاء حکیم الحکماء کی چند روز صحبت پائی تھی۔ جو کچھ سیکھا وہیں سے سیکھا ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو، چار دن رہے تھے کسی کی نگاہ میں

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی عمر شریف کے چالیس سال تو ایسی خاموشی اور یکسوئی میں گزرے کہ مکہ کے باشندے آپؐ کی ثقاہت و امامت اور شرافتِ نفس کے تو ایسے قائل تھے کہ پورے مکہ میں آپؐ کا لقب امین مشہور تھا۔ مگر کسی بازار، کسی جلسہ، کسی ہنگامہ میں کبھی شرکت نہیں فرمائی۔ شعر و شاعری عرب کی فطری چیز ہے۔ ہر مرد و عورت شعر کہتا اور اس کو اپنے قومی جلسوں میں سناتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی شانِ امتیاز کو واضح کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ

نے آپؐ کو اس ظاہری وجہ شہرت سے بھی الگ رکھا اور قرآن میں فرما دیا: وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ۔ یعنی ہم نے ان کو شعر کہنا نہیں سکھلایا اور شعر گوئی آپ کے لئے شایان شان بھی نہ تھی۔ غرض چالیس سال تو بالکل خاموشی اور یکسوئی میں گذرے۔ اس کے بعد جب آپؐ کو عہدۂ نبوّت و رسالت عطا ہوا۔ وحی الہیٰ کا فیضان ہوا تو تاریخ شاہد ہے کہ زمانہ نزول وحی کے ابتدائی تیرہ سال جو مکّہ میں گذرے ہیں وہ آپؐ کے اور آپؐ کے رفقاء مسلمانوں کے لئے انتہائی سخت اور صبر آزما تھے۔ جہاں بلند آواز سے اذان دینے پر قدرت نہ تھی، جہاں دوستی کے جواب میں دشمنی، خیر خواہی کے جواب میں پتھراؤ، کلمۂ حق کے جواب میں انھوں نے نہ تھا۔ ان حالات میں کوئی اصلاحی سکیم کتنے قدم چل سکتی تھی اور بڑے سے بڑا مصلح اعظم کیا کر سکتا تھا۔ مگر رسول کریم صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی خداداد صلاحیت اور حکمت و دانشمندی اور خلقِ خدا کی ہمدردی و خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ انتھک کوشش اور مایوس کن حالات سے مایوس نہ ہونا ایسے اوصاف تھے جو بالآخر میدان جیت کر رہے۔

مکی دورِ زندگی تو انہی حالات میں گذرا اور مدینہ طیّبہ کی ہجرت کے بعد کا دس سالہ دَور ایسا ہے کہ جس کو آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم اور مسلمانوں کے لئے سکون و اطمینان کا اور تعمیری پروگراموں کو بروئے کار لانے کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہی دس سالہ دور ہے جس میں بدر و احد، خندق و خیبر، فتح مکہ و حنین کے عظیم الشان معرکے اور اسی طرح کے ستائیس غزوات ہیں جن میں خود سرور کائنات صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم بہ نفس نفیس شریک ہوئے اور سینتالیس وہ معرکے ہیں جن میں خود تشریف نہیں لے گئے صحابہ کرامؓ کو بھیجا گیا جن کو سرایا کہا جاتا ہے۔ ستائیس غزوات اور سینتالیس سرایہ کے چوہتر معرکے ہیں جو ان دس سالوں میں سر کرنے پڑے۔ اس میں دوسری قوموں سے معاہدات اور ان کی طرف سے عہد شکنی کے واقعات بھی سامنے آئے اور اگر اپنا اور اقوام دنیا کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو کیا کسی کو کوئی تصور ہو سکتا ہے کہ اس طرح کے معرکوں میں گھری ہوئی کوئی حکومت اپنے اس دس سالہ دور میں بھی کوئی تعمیری پروگرام بروئے کار

لا سکتی ہے۔

لیکن دُنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ اسی دس سالہ عہدِ نبویؐ میں پُورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیرِ نگین آگیا تھا۔ اس کی ہر بستی اذان اور تلاوتِ قرآن کی آوازوں سے گونج رہی تھی اور اس کے ہر صوبہ اور ہر خطہ پر رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عمّال بڑی آب و تاب سے اسلامی قانون جاری کر رہے تھے۔ پورے قلمرو اسلامی میں عدل و انصاف مفت اور فوری تھا۔ امن و امان کا یہ عالم کہ جس خطّہ میں صدیوں سے کسی کو آزادانہ سفر ممکن نہ تھا، ایک کمزور بڑھیا اس میں بڑی آزادی کے ساتھ سفر کرتی تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی آپؐ ہی کے عہد میں پوری ہو گئی تھی کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ جب ایک آدمی صنعاء (یمن) سے حضرموت تک تنہا سفر کرے گا اور اُس کو خدا تعالےٰ کے سوا کوئی خوف نہ ہو گا۔ جس ملک میں کسی کی بہو بیٹی کی عزت محفوظ نہ تھی وہاں غیر محرم کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ جن کا پیشہ راہزنی اور عام لوگوں کے اموال کے نگران اور محافظ بن گئے تھے۔

خلیج فارس سے لے کر حدود شام تک تو یہ امن و سلامتی اور سکون و اطمینان خود عہدِ نبوی میں پہنچ چکا تھا اور رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی وفات کو پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ اسلامی نظریہ اور نظام آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں اپنی برق رفتار سے بڑھ کر پورے عالم میں پھیل چکا تھا۔

اسلام کی اس حیرت انگیز ترقی سے تو موافق و مخالف ساری دنیا ہی حیرت زدہ ہے یورپین مؤرخین کی کتابیں اس پر اظہارِ حیرت سے پُر ہیں۔ کچھ متعصب لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کو کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی کہنے لگے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ اور یہ ایسا جھوٹ ہے کہ شاید اس آسمان کے سایہ میں ایسا بڑا جھوٹ کوئی نہ بولا گیا ہو؟ ساری باتوں سے قطع کر کے کوئی پوچھے کہ جن لوگوں کو تلوار کی جھنکار اور تیروں کی بوچھاڑ کے سایہ میں اسلام کا حلقہ بگوش بنایا گیا ہو کیا ان کی یہی شان ہوتی جو قرونِ اولیٰ کے عام مسلمانوں میں مشاہدہ کی جاتی تھی کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسولؐ اور

اسلام کے ایسے فدائی ہیں کہ اس کے مقابلہ میں نہ مال و دولت کی پرواہ نہ بیوی بچوں کی نہ اپنے تن من کی۔ اور کوئی پوچھے کہ تلوار کا کام تو اسلام کے بالکل آخری دس سال میں ہوا ہے۔ مکہ مدینہ میں رہتے ہوئے جو اسلام کی اشاعت اور اس میں داخل ہونے والوں کی کثرت نے قریش مکہ کو خوف زدہ کیا ہوا تھا اس وقت کون سی تلوار چل رہی تھی۔ ہاں اسلام سے روکنے کے لئے ہر تلوار اور ہر طاغوتی قوت پوری سرگرمی سے میدان میں آئی ہوئی تھی۔ بلال حبشیؓ کے سینے پر پتھر رکھ کر اس کو احد کہنے سے روکا جاتا تھا سلمان فارسیؓ کو رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی بات پوچھنے پر طمانچے لگائے جاتے تھے۔ صہیب رومی پر تیروں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ ہر مسلمان ہونے والے پر کوئی ستم نہ تھا جو توڑا نہ جاتا ہو۔ مگر اللہ کے بندے تھے کہ ان طاغوتی قوتوں کے زیر سایہ موت سے کھیلتے ہوئے مسلمان ہو رہے تھے۔

ہاں! یہ بھی تو سوچئے کہ تلوار تو جبھی چلی ہو گی جب تلوار چلانے والوں کا کوئی جتھہ، کوئی قوت پیدا ہو گئی ہو گی۔ تو کوئی پوچھے کہ ان تلوار چلانے والوں کو کس تلوار نے اسلام کا فدائی بنا دیا تھا کہ سر کو کفن باندھ کر ہر میدان میں سربکف کھڑے نظر آتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سفید جھوٹ کی تردید کرنا بھی سچ کی توہین ہے ہاں اسلام کی اس حیرت انگیز ترقی کو ممکن ہے کہ کچھ ناواقف لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ سراسر رسول اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا معجزہ ہے اسباب و تدابیر کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ لیکن غور کیا جائے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے معجزات بے شمار اور اپنی جگہ یقینی اور ان فتوحات میں بھی ان کا ظہور کھلا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ایک معجزہ اور خرق عادت تھا جو ہو چکا اور اب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ اور نظام درجہ اسباب میں بھی ایسی چیز ہیں کہ جب ان کو پورا پورا عمل میں لایا جائے تو اس کے یہی آثار و برکات ہر زمانہ اور ہر ملک میں رونما ہو سکتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

اسلامی نظام اور اسلامی نظریہ ہی امن و اطمینان کا ضامن ہے

مجھے اپنے اس مقالہ میں درحقیقت یہی دکھلانا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ جس نے تمام دُنیا کو ایک صحیح نظریہ اور مستحکم عادلانہ نظام دیا ہے وہ بجائے خود دُنیا کی امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ اس کی مزید توضیح کے لئے آیئے ذرا اس نظام کا تجزیہ کرکے دیکھیں کہ اس میں وہ کون سی روح ہے جس کے جلو میں دُنیا کی امن و سلامتی گردش کرتی جارہی ہے۔ سُنیئے !

"کسی عالمگیر تحریک اصلاح کے لئے یہ ظاہر ہے کہ کسی کی انفرادی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی بلکہ اجتماعی نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے ہر قوم و ملت میں جب کوئی اصلاحی تحریک اُٹھائی جاتی ہے تو اُس کے پیچھے قوم کی اجتماعی قوت ہی کام کرتی ہے۔

لیکن یہاں ایک دھوکہ بڑے بڑوں کو لگ جاتا ہے اور عام دنیا اسی دھوکہ کی شکار ہے جس کی وجہ سے ان کی اجتماعی کوششیں عالمگیر اصلاح کے معاملہ میں ناکام ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اجتماع اور اجتماعی قوت کا کوئی الگ وجود نہیں ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہو یا زمین سے اُگتا ہو بلکہ افراد کے مجموعہ کا نام اجتماع اور ان کی مجموعی طاقت اجتماعی طاقت ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کے افراد صحیح نہیں تو اس کا اجتماع بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ بوگس و ناکارہ افراد کی بھیڑ کوئی اصلاحی کام نہیں کرسکتی۔ بلکہ اس کو باقی بھی نہیں رکھ سکتی ہے۔

افراد کا درجہ اجتماع میں ایسا ہے جیسے کسی مشین میں اُس کے پُرزوں کا۔ جب پُرزے ہی درست نہ ہوں تو مشین کی فٹنگ کیسے درست ہوسکتی ہے اور کسی طرح فٹ بھی کردیا تو وہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی۔

اجتماعی کام سے پہلے افراد سازی

حکیم الحکماء خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اس گُر کو سمجھا اور اختیار فرمایا ہے کہ کوئی اجتماعی کام کرنے سے پہلے افراد سازی کا کام سب سے اہم ہے اور درحقیقت یہی کام سب سے زیادہ مشکل بھی ہے۔ ایک فرد کے ذہن کو صحیح نظریہ پر ہموار کرنا پھر اُس کے اعمال واخلاق کو اس نظریہ کے مطابق ڈھالنا بڑا وقت اور بڑی محنت چاہتا ہے۔

عطاءِ نبوت کے بعد رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمر کل تئیس سال ہی باقی ہے جس میں سے مکی دور کے تیرہ سال پورے صرف اسی افراد سازی کے کام میں صرف ہوئے ہیں۔ مکّی اور مدنی دَور کا تجزیہ کرنے والے بعض حضرات اس کو ضعف وقوت کی دو حالتوں میں تقسیم کر کے مکّی دَور کو ضعف کا اور مدنی کو قوت کا دور قرار دیتے ہیں اور احکام و واقعات کو اس کے تابع کرتے ہیں۔

لیکن غور کیا جائے تو صرف ضعف وقوت ہی تفاوتِ احکام کا سبب نہیں، بلکہ دوسری حکمتیں بھی اولین مستور ہیں۔ ورنہ مشرکینِ مکّہ کا زیادتیوں کا کچھ نہ کچھ مقابلہ ضعف کے باوجود مکّہ میں بھی کیا جاسکتا تھا۔

بظاہر حکمت یہ تھی کہ مکّی دَور میں افراد سازی ہی کا کام پیشِ نظر تھا۔ کوئی اجتماعی کام خواہ دفاع کا ہو یا اقدام کا اس کی تکمیل سے پہلے صحیح نہ تھا۔

"یہ افراد جو عالمگیر اصلاح اور امنِ عالم کے لئے مکّہ مکرمہ کے ایک گمنام گوشہ دار ارقم میں چھپ چھپ کر تیار کئے جا رہے تھے ان کی اصلاح و تربیت کن خطوط پر کی گئی اس کا اندازہ قرآن کریم کے اس حصہ سے ہوتا ہے جو اولین زمانہ میں نازل ہوا۔ سورہ مزمل، مدثر اور فاتحہ وغیرہ جن میں تقویٰ وطہارت عبادت وریاضت اور ذکر اللہ کی کثرت اور جفاکشی اور دشمنوں اور ایذا دینے والوں کے مقابلہ میں عفو و درگزر اور مکمل طور پر صبر و ضبط کی تلقین کی گئی تھی"

جب تک کسی مشین کے پُرزے درست نہ ہوں تو ان سے کوئی مشین اور فیکٹری کیسے تیار کی جاسکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پہلا کارنامہ

آنحضرت صلی اللہ تعالے علیہ وسلم دنیا میں امن اور اطمینان وسکون کے علمبردار ہو کر تشریف لائے تو آپ کی نظرِ حقیقت شناس اس پر پڑی کہ یہ کام تنہا نہ کسی حکومت و سلطنت سے ہو سکتا ہے۔ نہ صرف قانون اور اخلاقی مشینری سے جب تک کہ انسان کو صحیح معنی میں انسان نہ بنایا جائے اور صحیح انسانیت سے روشناس نہ کیا جائے۔ اس وقت تک یہ دنیا ظلم وجور، قتل وغارت گری، بے حیائی وبد معاشی کا جہنم ہی بنی رہے گی۔ کیونکہ حکومت کوئی کام اپنے اعوان ہی کے ذریعہ عمل میں لاسکتی ہے اور کوئی قانون خود کار مشین نہیں ہوتا کہ خود بخود چلے بلکہ اس کو نافذ کرنے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔ جب انسان صحیح معنوں میں انسان ہی نہ ہوں تو کوئی قانون اور کوئی دستور اور کوئی حکومت مفاسد کی اصلاح، جرائم کا سدِباب اور دنیا میں امن وامان پیدا نہیں کر سکتی۔

اس لئے مکی دور کے تیرہ سال پورے اس افراد سازی کے کام پر صرف کئے گئے جس میں پیغمبرانہ حکمت کے ساتھ کچھ انسانوں کو انسان کامل بنایا گیا۔

یہ افراد سازی کا کام مکہ مکرمہ کے ایک گمنام گوشہ میں ایک چھوٹے سے مکان کے اندر ہوتا تھا جو "دار ارقم" کے نام سے موسوم صفاء ومروہ کے درمیان واقع تھا اور حالیہ توسیع حرم سے پہلے تک موجود ومحفوظ تھا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالے عنہ اسی مکان پر ننگی تلوار لئے ہوئے پیغمبر امن وسلامت کا قصہ ختم کرنے کے قصد سے آئے اور پھر اسلام کے حلقہ بگوش ہو کر آپ کی غلامی کی سعادت لے کر لوٹے تھے۔

رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم پچھلے انبیاء علیہم السلام کی طرح کسی خاص قوم یا خاص خطہ ملک یا خاص زمانہ کے رسول بن کر نہیں آئے تھے بلکہ آپ کی بعثت اور آپ کی

دعوت پوری دُنیا کے جن وانس اور قیامت تک پیدا ہونے والی نسلوں کے لئے عام تھی۔
اور فرضِ منصبی آپؐ کو یہ سونپا گیا کہ پورے عالم کی اصلاح کر کے سب انسانوں کو دُنیا
میں امن وسکون اور عزت وعافیت کی زندگی عطا کریں اور ان کو اس قابل بنائیں کہ
آخرت میں اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو کر وہاں کی دائمی راحت کے وارث بنیں۔
اس مقصد کے لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سب سے پہلا کام سامنے
کچھ انسانوں کا ایک مثالی معاشرہ پیدا کرنا تھا جو اس عظیم مقصد میں آپؐ کے دست بازو
بنیں اور آئندہ اس بارگراں کو سنبھالنے کے قابل ہوں۔

یہ افراد سازی کا عظیم الشان کام جو راقم کے گمنام گوشہ میں شروع ہُوا تھا
اس کام کا مختصر عنوان تو انسان کو انسان کامل بنانا ہے اور اس کی تفصیل و تشریح
وہ پورا قرآنؐ ہے جو مکّی دورِ نبوت میں نازل ہُوا جس کی ہدایات کا تجزیہ کرنے
سے چند چیزیں نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہیں جن کو انسان کامل بنانے میں
خاص دخل ہے :-

۱۔ اللہ تعالےٰ کی عظمت و محبت۔

۲۔ فکرِ آخرت

۳۔ دنیا کی چند روزہ زندگی اور اس کی راحت و کلفت کی حقیقت کا انکشاف۔

۴۔ مخلوقات کے ساتھ معاملہ میں ان کے حقوق کی پوری ادائیگی اور اپنے
حقوق سے چشم پوشی۔

۵۔ ان کی ایذاؤں پر عفو و درگذر اور اپنی طرف سے ہر حال میں ان کی خیر خواہی
اور ہمدردی۔

مکّی دورِ نبوت کی تمام سورتوں اور آیتوں کا بغور مطالعہ کیجئے تو ان میں انہی
اصولوں کی تلقین اور معجزانہ انداز سے انسان کے ذہن کو ان کے لئے تیار کرنے
کا انتظام پایا جائے گا۔

ابتدائے وحی کے وقت کی ابتدائی سورتوں کو پڑھئے تو ان میں سب سے

زیادہ زور ذکر اللہ کی کثرت اور حسن سیادت پر دیا گیا ہے اور اس پر کہ تمام پیش آنے والے واقعات و حوادث سب اللہ تعالےٰ کے اذن و مشیت کے تابع ہیں۔ اس کے بغیر دوست کسی دشمن کی مجال نہیں کہ کسی کو کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ اور یہ کہ اپنے تمام کاموں میں صرف اللہ تعالےٰ پر بھروسہ اور توکل کیا جائے۔ قیامت کے حساب و کتاب اور جزاء و سزا، جنّت و دوزخ کی فکر سے کسی وقت غافل نہ ہوں۔ اور یہ کہ دنیا کی زندگی اور اس کی راحت و تکلیف فانی ہے اور اس پر زیادہ دھیان نہ دیا جائے بلکہ بقدرِ ضرورت حاجت روائی کے لئے رکھا جائے۔

زندگی کا اصلی مقصد اللہ تعالےٰ کا ذکر و عبادت اور اس کو راضی کرنا ہو اور اس راستہ میں جتنی مشکلات پیش آئیں مردانہ مردار ان کو عبور کیا جاوے اور جو مصائب سامنے آئیں ان پر صبر و ثبات سے کام لیا جائے۔ لوگ اگر تمہارے حقوق ادا نہ کریں یا تم پر ظلم کریں تو تم چشم پوشی اور عفو در گزر سے کام لو اور ان کی خیر خواہی کو کسی حال میں نہ چھوڑو۔ ان کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں ان کو پورا پورا ادا کرو۔ سورہ اقراء، فاتحہ، مزمل اور مدثر جو بالکل ابتدائی سورتیں ہیں ان کا ترجمہ ہی پڑھ لیجئے تو اس کی پوری تصدیق ہو جائے گی۔

خلاصہ ان تمام تعلیمات کا یہ ہے کہ انسان کے رُخ کو خدا تعالےٰ کی طرف پھیر کر اس کے تمام ارادوں اور خواہشات کو حق تعالےٰ کی مرضی کے تابع بنا دیا جائے جس طرح اس کی عبادت صرف اللہ تعالےٰ کے لئے ہے اسی طرح اس کے تمام دنیاوی کاروبار کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، جینا مرنا، دوستی دشمنی، حب و بغض مرضیٔ اللہ کے تابع ہو جائے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کا یہی مطلب ہے۔ حدیث صحیح میں اسی کو کامل ایمان کی علامت بتلایا گیا ہے:۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ۔ (بخاری و مسلم)	جس شخص نے اپنی محبت بھی اللہ کے لئے وقف کر دی اور بغض و دوستی بھی، اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔

اسی صفت کے حاصل ہونے سے انسان، انسان کامل اور پورے عالم کے لئے وجہ سکون واطمینان بنتا ہے۔ یہی وہ انسان ہوتا ہے جس سے نہ کسی چوری اور بدمعاشی کا اندیشہ، نہ دھوکہ فریب یا ایذا رسانی کا خطرہ، نہ گروہی عصبیت اُس کے پاس آتی ہے، نہ دولتِ دُنیا کی ہوسِ خام اس کے ذہن و دل کو داغدار کرتی ہے۔ اس کو دھن ہی ایسی لگی ہے کہ لوگوں سے اپنے حقوق وصول کرنے کی بھی اُسے فرصت نہیں، دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا احتمال کہاں! ؎

خود جہم جائے جنگ و جدل نیک و بد   کن دلم صلحہا ہم می رمد

نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو ساری دنیا سے مختلف ایک نظریہ لے کر تشریف لائے اور پورے عالم میں اس نظریہ کو عام کرنے اور سب کو اس کے زیر اثر چلانے کی فہم ساتھ لائے۔ آپؐ نے اس عظیم مقصد کے لئے نہ ٹینک اور ہوائی جہاز بنائے اور نہ قلعہ شکن توپیں اور ایٹم بم اور نہ عالمگیر انداز میں کسی اجتماع اور جماعت سازی کی فکر فرمائی۔ بلکہ سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جس قدر انسان آپؐ کے ساتھ لگ سکے ان کو مذکورہ بنیادوں پر فرشتہ خصلت بلکہ فرشتوں سے بھی بالاتر ایک مخلوق بنا دیا۔ جو نتیجہ تھا قرآن کریم کی تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا۔

اثر اس حکمت عملی کا وہ ہے جس نے ساری دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا کہ تیرہ سال کی مدت میں جو ایک مختصر بلکہ نہایت مقدس انسانی معاشرہ تیار ہُوا جب یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خلقِ خدا کی خیر خواہی میں سرشار ہو کر اپنی حاصل کی ہوئی دولتِ انسانیت کو عام کرنے کی دعوتِ حق لے کر نکلا تو خدا تعالےٰ کی امداد و نصرت ہر قدم پر اس کے ساتھ ہوئی۔ اس کے عزم و استقلال کے سامنے کوئی کوہ و دریا اور بڑی سے بڑی طاقت حائل نہ تھی۔ تھوڑے عرصہ میں انہوں نے لاکھوں انسانوں کو اپنے رنگ میں رنگ کر خدا شناس انسان کامل بنا دیا اور اب یہ حزب اللہ بغیر کسی خاص تنظیم و اسکیم کے خود بخود دنیا کے جغرافیہ میں ایک مستحکم طاقت بن کر سامنے آگئی۔ اس کی ساری تعلیم ایک اللہ اور اس کا کلام تھا اور ساری تنظیم رسول اکرمؐ کی اطاعت شعاری اور جاں نثاری تھی۔

قرآن و رسولؐ کی تعلیم و تربیت سے جو مقدس گروہ پیدا ہوا حق تعالیٰ نے اس کا نام "حزب اللہ" رکھ کر ان کی فلاح دنیا و آخرت کی ضمانت دے دی۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

"یہ اللہ کا گروہ ہے خوب سن لو کہ اللہ کا گروہ ہی کامیاب ہونے والا ہے۔"

اس حزب اللہ کی صفات اور خصوصیات قرآن کریم نے مختلف سورتوں میں مختلف عنوانات سے بیان فرمائی ہیں۔ بات اگرچہ طویل ہوتی جاتی ہے، مگر مقصد کا گہرا تعلق اسی سے ہے۔ آئیے قرآن کریم کے ہی الفاظ میں اس کے چند نمونے دیکھئے:-

سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا:-

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ج وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ج وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (آیت ۱۷۷)

"لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے کہ جو کوئی ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر، اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کرے اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف اور لڑائی کے وقت یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار۔"

سورۂ مومنون پارہ ۱۸ میں ارشاد فرمایا۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝

"کام نکال لے گئے ایمان والے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ٥ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ٥ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ـ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥

اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں، مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر، سو ان پر نہیں کچھ الزام، پھر جو کوئی ڈھونڈے ان کے سوا، سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے، اور جو اپنی امانتوں اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی خبر رکھتے ہیں، وہی ہیں میراث لینے والے، جو میراث پائیں گے باغ ٹھنڈی چھاؤں کے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔"

(پارہ ۱۸ آیت)

سورۂ نور میں ان کی یہ صفت بیان فرمائی :-

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ـ (آیت ۳۷)

"وہ مرد کہ نہیں غافل ہوتے سودا کرنے میں اور نہ بیچنے میں اللہ کی یاد سے اور نماز قائم رکھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے، ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔"

سورۂ فرقان میں اس گروہ کی خصوصیات یہ بیان فرمائیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ٥ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ٥ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ٥ؕ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ٥ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا

"اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں اور جب بات کرنے لگے ان سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت، اور وہ لوگ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے آگے سجدہ میں اور کھڑے، اور وہ لوگ کہ کہتے ہیں اے رب! ہٹا ہم سے دوزخ کا عذاب بے شک اس کا عذاب چمٹنے والا ہے، وہ بری جگہ ہے ٹھہرنے کی اور بری جگہ رہنے کی اور وہ

وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ
لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ
لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ○
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ
مُهَانًا ○ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ
عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ
سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ وَمَنْ
تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ
اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ
الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا
كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا
صُمًّا وَّعُمْيَانًا ○ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا
وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا
لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○

(سورۂ فرقان)

لوگ کہ جب خرچ کرنے لگیں نہ بے جا اُڑائیں
اور نہ تنگی کریں اور ہے اس کے بیچ ایک سیدھی
گزران، اور وہ لوگ کہ نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ
دوسرے حاکم کو اور نہیں خون کرتے جان کا جو
منع کر دی اللہ نے، مگر جہاں چاہیئے، اور
بدکاری نہیں کرتے اور جو کوئی کرے یہ کام وہ
جا پڑا گناہ میں، دونا ہوگا اس کو عذاب
قیامت کے دن اور پڑا رہے گا اس میں خوار
ہو کر، مگر جس نے توبہ کی اور یقین دلایا اور
کیا کچھ کام نیک سو اُن کو بدل دے گا اللہ
برائیوں کی جگہ بھلائیاں۔ اور ہے اللہ بخشنے والا
مہربان، اور جو کوئی توبہ کرے اور نیک کام
کرے سو وہ پھر آتا ہے اللہ کی طرف پھر
آنے کی جگہ۔ اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے
جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں کھیل
کی باتوں سے نکل جائیں گے بزرگانہ، اور
وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب
کی باتیں نہ پڑیں اُن پر بہرے اندھے ہو کر
اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب! دے
ہم کو ہماری عورتوں کی طرف سے اور اولاد
کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور کر ہم
کو پرہیزگاروں کا پیشوا۔"

اور سورہ فتح کے آخر میں ارشاد فرمایا :-

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۔ (آیت ۲۹)

"محمد رسول اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدے میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی، نشانی اُن کی اُن کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر کی ۔"

اس گروہ حزب اللہ کی خصوصیات اور صفات پر مشتمل قرآن کریم کی بے شمار سورتیں اور آیات موجود ہیں اور مذکورہ الصدر آیات سے بھی اس گروہ کی خصوصیات کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے جس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے اس گروہ کی تعلیم وتربیت کس نصاب اور کن خطوط پر فرمائی تھی اور آج کوئی شخص یا جماعت اگر اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر اور صحیح انسان اور اچھے افراد پیدا کرنا چاہے تو اُن کو یہ کام کس طرح اور کن اصولوں پر انجام دینا چاہیئے ۔

مذکور الصدر آیات سے حزب اللہ کی خصوصیات کا جو خاکہ حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے :-

(آیات سورہ بقرہ سے)

(۱) اللہ تعالٰے، روزِ آخرت، ملائکہ، قرآن اور تمام انبیاء پر کامل ایمان ۔

(۲) اپنے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں کی امداد اور غلاموں کی رہائی پر اپنا محبوب مال خرچ کرنا ۔

(۳) نماز قائم کرنا (یعنی اُس کے آداب وشرائط کے موافق ادا کرنا) ۔

(۴) مال کی زکوٰۃ واجبہ ادا کرنا ۔

(۵) کسی سے جو معاہدہ ہو جائے اس کو پورا کرنا ۔

(۶) مصیبت اور فقر وفاقہ اور دشمنِ دین سے جنگ کے وقت ثابت قدم رہنا ۔

یہ چھ خصوصی اوصاف ہیں جن کے حاملین کو قرآن کی زبان میں صادقین اور متقین کا

خطاب دیا گیا ہے۔

(سورۂ مومنون کی آیات سے)

(۷) نماز میں خشوع۔ یعنی غیر ضروری حرکات سے سکون، خواہ حرکت جسمانی ہو یا ذہنی۔

(۸) لغو سے اعراض و پرہیز، لغو سے مراد ہر وہ کام، کلام اور مجلس ہے جس سے دین یا دُنیا کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

(۹) باطنی پاکی کا اہتمام، یعنی عقائد فاسدہ اور اخلاق مذمومہ سے اپنے قلب کو پاک رکھنا۔

(۱۰) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت، بجز ان صُورتوں کے جن کی ذریعۂ نکاح وغیرہ اللہ نے اجازت دی ہے۔

(۱۱) اپنے ہر عہد و پیمان پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

(۱۲) نمازوں کی پابندی اور اہتمام۔

(سورۂ نور کی آیات سے)

(۱۳) اللہ کی یاد، نماز اور ادا زکوٰۃ کا ایسا اہتمام جو دُنیا کی ساری فکروں پر غالب ہو اور دنیا کے ہر کاروبار کے ساتھ قائم رہے۔

(۱۴) روز قیامت اور اس کے حساب کا خوف۔

(سورۂ فرقان کی آیات سے)

(۱۵) اپنی چال ڈھال میں تواضع اور عجز بندگی کو سامنے رکھنا اور تفاخر اور تکبّر سے پرہیز کرنا۔

(۱۶) لڑنے جھگڑنے والوں کے ساتھ سلامت روی کا معاملہ کرنا۔

(۱۷) رات کے اکثر حصّہ کو رکوع و سجود اور عبادت میں گزارنا۔

(۱۸) عذاب جہنّم سے پناہ مانگنا۔

(۱۹) خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لینا کہ نہ اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کریں اور نہ کنجوسی سے کام لیں۔

(۲۰) اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک یا برابر نہ ٹھہرانا۔

(۲۱) ناحق کسی کو قتل نہ کرنا۔

(۲۲) زنا اور بدکاری سے مکمل پرہیز کرنا۔

(۲۳) جھوٹ، فریب اور گناہ کی مجالس میں شریک نہ ہونا۔

(۲۴) اگر کسی بے ہودہ کام یا مجلس سے سابقہ پڑ جائے تو وہاں سے شریفانہ انداز سے گزر جائے۔

(۲۵) اللہ تعالے کے احکام و آیات کو صحیح سمجھنے کی فکر کرنا اور ان پر اندھادھند عمل کرنے سے بچنا۔

(۲۶) اپنے ساتھ اپنے اہل وعیال کی اصلاح کے لئے کوشش اور دُعا کرنا۔

(سورہ فتح کی آیات سے)

(۲۷) کفر و کافر کے مقابلے پر سخت ہونا اور دلیر ہونا۔ اسلام اور مسلمانوں کے معاملے میں رحیم و کریم ہونا۔

(۲۸) ان کے عام اوقات کا (جو ضروریات سے فارغ ہوں) مشغلہ ہما نماز اور رکوع و سجدہ کرنا ہو۔

(۲۹) ان کے چہروں پر نماز کے آثار و علامات موجود ہونا۔

(۳۰) تمام معاملات میں صرف اللہ تعالے کی رضا جوئی کا اہتمام کرنا۔

یہ ہیں وہ اوصاف اور خصوصیات جو رسول کریم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم نے اُن اَن پڑھ لوگوں میں پیدا کئے، جن کی اعتقادی، عملی، علمی، اخلاقی اور تمدنی کوئی کَل سیدھی نہ تھی۔ جس کو دیکھ کر اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلّی اللہ تعالے علیہ وسلّم کا ہر صحابی آپ کا زندہ اور چلتا پھرتا معجزہ ہے تو کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اور غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ یہ تمام اوصاف کمال اور اخلاق حسنہ اسی توحید و رسالت اور خوف آخرت کے پھل پھول ہیں جو اسلام کے بنیادی نظریہ کی حیثیت سے ان حضرات کے قلوب میں سمویا گیا تھا۔

دار ارقم کو اسلام کا سب سے پہلا مدرسہ کہو یا سب سے پہلی خانقاہ اس میں اس

قدسی گروہ کی ابتداء ہوئی اور اسی میں ان پر یہ صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) چڑھا اور یہی وہ رنگ ہے جو کسی رنگ سے مغلوب نہیں ہوتا، یہی رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کارنامہ ہے اور یہی اسلام کا پہلا سرمایہ اور اصلی طاقت ہے جس نے ترقی رفتار سے دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا دوسرا کارنامہ

ماحول یا سوسائٹی کی اصلاح

یہاں تک خاموشی کے ساتھ کچھ افراد بنائے گئے جو نظریۂ اسلام کے رنگ میں پختہ ہو کر نظامِ اسلام کے نمود بنے۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے سامنے جو مہم تھی وہ صرف مکہ یا حجاز دونوں ہی کی اصلاح کی نہ تھی بلکہ پوری دنیا کے مشرق و مغرب اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے آپ کی دعوتِ عام تھی اور یہ ظاہر ہے کہ جتنے افراد دشمنوں کے نرغہ اور ہر طرح کی مصائب و تکالیف کو برداشت کر کے اس وقت تیار ہوئے تھے وہ پورے عالم کی ہمہ گیر اصلاح کا کام پورا نہیں کر سکتے تھے۔

اس لئے اب دوسرا قدم اس صبغۃ اللہ کو عام کرنے اور حزب اللہ کے افراد بڑھانے اور پھیلانے کی طرف اٹھایا گیا۔ وہ بھی عام دنیا کے مروجہ طریقوں سے مختلف ایک انوکھے انداز سے خالص فطری اصول پر اس طرح اٹھایا گیا کہ اس مکتبِ فکر کے ہر تربیت یافتہ شخص پر یہ فرض کر دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ماحول کو اپنے رنگ کے مطابق بنانے میں اپنی پوری کوشش اور پوری توانائی کو خرچ کرے اور اس راہ میں جان و تن کی بازی لگا دے اور جو کوشش و تدبیر کے بعد بھی ہم رنگ نہ ہو اس سے اپنی برأت اور قطع تعلق کا اعلان کر کے اُسے اپنے ماحول سے علیحدہ کر دے۔

تجربہ شاہد ہے کہ کسی فرد یا قوم کے بننے اور بگڑنے کا اصل مدار اس کے ماحول

اور سوسائٹی پر ہی ہوتا ہے۔ انسان فطرتاً دوسرے سے متاثر ہو کر غیر شعوری طور بھی اس کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ جب تک انسان کا ماحول درست نہ ہو کوئی تعلیم و تربیت کام نہیں دیتی اور اپنے ماحول اور گرد و پیش میں ایک بھی غیر جنس کا آدمی ہو تو وہ بھی ماحول کو درست کرنے کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتا ہے، بڑا ہی حکیمانہ مقولہ ہے ؏

کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

اسی لئے قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ہر شخص پر یہ ذمہ داری عائد کر دی کہ وہ جس طرح اپنے عمل کی اصلاح کی فکر کرے اسی طرح اپنے اہل و عیال اور خاص احباب کی اصلاح کے لئے بھی ایسی ہی کوشش کرے۔ قرآن حکیم نے فرمایا: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے۔ اور رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔ "تم میں سے ہر ایک اپنے کنبہ پر نگران اور ذمہ داری ہے۔

اور قیامت کے روز اس سے اپنے اعمال کی پرسش اور علاوہ اپنے اہل و عیال کے اعمال کا بھی سوال ہو گا۔

نئی نسل کی تربیت

اہل و عیال کی اصلاح کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ نئے پیدا ہونے والے بچوں کو شروع ہی سے ایسی تربیت دی جائے کہ اُن کے قلب و دماغ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی عظمت و محبت سے رنگے ہوئے ہوں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی حکیم الحکماء سید الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے جو اصول وضع فرمائے وہ بھی ایسے فطری اور مؤثر ہیں کہ بغیر کسی مشقت کے بچہ کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا ذہنی اور اخلاقی ارتقاء خود بخود ہوتا چلا جائے۔

سب سے پہلا کام جو بچہ کی پیدائش کے متصل ماں باپ پر لازم کیا وہ یہ کہ اس کے

داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جائے۔ نرے فلسفہ طبعی کے پرستار تو کہیں گے کہ فضول حرکت ہے کہ جو بچہ ابھی اپنی ماں کی زبان بھی نہیں سمجھتا اس کے کان میں حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح کے عربی جملے ڈالنے سے کیا فائدہ؟ مگر نفسیات کے جاننے والے سمجھیں گے کہ یہ الفاظ حقیقت شناس سمجھتے ہیں کہ یہ الفاظ درحقیقت ایمان کا بیج ہے جو کان کے راستے سے بچہ کے دل میں ڈالا گیا ہے اور یہ بیج پرورش پاکر کسی وقت ایک تناور درخت بنے گا۔ دوسرا کام یہ کہ جب یہ زبان کھولنے لگے تو اس کو سب سے پہلے اللہ کا نام سکھاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے بچوں کی زبان کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے کھلواؤ اور یہی کلمہ موت کے وقت ان کو یاد دلاؤ"

(رواہ عن ابن عباس از تحفۃ الودود لابن القیم)

گویا دنیا میں دخول وخروج اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ پھر جب بچہ سمجھنے بوجھنے کے قابل ہو جائے تو اللہ تعالےٰ کی عظمت و محبت اس کے دل نشین کرے اور سنت کے مطابق ادب و تہذیب سکھائے۔ بچہ کے سامنے جھوٹ بولنے، غیبت کرنے سے خود بھی پرہیز کرے کہ بچہ ان بری خصلتوں کا عادی نہ بن جائے۔ بچے کے ہاتھ سے اچھے کاموں میں خرچ کرائے کہ بخل اس کی طبیعت میں جگہ نہ پائے۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے اخلاق سے بہتر کوئی دولت نہیں بخشی اور فرمایا کوئی شخص اپنے بچہ کو ادب و تہذیب سکھائے، یہ اس سے بہتر ہے کہ بقدر ایک فطرہ کے مساکین پر صدقہ کیا کرے۔ (معجم طبرانی از تحفۃ)

قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کی یہ دعا مذکور ہے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ۔ یعنی اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیبیوں اور اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے فرمایا ہے آنکھوں کی ٹھنڈک یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالےٰ کی اطاعت میں لگا ہوا دیکھے۔

اس طرح ہر شخص پر اُس کے متعلقین کی اصلاح کی ذمہ داری ڈال کر اور ان کو اصلاح و

تربیت کے سہل اصول سکھا کر رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ہر گھر کو ایک تعلیم گاہ بنادیا جس میں غیر شعوری طور پر ہر چھوٹا بڑا صحیح انسانیت کے نہ صرف آداب جانتا ہے بلکہ عملاً اس کا خوگر بنتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اصلاحِ خلق کا یہ دوسرا پروگرام بھی جلسے سے، کانفرنس یا اجتماعی شعائر سے نہیں بلکہ فطری اصول کے مطابق دو بنیادوں پر قائم فرمایا۔ اوّل یہ کہ ہر شخص اپنے ماحول اور سوسائٹی میں اسلامی نظریہ کو حکمت کے ساتھ پیش کرے اور وہ نعمتِ ایمان وعمل صالح جو اس کو ملی ہے، جس نے اس کو صحیح معنی میں انسان بنایا ہے اپنے اہل وعیال اور دوست واحباب کو بھی اس سے محروم نہ رہنے دے۔ کیونکہ ان کی اس سے بڑھ کر کوئی بھلائی اور خیر خواہی نہیں ہوسکتی۔ ان کے ذہن کو اس کے لئے ہموار کرنے میں قرآنی تعلیم کے مطابق ہر حکمت وتدبیر اور نصیحت وہمدردی استعمال کرے۔ اور اگر وہ مقابلہ پر آجادیں تو مجادلہ حسنہ یعنی ان کو حجت ودلیل سے مغلوب کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔ ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن کا یہی مطلب ہے۔

اس اصلاحی عمل کی دوسری قسط یہ ہے کہ اگر وہ کسی طرح اصلاح قبول نہ کرے اور اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی پر ہی لگا رہے تو اس سے تعلق منقطع کرکے اپنے ماحول کو اس کے اثرات سے پاک کردے اور قرآن مجید کی پیش کردہ سنتِ ابراہیمی کے مطابق یہ اعلان کردے۔

قد بدت العداوۃ والبغضاء بیننا وبینکم حتی تؤمنوا باللہ وحدہ۔	ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت وبغض کی دیوار حائل ہے جب تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

اور پھر اس معاملہ میں اس کی بھی پرواہ نہ کرے کہ یہ مخالفت کرنے والا اپنا باپ ہو یا بیٹا یا خاندان کا کوئی فرد ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لا تجد قوما یؤمنون باللہ ورسولہ	آپ کسی مومن قوم کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ

لا تجد قوما یومنون باللہ... یوادون من حاد اللہ ورسولہ — اللہ ورسول کے دشمنوں سے دوستی رکھیں اگرچہ
ولو کانوا آباءھم او ابناءھم او — وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا
اخوانھم او عشیرتھم۔ — خاندان کے اور افراد ہوں"

اسی قربانی کے نتیجے میں قرآن کریم نے ان لوگوں کو حزب اللہ کا خطاب اور کامیابی کی خوشخبری دی۔ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔ یعنی وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا وہی مراد کو پہنچے۔

اس حکمت علمی اور فطری طور پر تدریجی ترقی کا یہ اثر تھوڑے ہی عرصہ میں آنکھوں نے دیکھ لیا کہ یہ حزب اللہ اب نہ صرف مکہ مکرمہ کے گھر گھر میں داخل ہو گیا بلکہ مکہ سے باہر بھی اُس کے افراد پہنچنے لگے۔ اس مقدس گروہ کے سامنے صرف اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اور رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی اطاعت تھی۔ اس کے سوا نہ کوئی طمع ان کے قدم میں لغزش کا سبب بنتی تھی اور نہ کسی کا خوف ان کے عزم میں ادنیٰ سستی ہی پیدا کرتا تھا ؎

گو مخالف ہوں زمین و آسماں کچھ غم نہیں
سب گوارا ہے مزاجِ یار گر برہم نہیں

یہ حزب اللہ جب اللہ تعالےٰ کی رضاجوئی اور خلق اللہ کی خیرخواہی میں سرشار ہو کر اپنی حاصل کی ہوئی دولتِ انسانیت کو دُنیا میں عام کرنے کی دعوتِ حق لے کر نکلا تو کوئی کوہ و دریا ان کی راہ میں حائل نہ رہا۔

مکہ مکرمہ میں دشمنوں کی کثرت و قوت کے باعث اس دعوت کا مقابلہ شدید تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اس کا یہ سامان فرمایا کہ مدینہ طیبہ کے کچھ خوش نصیب بزرگ مشرف باسلام ہو کر اس کے لئے تیار ہوئے کہ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو اپنے یہاں لے جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کا یہ قدم پورے قریشِ مکہ بلکہ پُورے عرب کی مخالفت اپنے سر لے لینے کے مرادف ہے۔ مگر انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ بوجھ اپنے سر پر اُٹھا لیا۔

ہجرتِ مدینہ

یہاں ہجرت کے حالات و واقعات لکھنے کی گنجائش نہیں اور میرا مقصد بھی ان سے متعلق نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھلانا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم جو پورے عالم کی ہدایت و اصلاح اور پوری دنیا میں قیام امن و امان کا مقصدِ عظیم لے کر تشریف لائے تھے آپؐ نے کن اصول اور کن طریقوں سے اس مہم کو سر کیا جس کے نتیجے نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

مدینہ طیبہ میں تشریف لانے کے بعد دعوتِ حق کے راستہ سے ایک بہت بڑا سنگِ گراں تو ہٹ گیا کہ وہاں رہتے ہوئے مسلمان ہونا اور رہنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ یہاں مسلمانوں کو اس سے کسی قدر امن ملا۔ اور مسلمانوں کی تعداد روزافزوں زیادتی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ یہی وہ مدنی دورِ نبوّت ہے جس میں اسلام کے تمام تعمیری کاموں کا آغاز ہُوا اور اسلام کی سب سے پہلی چھوٹی سی حکومت مدینہ طیبہ میں قائم ہوگئی۔ لیکن جس طرح مصلحِ اعظم کے اصلاحِ خلق کے لئے ابتدائی کارنامے عام دُنیا کے طور و طریق سے بہت مختلف سادگی اور سہولت پر مبنی تھے اسی طرح اس انوکھی حکومت اسلام کے دستور و قانون اور تنفیذی مشینری بھی ساری دنیا سے مختلف تھی۔ جس میں انصاف نہایت سہل، فوری اور مفت بلکہ جبری تھا۔ تنفیذِ قانون کے لئے بہت پولیس اور پہرے چوکی کی ضرورت نہ تھی۔ جو قانون قرآن میں نازل ہُوا یا رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سُن لیا بس اُس کا سُن لینا تنفیذ کے لئے کافی تھا کیونکہ تیرہ سالہ دَور میں جو مقدس اسلامی معاشرہ تیار کیا گیا تھا ان سب کا حال یہ تھا کہ گویا ہر مرد و عورت احکامِ شرعیہ کے لئے گوش بر آواز رہتے تھے۔ حکم سُن لینے کے بعد اُس کی خلاف ورزی کا وہاں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

شراب، زمانۂ جاہلیت سے عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ تقریباً تمام عرب اس کا عادی تھا اور ابتداءِ اسلام میں اس کا پینا حرام بھی نہیں کیا گیا تھا اس لئے مسلمانوں

کو بھی اس سے اجتناب کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بجز رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ اور چند مخصوص حضرات کے، جن کی طبائع کو اللہ تعالیٰ نے فطرتاً ایسا بنایا تھا کہ جو چیز آئندہ چل کر قابلِ نفرت اور حرام ہونے والی تھی ان کے طبائع قدسیہ پہلے ہی سے ان چیزوں سے نفرت کرتی تھی۔ اور اسی لئے شراب کے حلال ہونے کے زمانہ میں بھی انہوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مگر ان کے علاوہ عام صحابۂ کرام اور اور سب مسلمان اس وقت تک شراب کے عادی تھے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس اُمّ الخبائث کا جو عادی ہو جائے اس کو اس کا چھوڑنا اپنی جان دینے کے برابر گراں ہوتا ہے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے اپنے کام کی بُنیاد ہی ایسی رکھی تھی کہ اس پر ہر تعمیر نہایت آسان اور پختہ ہی استوار ہوتی تھی۔

جس وقت شراب کی حرمت قطعی طور پر قرآن میں نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے ایک صحابی غالباً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو حکم دیا کہ مدینہ کی گلیوں میں جا کر یہ منادی کر دیں کہ الا ان الخمر قد حرمت۔ یعنی "خبردار شراب حرام کر دی گئی ہے"۔

ابوہریرہؓ کی ایک آواز نے پورے مدینہ میں جو عجیب و غریب انقلاب پیدا کیا وہ تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس منادی کے وقت بہت سے گھروں میں شراب کا دَور چل رہا تھا۔ حالت یہ ہُوئی کہ جس کے ہاتھ میں جام تھا اور ہونٹوں کو لگا ہُوا تھا اُس نے وہیں سے اُس کو پھینک دیا۔ جس کے پاس صراحی یا خم یا شراب کا مشکیزہ تھا اُس نے فوراً اُسے توڑ ڈالا۔ تھوڑی دیر میں مدینہ کی تمام گلیوں میں شراب اس طرح بہہ رہی تھی کہ جیسے بارش کی رَو کا پانی۔ مہینوں تک ان گلیوں سے شراب کی بدبو نہیں گئی۔

بعض صحابہ تجارت کے لئے ملک شام سے کثیر مقدار میں شراب لینے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے جس وقت وہ شراب کے سینکڑوں مشکیزے اونٹوں پر

لادے ہوئے مدینہ میں داخل ہوئے تو کسی نے اُن کو شراب کی حرمت کی خبر سنا دی ۔ یہ صحابی اگرچہ حُرمت کے نازل ہونے سے پہلے اپنا بہت بڑا سرمایہ لگا کر اس کو خرید چکے تھے اور اس وقت اس کے حرام ہونے کا نتیجہ اُن کے لئے بالکل دیوالیہ ہو جانے کا تھا، مگر

ع نسبت تلخہا شیریں شود

اطاعت رسول کے آگے سارے منصوبے اور ارادے فوراً ختم کر کے شراب کے مشکیزے ایک پہاڑی پر اتار کر آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا حال ذکر کر کے حکم رسالت دریافت کیا کہ کیا اب اس کو فروخت کیا جا سکتا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح شراب کا پینا حرام ہے اسی طرح اس کو فروخت کرنا بھی حرام ہے اور اس کے معاوضہ میں جو مال حاصل کیا جائے وہ بھی حرام ہے ۔

فداکار صحابی یہ حکم سنتے ہی اپنے شراب کے لائے ہوئے ذخیرہ کے پاس پہنچے اور ایک ایک کر کے سب مشکیزوں کو پھاڑ ڈالا اور ساری شراب اس پہاڑی پر بہا دی ۔

آج کی دنیا میں کہیں اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی حکومت کا کوئی قانون اس طرح جاری ہو سکے ۔ ابھی دُور کی بات نہیں، امریکہ میں انسدادِ شراب کی تحریک چلی اور بالآخر انسداد کا قانون بن گیا اور شراب کی ہلاکت خیزی اور بدتر مفاسد کی تعلیم و تبلیغ کے لئے سینکڑوں رسالے، اخبار، پمفلٹ اس ملک میں حکومت کے زیر اثر شائع کئے گئے تاکہ لوگوں کے ذہن اس قانون کے لئے ہموار کئے جائیں ۔ لیکن اس قانون کا جو حشر امریکہ میں ہوا وہ ابھی تک لوگوں کے حافظہ سے گیا نہیں کہ اعداد و شمار بتلانے والوں نے بتلایا کہ اس سال شراب کا خرچ امریکہ میں پچھلے ہر سال سے زیادہ پایا گیا ۔

اسلام میں حرمتِ شراب اور امریکہ میں انسدادِ شراب کا موازنہ مقابلہ تو سب نے دیکھا، مگر اس کی حقیقت پر غور کرنے والے کہاں کہ اسلام میں یہ قانون کس طرح کامیاب ہوا اور امریکہ میں کیوں فیل ہوا ؟

حقیقت وہی ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دُنیا کا کوئی قانون آٹومیٹک (خودکار) مشین نہیں ہوتی بلکہ اس کو آدمی چلایا کرتے ہیں۔ جب آدمی، آدمی نہ رہے تو قانون کا حشر معلوم ہے۔ آج کی دُنیا قانون سازی اور تنفیذ قانون کی نئی سے نئی مشینری بنانے میں تو بہت ہوشیار ہے۔ قانون اور قانونی مشینریوں کے جال سے پوری مخلوقِ خدا کو جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن اس طرف دھیان نہیں دیا جاتا کہ ہماری یہ کوششیں فیل کیوں ہو رہی ہیں؟ جتنی زیادہ حفاظتی پولیس اور اس پر سپیشل پولیس و عدلیہ بڑھتی جا رہی ہے اسی رفتار سے جرائم بڑھتے جاتے ہیں۔

مگر اس کی اصل حقیقت کو یورپ کے مادہ پرست ذہن و فکر کہاں اور کس طرح جائیں۔ کیونکہ انسان کو صحیح معنے میں انسان بنانے کا پہلا اور آخری کام ہی یہ ہے کہ اس مادہ اور مادیات کے پیدا کرنے والے خدا کو پہچانیں اس سے اپنا رابطہ درست کریں۔ اس کے بغیر کوئی انسان صحیح معنی میں انسان نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک انسان انسان نہ بنے سارے قانون اور سارے نظام بے کار ہیں اور کسی طرح دنیا میں امن و امان قائم نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ لے لیجئے۔ سُود اور جُوئے کا کاروبار اسلام سے پہلے عرب میں بھی کچھ ایسا ہی عام تھا جیسے آج کل اس کو تجارت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کہا جاتا ہے۔ مگر جب قرآن میں اس کی حرمت نازل ہوئی اور ساتھ ہی یہ حکم بھی آیا کہ ممانعت سے پہلے جو سُود کے معاملات ہو چکے ہیں ان میں صرف راس المال لیا اور دیا جائے گا۔ سُود کی پچھلی رقم کا لینا اور دینا بھی جائز نہیں۔ یہ احکام فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی آخری عمر میں نازل ہوئے جب کہ اسلام تقریبًا پورے جزیرۃ العرب میں پھیل چکا تھا۔ احکام کے نازل ہوتے ہی تمام معاملات اور سُود و قمار کے معاملات سے عرب اتنا پاک ہو گیا کہ کبھی گویا یہاں یہ معاملات تھے ہی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی ایک بڑی رقم سُود کی دوسروں کے ذمہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے

سے نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں سب سے پہلے اس رقم کے چھوڑ دینے کا اعلان فرمایا جس کو حضرت عباسؓ نے بڑی خوشی سے قبول کیا۔ جوئے اور قمار میں اس سے پہلے جو شخص شرکت نہ کرتا اس کو بہت ہی حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ مگر احکامِ حرمت نازل ہوتے ہی معاملہ برعکس ہو گیا۔ لیکن ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ اس قانون کے جاری کرنے اور اس پر نگرانی کرنے کے لئے کوئی محکمہ پولیس یا خفیہ پولیس کا قائم کیا گیا ہو یا نزول حرمت کے بعد کوئی ایک واقعہ بھی خلاف ورزی کا دربارِ نبوت میں پیش ہُوا ہو۔

دُنیا کے عقلاء و حکماء اس پر غور کریں کہ آخر اسلامی قانون میں یہ کون سا جادو تھا کہ عمر بھر کی عادات کو ایک منٹ میں ختم کر دے۔ لوگ اپنے مال و دولت کے بڑے بڑے سرمایوں سے یک لخت دستبردار ہو جائیں۔

غور کریں گے تو وجہ یہی ملے گی کہ جس کو پہلے تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلام نے صرف قانون جاری نہیں کیا بلکہ قانون جاری کرنے سے پہلے انسانوں کو ایسا انسان بنا دیا کہ وہ خود ہی بُرائی سے نفرت کرنے لگے اور ہر بھلائی کے لئے تیار رہنے لگے۔ خواہ اس میں ان کی نفسانی اور طبعیاتی مفاد کتنے ہی مجروح ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حکیم الحکماء نبی الانبیاء صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے نظریہ اور نظام کو دنیا میں پھیلانے کے لئے دو بنیادیں تھیں۔ اوّل اخلاقی اور ذہنی تربیت۔ دوسرے قرآن کا قانون عدل و انصاف جس میں صرف حاکمانہ نہیں بلکہ حکیمانہ اور مشفقانہ انداز سے اُمّت کو قانون پر عمل کی دعوت دی گئی اور بصورتِ خلاف ورزی احکامِ سزا سنائے گئے۔

آج کی دُنیا قانون سازی اور قانون کی تنفیدی مشینری پر تو حکومت کی پوری قوت خرچ کرتی ہے۔ لیکن اخلاقی اور ذہنی تربیت کی طرف اوّل تو توجّہ اور دھیان نہیں اور جو ہے وہ ایسی ناکارہ ہے کہ اُس سے اخلاق کی بجائے کے بجائے اخلاقی گراوٹ اور فساد ہی فساد نتیجہ میں آتا ہے۔ کیونکہ ان کی اصلاح و تربیت کی آخری کڑی بھی صرف مادہ اور مادیات تک ہی پہنچتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب انسان کا انتہائی مقصد

مادی فوائد ہی ٹھہرے تو کوئی شخص کسی قانون کی وجہ سے اپنے مادی فوائد کو کیوں چھوڑے؟
اور جان و مال کی قربانی کس کے لئے کرے۔ یہ کام تو جبھی ہو سکتا ہے کہ جب مادیت
سے بالاتر کسی ہستی کو تمام کائنات کا خالق و مالک اور ہر چیز پر قادر تسلیم کر کے اُس
کی رضا جوئی کی فکر اور اس کی ناراضگی سے بچنا آخری مقصد ہو۔

یہاں اس موضوع پر زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ بتلانا صرف یہ تھا کہ ہجرتِ مدینہ
کے بعد جب اسلام کی اجتماعیت اور مدنیت کا دَور شروع ہوتا ہے اور اس کے
لئے ایک نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے تو وہ بھی دُنیا کی عام حکومتوں کے خلاف بالکل
فطری اور سہل اور آسان بُنیادوں پر اُٹھایا جاتا ہے جس کے لئے آج کل کے دفتری
نظاموں کی بھول بھلیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ اسلامی نظام کو چلانے کے لئے دو بنیادی اصول
ہیں۔ ایک قانون۔ دوسرے اخلاقی اور ذہنی تربیت۔ گویا اس گاڑی کے یہ دو پہیئے ہیں
جس پر اس کے چلنے کا مدار ہے۔ نفاذِ قانون کا سیدھا اور سہل طریقہ کار آپ نے کسی
درجہ میں دیکھ لیا اب تعلیم و تربیت کے نظام کو دیکھئے۔

نظامِ تعلیم و تربیّت

اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت پر نظر ڈالنے سے پہلے ایک سرسری نظر اس پر ڈالئے
جو آج کی دُنیا میں محکمہ تعلیم اور اُس کے دفاتر، ان میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد
اور پرائمری سکول سے لے کر یونیورسٹی تک جو انتظامی جال پھیلا ہوا ہے اُس کی وسعت
اور اُس پر کروڑوں روپے کا خرچ اور اس خرچ کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے والوں کے
تعلیمی مصارف کا بارِ گراں اور پھر ان سب کے باوجود اس کے نتائج و ثمرات کہ جو بھی علم و فن
ان کو پڑھایا جاتا ہے اس کی استعداد فیصدی کتنے آدمیوں میں پیدا ہوتی ہے اور یہ تعلیم ان
کے اخلاق و کردار کیسا بناتی ہے؟ اس کے بعد حکیم الحکماء سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

کے دیئے ہوئے نظامِ تعلیم کو دیکھئے وہ کس طرح فطری اور سہل وسادہ اصول پر مبنی ہے جس میں حکومت کا بھی کوئی بہت بڑا خرچ نہیں اور طالب علم پر تو ایک پیسہ کا بھی بار نہیں۔

جیسا کہ اس مقالے میں چند ورق پہلے آپ نئی نسل اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا ایک اجمالی خاکہ دیکھ چکے ہیں۔ اس کے ہر دیکھنے والا اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ہر مسلمان کا گھر بچوں کے لئے پرائمری اسکول ہے۔ رسول کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کے ہر گھر کو ایک پرائمری سکول بنا دیا ہے جس میں غیر شعوری طور پر بچے ہوش سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ضروری تعلیم حاصل کرتے جاتے ہیں۔

جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو فطری طور پر اس کو پاکی ناپاکی کی تمیز ہونے لگتی ہے اور اس وقت ماں باپ کے لئے حکم ہے کہ اس کو نماز پڑھنا سکھائیں، مسجد میں ساتھ لے جائیں۔ عام مساجد ثانوی مدارس کا کام انجام دیتی ہیں۔ غور کیا جائے تو ہماری مساجد ثانوی مدارس کے قائم مقام ہیں جہاں ہر طرح کے اہل علم وفضل جمع ہوتے ہیں۔ ان کے وعظ و پند بھی ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت سے وہ غیر شعوری طور پر علم و حکمت کے دروازے کھلتے ہیں جو بہت سی کتابیں پڑھنے سے بھی میسّر نہیں آتے۔

یہ تعلیم تو اہلِ علم وفضل کی صحبت سے اور تلقین سے حاصل ہو گی۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کو اللہ کے رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ اگر اپنے کسی مسلمان بھائی کو کسی غلطی میں مُبتلا دیکھو تو اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ ہو سکے تو ہاتھ یعنی قوت کے ذریعے روک دو۔ یہ نہ ہو سکے تو زبانی فہمائش کر دو اور یہ بھی نہ ہو سکے تو ادنیٰ ذریعہ یہ ہے کہ تم اس کے فعل کو اپنے دل سے بُرا سمجھو۔

ہاتھ سے روکنے کی صورتیں دو ہیں۔ ایک تو حکام کے لئے جو بزورِ قانون بُرائی سے روک سکتے ہیں۔ دوسرے اپنے خاص عزیز دوست یا اولاد کو جن پر اُس کا قابو ہے اور زبانی فہمائش ہمدردی کے ساتھ ہر ایک کے لئے ہو سکتی ہے۔

غور کیجئے کہ جب ہر مسلمان کو اس کی ہدایت ہے کہ اس کو جو مسئلہ دین کا معلوم ہو اور اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ اس کو اس سے باز رکھنے کی مقدور بھر کوشش کرے۔ تو اس اصول سے دینی تعلیم کی اشاعت کس قدر آسان طریقہ پر بالکل مفت بلکہ جبری ہو جاتی ہے۔ نماز گھر میں ادا کی جاسکتی تھی مگر اس کے لئے مساجد کے اجتماع میں ایک عظیم فائدہ یہ تعلیم و تلقین کا بھی مضمر ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے آئینہ بن کر اس کے غلط اقدامات پر اس کو متنبہ کرے۔ تو پوری قوم کی تعلیم اور ساتھ ہی عملی تربیت کس قدر آسان طریقہ پر ہو جاتی ہے جو نہ کسی سکول میں ممکن ہے نہ کسی مدرسہ میں۔

ہاں اس حکم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے کو غلطی پر مطلع کرنے کے لئے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ غالب ہو، نرمی کے ساتھ تنہائی میں سمجھایا جائے جس سے اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ضد پر نہ آجائے۔ قرآن کریم نے جہاں حق کی دعوت کا مسلمانوں کو حکم دیا وہیں اس کے لئے یہ شرائط بھی لگا دیں۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ یعنی اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ دانشمندی اور اچھی خیر خواہی کے ساتھ" دانشمندی کا مقصد یہ ہے کہ کہنے سے پہلے اس پر غور کرے کہ مخاطب کو یہ بات کس وقت کس حال میں کس عنوان سے پہنچاؤں جو اس کے دل میں اتر سکے پھر بات بھی اس کی خیر خواہی کے پیشِ نظر ہو اپنی بڑائی جتلانا یا دوسرے کو رسوا کرنا مقصود نہ ہو۔ اسی لئے موعظہ کے ساتھ حسنہ کی قید لگا کر اس پر تنبیہ کر دی گئی۔ مسلمانوں کی عام جہالت و غفلت نے جہاں سارے اسلامی اصول و فروع کو مختل کر دیا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اوّل تو کوئی کسی کو برائی پر ٹوکتا ہی نہیں اور جو کسی کو ٹوکنے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے تو اس میں مذکورہ آداب و شرائط نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ زرّیں اصول تعلیم و اصلاح، مساجد و محافل میں لڑائی جھگڑے اور اختلاف و افتراق کا موجب ہو جاتا ہے اور یہ کوئی دینی امور کے ساتھ مخصوص نہیں، تمام دنیوی کاروبار میں ہر وقت کا مشاہدہ ہے کہ بہتر سے بہتر مقوی غذا یا دوا کو اگر غلط طریقے

سے استعمال کیا جائے تو وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلّم کی ہدایات پر صحیح عمل کیا جائے تو بچے کے لئے آغوشِ مادر اور اس کا گھر ایک بہترین ابتدائی مدرسہ بن جاتا ہے اور ہر مسجد ایک ثانوی تعلیم کا بہترین مدرسہ بن جاتی ہے جس میں علم کے ساتھ عمل اور تعلیم کے ساتھ ذہنی واخلاقی تربیت ساتھ ساتھ ہوتی جاتی ہے اور تعلیم کا اصل مقصد جو انسان کو انسان کامل بنانا ہے اس کے درجات تدریجاً طے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

اعلٰی تعلیم اب صرف اعلٰی تعلیم رہ جاتی ہے جس کے لئے قرونِ اولٰی میں عُلماء کی مجلسیں اور درس وتدریس کے حلقے ہر شہر و قصبے میں جاری رہتے تھے۔ یہ تعلیم بھی بالکل مفت تھی۔ بعد میں مستقل مدارس اور تعلیم گاہوں کے قیام کی صورت عمل میں آئی۔

دینی علوم وفنون اور غیر ملکی زبانوں کی تعلیم اصولِ تعلیمات تو سب کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ دنیوی اور اقتصادی یا ہنگامی ضرورتوں کے لئے جو کام سیکھنا ضروری ہیں ان کا انتظام بھی اس سادہ نظام کے ساتھ ہی جاری رہا۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ لکھنا جانتے تھے ان کے ذمے یہ خدمت لگائی گئی کہ وہ صحابہ کرامؓ کو لکھنا سکھائیں۔ دوسری زبانیں جاننے اور سیکھنے کا بھی بقدرِ ضرورت انتظام تھا۔ رومی، فارسی اور حبشی زبان جاننے والے صحابہ کرامؓ میں موجود تھے۔

صنعت وحرفت کا انتظام ضرورت کے مطابق صنعت وحرفت کا سیکھنا سکھانا بھی جاری تھا اور اس کے لئے بعض اوقات اس کی بھی نوبت آئی کہ کہیں باہر جا کر سیکھا جائے۔

آلاتِ حرب کی صنعت سیکھنے کے لئے صحابہؓ کا اہتمام حافظ حدیث ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عروہ بن مسعودؓ اور غیلان بن سلمہ رضی اللہ عنہما غزوۂ حنین میں اس لئے شریک

نہیں ہوسکے کہ وہ بعض جنگی سامانوں کی صنعت سیکھنے کے لئے جرش میں مقیم تھے۔ وہاں رہ کر
دبابات، ضبور، منجنیق کی صنعت سیکھی۔ (البدایہ والنہایہ بیان غزوہ حنین ص۳۴۵ ج ۴)
دبابہ اور ضبور قلعہ کے محاصرہ کے وقت تیروں تلواروں کی لوچھاڑ سے بچ کر قلعہ تک
پہنچانے والی ایک قسم کی گاڑی ہے جس میں بیٹھ کر اس کو چلایا جاتا ہے۔ اسی کی ترقی یافتہ
شکل آج کل کے ٹینک ہیں۔ بعض اہلِ علم سے سنا ہے کہ انگریزوں نے قلعہ میسور کی فتح کے
وقت بھی اُسے استعمال کیا تھا۔ منجنیق وہ آلہ ہے جس سے بھاری پتھر اٹھا کر پھینکے جاتے ہیں۔
قلعہ شکن توپوں کی ایجاد سے پہلے ان سے کام لیا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم نے فتح کرنے کے
وقت سب سے پہلے مقام دیبل کے قلعہ پر اس کو استعمال کیا تھا۔ غور کیجئے! کس قدر سہل سادہ
بلا خرچ تعلیم کا نظام ہے جس کے ذریعے علمی استعداد کی تکمیل، اخلاقی اور ذہنی ارتقاء، عمل
اور کردار کا استحکام ساتھ ساتھ ہو رہا ہے اور تعلیم کا اصل مقصد انسان کو صحیح بنانا کس
آسانی کے ساتھ پورا ہو رہا ہے۔ یہاں ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ اس وقت سادہ
زندگی و سادہ معاشرت پوری دنیا میں عام تھی اس کے لئے زیادہ تعلیم کی ضرورت نہ
تھی۔ مذکور الصدر نظام تعلیم اُس قدر تعلیم کے لئے کافی تھا آج کی دُنیا کہیں سے کہیں
پہنچ گئی۔ علم و تعلیم کے اتنے بے شمار شعبے ہو گئے کہ ان کے حاصل کرنے کے لئے یہ پچھلا
نظام کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر کوئی شخص اسی سادہ مگر مختصر نظامِ تعلیم کے تعلیم یافتہ حضرات کے کارناموں
پر ایک طائرانہ نظر بھی ڈال کر دیکھ لے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ اسی سادہ
نظامِ تعلیم کے تعلیم یافتہ حضرات نے حکومت، سیاست و حکمت میں وہ مقام حاصل
کیا تھا کہ ساری دُنیا کی گردنیں اُن کے سامنے جھک گئیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت
عمر فاروقؓ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نہ تھے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ
نے کہیں باہر سے علوم حاصل نہیں کئے تھے۔ حضرت خالدؓ بن ولید، ابوعبیدہؓ بن جراح
عمروؓ بن عاص، عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس
سادہ نظام تعلیم کے علاوہ کہیں سے جا کر کچھ نہیں سیکھا تھا۔ بلکہ حقیقت

یہ ہے کہ اگر قرآن و سُنّت کی تعلیمات کو صحیح طور پر حاصل کر لیا جائے تو انسان کی کوئی انفرادی اور اجتماعی ضرورت ایسی نہیں جس کے لئے اس میں بہترین اور واضح ہدایات نہ ہوں۔ شخصی اور خانگی زندگی کے تمام شعبوں سے لے کر قبائلی اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کے متعلق ایسا بہترین دستور العمل موجود ہے کہ اُس پر عمل کیا جائے تو پوری دُنیا امن وچین اور اطمینان وسکون کا گہوارہ بن جائے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو صرف ہم مسلمان ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں ان کو بھی اس کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں ہے جس کی بے شمار شہادتیں ہیں۔ اس وقت صرف ایک شہادت ایک ایسے مسیحی شخص کی پیش کی جاتی ہے جو فرانس کا ایک مشہور سیاسی مدبر ہے۔ اس نے مسلمانوں کے حالات وعزائم کا پتہ چلانے کے لئے تیس سال اسلامی ممالک میں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے گزارے اور جزائر تونس، استنبول، مصر، حجاز میں رہ کر عربی زبان اور تمام علومِ اسلامیہ حاصل کئے اور واپس جا کر ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے " ثلاثون عاما فی الاسلام " یعنی " اسلام میں تیس سال "۔ اس سیاسی مدبر کا نام ہے " سولیون روش " اس کی اپنی تحریر کے چند جملے سنیئے جو عربی سے اُردو میں ترجمہ کر کے پیش کئے جاتے ہیں وہ کہتے ہیں :-

"میں نے ایک زمانۂ طویل اسلام کو گلے لگائے رکھا جس کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی طرح امیر عبدالقادر کے خواص میں داخل ہو کر اُن کے راز معلوم کروں اور میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ امیر موصوف نے مجھ پر پورا اعتماد کر لیا اور مجھے اپنا سکرٹری مقرر کر لیا۔

میں نے اس دینِ اسلام کو جس کی اکثر لوگ بُرائی کرتے ہیں اپنی معلومات کے مطابق تمام ادیان و مذاہب سے بہتر پایا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی ایک ایسا دین ہے جو انسانی، فطری طبیعی اور اقتصادی اور اخلاقی کہلانے کا مستحق ہے۔ میں نے اپنے تمام قوانین حکومت میں کوئی ایسا قانون نہیں

پایا جو اسلام میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ بلکہ میں نے اس قانون کا مطالعہ کیا جس کو "جول سیمون" قانون فطری کہتا ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ پورے کا پورا اسلام سے لیا گیا ہے۔

پھر میں نے اس کی تحقیق کہ مسلمانوں کے نفوس میں اس دین نے کیا آثار پیدا کئے تو میں نے دیکھا کہ اس دین نے کیا آثار پیدا کئے ہیں۔ تو میں نے دیکھا کہ اس دین نے اُن کے قلوب کو شجاعت، سخاوت، شرافت اور بزرگی سے بھر دیا ہے۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ ان کے نفوس ان تمام مضامین عالیہ کے ماہر ہیں جو فلاسفر اپنی حکمت و دانش سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں شر، فساد، لغو اور جھوٹ کو کوئی نہیں جانتا۔ مسلمان سادہ دل ہیں جو کسی پر بدگمانی نہیں کرتے اور وہ اپنے طلب معاش میں کسی ناجائز و حرام کو استعمال نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے وہ مال و دولت میں اسرائیلیوں اور بعض مسیحیوں سے اکثر کم رہتے ہیں۔

اور میں نے اسلام میں ایسے دو مسئلوں کا بہترین حل پایا جس میں تمام دُنیا بری طرح مُبتلا ہے۔ ایک قرآن کا یہ قول اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ یعنی سب مُسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" جو مساوات کا ایک بہترین اصول ہے۔ دوسرے ہر مال والے پر زکوٰۃ کا فرض کرنا اور فقراء کا حق ان کے مال میں قرار دینا جس کو اگر وہ مالدار نہ دیں تو وہ جبرًا بھی وصول کر سکتے ہیں"

(الاسلام بروح المدینہ مصنفہ مصطفیٰ بیروت صہ۳۹، صہ۴۰)

(غالبًا اس کی مراد زکوٰۃ کے جبرًا وصول کرنے سے یہ ہے کہ اسلامی حکومت جبرًا زکوٰۃ وصول کر کے فقراء کا حق ان کو دلانے کی ذمہ دار ہے۔ محمد شفیع غفرلہ)

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مُسلمان اپنے گھر کے جواہرات کو چھوڑ کر دوسروں سے سنگریزوں کی بھیک مانگنے کے لئے تیار ہو گئے۔ کتاب و سُنّت کی

تعلیمات سے یکسر بے خبر ہو کر اپنے ہر کام میں غیروں کی طرف دیکھنے اور ان کی نقالی کرنے ہی میں فخر محسوس کرنے لگے۔ اس نے ان کے ہر کام اور ہر شعبۂ زندگی کو ایک لاینحل معمّہ بنا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظام فطری اصول پر سادہ، سہل اور مفید ہر شعبۂ زندگی پر حاوی اور سو فیدی کامیاب رہا ہے۔ جس کی بنیاد کتاب و سنت کی تعلیم ہے، وقتی اور دنیوی ضرورتوں کے لئے بقدرِ ضرورت صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت سبھی کچھ سیکھا اور سکھایا جاتا تھا۔

بات دُور چلی گئی، یہاں نظامِ حکومت یا نظامِ تعلیم پر کوئی تفصیلی بحث مقصود نہیں، بتلانا صرف یہ ہے کہ حکیم الحکماء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ہر کام اور ہر چیز کا جو نظام خلقِ خدا کو عطا فرمایا وہ نہایت مکمل اور مفید و کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ سہل اور کم خرچ بالانشین تھے۔ جب سے دُنیا نے اس کو چھوڑا قانونی مشینری اور رطول طویل دفتری نظام کی بھول بھلیاں تو ضرور وجود میں آئیں، جو ایک ظاہر بین شخص کے لئے ممکن ہے کہ نظر فریب ہو مگر نتائج اور عواقب کے اعتبار سے دنیا نے مشاہدہ کر لیا کہ وہ بالکل ناکام ثابت ہوئی۔

آج کی دنیا میں انصاف قائم کرنے اور جرائم کو روکنے اور ملک میں علم و تعلیم کو اور اس کے ذریعہ اخلاقِ حسنہ کو عام کرنے کے نام پر ہزاروں مستقل ادارے قائم ہیں۔ لاکھوں تعلیم یافتہ ماہران میں کام کرتے ہیں اور یوں اربوں روپیہ اُن پر صَرف ہوتا ہے۔ مگر نتائج پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ روز بروز انصاف رخصت ہوتا جاتا ہے۔ جرائم بڑھتے جاتے ہیں۔ علم و تعلیم کا معیار پست ہوتا جاتا ہے۔ اخلاق کی گراوٹ انتہا کو پہنچی جاتی ہے۔ اور ملک و ملت کے بہی خواہ جب اس افراتفری کو دیکھتے ہیں تو ایک پولیس پر دوسری اسپیشل پولیس کا ادارہ اور ایک خفیہ پر دوسرا خفیہ ادارہ، ایک اصلاح کی اصلاح کے لئے اور ایک ادارہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس کا ہر زمانے میں نتیجہ یہی

یہی رہتا ہے کہ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

وجہ وہی ہے جو اُوپر بار بار ذکر کی جاچکی ہے کہ قانون اور قانونی مشینری کوئی خود کار مشین نہیں، اس کو چلانے کے لئے انسان درکار ہیں اور اس کا قحط ہے ۔ بقول سلطان عالمگیرؒ کے "دنیا میں وہ چیز جو بہت ہونے کے باوجود نہیں ہے وہ انسان ہے۔"

اور صحیح انسان بننے کا راستہ بجز اسلامی نظریہ توحید و عقیدہ آخرت کے کوئی نہیں ہے۔

اِسلامی نظریہ اور نِظام کے ثمرات

امن و امان، عدل و انصاف، سلامت و سکون

اُوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ سید الانبیاء سرورِ کائنات صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے جو نظریہ اور نظام خلق خدا کو عطا فرمایا اُس کے دو بُنیادی اصول تھے۔ اوّل انسان کو خوفِ خدا اور آخرت کے ذریعے اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے انسان بنانا۔ جو مال و دولت جاہ و حشم اور خواہشاتِ نفسانی کے تحصیل میں ایسا مست ہی نہ ہو کہ ہر جائز و ناجائز طریق سے حاصل کرنے کی فکر کرے، دُوسروں کے حقوق چھینے اور تکلیف پہنچائے۔

بلکہ دُوسروں کے حقوق پورا کرنے کا قوی جذبہ اور اپنے حقوق سے چشم پوشی اور عفو و درگزر اس کا شیوہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جس دنیا میں ایسے انسان ہوں، وہاں ظلم و جور، قتل و غارت اور فسق و فجور کا وجود کیسے متصور ہو سکتا ہے۔

دُوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر کام میں اچھے بُرے اور صحیح و غلط، مفید و مضر

کا معیار انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار سے نہیں بلکہ خالقِ کائنات اور رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے اصول سے طے کیا جائے۔ اس کے ہر قانون کی بنیاد حکمِ خدا اور رسول اور ہر کام کا مقصد ان کی رضا ہو۔

ان دونوں اصولوں کا لازمی نتیجہ وہ تھا جو دُنیا نے آنکھوں سے دیکھا اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک ان اصولوں پر عمل ہوتا رہا۔ اور آج بھی جس خطّہ ملک میں اس پر پورا پورا عمل ہو جائے وہ ملک یقیناً راحت وسکون کی جنت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم فداہٗ ربی اُمی پورے عالم کے لئے پیغمبر امن و امان اور سلامت و راحت بن کر تشریف لائے تھے جس وقت تک دُنیا نے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پروگرام پر عمل کیا، امن وچین کا دَور دورہ رہا۔ جب اس پروگرام کو چھوڑا تو فتنہ وفساد، ظلم وجور اور طرح طرح کے جرائم پھوٹ پڑے۔

دُنیا نے امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے اور انسدادِ جرائم کے لئے سینکڑوں مختلف قسم کے نظام چلا کر دیکھ لئے اور نتیجہ سب کے سامنے یہ آیا کہ جوں جوں یہ نظام بڑھے، جرائم کا طوفان بھی بڑھا۔ انصاف رخصت ہوا، اور امن واطمینان کا نام نہ رہا۔

اب ذرا اس میدان میں آگے بڑھنے کی بجائے کچھ پیچھے لوٹ کر دیکھیں اور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے نظام کو زیادہ نہیں تو کچھ عرصہ ہی کے لئے، امتحان ہی کے طور پر سہی، آزما کر دیکھیں اور پھر اس کا مشاہدہ کریں کہ دُنیا میں امن و امان، راحت وسلامت صرف پیغمبرِ امن و سلامت رسولِ اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مدتوں سے وابستہ ہے۔ اس کے تاریخی شواہد عہدِ رسالت اور پھر خلفاءِ راشدین اور صحابہ وتابعین کے دورِ حکومت میں مسلسل اور بعد کے زمانوں میں جب کہیں اس نظام کو پورا جاری کیا گیا اس

جگہ ایسے مشاہد ہیں کہ مخالف معاند کو بھی انکار کی گنجائش نہیں رہتی ۔
خیال تھا کہ اس جگہ اُس کے چند نمونے تاریخ اسلام سے پیش کئے جائیں مگر اس وقت اس مقالہ کو مزید طول دینا وقت کی گنجائش اور اپنے مشاغل کے اعتبار سے آسان بھی نہیں ۔ اور تاریخ اسلام میں ان کے نمایاں اور واضح ہونے کی بناء پر ضروری بھی نہیں ۔ اس لئے اس وقت اسی پر مقالہ کو ختم کرتا ہوں ۔
اللہ تعالٰے قبول فرمائیں اور ہم سب کے لئے مفید بنائیں ۔

واللہ المستعان وعلیہ التکلان

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

کراچی نمبر ۵

نومبر ۱۹۶۲ء ، رجب ۱۳۸۲ھ

اِتّباعِ سُنّت کا صحیح طریقِ کار

بین الاقوامی سیرت کانگریس کیلئے ایک پیغام

۱۲ / ربیع اوّل کو کراچی میں بین الاقوامی سیرت کانگریس کا جو اجلاس ہُوا اس کے لئے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک پیغام ارسال فرمایا تھا جس کا عربی ترجمہ مدیر "البلاغ" نے کانفرنس میں سُنایا۔ یہ پیغام پیشِ خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

یہ مبارک مجلس جو خاتم الانبیاء صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ پر مذاکرے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یقیناً یہ اپنی نوعیّت کی ایک منفرد مجلس ہے کہ اس میں تمام اسلامی ممالک بلکہ پُوری دُنیا کے چیدہ اہلِ علم اصحابِ فکر زعماء اور دانش ور اسی مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ چونکہ اس مجلس کا موضوعِ گفتگو رسول اکرم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ ہے اس لئے اس میں شرکت کا کوئی حصّہ مل جانا دین و دنیا کی بڑی سعادت ہے۔ مقالہ کی حد تک اس بزم میں شرکت کے لئے احقر نے "پیغمبر امن وسلامت" کے عنوان سے ایک مقالہ داخل کر دیا ہے جو انشاء اللہ تعالےٰ مطبوعہ صورت میں سامنے آجائے گا۔ لیکن میں اس اجلاس میں مقالہ کے بجائے چند دردمندانہ گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ سیرتِ طیّبہ پر علمی مقالات کی کسی دَور میں کمی نہیں رہی۔ خود اس تاریخی سیرت کانگریس نے یقیناً اس موضوع پر گراں قدر علمی سرمایہ تیار کیا ہو گا۔ البتہ سیرت طیّبہ

کا ایک پہلو ایسا ہے جس سے بے توجہی اور بے پرواہی ہم میں عام ہو رہی ہے اور احقر کی رائے میں اہلِ علم و فکر کے اس منتخب اجتماع کو اس پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

سیرتِ طیبہ کے لئے منعقد ہونے والی اس عالمی محفل کے لئے قرآن کریم کا سب سے واضح اور جامع ہدایت نامہ یہ ہے :-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

"بلا شبہ تمہارے لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ طیبہ میں بہترین نمونہ ہے، اُن لوگوں کے لئے جو اللہ (کی رحمت) اور یوم آخرت سے امید رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں"

اس آیت نے ہمارے سامنے رسولِ کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے حالات و مقالات پڑھنے اور سُننے کے مقصد کو واضح کیا ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ سردارِ دو عالم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور آپؐ کے حالات و مقالات کو عام دُنیا کے بادشاہوں، فلسفیوں، دانش وروں اور لیڈروں کی طرح محض ایک تاریخ اور سوانح نہ سمجھا جائے بلکہ درحقیقت سیرتِ طیبہ ایک عملی قرآن کا نام ہے جس میں تمام اسلامی تعلیمات اور اُن پر عمل کرنے کے طریقے سموئے ہوئے ہیں۔ وہ ایک "صبغۃ اللہ" (خدائی رنگ) ہے جس میں پوری دنیا کو رنگنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ یہ وہی "صبغۃ اللہ" ہے جس کی معجزانہ تاثیر نے بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلے اور ہزارہا مخالفتوں کے نرغے میں رہتے ہوئے صرف تئیس سال کی مختصر مدت میں پورے جزیرۂ عرب کو مسخر کر لیا اور خود آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک ہی میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد انسان جن میں مرد عورت اور چھوٹے بڑے سب شامل ہیں، اس رنگ میں ایسے رنگے گئے کہ ان کے دیکھنے والوں پر بھی پہلی نظر ہی میں یہ رنگ چڑھنے لگتا تھا۔ ان کی شان یہ تھی کہ الّذین اذا رأوا ذُکر اللہ یعنی جب ان پر نظر پڑتی ہے تو خدا یاد آتا ہے ۔

چنانچہ اسلام کی تاریخ میں ایسے واقعات بے شمار ہیں کہ دنیا کے اطراف میں جب اس نرالے رنگ کے مسلمان تجارت اور کاروبار کے لئے بھی کہیں پہنچ گئے تو وہاں کے لوگ اُن کے حالات و معاملات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ مثلاً مالا بار کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نہ وہاں کوئی تبلیغی مشن گیا، نہ کوئی تبلیغی کانفرنس منعقد ہوئی اور نہ دعوت و تبلیغ کے معروف اور رسمی طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا گیا بلکہ وہاں صرف چند مسلمان تاجر اور مزدور پہنچ گئے تھے اور معاملات میں ان کی صفائی، سچائی اور عصمت و عفت کے حیرت انگیز واقعات دیکھ کر وہاں کے لوگوں میں ان کے دین کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا جذبہ پیدا کیا جو بالآخر انہیں کشاں کشاں اسلام کی طرف لے گیا۔

جس چیز نے انسانوں کے افکار و اعمال میں یہ حیرت انگیز انقلاب برپا کیا وہ درحقیقت عبادت و طاعت، حُسنِ معاملہ، حُسنِ اخلاق، حسنِ صورت، حسنِ سیرت حُسنِ معاشرت، عدل و انصاف، رحم و کرم، عفت و عصمت اور امانت و دیانت کا وہ دلآویز رنگ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست اور آپؐ کی ہر ہر حرکت و سکون سے مترشح تھا اور صحابہ کرامؓ نے اس رنگ کو سمجھنے اور اپنانے کے لئے اپنی عمریں وقف کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان کی زندگیاں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ کا نمونہ تھیں۔ ان کی بیشتر مجلسیں اور باہمی ملاقات و گفتگو اسی رنگ کو تازہ اور گہرا کرنے کے لئے ہوتی تھیں۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالےٰ عنہ جو صحابہ کرامؓ میں حکیم الامت کا لقب رکھتے تھے ان سے دوسرے صحابہ یہ کہا کرتے تھے:

اِجلس بنا نؤمن ساعۃً۔ "کچھ دیر کے لئے ہمارے ساتھ بیٹھ جائیے تاکہ ہم ایمان تازہ کرلیں۔"

حضرات صحابہؓ کے ایک ایک فرد کا حال یہ تھا کہ اپنے رہن سہن، نشست و برخاست سونے جاگنے اور کھانے پینے کے تمام احوال میں ان کو کوئی ایسی چیز برداشت نہیں تھی جو سیرتِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔ ان حضرات کا حال یہ

تھا کہ انہوں نے خواہ کسی کام کا کتنا پختہ عزم کر رکھا ہو، کسی مقصد کے لئے خواہ کتنا مستحکم منصوبہ بنا رکھا ہو۔ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ عمل سیرتِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف ہے تو اس پورے منصوبہ کو چھوڑ دینے میں انہیں مطلق تامل نہیں ہوتا تھا۔ اور اس کے لئے انہیں بڑی سے بڑی قربانی بھی گوارا تھی۔ حضرت معاویہؓ کا یہ واقعہ ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ اور سلطنتِ روم کے درمیان جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے صلح کی مدت کے دوران ہی فوجوں کو سرحد کی طرف روانہ شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ جونہی صلح کی مدت ختم ہو گی فوراً حملہ کر دیا جائے گا۔ رومی حکام اس خیال میں ہوں گے کہ ابھی تو مدت ختم ہوتی ہے، اتنی جلدی مسلمانوں کا ہم تک پہنچنا ممکن نہیں، اس لئے وہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور اس طرح فتح آسان ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جیسے ہی مدت پوری ہوتی آپؓ نے فوراً پوری قوت سے رومیوں پر یلغار کر دی۔ ظاہر ہے کہ رومی اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لا سکے اور پسپا ہونے لگے۔ عین اسی حالت میں جبکہ حضرت معاویہؓ کا لشکر فتح کی اُمنگیں دل میں لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے سے ایک شہسوار آتا دکھائی دیا جو پکار پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ اکبر، اللہ اکبر وفاء لا غدر" (اللہ اکبر اللہ اکبر مومن کا شیوہ وفا ہے، غدر و خیانت نہیں) یہ شہسوار قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہؓ صحابی ہیں۔ حضرت معاویہؓ کی ذاتی رائے میں یہ چیز غدر و خیانت نہیں تھی۔ کیونکہ حملہ جنگ بندی کی مدت ختم ہونے کے بعد ہو رہا تھا۔ لیکن حضرت عمرو بن عبسہؓ نے فرمایا:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عھدا ولا یشدنہ حتی یمضی امدہ او ینبذ الیھم علی سواء۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص کا کسی قوم سے کوئی معاہدہ ہو تو وہ اس عہد کو نہ کھولے نہ باندھے (یعنی اس کے

خلاف کوئی حرکت نہ کرے، تاوقتیکہ یا اُس معاہدے کی مُدت گزر جائے، یا کھلم کھلا معاہدے کے اختتام کا اعلان کر دیا جائے۔"

حضرت عمرو بن عبسہؓ کا مقصد یہ تھا کہ اس حدیث کی رُو سے جنگ بندی کے دوران جس طرح حملہ کرنا ناجائز ہے اسی طرح دشمن کے خلاف فوجیں لے کر روانہ ہونا بھی جائز نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے لیئے وہ مرحلہ کس قدر نازک تھا؟ اس کا اندازہ بھی شاید ہم آپ اس وقت نہ کر سکیں۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ کی نصیحت اور مطالبہ پر عمل کرنے سے بظاہر ان کی ساری اسکیم فیل ہو رہی تھی۔ ان کا وہ منصوبہ پیوند زمین ہو رہا تھا جو انہوں نے نہ جانے کب سے سوچ رکھا ہو گا۔ ساری فوج کے مشقت آمیز سفر کی محنت اکارت جا رہی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لشکر کی فتح کی امنگیں مجروح ہو رہی تھیں۔ لیکن حضرت معاویہؓ نے آنحضرت صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد سُننے کے بعد ان تمام مصلحتوں کو قربان کر کے لشکر کو فوراً واپسی کا حکم دے دیا۔ (مشکوٰۃ المصابیح۔ باب الایمان) اس وقت نہ کوئی حکمت و مصلحت آڑے آئی، نہ ارشادِ نبویؐ میں کسی تاویل کا کوئی خیال آیا۔ بلکہ انہوں نے اپنے اس عظیم اقدام کو فوراً واپس لے لیا اور مفتوحہ علاقہ تک دشمن کے حوالہ کر دیا۔

حضرت مرثد بن ابی مرثد غنوی رضی اللہ تعالےٰ عنہ مہاجرینِ صحابہؓ میں سے ہیں۔ مکّہ مکرمہ میں اسلام سے پہلے عناق نامی ایک عورت سے ان کے تعلقات تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم نے انہیں کسی کام سے مکّہ مکرّمہ بھیجا۔ وہاں عناق ان سے ملی اور حسبِ سابق اپنے تعلّقات جتائے۔ لیکن حضرت مرثدؓ نے جواب میں فرمایا کہ "اسلام میرے اور تمہارے درمیان حائل ہو چکا ہے۔" اس پر عناق نے ان سے نکاح کی درخواست کی۔ لیکن حضرت مرثدؓ نے فرمایا کہ "میں نکاح پر راضی ہوں، لیکن جب تک رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے مشورہ نہ کر لوں اس وقت تک کچھ کہہ نہیں سکتا۔" چنانچہ مدینہ منورہ پہنچ کر انہوں نے آپؐ سے مشورہ کیا۔ اس پر یہ آیتِ قرآنی نازل ہوئی کہ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (یعنی مشرک عورتوں

سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں)۔ چنانچہ حضرت مرثد رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اس امرالٰہی کے سامنے سر جھکا کر نکاح کا ارادہ ترک کر دیا۔ (تفسیر مظہری ص ۲۵۵ ج ۱)۔

غرض صحابۂ کرام کا حال یہ تھا کہ وہ نبیؐ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت کے لئے اپنی جان و مال اور جذبات وخواہشات کو ہر آن قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اپنی ہر ہر نشست و برخاست کو آپ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کی فکر میں رہتے تھے اور اس معاملہ میں اُن کے جذبۂ اطاعت کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے اور جب منبر پر بیٹھ گئے تو کھڑے ہوئے لوگوں سے فرمایا "بیٹھ جاؤ" اتفاق سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہ مسجد کی طرف تشریف لارہے تھے اور ابھی دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ آپ کی یہ آواز کانوں میں پڑی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ حکم سُن کر ایک قدم آگے بڑھانا گوارا نہ کیا اور وہیں دروازے کے پاس بیٹھ گئے۔ آپؐ نے ان کا یہ جانثارانہ جذبۂ اطاعت دیکھا تو اس کی تعریف فرمائی اور پھر اندر بُلا لیا۔ (کنزالاعمال ص ۳۳۸ ج ۴)

صحابۂ کرامؓ کو سیرتِ طیبہ کی اتباع اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کی نقل اتارنے کا اس قدر شوق اور اتباعِ سنت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس معاملہ میں غیروں کے استہزاء سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے بلکہ مخالف سے مخالف ماحول میں اپنی وضع اور اپنے طرزِ زندگی پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت جثامہ بن مساحقؓ کو ہرقل بادشاہِ روم کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا، وہ ہرقل کے دربار میں پہنچے تو اُن کے اکرام کے لئے ہرقل نے انہیں سونے کی ایک کرسی پر بٹھایا۔ حضرت جثامہؓ فرماتے ہیں کہ مَیں شروع میں بے خیالی کے عالم میں اس کرسی پر بیٹھ گیا لیکن جب احساس ہُوا کہ یہ سونے کی کُرسی ہے تو اس سے فوراً اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ ہرقل نے میرے اس عمل پر ہنس کر پوچھا کہ ہم نے تو اس کرسی کے ذریعہ تمہارا اکرام کیا تھا تم اُتر کیوں گئے؟ مَیں نے جواب میں کہا :-

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلّم سے خود سُنا ہے کہ آپؐ نے اس جیسی (سونے کی چیز) پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔"

(کنز العمال ص ١٥ ج ٧، والاصابہ ص ٧٧، ج ٢)

اسی طرح صُلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی کی حیثیت میں مکّہ مکرّمہ پہنچے اور مکّہ مکرّمہ کے سرداروں سے ملنے کے لئے جانے لگے تو ان کا ازار طریق سنّت کے مطابق ٹخنوں سے اوپر تھا۔ مکّہ مکرّمہ کے سرداروں کے عام رواج کے مطابق یہ طریقہ کسی سردار کے شایانِ شان نہیں سمجھا جاتا تھا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو ان کے چچازاد بھائی نے ٹوکا کہ آپ مکّہ کے سرداروں کے پاس جارہے ہیں، وہ آپ کی اس وضع کو نہ جانے کیا سمجھیں؟ اس لئے اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے کر لیجئے۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے پاس ایک ہی ٹکسالی جواب تھا:۔

ھٰکذا ازرۃ صاحبنا ۔ "ہمارے آقا (صلّی اللہ علیہ وسلم) کا ازار اسی طرح ہوتا ہے۔" (کنز العمال ص ٨٤ ج ١٧)

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے اس طرح کے واقعات سے بلا شُبہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اہلِ علم کے مجمع میں اس قسم کے واقعات زیادہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن توجہ دراصل اس طرف دلانی ہے کہ اسلام نے دنیا کی تاریخ میں خوشگوار اور حسین انقلاب برپا کیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سرکارِ دوعالم صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کے جاں نثاروں نے آپؐ کی سیرت طیبّہ کے ایک ایک جزء کی پوری پوری نقل اتارنے کی کوشش کی اور اس معاملے میں نہ کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت اور کسی قسم کی تاویل وتحریف کو آڑے آنے دیا اور نہ اس راہ میں دوسروں کے طعن وتشنیع اور تمسخر واستہزاء کی کوئی پرواہ کی۔ اگر وہ حضرات آنحضرت صلّی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی سیرتِ طیبّہ کے صرف زبانی تذکرے پر اکتفا کرتے تو دُنیا کے اسلام کی حکمرانی کی برکات نصیب نہیں ہو سکتی تھیں۔

لہٰذا میری گزارش کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ رسولِ مقبول صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی سیرت

طیبہ اور حالات و مقالات کا سُننا سنانا ہر حال میں نور ہی نور اور نفع ہی نفع ہے اس لئے مسلمانوں کے جتنے بھی اجتماعات منعقد ہوں وہ ناکافی ہیں، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہم سیرتِ طیبہ کو ہر تعلیمی ادارے اور ہر مسلمان گھر تک پہنچانے کی فکر کریں۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ حقیقت ہر آن پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ ہم دنیا کے دوسرے لیڈروں کی طرح محض کسی شخص کی تاریخی سوانح نہیں پڑھ رہے بلکہ دُنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کا ایک نسخۂ اکسیر لے اور دے رہے ہیں جس کا صرف پڑھ لینا اور سمجھ لینا کافی نہیں۔ بلکہ اپنے جسم اور روح پر اس کا استعمال ضروری ہے۔ لہٰذا سیرتِ طیبہ کے لئے منعقد ہونے والی ہر محفل کا ہم سے ایک تقاضا ہے اور وہ تقاضا یہ ہے کہ اس محفل کے دوران ہم بار بار اپنے آپ سے یہ محاسبہ کریں کہ ہم نے کس کی حیاتِ طیبہ کو اپنا موضوع بنایا ہے اور خود ہماری زندگی کو اس سے کیا نسبت ہے ؟

یہ فریضہ یوں تو ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے لیکن ہم لوگ چونکہ عام مسلمانوں تک سیرتِ طیبہ پہنچانے کا ذریعہ ہیں اس لئے ہم پر اس فریضے کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سیرتِ طیبہ کے بارے میں ہماری ہر تقریر اور ہر مقالہ ہم سے یہ سوچنے کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی میں کس مقام پر کھڑے ہیں ؟ ہم نے دُنیا و آخرت کی صلاح و فلاح کے اس نسخۂ اکسیر سے عملاً کتنا فائدہ اُٹھایا ہے جسے قرآن کریم ہمارے لئے بہترین نمونہ قرار دیتا ہے اور جس کے فضائل و مناقب میں ہم خود رطب اللسان ہیں۔ سیرتِ طیبہ کے لئے اجتماعات بہت ہوتے رہے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ لیکن درحقیقت صرف وہ اجتماع ہماری انفرادی اور اجتماعی سعادت کی صبح صادق ثابت ہوگا جو ہمارے دلوں میں ان سوالات کا کھرا کھرا جواب تلاش کرنے کی بے تابانہ لگن پیدا کر سکے۔ جو ہمارے فکر و عمل سے منطقی تاویلات کی غلیظ تہیں اُتار کر ہمیں سیرتِ طیبہ کے آئینہ میں اپنی صحیح صُورت دکھا سکے اور جس کے بعد ہم سیرتِ طیبہ کی صرف نظری اور فلسفیانہ تعریفیں کرنے کے بجائے اتباعِ سنّت کی اس راہ پر گامزن ہو سکیں جس پر ابو بکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ اور دوسرے تمام صحابہؓ کے

نقوشِ قدم ثبت ہیں۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس مبارک اجتماع کو صرف حاضرین کی کثرت و قلت اور مقالات کے حسن و قبح کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس علمی معیار پر کامیاب بنانے کی کوشش کرے اور جب ہم اس اجتماع سے لوٹیں تو سیرتِ طیبہ کا صحیح اتباع کرنے اور کرانے کا جذبہ ہمارے دلوں میں پہلے سے زیادہ بیدار ہو اور ہم سیرتِ طیبہ کا محض نظری فلسفہ نہیں بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی دُنیا کے سامنے رکھ سکیں۔

آخر میں میری گزارش یہ ہے کہ سیرت کانگریس کے اس آخری اجلاس میں ہم اپنے آپ سے یہ پوچھیں کہ کیا ہم ایک ہفتے کی بحث کے بعد کسی عملی اقدام تک پہنچے ہیں یا نہیں؟ اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ سوال صرف میرے دل میں پیدا نہیں ہوا، بلکہ اکثر مندوبین کے دل میں پیدا ہو رہا ہے۔

چنانچہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہم کم از کم کچھ عملی تجاویز مرتب کرلیں۔ ان میں سے بعض تجاویز عام مسلمانوں کے لئے ہوں۔ بعض اہلِ علم و فکر کے لئے اور بعض مسلمان حکومتوں کے لئے۔ میرے ذہن میں تین تجاویز ہیں اگر ان کو اس کانفرنس کی طرف سے منظور کرکے شائع کردیا جائے تو امید ہے کہ یہ اجتماع جس پر مسلمانوں کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں انشاء اللہ دینی فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ وہ تجاویز یہ ہیں :۔

۱۔ یہ کانفرنس ہر دَور اور ہر جگہ کے مسلمانوں سے یہ اپیل کرے کہ ان میں سے ہر ایک روزانہ تھوڑا سا وقت سیرتِ طیبہ کے مطالعہ کے لئے نکالے، خواہ یہ وقت آدھا گھنٹہ یا اس سے بھی کم ہی کیوں نہ ہو۔ سیرت کے واقعات اپنے اہلِ خانہ کی موجودگی میں پڑھے جائیں اور اپنے نفس کا محاسبہ کیا جائے کہ وہ ان پر کس حد تک عمل پیرا ہیں۔

۲۔ یہ کانفرنس تمام مسلمان حکومتوں سے مطالبہ کرے کہ وہ :۔

(الف) سیرتِ نبویّہ کو ہر قسم کی تعلیم کے ہر مرحلے اور تمام کالجوں اور اسکولوں

میں لازمی مضمون قرار دے۔

(ب) نشر و اشاعت کے تمام اداروں میں سیرت پر مشتمل ایک پروگرام روزانہ پابندی سے نشر کیا جائے۔

۳۔ یہ کانفرنس تمام اہلِ علم و فکر سے مطالبہ کرے کہ وہ :۔

(الف) عام مسلمانوں میں سیرتِ طیبّہ کو عام فہم طریقے سے پھیلانے کے لئے کوشش کریں۔

(ب) قرآن و سُنت کو نئے نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ہر ایسے اقدام سے احتراز کریں جو تحریف کی حد تک پہنچتا ہو۔ اس کی بجائے سیرت طیبّہ کو اپنی صحیح اور اصلی صورت میں مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں نمونہ بنائیں۔

دعا فرمایئے کہ اللہ تعالے مجھے اور تمام مسلمانوں کو سُنت نبویؐ عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جوامع الکلم

یعنی چہل حدیث مترجم

رسول[1] مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص میری اُمت میں فائدہ کے واسطے دین کے کام کی چالیس حدیثیں سُنادے گا اور حفظ کرے گا۔ خدا تعالےٰ اُس کو قیامت کے دن عالموں اور شہیدوں کی جماعت میں اُٹھادے گا اور فرمادے گا کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہوجاؤ۔

اس عظیم الشان ثواب کے لئے سینکڑوں عُلمائے اُمت نے اپنے اپنے طرز میں چہل حدیث لکھیں جو مقبول و مفید عام ہوئیں۔

میری حیثیت اور حوصلہ سے بہت زیادہ تھا کہ اس میدان میں قدم رکھتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری سیرت خاتم الانبیاءؐ اس غرض سے لکھی کہ مبتدیوں اور عورتوں کو پڑھائی جائے تو مناسب معلوم ہُوا کہ آخر میں کچھ احادیث

---

[1] رواہ ابن عدی عن ابن عباس و ابن النجار ابی سعید کذا فی الجامع الصغیر ۱۲ منہ

حفظ حدیث کے دو طریق ہیں۔ زبانی یاد کرکے لوگوں کو پہنچادے یا لکھ کر شائع کردے اس لئے وعدہ حدیث میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو چہل حدیث طبع کراکر شائع کرتے ہیں۔ اس صورت میں چہل حدیث کا ہر نُسخہ اس عظیم الشان ثواب کا مستحق بنادیتا ہے اس قدر سہل الوصول اور عظیم الشان ثواب سے بھی اگر کوئی محروم رہے تو اس کی قسمت۔ سراج المنیر شرح جامع صغیر میں اسی مضمون کو عبارت ذیل میں ادا کیا ہے۔ فلو حفظ فی کتاب ثم نقل الی ان من دخل فی وعد الحدیث و لوکتبہا عشرین کتابا الخ۔ ۱۲ منہ ؎

کے مختصر جملے بھی درج کئے جائیں جن کو مبتدی بھی یاد کر سکیں۔

اس ذیل میں خیال آیا کہ پوری چالیس حدیثیں کر دی جائیں تاکہ اس کے یاد کرنے والے چہل حدیث کے عظیم الشان ثواب کے بھی مستحق ہو جائیں اور شاید ان کی برکت سے یہ سراپا گناہ گار بھی ان بزرگوں کے خدام میں شمار ہو جائے۔

(وما ذالک علی اللہ بعزیز)

تنبیہ :-

(۱) یہ احادیث سب نہایت صحیح اور قوی، بخاری و مسلم کی حدیثیں ہیں۔

(۲) چونکہ آج کل عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت زیادہ تباہ ہوتی جارہی ہے۔ اور بچپن میں تعلیم اخلاق مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اکثر احادیث وہی درج کی ہیں جو اعلیٰ اخلاق اور تہذیب و تمدن کے زریں اصول ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ۔	سارے عمل نیت سے ہیں ۔ (بخاری و مسلم)
(۲) حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ رَدُّ السَّلَامِ وَعِيَادَةُ الْمَرِيْضِ وَاِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَاِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِيْتُ الْعَاطِسِ ۔ (بخاری ومسلم، ترغیب)	مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں : اسلام کا جواب دینا ۔ مریض کی مزاج پرسی کرنا ۔ جنازہ کے ساتھ جانا ۔ اس کی دعوت قبول کرنا، چھینک کا جواب یرحمک اللہ کہہ کر دینا ۔
(۳) لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ (بخاری ومسلم)	اللہ تعالےٰ اُس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہ کرے ۔
(۴) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ ۔	چغلخور جنت میں نہ جائے گا ۔
(۵) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ (بخاری ومسلم)	(رشتہ قطع کرنے والا جنت میں نہ جائے گا ۔
(۶) اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ (بخاری ومسلم)	ظلم قیامت کے روز اندھیروں کی صورت میں ہوگا ۔
(۷) مَا اَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْاِزَارِ فِي النَّارِ (بخاری ومسلم)	ٹخنوں کا جو حصّہ پائجامہ کے نیچے رہے گا وہ جہنم میں جائے گا ۔
(۸) اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ (بخاری ومسلم)	مسلمان تو وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا سے مسلمان محفوظ رہیں ۔

ؔ یعنی اچھی نیت سے اچھے اور بُری نیت سے بُرے ہو جاتے ہیں ۔ ۱۲ منہ

(٩) وَمَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ ۔

"جو شخص نرم عادت سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا۔"

(١٠) لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ ۔ (بخاری و مسلم)

"پہلوان وہ شخص نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہی شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔"

(١١) إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ۔

"جب تم حیا نہ کرو تو جو چاہے کرو۔"[1] (بخاری و مسلم)

(١٢) أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ ۔ (بخاری و مسلم)

"اللہ کے نزدیک سب عملوں میں وہ زیادہ محبوب ہے جو دائمی ہو اگرچہ تھوڑا ہو۔"

(١٣) لَا تَدْخُلُ الْمَلٰئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ أَوْ تَصَاوِيْرُ ۔ (بخاری و مسلم)

"اس گھر میں (رحمت) کے فرشتے نہیں آتے جس میں کتا یا تصویریں ہوں۔"

(١٤) إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا (بخاری و مسلم)

"تم میں سے وہ شخص میرے نزدیک محبوب ہے جو زیادہ خلیق ہو۔"

(١٥) اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ ۔ (بخاری و مسلم)

"دنیا مسلمان کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔"

(١٦) لَا يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ (بخاری و مسلم)

"مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے قطع تعلق رکھے۔"

(١٧) لَا يُلْدَغُ الْمَرْءُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ ۔ (بخاری و مسلم)

"انسان کو ایک ہی سوراخ[2] سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاسکتا۔"

(١٨) اَلْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ (بخاری و مسلم)

"حقیقی غنا دل کا غنا ہوتا ہے۔"

(١٩) كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ (بخاری شریف)

"دنیا میں ایسے رہو جیسے کوئی مسافر یا رہگذر[3] رہتا ہے۔"

---

[1] یعنی جب حیا ہی نہیں تو ساری برائیاں برابر ہیں [2] یعنی جس سے ایکبار نقصان پہنچتا ہے پھر دوبارہ اسکے پاس نہیں جاتا۔ [3] یعنی زیادہ ٹھاٹھ نہ بناؤ۔

(۲۰) كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ۔

(مسلم از مشکوٰۃ)

"انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو بات سنے (بغیر تحقیق کے) لوگوں سے بیان کرنا شروع کر دے۔"

(۲۱) عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ (بخاری ومسلم)

"آدمی کا چچا اس کے باپ کے مانند ہے۔"

(۲۲) مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (بخاری ومسلم)

"جو کسی مسلمان کے عیب چھپائیگا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیب چھپائے گا۔"

(۲۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ اَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا اٰتَاهُ ۔

فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ ۔ (مسلم از مشکوٰۃ)

"وہ شخص کامیاب ہے جو اسلام لایا اور جس کو بقدر کفایت رزق مل گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی روزی پر قناعت دے دی۔"

(۲۴) اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ ۔ (بخاری ومسلم)

"سب سے سخت عذاب میں قیامت کے روز تصویر بنانے والے ہوں گے۔"

(۲۵) اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ ۔ (مسلم)

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔"

(۲۶) لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ ۔ (بخاری ومسلم)

"کوئی بندہ اس وقت تک پورا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

(۲۷) لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ ۔ (مسلم)

"وہ شخص جنت میں نہ جائے گا جس کا پڑوسی اس کی ایذاؤں سے محفوظ نہ رہے۔"

(۲۸) اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ ۔ (بخاری ومسلم)

"میں آخری پیغمبر ہوں، میرے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا۔"

(۲۹) لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا ۔

(بخاری)

"آپس میں قطع تعلق نہ کرو اور ایک دوسرے کے درپے نہ ہو اور آپس میں بغض نہ رکھو اور حسد نہ رکھو۔ اور اے اللہ کے بندو سب بھائی ہو کر رہو۔"

(٣٠) اِنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ وَاِنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَاِنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ ۔ (مسلم مشکوٰۃ)

" اسلام ان تمام گناہوں کو ڈھا دیتا ہے جو پہلے کئے ہوئے تھے اور ہجرت اور حج ان تمام گناہوں کو ڈھا دیتے ہیں جو اس سے پہلے کئے تھے "

(٣١) اَلْكَبَائِرُ الْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ ۔ (بخاری مسلم از مشکوٰۃ)

" کبیرہ گناہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا اور کسی کو بیگناہ قتل کرنا اور جھوٹی شہادت دینا ہیں "

(٣٢) مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ ۔

(مسلم از مشکوٰۃ)

" جو شخص کسی مسلمان کو دنیاوی مصیبت سے چھڑائے اللہ تعالےٰ اس کو قیامت کی مصیبتوں سے چھڑا دے گا۔ اور جو شخص کسی مفلس غریب پر (معاملہ میں) آسانی کرے۔ اللہ تعالےٰ اس پر دنیا و آخرت میں آسانی کرے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالےٰ اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد میں لگا رہے گا۔ اللہ تعالےٰ اس کی مدد میں لگا رہے گا "

(٣٣) اَبْغَضُ الرِّجَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ ۔ (بخاری و مسلم)

" اللہ تعالےٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض جھگڑالو آدمی ہے "

(٣٤) كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (مسلم)

" ہر ایک بدعت گمراہی ہے "

(٣٥) اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ ۔ (مسلم)

" پاک رہنا نصف ایمان ہے "

(۳۶) أَحَبُّ الْبِلَادِ إِلَى اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا۔ (مسلم)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب جگہ مسجدیں ہیں۔"

(۳۷) لَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ (مسلم)

"قبروں کو سجدہ گاہ نہ بناؤ۔"

(۳۸) لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ (مسلم)

"نماز میں اپنی صفوں کو سیدھا کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں اختلاف ڈال دے گا۔"

(۳۹) مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا۔

"جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اُس پر دس مرتبہ رحمت بھیجتا ہے۔"

(۴۰) إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ۔

"سب اعمال کا اعتبار خاتمہ پر ہے۔"

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الْمَخْصُوْصِ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ وَخَوَاصِّ الْحِكَمِ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

العبد الضعیف محمد شفیع عفی اللہ عنہ

۱۷ / رجب المرجب سنہ ۱۳۳۳ھ

حیاتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک اہم استفتاء
اور
اُس کا ناصحانہ جواب

استفتاء ۱

مخدوم العلماء والفضلاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ !

السلام علیکم۔ ماہنامہ "تعلیم القرآن" راولپنڈی جلد ۲ شمارہ ۱۱ ماہ ستمبر ۱۹۸۵ء ص ۳۸ میں مسئلہ حیات النبیؐ میں جناب کا ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔ اس کے ابہام واجمال کی وجہ سے بہت سے ناظرین کو مغالطہ ہوا یا غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا مودبانہ عرض ہے کہ مندرجہ ذیل امور کی تشریح فرما کر مغالطہ اور غلط فہمی کو دور فرمایا جاوے :-

۱ - عالم برزخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ العنصری حیاتِ دنیوی کی طرح زندہ ہیں یا روح کا جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ گو جسم سلامت مانا جائے حیات صرف روحانی ہے آپ کا کیا عقیدہ ہے ؟

۲ - عالم برزخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بجسدہ العنصری زندہ اعتقاد کرنا، آیا اکابرِ دیوبند کا متفق علیہ مسئلہ ہے یا مختلف فیہ ؟

۳ - اگر متفق علیہ مسئلہ ہے تو جو علماء عالم برزخ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ جسمانی کے منکر ہو کر صرف حیاتِ روحانی کے قائل ہیں اور قائل ہی نہیں بلکہ شب و روز حیاتِ جسمانی کی تردید کو موضوعِ بحث بنائے ہوئے ہیں اور آپ کے محولہ بالا فتوے کو (جو ملف ہذا ہے) تائید میں پیش کرتے ہیں کیا یہ اس مسئلہ میں دیوبندیت سے ہٹے

ہٹے ہوئے یا بالفاظِ دیگر دیوبندیت سے خارج ہیں یا نہیں ؟ اور آپ کے فتوے کو ان کی تائید میں پیش کرنا صحیح ہے یا نہیں ؟

۴ - اگر تائید میں پیش کرنا صحیح نہیں تو جناب اپنے فتویٰ کی ایسی مفصل تشریح فرمادیں کہ مغالطہ اور غلط فہمی دُور ہو جائے - بینوا و توجروا

السائل :- یکے از خدام علماء دین - ملتان ۹ ۷۸/۶ ہجری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مخدومنا المحترم دامت معالیکم - السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سوالات کے جواب سے پہلے یہ عرض ہے کہ میرے خیال میں پہلے بھی میری تحریر کا منشاء کچھ زیادہ مبہم نہ تھا مگر تعمیلِ ارشاد کے لئے مزید توضیح عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک عوام کا یہ اجمالی عقیدہ کہ حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اُن کے ایمان اور نجات کے لئے کافی ہے - ان کے ذہنوں کو اس کی تفصیلات سے الجھانا مناسب نہیں خصوصاً ایسے زمانہ میں کہ ہمارے عوام کو اسلام کے ضروری احکام و فرائض و واجبات اور حلال و حرام تک کی خبر نہیں اور ان کو کسی واقعی مجبوری یا غفلت کی بنا پر ان ضروری احکام کا علم حاصل کرنے کی فرصت بھی نہیں ہمارے لئے اسلام کی کوئی اچھی خدمت نہ ہوگی کہ ہم ان کو ضروری احکام دین بتلانے کی بجائے اس مسئلے کی غیر ضروری تفصیلات میں اُلجھائیں - جس بزرگ یا جس عالم نے عوام میں یہ بحث پیدا کر دی ہے میرے نزدیک کوئی ثواب کا کام نہیں کیا ہے اور آئندہ بھی اگر اس بحث کے کچھ اختلافی پہلو ہیں تو علماء کو چاہیئے کہ صرف کسی علمی مجلس میں بیٹھ کر ان کو سُلجھائیں، عوام میں اس بحث اور اختلاف کی اشاعت تقریراً یا تحریراً کرنا سوائے مفاسد کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا - اس لئے پچھلے جواب میں احقر نے قصداً مسئلے کی تفصیل و تنقیح سے گریز کیا تھا - اب چونکہ سوال ایک بزرگ عالم کی طرف سے آیا اور ایک علمی

رنگ میں آیا تو اپنی معلومات پیش کرتا ہوں۔

۱۔ جمہورِ اُمّت کا عقیدہ اس مسئلہ میں یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام برزخ میں جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہیں۔ اُن کی حیات برزخی صرف روحانی نہیں بلکہ جسمانی حیات ہے جو حیاتِ دنیوی کے بالکل مماثل ہے۔ بجز اس کے کہ وہ احکام کے مکلف نہیں ہیں بلکہ اُن کی حیات برزخی ہے بعض دنیوی احکام میں بھی باقی ہیں۔ مثلاً میراث کا تقسیم نہ ہونا، اُن کی ازواجِ مطہرات رضی سے بعد وفات کسی کا نکاح جائز نہ ہونا متقدمین میں امام بیہقیؒ کا اور متاخرین میں شیخ جلال الدین سیوطیؒ کا مستقل رسالہ اس مسئلے کی توضیح کے لئے کافی ہے جن میں روایات حدیث پوری تنقیح کے ساتھ درج ہیں بیہقی نے فرمایا۔ و لحیاۃ الانبیاء بعد الممات شواھد من الاحادیث الصحیحۃ۔ اس میں تصریح ہے کہ موت کے بعد ان کی حیات احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ موت صرف جسم پر آتی ہے روح پر نہیں اس لئے حیات بعد الموت وہی ہو سکتی ہے جس میں جسم بھی شریک ہو۔ اس حیات کو صرف روحانی کہنے کے کوئی معنی نہیں۔

اور شفاء السقام میں امام حدیث و فقہ تقی الدین سبکیؒ نے اپنی کتاب کا نواں باب اسی مسئلے کی تحقیق کے لئے لکھا ہے اس میں انبیاء علیہم السلام کے لئے بعد وفات کے حیاتِ جسمانی حقیقی ثابت کرنے کے لئے فرمایا ہے وقد ذکرناہ من جماعۃ عن العلماء و شھد لہ صلوٰۃ موسیٰ علیہ السلام فی قبرہ۔ فان الصلوٰۃ یستدعی جسداً حیاً وکذلک الصفات المذکورۃ فی الانبیاء لیلۃ الاسراء کلھا صفات الاجسام ولا یلزم من کونھا حقیقیۃً ان یکون الابدان معھا کما کانت فی الدنیا عن الاحتیاج والشراب والامتناع عن النفوذ فی الحجاب الکثیف وغیر ذالک من صفات الاجسام التی تشاھدھا بل قد تکون لھا حکم آخر فلیس فی العقل ما یمنع من اثبات الحیاۃ الحقیقۃ لھم۔ (شفاء الاسقام سبکی ص۱۴۲)

اس کے بعد شہداء کی حیاتِ برزخی پر بحث کرتے ہوئے فرمایا فلم یبق الا انھا حیاۃ حقیقۃ الان وان الشھداء احیاء حقیقۃ وھو قول جمھور العلماء لکن ھل ذالک

للروح فقط او للجسد معها فيه قولان ۔

اس کے بعد اس قول ثانی کو ترجیح دی ہے کہ یہ حیات حقیقی صرف روح کے لئے نہیں بلکہ جسد کے لئے بھی ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ جب عام شہداء امت کے لئے برزخ میں حیات حقیقی جسمانی ثابت ہے تو انبیاء کی حیات کچھ ان سے اعلیٰ و اقویٰ ہی ہو گی خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات بعد الموت حقیقی جسمانی مثل حیات دنیوی کے ہے جمہور امت کا یہی عقیدہ ہے اور یہی عقیدہ میرا اور سب بزرگانِ دیوبند کا ہے ۔

۳، ۴ مسئلہ مذکور الصدر کی تحقیق میں یہ بھی آ چکا ہے کہ صرف حیاتِ روحانی کا قول جمہور علماء امت کے خلاف ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دیوبندیت کوئی مستقل مذہب نہیں ۔ سلف اور جمہور اہل سنت والجماعت کے مکمل اتباع ہی کا نام دیوبندیت ہے جو عقیدہ جمہور اہلِ سنت والجماعت کے خلاف ہے وہ دیوبندیت کے بھی خلاف ہے ۔

میرے سابقہ فتویٰ سے حیاتِ جسمانی کے انکار پر سند پکڑنا صریح ظلم اور میرے کلام کی تحریف ہے ۔ واللہ الموفق للسداد ۔

آخر میں پھر عاجزانہ التماس ہے کہ حیات انبیاء کے تفصیل درجات کی خالص علمی بحث کو علمی دائروں میں ہی رکھا جائے عوام میں نفیاً یا اثباتاً اس بحث کو ڈالنا نہ اُن کے لئے کوئی خیر خواہی ہے اور نہ اسلام کی کوئی اچھی خدمت جو بحث کسی طرح رسالوں میں یا اشتہارُں کی صورت میں چل چکی ہے اس کو وہیں ختم کر کے اگر ہمت کرنا ہے تو کسی علمی مجلس میں مشافہۃً بحث کر لی جائے ۔ والسلام

دستخط ۔ بندہ محمد شفیع غفرلہ

دار العلوم کراچی ۱۴ ۷۸ ھجری

(نقل از ماھنامہ الصدیق ملتان جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ)

٭